

دسمبر 2018

ماہنامہ  
دکھن

URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

[www.urdutubes.com](http://www.urdutubes.com)

دکھن  
کتاب

اندونی صفحات پر  
ملاحظہ فرمائیں

Digitized by Google



چاندنگر و پند و اندیشہ

دکھن

رکن آل پاکستان تحریک ز سوسائٹی  
رکن کونسل آف پاکستان تحریک ز سوسائٹی

MEMBER  
APNS  
CPNE

باقی ————— محمود باغیض

نیکران ————— محمود باغیض

مدیر ————— نادرہ خاتون

مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود

نائب مدیر ————— شعاع حمید

مدیر خصوصی ————— اہت الشیخ

رشتہ کاران ————— خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ————— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈیٹر ایچ ایچ کونسل





## محمد نعت

فرزانہ غیندل 9  
مولانا ابرار ستریزیاری 9

## انٹرویو

## سلسلہ ناول

ساگر کنارے 68 ام طیفور  
عشق ہوا 169 نادیا احمد

## ناول

شہزاد رنگ سیاہ 102 ایمیل رحنا  
محبت شہزاد کا سیاہ چاند 151 فخر زہرہ  
زندگی تیرے رنگ 46 سدا حیات

## افسانے

شکست فاتحانہ 42 حیرانوشین  
صدقہ تمہارے 94 عائشہ تنویر  
تمہوڑی سی سجھ دلی 126 حیرانوشین  
خرافات 65 عمار خان  
پھر یوں ہوا 230 عروسہ احمد

## ناول

کونل رضوی سے ملاقات 10 شاپین رشید  
آواز کی دنیا سے 16 میرا سیٹھی  
میری بھی سنتے 13 فرخ کافلی  
مقابل ہے آئینہ 22 شائستہ حسین  
ہوائیں رخ بدل گئیں 24 نگہت عبداللہ  
شب نیم کی سحر 132 رخ چوہدری

## کرن 37- اڈو کا کلاچ

زوسٹ لائبریری بک کیئر سیکسٹی  
پاکستان (سلاٹ) ----- 700 روپے  
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 8000 روپے  
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے  
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین و بچہ اور ادارہ خواتین و بچہ کے قوت شائع ہونے والے رچل ماہنامہ شائع اور ماہنامہ کران میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت کی کاپی یا ڈیجیٹل یا فزیکل اور سلاٹ وار کٹ کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر اداروں کا نقلیہ چارٹر بھی لاگو رہتا ہے۔

## کرن کتاب

- 3 ادارہ نیوٹی ٹیکس
- 5 ادارہ اس ماہ کا پھل
- 6 ادارہ صحت
- 8 ادارہ ٹیکنالوجی
- 9 ادارہ باغبانی
- 10 ادارہ معاشرتی اور نفسیاتی مسائل
- 11 صیانت کچن اور آپ
- 13 خالد جیلانی کرن کا دسترخوان
- 16 مجھے یہ شعر پسند ہے شگفتہ سیلان
- 17 روسیہ شریف مسکراتی کرنیں
- 18 ادارہ کچھ موتی چنے ہیں

## مستقبل

- 233 شعلہ عمیر کرن کرن خوشبو
- 236 بشری محمود یاد دل کے دیکھئے بشری محمود
- 238 مدیرہ کرن تالے میسر نام

دسمبر 2018  
جلد 41 شمارہ 9  
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آدریس ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔  
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872  
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com





سال رواں اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔  
کچھ دن گزریں گے کہ یہ سال بھی ماضی کا حصہ بن جائے گا اور ہم ایک نئے سال کے سورج کو خوش آمدید کہہ رہے ہوں گے۔

ہم آگے جاتے سال خوشی اور غم کا احساس دل میں جھگاتے ہیں۔ زندگی کا ایک سال کم ہونے پر دیاں کا احساس اور نئے سال کی آمد پر منتقلی کے لیے نئی امیدیں اور نئے خواب۔  
دنیا بہت قدیم ہے، وقت کا سفر دہانے کب سے جاری ہے اور کب تک اسی طرح جاری رہے گا۔ اس دنیا میں ہمارے پاس ایک مختصر سی زندگی ہے جس کی مدت بھی نامعلوم ہے۔ لیکن یہ زندگی ہمارا اختتام نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک اور زندگی ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔ جہاں ہمیں اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہے۔ جیوتی سے جیوتی نئی اور برائی کو میسران پر ٹولا جائے گا۔ کامیاب وہی ہوگا جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا۔

دنیاوی کامیابی بہت اہم ہے۔ اس کے لیے محنت اور کوشش کریں لیکن جائزہ لے سکتے اختیار کریں۔ غلط راستے کبھی منزل تک نہیں لے جاتے۔ غلط راستوں سے حاصل کردہ کامیابی ماضی ہوتی ہے۔  
سال کا اختتام ہے۔ اپنے گزشتہ سال پر نظر ڈالیں کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس کی تلافی کریں۔ کوئی اپنا وعدہ لیا ہے تو اسے منالیں۔ کوئی کوتاہی ہو گئی ہے تو اس کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ یہی جتنی خوشی اور کامیابی کا راستہ ہے۔ اس جہان میں بھی اور اگلے جہان میں بھی۔

## اس شمارے میں،

- ۱. اداکارہ ”مکمل رضوی“ سے شائیں رشید کی ملاقات،
- ۲. اداکارہ ”میرا بیٹی“ کہتی ہیں ”میری بھی بیٹی“،
- ۳. ”آواز کی ڈنکے“ اس ماہ مہمان ہیں ”آر جے فرخ کاطلی“،
- ۴. اس ماہ ”شائستہ بایں“ کے مقابلے آئینے،
- ۵. نگہت عبداللہ کا سلسلے دار ناول ”ہوا میں زرخ بل گئیں“،
- ۶. شب غم کی سحر ”زرخ جو ہدی کا سلسلے دار ناول“،
- ۷. آرم فیضور کا مکتب ناول ”ساگر کنارے“،
- ۸. ”عشق ہو“ نادیہ احمد کا مکتب ناول،
- ۹. ایل رضا کا ناول ”شام رنگ سیاہ“،
- ۱۰. ”زندگی تیرے رنگ“ سدرہ حیات کا ناول،
- ۱۱. کیفیز زہرا کا ناول ”عقبت شب کا سیاہ چاند“،
- ۱۲. جملہ انجمن، عثمان خان، عائشہ تنویر، حمزہ افتخار اور عروسا احمد کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- ۱۳. برکت کتاب ”مختلف موضوعات کے ساتھ“،

سُؤَالِ مَقُولِ  
تَحْسِبُ

تَحْسِبُ  
بَارِیَ تَعَالٰی

رحمت کا ہے دروازہ کلامانگ ارے مانگ  
رہتا ہے کرم ان کا سدا مانگ ارے مانگ

آبلے گا طیبہ سے بلاوا بھی کسی روز  
ہر وقت مدینے کی دعا مانگ ارے مانگ

مایوس نہ ہو یہ میرے لچال کا در ہے  
ہے کس لیے خاموش کھڑا مانگ ارے مانگ

بھر جائے گا کشتول مرادوں سے تیرا بھی  
بن کر میرے آقا کا گدا مانگ ارے مانگ

سرکار کو سرکار سے مانگوں گانیا آزی  
سرکار نے جس وقت کہا مانگ ارے مانگ

مولانا عبدالتار نیازی

یارب نفس نفس میں ہے پنہاں تیرا نام  
دنیا کا ذرہ ذرہ کرے ورد تیرا نام

تیرے ہی نور سے ہیں فروزاں مہ و نجوم  
روشن ہے آفتاب ہے درخشاں مہ و تمام

سیراب سب ہوئے تیرے زم زم کے فیض سے  
لونا تھیں ہے در سے ترے کوئی تشنہ کام

مل جائے مجھ کو ایک ہی سجدہ نصیب سے  
گھر میں ترے جہاں ہے ابراہیم کا مقام

کرنے قبول ساری دعائیں جو دل میں ہیں  
نیناں یہاں سے جلے گی ہرگز نہ تشنہ کام

فرزاتہ نیناں



# محکم رضوی ہے ملاقات

شاہین رشید

مکراتفاق دیکھیں کہ ابتدا اداکاری سے ہوئی۔  
☆ ”کس نے احساس دلایا کہ آپ اداکاری  
بھی کر سکتی ہیں اور گلوکاری بھی؟“

☆ ”اصل میں میری اہی بہت اچھا گاتی تھیں  
اور وہ گھر میں اکثر نکلنا رہتی تھیں..... تو انہیں دیکھ  
کر مجھے بھی عادت پڑ گئی، نکلنے کی، پھر جب فیملی  
میں کوئی تقریب ہوتی تھی تو وہاں بھی سب کی ڈیمانڈ  
پر گایا کرتی تھی..... اب میں چاہتی تھی کہ اپنے اس  
فن کو آگے بڑھاؤں..... مگر گھر والوں کی طرف سے  
اجازت ہی نہیں ملتی تھی۔“

☆ ”اچھا! پھر اداکاری کی اجازت کیے  
لی؟“

☆ ”وہ اس طرح کہ ہمارے گھر میں حیدر رام  
رضوی اور غضنفر احمد کا بہت آنا جانا تھا..... انہوں نے  
ہی گھر والوں کو گلوکاری کا کہا..... مگر گھر والے کسی بھی  
طریقے سے راضی نہ ہوئے..... البتہ اداکاری کے  
لیے راضی ہو گئے، شاید اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ  
اداکاری کے وقت تو یہ سر پر ہوں گے..... تو میں پہلے  
اداکاری کی طرف آئی اور اچھا رسپانس ملا، تعریف  
ہوئی تو پھر گلوکاری کے لیے بھی اجازت مل گئی۔“

☆ ”کیس ”سن“ کی بات ہے اور پہلا ڈرامہ  
یا سیریل کون سا تھا؟“

☆ ”یہ بات ہے 1997ء کی جب حیدر رام  
رضوی نے مجھے اپنے سیریل ”ہوا میں“ میں بک کیا۔  
میری اداکاری کو بہت پسند کیا گیا اور یہی ڈرامہ  
میرے کامیابی کے راستے کھول گیا..... چونکہ میں نئی  
تھی تو میرا کردار بھی مختصر تھا مگر پھر جب میرے کردار کو  
پسند کیا جانے لگا تو اس سیریل کے رائٹر امیر ندیم سید  
نے میرے رول میں اضافہ کر دیا۔“



کول رضوی کسی تعارف کی محتاج نہیں  
نے جس کام میں ہاتھ ڈالا شہرت و کامیابی ملی..... اور  
اس زمانے میں کامیابیاں حاصل کیں جب مخصوص  
چینل ہوتا تھا..... اور مقابلہ زیادہ تھا..... اداکاری  
سے کیریئر کا آغاز کیا مگر زیادہ نام گلوکاری سے کمایا۔  
☆ ”کول..... کیسی ہیں؟“

☆ ”جی ٹھیک۔“  
☆ ”اداکاری سے گلوکاری تک کا سفر..... کچھ  
بتائیں گی آپ؟“

☆ ”اداکاری سے گلوکاری تک کا سفر بہت اچھا  
گزرا، بہت عزت پائی بہت شہرت پائی، بہت  
کامیابیاں حاصل کیں۔“  
☆ ”آپ کو بچپن سے گلوکاری کا شوق تھا.....  
اداکاری میں کیسے آئیں.....؟“

☆ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے  
گلوکاری کا شوق تھا اور میں اس میں آنا چاہتی تھی.....



☆ ”پہلے وقت میں ناظرین کا ریسپانس دیکھ کر کہانی میں بھی رد و بدل کیا جاتا تھا اور فنکاروں کے کردار میں بھی۔ اب ایسا نہیں ہے..... تو وہ دور اچھا تھا یا اب؟“

☆ ”ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ پہلے کم کام تھا، ناظرین کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اب پورا سیریل پورا سوپ تیار کر کے آن ایئر کیا جاتا ہے۔“

☆ ”چاہے ناظرین کو پسند آئے یا نہیں..... خیر پھر اگلا قدم گلوکاری تھا..... اس میں کب آمد ہوئی؟“

☆ ”گلوکاری میں آمد 1999ء میں ہوئی، جب میرا گانا ڈی جی بہت مقبول ہوا..... بس پھر نہ کسی نے گلوکاری کے لیے رکاؤ ڈالی اور نہ ہی اداکاری کی..... اور یوں میں آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔“

☆ ”گھر میں کسی کو اعتراض تھا آپ کے کام پر؟“

☆ ”امی کی خواہش تھی کہ میں گلوکاری کی طرف آؤں اور جب میں نے اداکاری شروع کی تو انہوں نے اعتراض کیا اور برا بھی منایا..... مگر میرے والد نے مجھے سپورٹ کیا، میری حوصلہ افزائی کی، میرے ساتھ ساتھ رہتے تھے..... اور بالآخر میری امی کو بھی میری صلاحیتوں کو تسلیم کرنا پڑا..... بس پھر سب کچھ ہو گیا۔“

☆ ”کریڈٹ کس کو دیں گی کامیابی کا؟“

☆ ”کریڈٹ تو ان ہی کو دوں گی جو مجھے اس فیلڈ میں لائے۔ پھر کریڈٹ ان کو دوں گی جن کی اجازت سے میں اس فیلڈ میں آئی..... پہلا کریڈٹ حیدر امام رضوی صاحب کو جاتا ہے اور دوسرا میرے والدین کو، خاص طور پر والد کو جو نہ صرف میری حوصلہ افزائی کرتے تھے بلکہ میرے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔“

☆ ”جب آپ اسکرین پہ آتی ہیں تو مسلسل آتی ہیں اور جب غائب ہوتی ہیں تو لبا ہی ہوتی ہیں..... وجہ؟“

☆ ”بس کچھ وجوہات کی بنا پر ایسا ہو جاتا ہے..... لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں نے اس فیلڈ کو خدا حافظ کہہ دیا ہوتا ہے..... اس فیلڈ کو خدا حافظ کہنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

☆ ”یہ تو ایک نشہ ہے، کیا خیال ہے آپ کا؟“

☆ ”بالکل ٹھیک کہا آپ نے..... میں تو اسے ”دل دل“ کہتی ہوں کہ جس سے ٹکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

☆ ”والدین اس فیلڈ میں آنے پر راضی نہیں تھے..... تو ان کے آپ کے لیے کیا خواب تھے؟“

☆ ”والدین کے اپنی بیٹی کے لیے دو ہی خواب ہوتے ہیں۔ ایک شادی دوسری یہ کہ اپنی لائف میں کچھ بن جائیں دونوں خواب ہی اچھورے رہ گئے..... ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر میں نہ بن سکی کہ اس فیلڈ میں آ گئی۔ مگر میرے اس فیلڈ میں آنے پر دونوں ہی خوش اور مطمئن ہو گئے اور شادی چونکہ کم عمری میں



ہوئی تھی تو کامیاب نہ ہو سکی۔“

☆ ”اس فیلڈ کی کوئی یادگار بات، کوئی یادگار پروگرام ہوا تو بتائیے؟“

☆ ”میں نے بالی ووڈ میں ایک شو کی میزبانی کی

تھی اور نامور فنکاروں کے انٹرویوز کیے تھے۔“

☆ ”اچھا..... گڈ، کچھ کے نام بتائیے؟“

☆ ”جیسے شاہ رخ خان، سلمان خان، ایتنا بھ بچن، پریتی زنا وغیرہ، وغیرہ۔“

☆ ”ہمارے فنکار ماشاء اللہ سے بہت فلاحی

کام کرتے ہیں آپ کا بھی ادھر رجحان ہے؟“

☆ ”بالکل ہے..... بہت نرم گوشہ ہے میرے

اندہ..... اپنی گلوکاری اور فلاحی کاموں کی طرف ہی

میرا فوکس ہے..... میں بچوں کے لیے کام کرتی

ہوں۔ ان کی اعلا تعلیم کے لیے اور کہتے ہیں کہ نیکی

کے کاموں کا پرچار نہیں کرنا چاہیے..... لیکن پھر بھی

میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ رمضان المبارک میں میں

غریبوں کے لیے دسترخوان کا اہتمام کرتی ہوں اور

بھی بہت سے کام کرنا چاہتی ہوں۔ بس اللہ توفیق

دے۔ (آمین)۔“

☆ ”صوفی گانہ کی طرف رجحان کیسے ہوا؟“

☆ ”میں نے زندگی میں بہت سے نشیب و فراز

دیکھے ہیں بہت سے مشکل ادوار سے گزری ہوں اور

اس تجربے سے گزری تو اندازہ ہوا کہ انسان کے ظاہر

اور باطن میں تضاد نہیں ہونا چاہیے، پھر نشیب و فراز

نے مجھے اللہ کے بہت قریب کر دیا..... اور میں

ضوفا نہ کلام کی طرف راغب ہو گئی..... اور صوفی

راک کو متعارف کرانے میں کامیاب ہوئی..... اور

میں صوفی راک گلوکارہ کہلانا پسند کرتی ہوں۔“

☆ ”سب کچھ کر لیا..... فلم نہیں کی..... کیوں؟“

☆ ”بس اب دو ہی خواہشات رہ گئی ہیں۔

ایک تو یہ کہ فلم میں کام کروں اور دوسری یہ کہ عابدہ

پردین کے ساتھ ڈونٹ گاؤں..... یہ میرے لیے

بہت بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔“

☆ ”کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“

☆ ”میں دہلی میں پیدا ہوئی 3 اگست کو، پرورش

برطانیہ اور تاجیکیریا میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں

سے حاصل کی..... پھر کم عمری میں ہی پاکستان شفٹ

ہو گئی دو بھائیوں کی اکلونی بہن ہوں، اس لیے لاڈلی

بھی ہوں..... ایک بھائی شوہر سے ہی وابستہ

ہیں..... میرا بچپن عام لڑکیوں سے تھوڑا مختلف گزرا،

لڑکوں والے گیزر کھیلنے کا مجھے زیادہ شوق تھا اور چونکہ

خاندان میں سب ڈاکٹر اور ٹیکر تھے تو امی کی خواہش

تھی کہ میں بھی ڈاکٹر بنوں..... مگر میں نے بتایا کہ

میں یہ خواہش پوری نہ کر سکی۔“

☆ ”گھر بلیو امور سے آپ کی دلچسپی؟“

☆ ”بالکل ہے اور ہر لڑکی کو ہونی چاہیے۔ مجھے

کھانا پکانے کا بہت شوق ہے اور بہت اچھا کھانا پکاتی

ہوں اور غیر ملکی کھانے زیادہ اچھے بناتی ہوں۔“

☆ ”بتانا پکانے کا شوق ہے کیا اتنا ہی کھانے کا

بھی شوق ہے؟“

☆ ”جی..... جی..... کھانے کا بھی بہت شوق

ہے اور میں ہر کھانا بغیر خزا دکھائے کھا لیتی ہوں۔

کیونکہ رزق خدا کی نعمت ہے اس پر خزا نہیں دکھانا

چاہیے۔“

☆ ”اپنی زندگی کا بہترین استاد کسے کہیں گی؟“

☆ ”وقت کو..... کیونکہ وقت انسان کو بہت کچھ

سکھا دیتا ہے اور میں نے بھی وقت سے بہت کچھ سیکھا

ہے۔“

☆ ”فارغ اوقات کس طرح گزارتی ہیں؟“

☆ ”میں..... اپنی فیلٹی کے ساتھ..... بہت

انجوائے کرتی ہوں۔“

☆☆

# میری بھی سیتے میرا لیٹھی

شاین رشید



1- ”پورا نام؟“

”میرا سیتھی۔“

2- ”بلا تے ہیں۔“

”میرو Miru“

3- ”دنیا میں آمد.....“

”بارہ جنوری اور ستارہ بنتا ہے کپری کورن؟“

4- ”قد کا ٹھہ؟“

”قد کا ٹھہ اللہ کی دین ہے ماشاء اللہ پاؤں 5 فٹ

اور نو انچ کی ہوں۔“

5- ”بہن بھائی؟“

”بچے دو بنی اچھے..... بس میں اور میرا بھائی۔“

6- ”تعلیمی ڈگریاں؟“

”ایک ہی ہے۔ گریجویٹ ہوں۔“

7- ”شادی؟“

”ابھی نہیں ہوئی۔ جب اللہ کو منظور ہوگا ہو

جائے گی۔“

8- ”اونچا لمبا قد اسماٹ، پھر بھی کچھ کی ہے؟“

”جی میرے بال لمبے اور کٹے نہیں ہیں۔“

9- ”والدین کے علاوہ میری پہچان؟“

”ڈرامہ سیریل ”سلوٹس“ بہت پسند کیا گیا تھا۔“

10- ”فیلڈ میں راستے تہوار ہوتے؟“

”اسی سیریل ”سلوٹس“ کے بعد مزید آفرز

آنی شروع ہوئی تھیں۔“

11- ”فیلڈ میں والدین کام آئے؟“

”چاہتی تو ان کے نام سے آتی مگر میں اپنے

ٹیلنٹ سے آئی ہوں۔“

12- ”اچھی صحت کے لیے ضروری ہے کہ.....“

”کہ آپ نہار منہ گرم پانی پیتیں۔ بہت سی

بیماریوں سے بچے رہیں گے۔ میں ایسا ہی کرتی

ہوں۔ اور ہاں پانی میں ”لیو“ ضرور شامل کیجیے گا۔“

13- ”کامیابی کے لیے پہلا گھر؟“

”خدا..... کامیاب زندگی کے لیے ”خدا“

بہت ضروری ہے۔ خدا سے مراد کہ بس ڈٹ جائیں

کہ میں نے یہ کام کر کے رہتا ہے۔“

14- ”غصہ آتا ہے؟“

”بالکل آتا ہے اور اس وقت آتا ہے جب کسی کو

کوئی کام کہا جائے اور وہ اسے وقت پر پورا نہ کرے۔“

15- ”جتنی چلاتی ہوں؟“

”غصے میں.....! نہیں جتنی چلاتی نہیں ہوں، بلکہ

تھوڑا تیز بولتی ہوں اور غصے کا ایک پھریٹ دکھاتی ہوں۔“



27- ”کس رنگ کے کپڑے زیادہ پہنتی ہوں۔“  
”بلو اور گرین۔“

28- ”ایک کھانا جو اچھا پکائی ہوں۔“  
”چکن کڑا ہی۔“

29- ”وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں۔“  
”جن کو ایک اچھا لائف پارٹنر مل جاتا ہے۔“

30- ”اپنی کمائی سے جو قیمتی چیز خریدی۔“  
”ایک گرم جیکٹ، جو خوب صورت بھی ہے اور قیمتی بھی۔“

31- ”کھانا اہتمام کے ساتھ کھاتی ہوں۔“  
”بالکل۔۔۔۔۔ بہت اہتمام کے ساتھ۔ ڈاننگ ٹیبل پر، کھانا سجا ہوا ہونا چاہیے۔ سلاؤ ضرور ہو جس میں گاجر، پیاز اور کھیرا ضرور ہو۔ اور میں کھانا چھری کاٹنے کے ساتھ کھاتی ہوں۔“

32- ”ایک عجیب سوال جو صحتیٰ ضرور کرتے ہیں؟“  
”کہ آپ کے والدین نے آپ کو اس فیلڈ میں کیسے آنے دیا۔۔۔۔۔ سمجھ نہیں آتا کہ مجھ سے یہ سوال کیوں کیا جاتا ہے۔“

33- ”کرکٹ دیکھتی ہوں۔۔۔۔۔“  
”دیکھتی تھی، اب نہیں دیکھتی۔۔۔۔۔ کیونکہ اب مصباح“ نہیں ہے۔ مجھے ”مصباح“ کی بیننگ بہت پسند ہے۔“

34- ”کیا جمع کرنے کا شوق ہے۔“  
”جیوری اور کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے۔“

35- ”کبھی موقع ملا تو۔۔۔۔۔“  
”خواتین کے حقوق کے لیے پالیسی بنائوں گی اور اس پر عمل درآمد بھی کرواؤں گی۔“

36- ”ایک جملہ جو برا لگتا ہے۔“  
”بیٹا صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“

37- ”آج تمہیں کبھی رہ جاتی ہیں۔“  
”جب کوئی منہ پر جھوٹ بولے تب۔“

38- ”شادی کی کون سی رسم انجائے کرتی ہوں۔“  
”جو تاج پہنائی کی۔“

39- ”تمہارے دینا اچھا لگتا ہے یا کیش۔“

16- ”میں چاہتی ہوں کہ۔۔۔۔۔“  
”میری غیر موجودگی میں لوگ میری تعریف کریں اور میرے منہ پر تنقید کریں۔ تاکہ میں اپنے کو بہتر سے بہتر کر سکوں۔“

17- ”دل چاہتا ہے کہ۔۔۔۔۔“  
”دل چاہتا ہے کہ پنجاب کی جٹی کا رول کروں۔ میں بہت اچھی پنجابی بولتی ہوں۔ قد کاٹھ بھی اچھا ہے تو بس دل چاہتا ہے کہ ایسا رول کروں جو سب کو اچھا لگے۔“

18- ”مجھے انتظار ہے۔۔۔۔۔“  
”اس دن کا جب میری کتاب شائع ہوگی۔“

19- ”میں ڈر جاتی ہوں۔۔۔۔۔“  
”دریاء، سمندر کے پانی سے اور گھرے پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

20- ”ایسی فلم بنانا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔“  
”جو لکھنؤ بھی میں ہی، ڈائریکٹ بھی میں ہی کروں، پروڈکشن بھی میری ہو اور پرفارم بھی میں خود کروں۔ اور فنکار بھی اپنی مرضی کے لوں۔“

21- ”میری اچھی عادت۔۔۔۔۔“  
”کہ میں اپنی غلطی کا اعتراف فوراً کر لیتی ہوں۔ اور جو کہتی ہوں وہ کر کے دکھاتی ہوں۔“

22- ”گھر آتے ہی دل چاہتا ہے کہ۔۔۔۔۔“  
”ٹھنڈا پانی پل جائے۔ پانی پی کر لمبی ٹان کر صوفے پر لیٹ جاتی ہوں۔“

23- ”جھوٹ بولتی ہوں۔۔۔۔۔“  
”جب کسی کو پچانا ہوتا ہے۔“

24- ”جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں۔۔۔۔۔“  
”تب سے ہر بات اپنے دل کی مانتی ہوں جبکہ پہلے ہر بات اپنے دماغ کی مانتی تھی۔“

25- ”میری بری عادت۔۔۔۔۔“  
”بے صبری بہت ہوں، غصہ بھی تھوڑا تیز ہے۔“

26- ”کھانا پینا کب بند کر دیتی ہوں۔۔۔۔۔“  
”کبھی بھی نہیں۔۔۔۔۔ کیونکہ مجھے کھانے سے پینے سے بہت محبت ہے۔“

”مجھے تو تھخہ دینا اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ وہ یادگار

بن جاتا ہے۔“

40- ”کس بڑی سیلیر بیٹی سے ملنے کی خواہش

ہے.....“

”ہیلری کانٹنن سے۔“

41- ”اے پاس کیا رکھ کر سوتی ہوں.....“

”اپنا سیل فون۔ اور کچھ نہیں۔“

42- ”فریش محسوس کرتی ہوں؟“

”مجھ بچے کے بعد۔ ناشتا کر کے۔“

43- ”مگر میں ناشتا، کھانا کون اچھا

بناتا ہے؟“

”ہمارا الگ ہے ان کا نام مشتاق ہے۔ وہ بہت

اچھا کھانا اور ناشتا بناتے ہیں۔ مجھے ان ہی کے ہاتھ

کی کچی ہوئی ہر چیز پسند ہے۔“

44- ”شوہر میں آنے کے لیے ٹیلنٹ ضروری

یا حسن؟“

”ضروری تو دونوں ہی ہیں۔ مگر حسن زیادہ

ضروری ہے۔“

45- ”میں سفر کرتی ہوں؟“

”انگریزی والا سفر نہیں بلکہ ٹریولنگ والا سفر کرتی

ہوں تو پھر اتحاد ایئر لائن۔“ سے کرتی ہوں۔ امارات

ہو، اتحاد ہو، بہت اچھی سروس ہوتی ہے ان کی۔“

46- ”موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟“

”جب کوئی بہت اچھا سا لطیفہ سنا دے۔“

47- ”کسی کو آزما نا ہوتا؟“

”یا تو اس سے ادھار مانگ لیں یا کرائس

میں اس کا رویہ دیکھ لیں۔“

48- ”اگر اپنے آپ کو ڈس کرائب کرو تو؟“

”تو میں اپنے آپ کو ”فاسٹ روڈمن“ کہوں گی۔“

49- ”میں کام کرنا چاہتی ہوں؟“

”نعمان اعجاز کے ساتھ۔“

50- ”بہت افسوس ہوتا ہے جب؟“

”جب میں نے محنت سے کوئی کام کیا ہو اور کوئی



میری حوصلہ افزائی بھی نہ کرے۔“

51- ”کوئی آپ کا بیک کھول لے تو؟“

”تو کوئی بات نہیں، اس میں سے ہونٹوں پر

لگانے والی ویسلین لٹکے گی۔ سیل فون ہوگا اور کچھ

چیزوں کی رسیدیں ہوں گی۔“

52- ”پورے ہور ہی ہوتو؟“

”تو کوئی کتاب پڑھنے لگ جاتی ہوں۔“



# فرخ کاظمی

شہابین رشید

ہیں اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتا ہے؟“  
 ﴿”ضرور..... میرا نام فرخ کاظمی ہے، میں  
 کاظمی سید ہوں، اور ہمارا اہل قسید فیملی سے ہے والد  
 صاحب آرمی آفیسر تھے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔  
 مجھ سے بڑے ایک بھائی ہیں جو پانچ سال بڑے  
 ہیں۔ جبکہ میری دو چھوٹی بہنیں ہیں..... اور کمپیوٹر  
 سائنس میں ماسٹرز ڈگری لی ہے اور میں ایک  
 ایجوکیشنل انسٹیٹوشن کے ساتھ منسلک ہوں۔ میں  
 کافی عرصہ ملک سے باہر بھی رہا ہوں۔ یہی کوئی تقریباً  
 آٹھ، نو سال دینی میں اور ہاں..... میں تینتیس سال کا  
 ہو چکا ہوں۔“

☆ ”آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“  
 ﴿”جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں ایک  
 ایجوکیشنل انسٹیٹوشن کے ساتھ وابستہ ہوں۔ بارہ، تیرہ  
 سال کی اس جاب میں میرا عہدہ ”نیٹ ورک منیجر“ کا

”آواز کی دنیا سے مراد“ ریڈیو ایف ایم“ تو  
 ہے ہی، لیکن ریڈیو ایف ایم سے تعلق رکھنے والے  
 صرف ریڈیو تک ہی محدود نہیں ہوتے، بلکہ وہ اپنی  
 آواز کا جادو ہر اس جگہ جگاتے ہیں جہاں بیک گراؤنڈ  
 میں ان کی آواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ڈبنگ بھی  
 کرتے ہیں۔ کمرشلز میں بھی ان کی آواز ہوتی ہے۔  
 دستاویزی فلموں میں بھی ان کی آواز ہوتی ہے اور  
 ریڈیو ایف ایم پر تو ان کے مداح ہوتے ہی ہیں۔ کل  
 تک آواز کا شعبہ محدود تھا مگر اب نہیں..... اس بار  
 آپ کی ملاقات فرخ کاظمی صاحب سے کروائیں  
 گے جو نہ صرف آواز کی دنیا سے وابستہ ہیں بلکہ ایک  
 پرائیوٹ کمپنی میں جاب بھی کرتے ہیں۔

☆ ”کیسے مزاج ہیں؟“  
 ﴿”اللہ کا شکر ہے۔“  
 ☆ ”تو شروعات فیملی بیک گراؤنڈ سے کرتے





ہے۔ صبح کے وقت آفس میں ہوتا ہے اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ریڈیو کو کافی ٹائم دیتا ہوں۔ پھر مختلف پروڈیوسر ہیں جن کے لیے کام کرتا ہوں۔ نیشنل اور انٹرنیشنل کارٹونز، پروگراموں کی ڈبنگ بھی کرتا ہوں۔ وائس اورز کرتا ہوں اور ٹیلی کو ٹائم دیتا ہوں۔“

☆ ”گڈ..... ٹی وی کے لیے بھی کام کیا آپ نے اور ریڈیو کے دیگر چینلوں کے لیے بھی کام کیا آپ نے؟“

☆ ”جی..... بالکل ٹی وی کے لیے کام کیا اور مختلف چینلوں کے لیے کیا مثلاً ٹی وی کے چینل سے ایک کارٹون پروگرام کی ڈبنگ کی ہے۔“ ٹی جی وائس کی ہے“ اسے ٹی وی کے ساتھ لائسنس پروگرام کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ جب بھی کوئی ٹی وی چینل بلاتا ہے کسی پروگرام کے لیے تو میں ضرور جاتا ہوں..... اور جو وائس اورز پروجیکٹ ہوتے ہیں اس میں جو پروڈکشن ہاؤسز لاہور..... پنڈی میں کام کر رہے ہوتے ہیں ان کے ساتھ بھی میں نے کام کیا ہے..... ”کھیل“ نیٹ ورک کے ساتھ بھی کافی ایڈ کیس ہیں میں نے۔ پھر اپنے ریڈیو کے بھی ایڈز چلتے رہتے ہیں اور وائس اورز بھی کرتے رہتے ہیں..... اسی طرح کراچی کے ایک پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ بھی کام کر رہا ہوں۔“ کے ایم کے“ ان کا نام ہے اور ان کے تحت کافی کام ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ڈراموں اور دیگر پروگراموں کے کافی پروجیکٹ ہوتے ہیں۔ تو ان کے ساتھ بھی گا ہے۔ گا ہے کام جاری رہتا ہے۔“ ☆ ”ریڈیو کی طرف اور آواز کی دنیا سے وابستہ ہونے کا خیال کیسے آیا آپ کو؟ ٹی وی سے آفر آئی تو جانیں گے؟“

☆ ”ایک زمانے میں مجھے جنون کی حد تک ریڈیو میں آنے کا شوق تھا، اور اس زمانے میں جو لوگ ریڈیو ایف ایم میں کام کرتے تھے ان کا میں شیمن بھی تھا اگر میں بہت پرانے لوگوں کا نام لوں تو ان میں سے ایک آر جے تھے ”کاشف خان“ جو اسلام

آباد کے ایف ایم 101 جو ریڈیو پاکستان کا ہی ادارہ ہے میں کام کرتے تھے اور ”کاشف خان“ کا ہی شو میں نے پہلی بار سنا تھا اور پھر میں خود بھی ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گیا.....

☆ ”ریڈیو اور ٹی وی میں آنے کی دوسری وجہ ہمارے ایک ماموں بنے، وہ کافی سینئر ٹیکنیکل منیجر تھے پی ٹی وی کے، انہوں نے مجھے کافی پروموٹ کیا کہ میں ریڈیو اور ٹی وی کی سائڈ میں آؤں، تو شوق تو مجھے تھا ہی پھر حوصلہ افزائی کہ تم آؤ کامیاب رہو گے تو میں نے ریڈیو جو ان کر لیا اور ٹی وی کے ساتھ بھی سلسلہ چل رہا ہے جیسا کہ میں نے آپ کو تفصیل سے بتایا..... اور ریڈیو اور ٹی وی دو الگ الگ میڈیم ہیں آخر آئی تو ضرور جاؤں گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آواز کا جو رشتہ ہے وہ بھی ٹوٹا نہیں ہے مطلب سامعین اور براڈ کاسٹر کا..... اور یہ سب سے بہتر بات ہے کہ ہم اپنے اس رشتے کو قائم رکھیں اور میں اسے بھی تبدیل نہیں کرنا چاہتا ہوں گا۔“

☆ ”کوئی بھی جاب ہو دل اسی وقت لگتا ہے جب موڈ اچھا اور مبالغہ فرائش ہو، تو کیا ریڈیو آر جے کے لیے اپنے آپ کو فریش زبردستی رکھنا پڑتا ہے یا



چیزیں بتاؤں جو کسی اور آر جے نے نہ بتائی ہوں۔ تو اس کے لیے مجھے کافی محنت کرنی پڑتی ہے اور میں محنت کرتا بھی ہوں اور اپنی اسٹور کی ہونی چیزوں کو ایک نئے انداز اور ایک نئے زاویے کے ساتھ بتاتا ہوں۔“

☆ ”لوگ پہچان لیتے ہیں؟ آپ کا کپا دل چاہتا ہے کہ کس طرح لوگ آپ کو یاد رکھیں۔ کوئی ایسی فنون کال جس کے بارے میں آپ بتانا چاہتے ہیں؟“

☆ ”سوشل میڈیا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعے دنیا آپ کو دیکھتی ہے اور جس طرح انسان کے لاشعور میں بہت سی میموری محفوظ ہو جاتی ہے اسی طرح سوشل میڈیا میں بھی انسان جو کچھ دیکھتا ہے اس کے دل و دماغ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ بہت بار ایسا ہوا ہے کہ جب لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے اور جب میں انہیں حوالہ دیتا ہوں تو پھر وہ فوراً پہچان جاتے ہیں۔ ایک بار ہم کہیں کھانا کھانے گئے تو ایک خاتون نے مجھے پہچان لیا۔ اسی طرح ایک کال کا ذکر ضرور کروں گا آپ کے اس سوال کے جواب میں کوئی کال جس کے بارے میں

آپ بتانا چاہتے ہیں۔“ ہماری ایک ناپائیدار سامع ہیں، مگر نام ہے ان کا، وہ اکثر فون کرتی رہتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ میں دیکھ نہیں سکتی تو نہ صرف اپنی زندگی سے پیار نہیں تھا بلکہ مجھ میں خود اعتمادی بھی نہیں تھی۔ لیکن آپ کا پروگرام سننے کے بعد مجھے زندگی اچھی لگنے لگی ہے اور مجھ میں خود اعتمادی بھی آگئی ہے میں آپ کے پروگرام کے بعد بہت بڑا اعتماد ہو گئی ہوں۔ وہ بہت زیادہ دعائیں بھی دیتی ہیں مجھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی میری کامیابی ہے کہ اگر چار لوگ بھی آپ کی بات سنتے ہیں اور آپ سے کچھ سیکھتے ہیں تو سب سمجھے کہ آپ نے اپنی سچ اپنی امید اور اچھی باتیں دوسروں کو ترانسفر کر دی ہیں۔ بہت لوگ ملتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔ مگر میری خواہش ہے کہ لوگ مجھے اچھے الفاظ سے یاد کریں

موڈ ہمیشہ ہی اچھا رہتا ہے؟“  
☆ ”یہ بالکل بھی ممکن نہیں ہے کہ آپ اپنے موڈ کو اور اپنے دماغ کو ہر وقت ٹھیک اور فریش رکھ سکیں۔ بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ جب گھر سے نکلے تو موڈ ٹھیک نہیں ہوتا۔ آفس جا رہے ہو تو موڈ ٹھیک نہیں ہوتا اور اس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں مثلاً ٹریفک، محسوس، نیند کا پورا نہ ہونا، گھر کا ماحول، مالی پریشانی۔ بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ اور پھر آر جے بھی انسان ہی ہوتا ہے دنیا کی کوئی دوسری مخلوق نہیں ہوتا، اس کے دماغ میں بہت سی چیزیں چل رہی ہوتی ہیں۔ جسے ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ تو میں آپ کو بتاؤں کہ یہ بالکل بھی آسان فیلڈ نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ ایک آر جے آتا ہے اور مائیک کے آگے بولنا شروع کر دیتا ہے تو ایسا نہیں ہے۔ بلکہ کام کرنے کے لیے اور آگے بڑھنے کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے۔ اور جو لوگ اس فیلڈ میں کامیاب ہیں وہ واقعی داد کے مستحق ہیں۔“  
☆ ”پروگرام سے پہلے کیا بہت تیاری کرنی پڑتی ہے؟“

☆ ”جو بھی اچھا براڈ کاسٹر ہوتا ہے وہ مائیک پہ جانے سے پہلے ایک اچھی تیاری کے ساتھ جاتا ہے۔ عموماً بہت سارے آر جے ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس پورا ہفتہ پروگرام نہیں ہوتے یا ایک پروگرام ہوتا ہے یا دو پروگرام ہوتے ہیں۔ تو ان لوگوں کو پروگرام کی تیاری میں زیادہ وقت مل جاتا ہے۔ جبکہ میرے سارے پروگرام کنفیٹ ہیں ہیں۔ میرے مارننگ شو، سٹیشن وائس شو، وہ بھی آر جے لاؤنچ ہے وہ بھی، ایوننگ لائو ٹائم وہ بھی، سب کنفیٹ ہیں پروگرام ہیں اس میں ہمیں بہت ساری چیزیں ایڈ کرنی ہوتی ہیں جس میں موسم اپ ڈیٹ ہے۔ خبریں ہوتی ہیں۔ شہر کی خبریں، غرض یہ کہ بہت کچھ شامل کرنا ہوتا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میرا پروگرام سب سے منفرد ہو اور میں ایسی



بجائے اس کے کہیں آپ بہت اچھے آرہے ہیں۔ کیونکہ ایک آرہے کو پتا ہوتا ہے کہ وہ کتنا اچھا آرہے ہیں۔ میں اپنے آپ کو ایک مناسب آرہے کی لسٹ میں دیکھتا ہوں۔ میرے اندر بھی بہت سی غلطیاں ہیں۔ کوتاہیاں ہیں۔ اسی لیے کوشش کرتا ہوں بہت کچھ سیکھنے کی..... جو لوگ اس پلیٹ فارم کو جوائن کرنا چاہتے ہیں ان کی مدد کرتا ہوں..... بس میرا ایک خواب ہے کہ لوگ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ اچھا انسان ہے۔“

☆ ”آپ گڈ لکک بھی ہیں، بولنے کا فن بھی آتا ہے۔ کبھی دل چاہا کہ ٹی وی کے کسی ٹاک شو کا ہسٹریک بن جاؤں؟“

☆ ”ٹی وی وی ہو یا ٹیلی وژن کا کوئی بھی ادارہ ہو، ہر کوئی کچھ نہ کچھ اچھا ضرور کرنا چاہتا ہے۔ مگر یہ دور ایسا ہے کہ مواقع ذرا مشکل سے ملتے ہیں۔ یعنی مواقع ملنے کے اینٹور بہت زیادہ ہیں..... اور میں اپنے آپ کو نیوز کا سٹر بھی سمجھتا ہوں، میں ایک اچھا ”ہوسٹ“ بن سکتا ہوں یا پھر ایک اچھا کرٹ فیئر ہسٹریک بن سکتا ہوں..... ریڈیو پر میرا ایک ”سٹیشنز وائس“ ہوتا ہے تو پھر دل چاہتا ہے کہ اس کی طرز کا ایک پروگرام میں ٹی وی پر بھی لے کر آؤں..... اس طرح کے پروگرام لوگوں کی ویلفیئر کا باعث بنیں گے اور لوگ اپنے پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے اسے آگے لے کر چلیں..... آج کل میں اسی پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں..... اللہ تعالیٰ ہمیں کامیاب کرے۔“

☆ ”اپنے پروگراموں کے بارے میں بتائیں..... اور یہ بتائیں کہ آپ کے سامعین خواتین زیادہ ہیں یا مرد حضرات؟“

☆ ”ویسے تو میرے سامعین ہر طرح کے اور ہر اوج کے لوگ ہیں، مگر خواتین کی تعداد زیادہ ہے..... اور جہاں تک میرے پروگراموں کی بات ہے ”مسیب لیس ٹائم“ بہت زیادہ مقبول پروگرام ہے

”سٹیشنز وائس“ یہ پروگرام اچھی بلڈا پ ہو رہا ہے تو اسے پاپولر ہونے میں ٹائم لگے گا..... ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو ایسے پروگرام سننا چاہتی ہے جس میں انٹرٹینمنٹ ہو، تفریح طبع کے پروگرام ہوں۔ اصلاح کی باتیں بھی لوگ سننا چاہتے ہیں، مگر کچھ ایریاز کے لوگ ہیں جو سننا چاہتے ہیں۔ البتہ ہمارا پروگرام ”آرہے لاؤنج“ کو پسند کرنے والوں کی تعداد اس لیے زیادہ ہے کہ اس میں ایک آرہے کو ہم بلاتے ہیں جو کہ ہمارا مہمان ہوتا ہے اور اس سے ہم ہر طرح کی باتیں کرتے ہیں..... اور ہمارا ”ایوننگ ڈرائیو ٹائم“ بھی کافی مقبول ہے کیونکہ لوگ جب جھگے ہارے گھر آ رہے ہوتے ہیں تو ہمارا پروگرام انہیں آگے کر رہے ہوتے ہیں..... بس پروگرام کا کنٹینٹ اچھا ہو تو سامعین کھینچے چلے آتے ہیں۔“

☆ ”FM100 سے کتنے سال سے وابستہ ہیں آپ؟ ریڈیو ایف ایم کے معیار کے بارے میں کیا کہیں گے؟ کچھ بہتر ہوا کیا ہو؟“

☆ ”میں ایف ایم 100 سے گزشتہ دو سال سے وابستہ ہوں اسلام آباد سے اور میں ایف ایم 100 سے پہلے بھی کام کر چکا ہوں..... ریڈیو کے معیار کی بات آپ نے پوچھی تو یہاں کافی کچھ رومانز ہو رہی ہیں کچھ چیزیں..... ریڈیو کی نشریات کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہیں جو اس کو صرف بزنس پوائنٹ آف ویو سے خریدنا چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ریڈیو پر کچھ ایسے لوگ آجائیں جو سالے دار پروگرام پیش کریں تاکہ ریٹنگ بڑھ جائے۔ ریٹنگ تو بڑھ جاتی ہے مگر معیار برقرار نہیں رہتا..... پھر شاید اس وجہ سے ریڈیو اسٹیشنز کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ سلیکشن میں بھی تعلقات حاوی ہو گئے ہیں جبکہ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، ہمیشہ میرٹ کی بنیاد پر انتخاب ہوتا تھا۔“

☆ ”جوا نا چاہتے ہیں اس فیلڈ میں، یعنی ایف ایم میں، ان کے لیے آپ کیا کہیں گے؟“



اور اللہ تعالیٰ نے مجھے جس فیلڈ کا حصہ بتایا وہ بہت اچھی ہے..... میں بہت خوش ہوں..... میں نے زندگی میں لالچ نہیں کیا، میں فینسی کے پیچھے نہیں بھاگا ہوں۔ میں نے اللہ سے اتنا ہی مانگا ہے جتنی مجھے ضرورت تھی..... اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا چاہتا تھا جو اللہ نے کر دیا۔ خواہش کی تکمیل کی کوشش کرتے رہنا چاہیے اللہ کہیں نہ کہیں راستے نکال ہی دیتا ہے..... اور اب تو زندگی میں بس ایک ہی خواہش ہے کہ میں اپنے لیے، اپنی بیٹی کے لیے کچھ ایسا کر جاؤں کہ لوگ مجھے بدلتوں یاد رکھیں۔“

☆ ”اور کچھ کہنا چاہیں گے آپ؟“

☆ ”میں اس پلیٹ فارم کے توسط سے کہنا چاہوں گا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں ہمارے ملک میں جو جدوجہد کر رہے ہیں اور میری ہمیشہ سے لوگوں سے یہ درخواست رہی ہے کہ آپ لوگوں کے لیے مطلب دوسرے لوگوں کے لیے ایک امید بنیں، ایک راستہ بنیں ایک پل بنیں..... ہمارے یہاں سب سے بڑی بدستی یہ رہی ہے کہ ہم دوسروں کو سچ گائیڈنس نہیں دیتے، اگر سچ گائیڈنس دیں تو جدوجہد کرنے والے اپنے وقت پر اپنے مقام پر پہنچ جائیں۔ اپنے پڑھنے والوں سے یہ بھی ضرور کہوں گا کہ زندگی میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ تو کبھی امید کا دامن نہ چھوڑیں، امید چھوڑ دینے سے زندگی رک جاتی ہے اور پھر وہ انسان ایک ”پتے“ کی مانند ہو جاتا ہے جس کو ہوا بھی ادھر بھی ادھر لے جاتی ہے اور کبھی وہ پیروں تلے روند جاتا ہے تو امید کو کبھی نہ چھوڑیں..... اور یہ کہ میرے پروگراموں کو بھی فالو کریں خاص طور پر سٹیشنز واکس کو کہ اس میں آپ کی ہی آواز آپ کے ہی مسائل ہوتے ہیں..... اور میری ”کوآرڈینٹ“ میرے ساتھ ہوتی ہیں تو سنیئے ہمارا پروگرام اور اپنی رائے بھی ضرور دیں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فرخ کاظمی صاحب سے اجازت چاہی۔

☆☆

☆ ”میں بات تو یہ کہ تمہاری بہت ضروری ہے۔ لگن بہت ضروری ہے، دیکھا، دیکھی جو لوگ پریزنتر بنے ہیں، وہ پھر کچھ ہی عرصے کے لیے بنے ہیں، ریڈیو ایک سیریس میڈیم ہے..... جب ریڈیو جوان کریں تو بہت احتیاط کے ساتھ، اچھے طریقے کے ساتھ، لگن و شوق کے ساتھ اور اپنی ساری صلاحیتوں کے ساتھ، تاکہ لوگ آپ کو سنیں اور پسند کریں اور معاشرے کی اصلاح کا پہلو خاص طور پر مد نظر رکھیں۔“

☆ ”چلیں جی..... بہت باتیں ہو گئیں اب اپنے بارے میں ذرا بتائیے؟“

☆ ”جناب میں بہت ہی ہنس مکھ اور خوش طبع انسان ہوں، کوشش ہوتی ہے کہ خوش رہوں۔ مگر جو زندگی کی سچ حقیقتیں ہیں وہ کبھی نہ ہی آپ کو پریشان ضرور کرتی ہیں، لوگوں کے رویے، لوگوں کا روی ایکشن، آپ کے مزاج کے خلاف ہو جاتے ہیں..... میں ایسے لوگوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں جو منفی سوچ رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

☆ ”سیاست..... گیمز، اسپورٹس؟“

☆ ”جی سیاست سے دلچسپی ہے، مختلف قسم کی خبروں پر میری نظر رہتی ہے، خبریں، بہت شوق ہے سنتا ہوں۔ اسپورٹس سے بھی لگاؤ ہے کہ کرکٹ سے دلچسپی ہے۔ دیگر کھانا فالو نہیں کیا۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ دنیا میں زیادہ تر لوگ فٹ بال کے گیم کو پسند کرتے ہیں۔“

☆ ”اگر اس فیلڈ میں نہ ہوتے تو کہاں ہوتے؟“

☆ ”ہوں..... خواہشیں تو بہت ساری تھیں اور ابھی بھی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ پوری ہوتی بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتیں تو اگر دل کی بات بتاؤں تو ایک زمانے میں مجھے ایئر پورٹ پہ کام کرنے کا بہت شوق تھا، میری جاب ایئر پورٹ پہ ہوتی، میں مختلف ایئر لائنز کے ساتھ کام کر رہا ہوتا یا گراؤنڈ اسٹاف کا حصہ ہوتا..... لیکن خیر..... میں ابھی بہت خوش ہوں

# شائستہ یاسین

ادارہ

برگر، کوک مجھے بہت پسند ہیں۔  
س: ”اگر آپ کو حکومت مل جائے کیا کریں گی؟“

ج: ”کاش کہ کوئی ذریعہ بن ہی جائے میں پورے پاکستان کو خوب صورت بنادوں گی۔ غربت ختم کرواؤں گی دسے سب سے پہلے گورنر ہاؤس بند کرواؤں گی جو عوام کے لیے کھولا گیا ہے کیونکہ جیسے ہمارے گھر میں ایک الگ کمرہ

مہمان کے لیے ہوتا ہے اس طرح گورنر ہاؤس بھی باہر کے ممالک سے آنے والے لہمانوں کے لیے ہی استعمال ہونا چاہیے تھا خیر یہ اک بحث ہے گورنر ہاؤس ہمارے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔“

س: ”پسندیدہ شاعر؟“  
ج: ”فراز احمد، وحشی شاہ، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، منیر نیازی۔“

س: ”مزاج والا کیا ہیں؟“  
ج: ”ہرگز نہیں۔ مجھے لڑائی کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

س: ”کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟“  
ج: ”بڑھے لکھے، سلجھے ہوئے، تمیز دار،

مطلب اچھے اخلاق کے ہوں، بھرپور ہوں۔“  
س: ”اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟“

ج: ”آپس کی بات ہے ہمارے ایریا میں بہت کم ہوتی ہے کیونکہ نواز شریف صاحب نے دس سالہ حکومت میں یہ بھی ایک خوب صورت تحفہ دیا عوام کو۔“  
س: ”اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟“

ج: ”صبح فجر اور رات کو عشاء کا وقت بہترین ہے۔ ویسے میرے دل میں اللہ کی یاد ہر وقت رہتی ہے (ماشاء اللہ)“

س: ”اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے کس نام سے پکارتے ہیں؟“

ج: ”اصل نام شائستہ یاسین باقی سب پیار سے ”مائی“ بلاتے ہیں۔“

س: ”آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟“  
ج: ”مت پوچھیں کیا کہتا ہے کہتا ہے کہ بنانے

والہ نے خوب صورت بنایا ہے۔“  
س: ”حسین صورت دیکر دل میں کیا خیال آتا ہے؟“

ج: ”کہ بنانے والے نے کتنی فرمت سے بنایا ہے کہ دیکھنے والا مبہوت رہ جاتا ہے۔“

”لازنی نہیں حسین صورتیں گورے رنگ میں ہی ہوں سانولے اور گندمی رنگ میں ہم نے بڑے بڑے شاہکار دیکھتے ہیں۔“

س: ”آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟“  
ج: ”بہت کچھ ملے گا۔ لب اسٹک، بال

پوائنٹ آئینہ اور پیسے کا غنڈا وغیرہ۔“  
س: ”بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟“

ج: ”جی ہاں اوہ تو دنیا کا ہر انسان ہی ڈرتا ہوگا۔“  
س: ”مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟“

ج: ”جو روز نہ آتے ہوں بلا وجہ جنگ کرنے وہ بالکل اچھے نہیں لگتے۔ ہاں کچھ اچھے لگتے ہیں جیسے میری کزن فائزہ ویسے مہمان اللہ تعالیٰ کی رحمت

ہوتے ہیں اور اپنا رزق ساتھ لے کر آتے ہیں۔“  
س: ”کھانے میں کیا پسند ہے؟“

ج: ”کھانے میں خیر نہیں کرتی جوں جوں کھا لیتی ہوں۔ آئسکریم، فروٹ چاٹ، بریانی،



کہوں گی کہ دوست یا کوئی بھی ہو اس کو ہمیشہ اچھے راستے پر لگانا چاہیے۔“

س: ”ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟“

ج: ”جی جی، یار آسمان کے ستارے، قلمی

ستارے یا کرن کے ستارے ہا ہا ہا، ان ستاروں پر نہیں رکھتی۔“

س: ”کوئی آخری بات؟“

ج: ”کہ لوگوں میں دکھاوا بہت ہے۔ ہمارے پرانے

رسم و رواج ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ دنیا دھوکہ باز ہوتی جا رہی

ہے۔ پلیزیہ سب ختم کریں اور دلوں کو صاف کر کے سب کے

ساتھ رہیں۔ خدا جل کا شکر مت ہوں۔“

س: ”کوئی ایسی بات جو ذہن میں ہمیشہ رہتی ہے؟“

ج: ”بہت ساری باتیں ہوتی ہیں مگر میں ان کو

ذہن سے نکالنا چاہتی ہوں کسی سے شیئر نہیں کرتی۔“

==

اطلس خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے ہفتوں کے لیے مختصر سورت ناول

# ایک تھی سہال

مکمل ناول کتابیں میں شائع ہو گیا

قیمت - 500/- رو

مکتبہ خزانہ ڈائجسٹ

32735021

37-144 ہمارے کلانی

س: ”آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟“

ج: ”میں اپنے اوپر بھی خرچ نہیں کرتی ہاں

دوسرے پر دل کھول کر کرتی ہوں۔ شکر اللہ کا۔“

س: ”وہ کون سے کام ہیں جنہیں کرتے

ہوئے سوچتی ہیں کہ دنیا کیا کہے گی؟“

ج: ”ہر کام کرتے ہوئے سوچتا پڑتا ہے

چاہے وہ بولتا ہی کیوں نہ ہو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ

فلاں کی بیٹی کی ”زبان۔“

س: ”آپ سنا سن راستے سے گزر رہی ہوں

اور کتنا پیچھے لگ جائے۔“

ج: ”میں بھاگو گی نہیں اس طرح تو وہ میرے

پیچھے بھاگے گا ہا ہا ہا۔“

س: ”آپ کی نظر میں محبت؟“

ج: ”ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا۔ چنانچہ ویری

سوری۔“

س: ”اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں؟“

ج: ”میری تعریف ہوتی ہی رہتی ہے (ماشاء

اللہ)۔“

س: ”ڈرامے دیکھتی ہیں؟“

ج: ”نہیں صرف ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔

سردیوں کی لمبی راتوں اور گرمیوں کی لمبی دوپہر میں۔“

س: ”اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے

مناتی ہیں؟“

ج: ”دوستیں بنانا چھوڑ دی ہیں تو منانے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری امی میری بہترین

دوست ہیں ہر بات ان سے کرتی ہوں۔ اگر کوئی

قارئین میں سے دوستی کرنا چاہے تو موسٹ ویلکم، وفا

شرط ہے۔“

س: ”حقیقی خوشی کب ہوتی ہے۔“

ج: ”جب میری میلی خوش ہو۔ کوئی مسئلہ نہ ہو۔“

س: ”زندگی سے کیا سبق سیکھا؟“

ج: ”مت پوچھیں کہ کیا سبق سیکھے زندگی سے

اگر بتانے بیٹھوں تو صفحات کم پڑ جائیں گے ہاں اتنا

نگہت عبد اللہ

# ہیروئن کی جدیگی

حیدر علی اور احمد علی دو بوائے تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا تھا اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خوتے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بد زبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سپینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سپینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے پاس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شریل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو چاب مل جاتی ہے لیکن اس کے پاس حسان صاحب کی بیٹی ریکا اس کو پسند کرنے لگتی ہے جو قافو قفا حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے اب بھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زونی کا بے لے لے کر کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔





سونا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خزیںہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خزیںہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزیںہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خزیںہ تیمور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حیدرہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزیںہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

تیمور میں قسمیں





شرجیل کی شادی کی تاریخ رکھنے کے لیے عالیہ خالہ کے بلانے پر حمیدہ بیگم ادھر چلی گئیں تو گھر میں اب شہرینہ اور خزینہ تھیں۔ حمزہ کی طرف سے بدگمانی دور ہونے پر شہرینہ اب خوش نظر آ رہی تھی۔  
 ”خزنی! ایسے ہی تم آ جایا کرو ناں۔ میرا مطلب ہے رہنے کے لیے۔ میں اکیلی بہت بور ہوتی ہوں۔“ وہ خزینہ کی منت کر رہی تھی۔

”اکیلی تو میں بھی ہوتی ہوں لیکن بور نہیں ہوتی۔“ خزینہ نے کہا تو وہ فوراً بولی۔  
 ”ہاں میں نے تمہاری روٹین دیکھی ہے۔ اچھا۔ ستو تم شرجیل بھائی کی شادی میں جاؤ گی۔“  
 ”بالکل، جانا پڑے گا کیونکہ عالیہ خالہ کہہ رہی تھیں وہ میری وجہ سے رکی ہوئی تھیں۔ اب دیکھو کیا تاریخ طے پاتی ہے۔ اگر قریبی تاریخ ہوئی تو پھر میں ابھی گھر نہیں جاؤں گی۔ کہیں سے شرجیل کی شادی انینڈ کرلوں گی۔“ خزینہ سوچتے ہوئے بول رہی تھی اور وہ خوش ہو گئی۔  
 ”ہاں خزی! یہ ٹھیک ہے۔ ابھی خزنی بھائی چلنے کو کہیں بھی تو منع کر دینا۔ تمہارے ساتھ مزائے کا دردناک تو بات بات پر مجھے ٹوکتی رہتی ہیں۔“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے اپنے کپڑے وغیرہ لینے کے لیے تو جانا پڑے گا۔“ خزینہ کہہ کر اس سے پوچھنے لگی۔

”تمہاری تیاری ہے؟“  
 ”کیا تیاری، جو رکھے ہیں وہی پہننے پڑیں گے۔“ وہ برا سامند بنا کر بولی۔  
 ”نہیں اور لے لینا اور دیکھنا، ای جی جی کہیں گی کیونکہ ان کے چہیتے بھانجے کی شادی ہے۔“ خزینہ خود ہی ہنسی تھی۔  
 ”یہ تو بے اور ہو سکتا ہے اس کے بعد بیلا کا کوئی فنکشن آ جائے۔“ اس نے کہا تو خزینہ چونک کر پوچھنے لگی۔  
 ”بیلا کا فنکشن ہے؟“  
 ”ہاں، اس کے لیے پروپوزل آیا ہوا ہے۔ حمزہ چھان بین کر رہا ہے اگر سمجھ میں آ گیا تو پھر میرا خیال ہے منگنی تو ضرور ہوگی۔“ وہ مزے لے کر بتا رہی تھی۔  
 ”اچھا، یہ تو اچھی بات ہے اور تم۔ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ بیلا تم سے چھوٹی ہے۔“ خزینہ نے بہت نرمی سے جتایا تھا۔

”تو کیا ہوا، تم ہی تو امی سے کہتی تھیں کہ یہ کسی کتاب میں نہیں لکھا کہ جب تک بڑی کی نہیں ہوگی چھوٹی کی نہیں ہو سکتی۔“ وہ اس کی بات یاد دلا کر کہنے لگی۔  
 ”خیر تم فکر مت کرو۔ میں نے سوچ لیا ہے، ایم اے کرتے ہی شادی کر لوں گی۔“  
 ”ہیں۔“ خزینہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ”یہ ایم اے کرنے کا مشورہ تمہیں کس نے دیا ہے۔“  
 ”میرے دل نے.....“ وہ کلک لکھائی۔ شرارت کے موڈ میں آ گئی تھی۔  
 ”کیا کہنے تمہارے دل کے۔ حمزہ بے چارہ تو بڑھا ہوا جائے گا۔“ خزینہ نے چھیڑا تو وہ اچھل کر بولی۔  
 ”کیوں بڑھا ہوا جائے گا، دو سال کی تو بات ہے۔“  
 ”اچھا، تم دو سال میں ایم اے کر لو گی۔“ خزینہ کی شریہ مسکراہٹ پر وہ گردن اٹھا کر بولی۔  
 ”ان شاء اللہ۔“

”اچھا جاؤ کچھ کھانے کو لاؤ، بھوک لگ رہی ہے۔ جلدی لانا، شاباش۔“ خزینہ نے اس کا کندھا تپتے ہاتھوں سے بھی اٹھ کر بھائی اور بہت جلدی فروٹ کاٹ کر لے آئی۔ کچھ دیر بعد حمیدہ بیگم آ گئیں تو پھر موضوع شرجیل کی



شادی تھا کیونکہ قریبی تاریخ طے پائی تھی اس لیے خزانہ اسی حساب سے پروگرام بنانے لگی۔  
 ”آج غزنی آئیں گے تو میں ان کے ساتھ گھر چلی جاؤں گی اور شادی میں پہننے کے لیے کپڑے وغیرہ  
 لے کر ایک دو دن میں آ جاؤں گی شک! اس نے شہرینہ کو دیکھا تو وہ فوراً بولی۔

”آ جانا، یہ نہیں کہ پھر کو غزنی منع کر رہے ہیں۔“  
 ”نہیں وہ تمہیں منع کریں گے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابھی ڈرائیوگ مت کرو لیکن میرا خیال ہے میں  
 ٹھیک ہوں۔ ڈرائیوگ کر سکتی ہوں۔ خیر یہ بتاؤ تم شاپنگ کیسے کرو گی؟“ خزانہ نے جان بوجھ کر حمیدہ بیگم کے  
 سامنے اس کی شاپنگ کی بات کی تھی۔ ساتھ آنکھ سے اشارہ بھی کیا تو شہرینہ سمجھ کر بولی۔  
 ”شاپنگ کیا کرنی ہے، جو رکھے ہیں وہی پہن لوں گی۔“  
 ”ہیں..... وہی کیوں پہنو گی؟“ حمیدہ بیگم بول پڑیں۔ ”کوئی دور پرے کی شادی نہیں ہے۔ گھر کی بات  
 ہے۔“

”میں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔“ خزانہ فوراً کہہ کر پوچھنے لگی۔ ”اور ای دینے دلانے کا کیا سوچا ہے؟“  
 ”وہی سوچ رہی ہوں، آپا کے بیٹے کی شادی ہے۔ ان کا، بھائی صاحب کا، شرجیل کا، ان تینوں کے  
 جوڑے تو لینے ہوں گے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا، تم بھی ابھی بازار تو نہیں جاسکو گی۔“ حمیدہ بیگم پُر سوچ انداز میں  
 بولتے ہوئے خزانہ کو دیکھنے لگیں، جیسے پوچھ رہی ہوں اب یہ شاپنگ کون کرے گا۔  
 ”آپ شہرینہ کے ساتھ چلی جائے گا انی! کوئی مسئلہ ہے کیا؟“  
 ”مسئلہ وہی کھٹوں کے درد کا ہے۔ میں اتنا نہیں چل سکتی۔“ حمیدہ بیگم نے معذوری بتائی تو خزانہ بے  
 ساختہ بولی۔

”تو شہرینہ کو خزانہ کے ساتھ بھیج دیجیے گا۔“  
 ”ہیں.....“ حمیدہ بیگم نے چونک کر خزانہ کو دیکھا جب کہ شہرینہ خوش گوار حیرت میں گھر کر اشارہ کرنے لگی  
 کہ وہ حمیدہ بیگم کو اس بات پر آمادہ کرے اور خزانہ نے انہیں آمادہ کر ہی لیا تھا۔

☆☆☆

کلب کی رونقیں عروج پر تھیں اور پہلے تو وہ بھی خوب انجوائے کیا کرتی تھی کیونکہ محفل کی جان اسے ہی کہا  
 جاتا تھا اور وہ گردن اکڑائے، اٹھلائی پھر پرتی تھی لیکن اب الگ تھلک بیٹھی تھی۔ بظاہر سب کو دیکھ رہی تھی لیکن اس  
 کے ذہن میں جانے کیا کچھوڑی پک رہی تھی، جس سے اس کے چہرے کے تاثرات لمحہ بہ لمحہ بدل رہے تھے اور  
 قریب تھا کہ وہ ہر شے کو ٹھوکر مارتے ہوئے یہاں سے دور بھاگ جانی کہ نیلی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے  
 میز پر ہاتھ مار کر ٹوکا۔

”ارے، تم کہاں گم ہو؟“ وہ بتا چوکتے نیلی کو دیکھنے لگی تو وہ انگوٹھے سے اپنے چہچہا اشارہ کر کے کہنے لگی۔  
 ”وہاں، سب تمہارے بارے میں باتیں کر رہے ہیں بلکہ باتیں بنا رہے ہیں۔“  
 ”وہ نہ بولی نہ آکھوں میں سوالیہ نشان ابھرا، جیسے اسے کسی بات کی پروا ہی نہ ہو۔“  
 ”ریکا۔“ نیلی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ ”تو تمہارے بارے میں باتیں بن رہی ہیں اور تم کوئی  
 نوٹس نہیں لے رہی یا تم جان بوجھ کر سب کو کوئی نیا موضوع دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہی بات ہے ناں۔ خیر جو  
 بھی ہو، سب کہہ رہے ہیں، ہمیں کوئی روگ لگ گیا ہے۔“

”ہاں.....“ ایک ذرا سی ہانسی نے جیسے فضا میں آگ لگا دی۔  
 ”کیا؟“ انتہاء درجے کی غیر یقینی تھی۔

”روگ، جس نے میرا کچھ چین سب چین لیا ہے۔ میں جل رہی ہوں، بری طرح جل رہی ہوں۔“ اس کے لہجے میں شعلوں کی سی تپش تھی۔ نیلی ابھی بھی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اپنے آپ بولتی چلی گئی۔ ایک عام سا شخص کسے میرے لیے اتنا اہم ہو گیا کہ مجھے اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ نہ میں اس سے ہٹ کر کچھ دیکھنا چاہتی ہوں لیکن وہ مسلسل مجھ سے کتر رہا ہے بلکہ اب تو انتہائی ہتک آمیز رویہ ہے اس کا جیسے مجھے دھکا رہا ہو مجھے..... ریکا حسان کو..... کیا تم یقین کر سکتی ہو؟“

نیلی سر اسیہ کی نفی میں سر ہلانے لگی۔

”یہ سچ ہے اور اس سچ نے میرے اندر آگ لگا دی ہے جس میں، میں خود کو جل رہی ہوں ساتھ اسے بھی جلا کر اڑا کر دینا چاہتی ہوں۔ بتاؤ ایسا کیا کروں میں کہ وہ ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے آن کھڑا ہو۔ بہت بے عزتی کی ہے اس نے میری۔ تو ذکر رکھ دیا ہے مجھے۔ میں اب اسے ٹوٹتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہاں، میرے اندر لگی آگ ایک صورت سرد ہو گئی۔“ زہر خند سے بولتے ہوئے وہ سانس لینے کو رکھی تھی کہ نیلی پوچھنے لگی۔

”کون ہے۔ کیا میں اسے جانتی ہوں؟“

”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”بہر حال جو بھی ہے، بہت عجیب ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ کوئی تمہیں رجسٹر کر سکتا ہے یا تو تم سے زیادہ کوئی حسین بری ہوگی جس پر وہ عاشق ہو گیا۔ کیا ایسا ہی ہے؟“ نیلی نے قیاس کرتے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”میں نہیں جانتی وہ حسین یا نہیں، لیکن بے ایک لڑکی جس کی وجہ سے وہ مجھ سے دور بھاگ رہا ہے۔“

”تو بھاگتے دو، تمہیں.....“ نیلی کہنا چاہتی تھی تمہیں کیا کی ہے لیکن وہ بول پڑی۔

”نہیں، وہ اب میری ضد بن چکا ہے۔ مجھے ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا ہے، میں اس تو ہن آمیز احساس کے ساتھ نہیں جی سکتی کہ ایک عام سے شخص نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ نو..... نیور.....“ وہ بے حد تنہا ہو گئی تھی۔ نیلی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

”سنو، تم خود کہہ رہی ہو کہ وہ عام سا شخص ہے تو ایک عام آدمی کو تم اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہو؟“

”اس لیے کہ اسے دیکھتے ہی میرے دل نے اسے اپنا مان لیا تھا اور جو چیز میرے دل کو بھا جائے اس پر صرف میرا حق ہے۔ اس لڑکی شہرینہ کو اس کی زندگی سے نکلنا ہوگا۔“ آخری بات وہ جیسے خود سے کہہ رہی تھی۔

”دیکھو بڑکا! اگر جو وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، تب تو یہ ناممکن ہے۔“ نیلی نے اسے سمجھانے کی سعی کی تھی کہ وہ بول پڑی۔

”ناممکن۔ میرے لیے کچھ ناممکن نہیں ہے۔“

”ہوں.....“ نیلی یوں اثبات میں سر ہلانے لگی جیسے اس کی جیسے واقف ہو۔ پھر سانس کھینچ کر بولی تھی۔

”یعنی تمہیں ہر حال میں وہ شخص چاہیے۔“

”ہاں۔“

”تو پھر ایسا کرو.....“ نیلی اپنی ہی بات سوچنے میں لگ گئی اور اس کے اندر بے چینی پھیل گئی۔

”یوں تو، کیا کروں؟“

”غائب کروادو اسے۔“ نیلی کی شاطرانہ مسکراہٹ سے وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھی۔

”کیسے؟“

”اس لڑکی کو جس کی وجہ سے وہ تمہیں رجسٹر کر رہا ہے۔“ نیلی کی مسکراہٹ ہنوز تھی۔



ریکا کے ہونٹ پھینچ گئے اور نیلی کی بات کو سوچتے ہوئے اس کا سر آہستہ آہستہ نفی میں ہلنے لگا تھا۔

☆☆☆

ناشتے پر نظر ڈالتے ہوئے خزیہ کو نفی آگئی۔ نجمہ خالہ نے اتنا اہتمام کر ڈالا تھا یوں جیسے وہ جانے کتنی مدت بعد آئی ہو۔ حالانکہ وہ ایک ہفتہ بھی ای کے گھر نہیں رہی تھی۔

”ماشاء اللہ بیٹا! ماں کے گھر وہ کرچرے پر رونق آگئی ہے۔“ نجمہ خالہ نے اسے ہنستے دیکھ کر کہا۔

”جیسا، ابھی مجھے پھر جانا ہے۔ مطلب ایک دو دن میں۔“ وہ کہہ کر ناشتے کی طرف متوجہ ہوئی۔

”خیریت۔ تمہاری امی ٹھیک ہیں؟“ نجمہ خالہ کو جو خیال آیا وہی پوچھ لیا۔

”جی، اللہ کا شکر ہے۔ اصل میں میرے خالہ زاد کی شادی ہے تو میں وہیں سے امی اور بہن کے ساتھ جانا

آنا کر لوں گی۔“ اس نے بتایا تو نجمہ خالہ نے یوں ہی سر ہلادیا پھر پوچھنے لگیں۔

”تمہاری نند پھر آئی تھی؟“

”میری نند.....“ وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

”ہاں وہی جو تمہیں اسپتال سے گھر لے کر آئی تھی۔“ نجمہ خالہ نے انجانے میں اسے حیران کر دیا۔ لیکن وہ

ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی جب ہی بات بنانے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

”کون سی نند آئی تھی خالہ؟“

”بیٹا! اب مجھے کیا پتا؟ میں نے سب کو تو نہیں دیکھا۔“

”ہوں۔“ اس نے یوں ہی سر ہلادیا لیکن اس کا ذہن اس سچ پر سوچنے لگا تھا کہ غزنی کی بہن آئی تھی تو شاید

وہ اپنے ماں باپ کو بھی لے آئے۔

”آنا چاہیے انہیں۔“ زریب خود کلاہی کرتے ہوئے وہ اٹھ کر اسے کمرے میں آگئی۔ کچھ دیر سمجھ میں نہیں

آیا کیا کرے پھر جب یاد آیا کہ اسے شرجیل کی شادی میں پہننے کے لیے کپڑے نکالے ہیں تو ڈریسنگ روم میں

آگئی اور وارڈروب کھولنے لگی تھی کہ نظر اوپر رکھے۔ ان چھوٹے بڑے ڈبوں پر پڑی جو اس نے بچے کے لیے

شاپنگ کی تھی۔ دل میں ہوک سی اٹھی، کتنی دیر وہ کم مٹم کھڑی رہی۔

”وہ نہیں تو یہ بھی نہیں۔“ اس خیال کے آتے ہی اس نے تمام ڈبے اتار لیے پھر انہیں لے کر لاؤنج میں

آگئی اور نجمہ خالہ کو پکار لیا۔

”کیا چاہیے بیٹی؟“ نجمہ خالہ نے آتے ہی پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ نظریں ڈبوں پر جمی تھیں۔

”یہ سب کیا ہے؟“ نجمہ خالہ نے ڈبوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو گہری سانس کے ساتھ اس کا ارتکاز ٹوٹ

گیا۔

”ان میں بچے کے کپڑے اور دوسری چیزیں ہیں خالہ! آپ کے بیٹا، بیٹی کے بچے ہیں ناں۔ یہ آپ ان

کے لیے لے جائیے گا۔“ وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بول رہی تھی۔

”نا بیٹا! اللہ پھر تمہاری گود بھرے گا تو یہ سب اس کے لیے رکھ دو۔“ خالہ کو اندازہ تھا کہ ان ڈبوں میں کتنی

قیمتی اشیاء ہوں گی جب ہی بیچا جائے۔

”اللہ اور دے گا تو اس کے لیے چیزیں بھی اور آجائیں گی۔ یہ آپ کے پوتا پوتی یا نواسا تو اسی استعمال

کریں گے تو مجھے خوش ہوگی۔ سکون ملے گا مجھے۔ میں، سنبھالیں یہ آپ۔ میں امی کے گھر جاؤں گی تو آپ بھی

اسے گھر سے ہوائے گا۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں، پلٹ کر واپس کمرے میں آگئی لیکن اب اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کیا

کام کرنے جا رہی تھی۔ خالی ذہن کے ساتھ چند لمحے ادھر ادھر دیکھا پھر لپٹ کر نی وی آن کر دیا۔ ڈرامے وغیرہ



وہ دیکھتی نہیں تھی اور اب تو گمانے سننے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ بس یوں ہی جھپٹلے بدلتے اس کی آنکھ لگ گئی تو پھر تیر غزنی نے اسے اٹھایا۔

”کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“ غالباً اس کے بے وقت سونے سے وہ متوحش ہوا تھا۔  
”ہاں بس ایسی تھی تو آنکھ لگ گئی۔ آپ کب آئے؟“ وہ اٹھ کر بال سینے لگی۔

”ابھی خالد نے بتایا، تم بہت دیر سے سو رہی ہو اور ہاں تم نے اچھا کیا، بچے کا سامان خالہ کو دے دیا۔ رکھا رہتا تو تم.....“ وہ قصداً خاموش ہو گیا پھر جیسے اچانک یاد آنے پر پوچھنے لگا۔

”سنو، تمہارا پاسپورٹ ہے؟“

”نہیں، کیوں؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میرا اطلاق کیا کاٹور ہے، تم پہلی فرصت میں پاسپورٹ بنواؤ تو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ چلو گی ناں۔“ وہ

سمجھ گیا تھا کہ بچے کا سامان دیکھ کر وہ حساس ہو رہی ہے، جب ہی اسے بہلا رہا تھا۔

”ہاں لیکن ابھی تو شریل کی شادی ہے۔ اس کے بعد ہی۔“

”نو پرابلم۔“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔ ”تم آرام سے شادی اٹینڈ کر لو۔ میں اپنا

وزٹ اس کے بعد رکھ لوں گا، بس یہ طے ہے کہ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“

”اچھی بات ہے، چلیں اب آپ منہ ہاتھ دھوئیں۔ میں کھانا لگوائی ہوں۔“ اس نے بیڈ سے اترتے

ہوئے کہا تو تیر غزنی اس کی شوڑی پکڑ کر بولا۔

”میرا خیال ہے آپ کو بھی منہ دھولیتا چاہیے، ابھی سو کر اٹھی ہیں۔“ وہ ہنسی ہوئی واٹس روم کی طرف گھوم

گئی۔

☆☆☆

”حزرو! تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔“ شہرینہ ہنگامہ شایگہ مال دیکھتے ہی چیخ پڑی۔

”کیوں تمہیں شایگہ نہیں کرنی۔ چچی جاننے نے اتنی لمبی لسٹ تمہیں بھجائی ہے۔“ حزرو نے گاڑی پارکنگ

میں روکتے ہوئے کہا تو وہ جتا کر اور چپا کر گویا ہوئی تھی۔

”سنو، ابھی ہم اتنے امیر نہیں ہوئے جو اس مال سے اتنی لمبی شایگہ کر سکیں۔“

”تمہاری شایگہ یہیں سے ہوگی، باقی جہاں تم کو کی لے چلوں گا۔ اب اترو، پیچھے گاڑی آرہی ہے۔“

حزرو نے کہنے کے ساتھ اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

”نہیں حزرو! میں یہ انور ذہب نہیں کر سکتی۔“ اس نے پرس پر یوں مضبوطی سے ہاتھ جمائے جیسے خود بھی وہیں جم

گئی ہو۔

”اوقات تو میری بھی نہیں ہے لیکن کبھی کبھی دل کی مان لینے میں کوئی حرج نہیں اور ابھی میرا دل چاہ رہا ہے

میں تمہیں اپنی پسند سے شایگہ کاڑوں۔ اپنی جیب سے۔“ حزرو نے آخر میں محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے

ہوئے اترنے کا اشارہ کیا تو وہ اچانک بے ترتیب ہوئی دھڑکنوں سے گھبرا کر اتر گئی۔

شایگہ مال کی چکا چوندا آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی لیکن وہ بہت محتاط تھی۔ خاص طور سے رک کر کسی چیز کو نہیں

دیکھ رہی تھی کہ کہیں حزرو اس کی خواہش سمجھ کر لینے کھڑا ہو جائے اور حزرو جانتا تھا اسے شریل کی شادی میں سینے کی

شایگہ کرنی ہے تو اسی حساب سے سوٹ پسند کر رہا تھا اور جب وہ دکان دار سے قیمت پر بات کرنے لگا تو وہ

ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نظریں گفٹ امپورٹیم پر ٹھہر گئیں، لیکن فوری طور پر وہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ کیا دیکھ رہی

ہے۔ کاج کا تیس کل دان یا جس کے ہاتھ میں گل دان تھا اور قریب تھا کہ وہ وہاں سے اپنی نظریں ہٹا لیتی کہ



اچانک ذہن میں جھماکا ہوا۔  
 ”ریکا“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے بے اختیار حمزہ کا بازو تھاما پھر ایک دم گرفت مضبوط کر کے بولی۔

”حمزہ! وہ ریکا ہے ناں۔“  
 ”ہیں۔“ حمزہ نے چونک کر اسے پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہی ہونٹ سمجھ کر ہونٹوں کی آواز نکالی۔

”میں ڈرا اس سے مل کر آتی ہوں۔“ اس نے کہنے کے ساتھ قدم بڑھایا کہ حمزہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔  
 ”کوئی ضرورت نہیں، چلو یہ شاہراہ ڈالو اور چلو یہاں سے۔“ اس نے شاہراہ اٹھالیا لیکن چلنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ حمزہ نے دبے لہجے میں ڈانٹا تو وہ بسورتے انداز میں بولی۔  
 ”تم کیوں منع کر رہے ہو؟“

”کیونکہ یہ پبلک پلےس ہے اور یہاں مجھے تماشا نہیں بننا۔ چلو۔“ حمزہ اس کا بازو پکڑ کر زبردستی اسے اپنے ساتھ چلانے لگا تو وہ اسے سنا کر اپنے آپ سے بولنے لگی۔

”سمجھ گئی کیوں نہیں ہٹتے دے رہا۔ ضرور اس کا اپنا چکر ہوگا۔ میرے سامنے کسی داستانیں گھڑ رہا تھا کہ وہ نفسیاتی لڑکی ہے۔ تو بتو، یہاں سے بھی نفسیاتی نہیں لگ رہی تھی۔“

حمزہ سب سن رہا تھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ شاپنگ مال کی سیڑھیاں اترتے ہی اس کا بازو چھوڑ دیا پھر پارکنگ ایریا پر نظر ڈال کر کہنے لگا۔

”وہاں تو بہت رش ہے تم یہیں رکو۔ میں گاڑی نکال کر سامنے لے آتا ہوں۔“  
 ”جلدی آنا۔“ وہ کہہ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ نظریں حمزہ پر ہی تھیں جو بہت تیز قدموں سے جا رہا تھا۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب اس نے گردن موڑ کر شاپنگ مال کو دیکھنا چاہا تھا کہ ریکا آتی دکھائی دی۔ چال ڈھال سے انتہائی پُر اعتماد۔ وہ اب غور سے اسے دیکھنے لگی تھی اور جب ریکا اس کے قریب سے گزرنے لگی تو بالکل غیر ارادی طور پر وہ قدم بڑھا کر اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ ریکا کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ سوالیہ نشان ابھرا تھا۔

”تم.....“ اس نے پہلے خود کو سرزنش کی پھر سنبھل کر پوچھنے لگی۔  
 ”تم ریکا ہونا؟“

”تم کون ہو؟“ ریکا نے جواب دینے کے بجائے الٹا پوچھا تو اب وہ جتا کر بولی تھی۔  
 ”شہرینہ..... میں شہرینہ ہوں۔“

ایک بل کو ریکا کی آنکھیں سکڑی تھیں لیکن پھر نخوت سے بولی۔  
 ”نسوری، میں کسی شہرینہ کو نہیں جانتی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی کہ شہرینہ فوراً بول پڑی۔

”میں حمزہ کی منگیت ہوں۔ حمزہ کو تو جانتی ہوں ناں۔ وہی حمزہ جسے حاصل کرنے کے لیے تم باہل ہو رہی ہو لیکن تمہارا یہ خواب بھی پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ میں اور حمزہ ازل سے ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ہم دو جسم ایک جان ہیں۔ ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہے اور تم ہزار جنم لے کر بھی اس کے دل تک رسائی حاصل نہیں کر سکتیں۔

وہاں میری شکرانی ہے صرف میری۔“ وہ جومنت میں آیا بوقتِ جلی جا رہی تھی۔

ریکا ہونٹ بچنے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”آئندہ کبھی حمزہ کا نام مت لیتا، بھیس۔“ اس نے وارننگ کے انداز میں شہادت کی انگلی اٹھائی پھر سر جھٹک کر پٹی اور تیز قدموں سے حمزہ کی طرف چل پڑی۔  
 پارکنگ سے گاڑی نکالتے ہوئے حمزہ خاصا عاجز نظر آ رہا تھا۔ اسے آتے دیکھا تو جلدی بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ بھی بھاگ پڑی پھر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے دیکھا۔  
 ریکا وہیں کھڑی تھی۔

☆☆☆

وہ بظاہر ٹی وی اسکرین پر نظر میں جمائے بیٹھی تھی لیکن اس کا ذہن اس بری طرح چیخ رہا تھا کہ نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ بھائی۔ پچھلے دو گھنٹے سے وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ یہ خیال بھی نہیں آ رہا تھا کہ ٹی وی بند کر کے سو جائے۔ شاید ٹی وی کی آواز سے وہ شہریت کی آواز دبانے کی کوشش کر رہی تھی جو مسلسل اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

”میں حمزہ کی منگیت رہوں۔ حمزہ کو تو جانتی ہوں نا۔ وہی حمزہ جسے حاصل کرنے کے لیے تم پاگل ہو رہی ہو۔ لیکن تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔“

پھر شہریت کی وارننگ۔

”آئندہ کبھی حمزہ کا نام مت لیتا۔“

بار بار یہ جملے جیسے ریواسنڈ ہو رہے تھے۔ اتنی حقیر بھلاکب کسی نے کی تھی۔ اس کا پور پور سلگ رہا تھا اور جانے کب تک وہ اسی حالت میں بیٹھی رہتی کہ شمرہ آئیں۔

”راہی! تم ابھی تک سوئی نہیں اور یہ ٹی وی کا والیوم کم کرو، سارے گھر میں آواز گونج رہی ہے۔“

”کیسی آواز؟“ وہ بتا چوٹے گردن موز کر شمرہ کو دیکھنے لگی۔

”ٹی وی کی آواز۔“

”ٹی وی کی آواز لیکن.....“ اس نے آنکھیں بند کر لیں، اندر اتنا شور تھا باہر کا شور کیسے سنائی دیتا۔

شمرہ نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا تو ایک دم خاموشی پھیل گئی۔ اس کے تھے ہوئے اعصاب بھی قدرے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

”کیا بات ہے بیٹا! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ شمرہ نے پوچھنے کے ساتھ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو بری طرح جل رہی تھی۔

”ارے تمہیں تو اتنا تیز بخار ہے۔“ شمرہ پریشان ہو گئیں۔ ”تمہیں بتانا چاہیے تھا بیٹا! اب اتنی رات کو ڈاکٹر کہاں ملے گا پھر بھی میں ٹرائی کرتی ہوں۔“

”تمہیں ممّا!“ اس نے شمرہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے ٹیبلٹ لے لی ہے، بس نیند آ جائے گی۔ ہاتھ نہیں نیند کیوں نہیں آ رہی۔“

”اتنی تیز آواز میں ٹی وی چل رہا تھا تو کیسے نیند آتی۔ چلو اب سو جاؤ۔ میں صبح ڈاکٹر کو کال کروں گی۔“ شمرہ اس کے پیچھے کھینچ کر سیدھا کرتے ہوئے بول رہی تھیں پھر اسے لٹا کر کیمبل اوڑھا دیا۔

”اوکے ممّا! گڈ نائٹ۔“ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”گڈ نائٹ بیٹا!“ شمرہ نے جھک کر اس کی پیشانی چومی پھر لائٹ آف کر کے کمرے سے نکل گئیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔



ثمرہ نائٹ بلب جلانا بھول گئی تھیں، جب ہی کمر اکمل تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ سردی کے باعث پردے بھی برابر تھے، ورنہ ادھر ادھر سے روشنی کی کیریں آ جانی تھیں اور وہ کیونکہ اندھیروں کی عادی نہیں تھی جب ہی گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نیند نے آ کر نہیں دیا۔ دماغ جوجھ رہا تھا۔

”حد ہے۔“ وہ اچانک جھٹکے سے سیدھی ہو کر لیٹ گئی اور یوں جیسے سانسے شہرینہ آن کھڑی ہوئی ہو اور وہ اپنے اندر کی کھولیں اس پر اندھیلنے لگی۔

”تم شہرینہ عام سی لڑکی، میرے سامنے اتنی بکواس کر گئیں اور میں اگر خاموش رہی تو اس لیے کہ میں تم جیسوں سے بات کرنا اپنی تو بہن سمجھتی ہوں۔ مائی فٹ۔“

”اور سنو، میرا بھی کوئی خواب ادھر انا نہیں رہا۔ خواب تم جیسوں کے ٹوٹتے ہیں۔ میں دیکھوں گی جب تم اپنے خوابوں کی کرچاں سمیٹ رہی ہو اور وہ دن زیادہ دور نہیں ہے۔“

”ساتم نے.....“

”ساتم نے.....“ وہ غنودگی میں جاری تھی کہ اچانک اس کی ساعتوں میں نیلی بولنے لگی تھی۔

”سنو، اگر جو وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں پھر تو نامکن ہے۔“

”میرے لیے کچھ بھی نامکن نہیں ہے۔“ وہ ابھی بھی نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

”عاب کر دادو اسے۔“ نیلی پھر بولی تھی۔

”ہوں.....“ اس وقت اس نے نفی میں سر ہلایا تھا اور اب اسی پنج پر سوچتے سوچتے نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی۔



بچے کے رونے کی آواز پر وہ گہری نیند میں سے اٹھ گیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا، سارہ کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اسے پکارنا چاہتا تھا لیکن پھر ناتم دیکھ کر خود ہی اٹھ کر بچے کے جھولے کے پاس آ گیا اور جھک کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

”کیا ہو گیا کمانڈو! بھوک لگی ہے۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے لیکن میں روتو نہیں رہا۔“ وہ خود ہی ہنسنے لگا پھر بچے کو اٹھالیا اور ہاتھوں پر جلاتے ہوئے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہا تھا کہ سارہ فیڈر لے کر آ گئی۔

”یہ..... یہ کیا کر رہے ہو؟“

”اس کی زبان میں باتیں کر رہا ہوں۔ دیکھ نہیں رہیں چپ ہو گیا اور سن بھی رہا ہے۔ ہیں ناں کمانڈو! چلو جاؤ تمہاری خوراک آ گئی ہے۔“ وہ بچہ سارہ کی گود میں ڈال کر پوچھنے لگا۔

”اور میری چائے کہاں ہے؟“

”کچن میں۔“ میرا مطلب ہے بٹلر سے کہو بنا دے گا۔“ سارہ نے بیٹھ کر بچے کے منہ سے فیڈر لگا دی تھی۔

”سارو! تمہیں پتا ہے میں چائے صرف تمہارے ہاتھ کی بنی پیتا ہوں۔“ اس کے احتجاج کا سارہ نے نوٹس

نہیں لیا کیونکہ وہ غلط کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے بچے کے ساتھ مصروف دیکھتا رہا پھر اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا۔

”سنو جب سے یہ بچہ آ رہا ہے۔ ہم کہیں آؤ تنگ پر بھی نہیں گئے۔ آج چلیں؟“

”کہاں؟“ سارہ اسے دیکھنے لگی۔

”کہیں بھی، دور تک جائیں گے۔ بچے کو ماما کے پاس چھوڑ دینا۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا تو وہ سارہ نے

ہمیشہ کی طرح فوراً ہی نہیں بھری۔ شش و پنج میں پڑی تھی۔

”ہاں لیکن، ماما زیادہ دیر بچے کو نہیں سنبھال سکتیں۔“

”ملم آن یار! کتنے دن ہو گئے ہیں اور پھر نیکسٹ ویک مجھے ملا بیٹھا جانا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گی؟“ وہ غالباً اندر سے خائف تھا، کہیں سارہ ہائی نہ بھر لے۔

”نہیں، میں اب کیسے جا سکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے بس تھوڑے دنوں کی بات ہے، بچہ اسکول جانے والا ہو جائے گا تو۔“

”ہیں.....“ وہ اچھل پڑا۔ ”تمہارا مطلب ہے تھوڑے دنوں میں یہ اسکول جانے لگے گا۔“

”ہاں۔“ سارہ کلکھلا کر ہنسی تھی اور وہ اندر سے تو مطمئن ہو گیا لیکن بظاہر اسے گھورنے لگا تھا۔

”اؤ ہنسی! سمجھو ناں۔ اس کے آنے سے ہمارے گھر میں کتنی رونق ہو گئی ہے پھر میں سارا وقت پور پھرتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں، اب اس کے ساتھ مصروف رہ کر وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ دیکھو ناں کتنا پیارا ہے۔“

سارہ کی بچے کے ساتھ محبت دیکھ کر وہ جہاں خوش ہوتا وہاں اسے خزی نہ کا خیال ضرور آتا تھا تو پھر وہ کوشش سے بھی سارہ کے ساتھ خوشی شیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہی مجرمانہ احساس کہ اس نے ایک سے خوشی چھین کر دوسری کی جھولی میں ڈال دی، ابھی بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔“

”کہاں جانے کی بات ہو رہی ہے۔“ ماما اس کی بات سنتے ہوئے آئی تھیں لیکن جواب کا انتظار نہیں کیا فوراً بچے کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگیں۔

”کتنی دیر سے اس کی آواز نہیں آئی تو میں پریشانی ہو گئی۔ ٹھیک ہے تابیہ۔“

”جی ماما! اصل میں گود میں ہے ناں جب ہی مزے سے سو رہا ہے۔“ سارہ نے کہتے ہوئے بچے کو ماما کی گود میں ڈال دیا تو وہ غیر ارادی طور پر دیکھنے لگا۔

ماما بچے کو پیار کرتے پھر سینے سے لگا تیں۔ والہانہ انداز تھا۔ یقیناً خون کی کشش تھی۔

”تمہی! پہلے چائے لوگے یا اب ناشتا ہی کرو گے۔“ سارہ نے پوچھا تو وہ چونک کر بولا۔

”ناشتا۔“

”اوکے، تم جلدی فریش ہو کر آؤ، میں ناشتا بنواتی ہوں۔“ سارہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تو وہ ماما سے پوچھنے لگا۔

”ماما! یہ آپ کو پیارا لگتا ہے؟“

”کیوں، تمہیں پیارا نہیں لگتا۔“ ماما نے الٹا اس سے پوچھا تو وہ سنبھل کر بولا تھا۔

”لگتا ہے تھوڑا تھوڑا۔“ ماما نے ٹوکنا نہ احساس دلانے کی سعی کی۔ بچے میں مصروف ہو گئیں تو اس نے داش روم کا رخ کیا۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ سارہ کے ساتھ ناشتے کی میز پر تھا اور بظاہر اسے چھپڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”سنو، میرا خیال ہے مجھے ایک اور شادی کر لینی چاہیے۔“ سارہ جو سلاش پر جام لگا رہی تھی، ایک دم اسے

دیکھا پھر زور سے چھپچھپٹ میں بیٹھ دیا۔ متوقع رد عمل تھا پھر بھی اس نے سکنے کی ایکٹنگ کی۔

”ارے میں مذاق کر رہا تھا۔“

”میں ایسا مذاق برداشت نہیں کر سکتی۔ جان لے لوں گی تمہاری یا اپنی۔“ سارہ آپے سے باہر ہو گئی تھی۔



”مائی گاؤ۔“ وہ جانتا تھا سارہ کو منانا آسان نہیں ہے۔ سارا دن اس کے آگے پیچھے پھرتا رہا تھا، جب کہیں جا کر اسے مٹانے میں کامیاب تو ہو گیا، ساتھ ہی یہ بھی سمجھ گیا کہ وہ کبھی اس پر اپنی دوسری شادی ظاہر نہیں کر سکے گا۔

☆☆☆

شرجیل کی شادی میں خوب ہلا گلا تھا۔ عالیہ خالہ جانتی تھیں کہ حمیدہ بیگم بیٹیوں کے ساتھ تین چار دن ان کے ہاں رہ جائیں لیکن حمیدہ بیگم نے خزیںہ کی وجہ سے منع کر دیا کہ ابھی وہ اتنا شور شرابا برداشت نہیں کر سکتی تھی پھر بے آرامی کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہونے کا اندیشہ بھی تھا۔ یوں انہوں نے معذرت کر لی کیونکہ آنے جانے کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ خزیںہ کی گاڑی مٹی اور ایسے موقعوں پر وہ جزوہ بھی کی خدمات حاصل کیا کرتی تھیں۔ بہر حال شہرینہ بہت خوش اور پر جوش تھی۔ مہندی مایوں، بارات، ولیمہ ہر فنکشن میں آگے آگے کیونکہ اس نے ہمیشہ شرجیل کو اپنا بھائی سمجھا تھا۔ شہینہ کے ساتھ مل کر نیک بھی وصول کیا تھا اور آج ویسے میں تو اس کی بیج و بیج ہی نرالی تھی۔ سب اسے چھیڑ رہے تھے کہ اب تمہاری باری ہے جواب اس کے ہونٹوں پر شرجیل مکان جگ جانی۔ ایسے ہی کسی لمحے میں جزوہ نے اسے دیکھا تو بے اختیار اس کے پاس چلا آیا اور کسی کا خیال کیے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ کر غلبت بھرے انداز میں کہنے لگا۔

”شہرینہ جلدی آؤ، چچی جان کہہ رہی ہیں گاڑی سے سامان نکال دو۔“

”کیسا سامان؟“ اس نے پوچھا لیکن جزوہ ان سنی کر کے اسے کھینچتے ہوئے ہال کے اس کونے میں لے آیا

جہاں آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اسے اپنے سامنے بٹھا کر بولا۔

”بس اب تم کہیں نہیں جاؤ گی۔“

”مطلب؟“ وہ بھی نہیں۔

”مطلب میں کب سے تمہیں جی بھر کر دیکھنے کو ترس رہا ہوں اور تم ہو کہ ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی ہو۔“

”کیونکہ آج ہم مہمان نہیں، میزبان ہیں اور عالیہ خالہ نے خاص طور سے مجھ سے کہا تھا کہ مہمانوں کا

خیال رکھنا۔“ وہ کہہ اس سے رہی مٹی لیکن دھیان ادھر مہمانوں کی طرف تھا۔ گردن اونچی کر کر کے سب کو دیکھ رہی تھی۔

”تو کیا خیال کر رہی ہو، میں بے چارہ اکیلا مہمان، نہ ادھر کا نہ ادھر کا۔ کوئی پوچھ ہی نہیں رہا مجھے۔“

”ہیں.....“ شہرینہ نے ایک دم جزوہ کو دیکھا تو اس نے فوراً مسکین شکل بنالی تھی۔ ”تم بوری ہو رہے ہو؟“

جزوہ نے مسکین شکل کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”سوری۔ سوری یار! اصل میں مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم..... اچھا ظہر د میں کھانا لے آتی ہوں۔ ہم

دونوں یہیں کھائیں گے۔“ وہ واقعی جزوہ کے لیے بہت حساس ہو گئی تھی۔ دو تین چکروں میں بھاگ بھاگ کر

ساری ڈشز لا کر اس کے سامنے رکھ دیں پھر خود بھی بیٹھ گئی۔

”میں نے خزیںہ سے کہہ دیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چلو کھانا شروع کرو۔“

”تھینک یو۔ تم بہت پیاری ہو اور آج تو کچھ زیادہ ہی پیاری لگ رہی ہو۔“ وہ فوراً شوخی میں آ گیا تھا۔

جیب سے موبائل نکال کر اس کا سندر روپ محفوظ کرنے لگا تو وہ بھی بھی بستی، بھی اٹھلاتی، بھی روشنی شکل بناتی تھی،

آخر میں کلکلا کر ہٹی تھی۔

”بس کرو جزوہ! کھانا کھنا ہو رہا ہے۔ پھر کہو گے تمہارے شرجیل بھائی کی شادی میں کیسا ٹھنڈا کھانا ملا تھا۔“

”وہ تو میں کہوں گا۔“ وہ موبائل جیب میں رکھ کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”توبہ باتے آنکھم۔ بندہ کیا کھائے، کیا نہ کھائے۔“  
 ”سب کھاؤ۔“ وہ کہہ کر کھانے میں مصروف ہو گئی پھر اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگی۔  
 ”ہاں حزرہ! وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا..... ربیکا اب تو نہیں تنگ کرتی تمہیں۔“  
 ”نہیں۔ کافی دنوں سے اس کا فون نہیں آیا۔“ وہ کھانے میں مصروف رہ کر بولا تھا۔  
 ”آئے گا بھی نہیں۔“ اس نے اتنے یقین سے کہا کہ حزرہ کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ ہنس  
 پڑی پھر اپنا کارنامہ بتانے لگی۔

”اس روز شاپنگ مال پر میں نے اس کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ وہ جب تم پارکنگ سے گاڑی نکال  
 رہے تھے، اس کی شامت آئی مگر جو میرے سامنے آگئی پھر مت پوچھو، ایسی کھری کھری سنائیں اسے کہ ہوش  
 ٹھکانے آ گئے تھے اس کے۔ ایک لفظ نہیں بول سکی تھی۔“  
 ”جج..... تم سچ کہہ رہی ہو۔“ حزرہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔  
 ”تو اور کیا، پھر تم خود دیکھو۔ اس دن کے بعد سے اس نے تمہیں کال نہیں کی۔ میں نے اسے وارن کیا تھا  
 کہ آئندہ تمہارا نام نہ لے اور تم سن لو، اب اگر اس نے تمہارا نام لیا تو میں جج اس کا منہ نوچ لوں گی، سمجھے۔“ وہ  
 جذباتی ہو گئی تھی۔

”میں تو سمجھ گیا اللہ کرے وہ بھی سمجھ گئی ہو۔“ وہ اب محفوظ ہو کر کھانے لگا تھا۔  
 ”تم ناحق پریشان ہوتے رہے۔ مجھے پہلے ہی بتا دیتے تو.....“ شہرینہ نے منہ میں نوالہ ڈالنے کا توقف کیا  
 تھا کہ وہ بول پڑا۔

”اب تک ہمارے دو تین بچے ہوتے۔“  
 ”توبہ، کتنے بے شرم ہو تم۔“ وہ ہلش ہو گئی۔  
 ”اس میں بے شرمی کی کیا بات ہے۔ ہماری شادی ہو گئی پھر بچے ہوں گے پھر وہ بڑے ہوں گے تو ان کی  
 شادی کرنے کے بعد ہم دونوں اپنی مون پر چلیں گے اور جب واپس آئیں گے تو ان کے بچے ہو چکے ہوں گے۔“  
 وہ بولے چلا جا رہا تھا۔  
 شہرینہ کو ہلکی سی مضطرب کرنا مشکل ہو گیا۔

www.urdu-tubes.com

☆☆☆

کتنا دن چڑھ آیا تھا جب فاخرہ نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔  
 ”حزرہ کیا کھا کر سوئے تھے کہ تمہاری نینٹ ٹوٹ کے نہیں دے رہی۔“  
 ”اماں! اچھٹی کے دن تو سونے دیا کریں۔“ وہ کسمسایا۔  
 ”بیٹا، بارہ بج رہے ہیں۔ اتنی دیر خالی پیٹ نہیں سوتے۔“ فاخرہ نے پکارا تو وہ انگڑائی لے کر بولا۔  
 ”خالی پیٹ کہاں اماں! رات ویسے میں اتنا کچھ کھا لیا تھا۔“  
 ”رات کا کھایا ابھی تک پیٹ میں نہیں رکھا ہوگا۔ دیکھو میں چائے بھی لے آئی ہوں، چلو اٹھو۔“  
 ”جائے۔“ وہ فوراً اٹھ بیٹھا تو فاخرہ نے چائے کا کپ اسے تھما دیا پھر بیٹھتے ہوئے۔  
 ”خیر سے ہو گئی شادی۔“

”جی، آپ بھی چلیں ناں۔ عالیہ خالہ بار بار پوچھ رہی تھیں کہ اماں اور بہن کو کیوں نہیں لائے۔“  
 ”بس بیٹا! جب سے موسم بدلا ہے گھٹن کا دور زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیتا۔ میں ایسے ہی کسی دن جا کر مبارک  
 باد دے آؤں گی۔“



”جی ضرور جایے گا ورنہ میری شادی میں نہیں آئیں گی۔“ اس نے کہا تو فاخرہ تائید کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو، تمہاری اور بیلا کی۔“ پھر پوچھنے لگیں۔  
”تم نے اس لڑکے کا پتا کیا۔ وہ لوگ بارہون کر کے جواب مانگ رہے ہیں اور گھر آنے کی دعوت بھی دے رہے ہیں۔ کیا کہتے ہو تم۔“

”ہوں۔“ اس نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھا پھر کہنے لگا۔ ”اماں! لڑکا تو اچھا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سب معلوم کر لیا ہے۔ باقی آپ جا کر گھر وغیرہ دیکھ لیں۔ گھر کے دوسرے لوگ اور ماحول آپ کی سمجھ میں آتا ہے تو باقی مجھ لیں اور اس سے پہلے بیلا سے ضرور پوچھ لیجیے گا۔“  
”وہ تو میں پوچھ لوں گی لیکن میں کیا وہاں اس کی جاؤں گی، ہم نہیں چلو گے؟“

”نہیں۔ میرا مطلب ہے ابھی میرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں تاکی جان کو ساتھ لے جائیں۔ وہ بھی دیکھ لیں گی بلکہ پہلے تاکی جان کو ہی دکھانا چاہیے کیونکہ آپ تو ہیں ماشاء اللہ۔ آپ کو سب اچھا اچھا نظر آتا ہے۔“ وہ آخر میں محفوظ ہو کر بول رہا تھا۔ فاخرہ مصنوعی حلقی سے گھورنے لگیں تو وہ ان سے پوچھ گیا۔

”میری پیاری اماں! آپ خود ابھی ہیں، جب ہی آپ کو سب اچھے نظر آتے ہیں۔“  
”ہو، میں سب سمجھتی ہوں تمہاری چال پلوسی۔“ فاخرہ نے اسے دھکیلا تو وہ ایک دم پرے ہو کر بولا۔  
”کیسی چال پلوسی؟“

”اپنی بات کرنا چاہ رہے ہوں۔ کہوں گی حمیدہ بھابی سے کہ بیلا کے ساتھ ساتھ تمہاری شادی بھی طے کر دیں۔“ فاخرہ نے اس پر کڑھ کر خواہش بیان کر دی تھی اور وہ بھی تو یہی چاہتا تھا جب ہی ہنسنے لگا۔  
”پھر کب جانا ہے؟“ فاخرہ نے پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

”آج ہی..... آج ہی چلی جائیں۔ چھٹی کا دن ہے سب گھر پر ہوں گے۔“  
”لیکن.....“

”کوئی لیکن ویکن نہیں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ آپ پہلے تاکی جان کو فون کریں پھر لڑکے کی اماں کو فون کر کے کہہ دیں کہ آپ آج شام میں آ رہی ہیں۔“ اس نے آغا فائز کو گرام سیٹ کر دیا تھا۔  
پھر شام میں اس نے پرائیویٹ کار منگوا لی تھی تو فاخرہ اور بیلا کو لے کر پہلے حمیدہ بیگم کے ہاں گیا۔ بیلا کو وہاں چھوڑا اور انہیں ساتھ لے کر دونوں خواتین کو لڑکے والوں کے گھر اتارا اور خود آگے نکل آیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ واپسی کے لیے فاخرہ اسے فون کر دیں گی تو وہ انہیں لینے آ جائے گا۔

اس کے خیال میں خواتین دو تین گھنٹوں سے پہلے تو وہاں سے انھیں گئی نہیں اور اتنا وقت وہ سڑکوں پر آوارہ گردی میں نہیں گزار سکتا تھا۔ اس لیے ایک جگہ چائے پینے بیٹھ گیا پھر سرکریٹ سٹاکر سوچا، بہتر ہے گھر چلا جائے یا شہرینہ اور بیلا کے پاس دوسرا خیال خوش کن تھا، اس نے جلدی سے چائے کا کپ خالی کیا پھر پلے کر کے نکلا تھا کہ فاخرہ کی کال آ گئی۔ وہ حیران ہونے کے ساتھ اچھٹے میں گھر گیا تھا۔

فاخرہ نے بھی تو بس اتنا کہا تھا کہ بیٹا آ جاؤ، جب ہی وہ جانے کیا کیا قیاس کرتے ہوئے وہاں پہنچا تو سب بہت تباہی سے اس سے ملے۔ نورما کے ابو شکایت کرنے لگے کہ وہ باہر ہی سے کیوں چلا گیا۔ بہر حال ماحول بہت خوش گوار تھا۔ اماں اور حمیدہ بیگم بھی خوش نظر آ رہی تھیں۔ جس کا مطلب اس نے یہی لیا کہ انہیں یہ رشتہ پسند آیا ہے اور جب فاخرہ نے اس سے پوچھ کر ہائی بھری تو پھر طے یہ پایا کہ اگلے ہفتے اسی دن لڑکے والے ان کے یہاں چھوٹی سی رسم کرنے آئیں گے۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ وہ بہن کی ذمہ داری

سے احسن طریقے سے سبک دوش ہو جائے۔

☆☆☆

شہرینہ مسلسل پیلا کو چھیڑ رہی تھی۔

”پتا ہے اب فاخرہ چچی کیا کہہ رہی ہوں گی۔ کہہ رہی ہوں گی کہ میری بیٹی بہت سکھڑ ہے۔ سلائی کڑھائی میں طاق اور کھانا تو ایسا بانی ہے کہ انگلیاں چاٹنے رہ جاؤ۔“

”جی نہیں، اماں جھوٹ نہیں بولتیں۔“ پیلا کو بہت شرم آ رہی تھی۔

”ارے ایسے موقعوں پر سب چلتا ہے۔ وہ تو بول اس وقت کھلتے ہیں جب واسطہ پڑتا ہے۔“ شہرینہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی مچا کر پھر پوچھنے لگی۔ ”سچ بتاؤ تم کیا دعا کر رہی ہو۔“

”میں کوئی دعا نہیں کر رہی۔“

”اچھا، ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، وہ کیا چاہ رہا ہے۔“

”میرا دل چاہ رہا ہے تمہارے منہ پر شپ چپکا دوں۔ کس اب خدا کے لیے چپ ہو جاؤ ورنہ میں رونے لگوں گی۔“ پیلا واقعی رو رہی ہوئی۔

”ارے ارے خبردار جو رو میں تو خوشی کے موقع پر رونا اچھی بات نہیں ہوتی۔“ شہرینہ ٹوک کر بولی۔ ”چلو کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ تمہارے امتحان کب ہیں؟“

”پتا نہیں۔ تم بھائی کو فون کرو۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔“ پیلا نے اس خیال سے کہا کہ کم از کم حمزہ کے سامنے وہ اسے تنگ نہیں کرے گی۔

”کہاں چلے گئے، وہ امی اور چچی جان کے ساتھ ہے۔ کیوں تمہیں بھی جانا تھا۔“ شہرینہ پھر بے ساختہ بول گئی۔

”اف.....“ پیلا نے زور سے شہرینہ کے پہلو میں چٹکی کاٹی تو وہ کراہ کر بھی ہنستی چلی گئی۔ ”پاکل ہو گئی ہو تم۔ بھائی اماں کے ساتھ نہیں ہیں۔ انہوں نے جیسے مجھے یہاں چھوڑا ہے ویسے اماں اور تائی جان کو وہاں چھوڑ کر کہیں اور نکل گئے ہوں گے۔“ پیلا زچ ہو کر بولی گئی۔

”کہیں اور کیوں نکل گیا، واپس یہیں آ جاتا۔“

”نہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ تم فون کر کے بلاؤ انہیں۔“ پیلا نے اس کا سیل فون اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تو اس نے فوراً کال ملا دی اور جیسے ہی کال ریسیو ہوئی پوچھنے لگی۔

”حمزہ کہاں ہو تم؟“

”اماں کے ساتھ، کیوں؟“ حمزہ کی دھیمی آواز سے وہ سمجھ گئی۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ کب تک آؤ گے؟“

”پتا نہیں۔“

”اچھا یہ تو بتاؤ، کیا رہا؟“ اس کی بے صبری پر حمزہ یقیناً جھنجھلایا ہوگا جب ہی لائن کاٹ دی تھی۔

”عجیب آ دی ہے۔“ وہ موبائل پر ریپلا کوڈ کیمنے لگی۔

”کیا ہوا؟“ پیلا کچھ نہیں سمجھتی تھی۔

”موصوف تمہارے سرال بیٹھے ہیں اور ظاہر ہے امی اور چچی جان کے ساتھ ہی آئیں گے۔ یہ بھی نہیں بتایا کب آئیں گے تو اب ایسا کرتے ہیں ہم دونوں پیٹ پوجا کر لیتے ہیں کیونکہ وہ لوگ تو میرا خیال ہے کھانا کھا کر ہی آئیں گے۔“ وہ بڑے آرام سے بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو پیلا نے خاموشی سے اس کی اٹھید کی۔



”کچھ اسپیشل کھاؤ گی تو بتاؤ۔ بنا دیتی ہوں ورنہ تو کھانا رکھا ہے۔“ شہرینہ نے کچن میں داخل ہوتے ہی بیلا

سے پوچھا۔

”نہیں بس جور کھا ہے وہی کھالوں گی۔“ بیلا کہنے کے ساتھ پلٹیں اور روٹی کا ہاٹ پاٹ اٹھا کر لاؤنج میں چلی گئی تو وہ جلدی سے سالن گرم کر کے لے آئی۔

”پلو جلدی نکالو، بڑی بھوک لگی ہے۔“ اس نے سالن کی ڈش بیلا کے آگے رکھی تو بیلا نے پہلے اس کی پلیٹ میں سالن نکالا پھر اپنی پلیٹ میں ڈال کر پوچھنے لگی۔

”تم نے بنایا ہے؟“

”میں ہی بنائی ہوں بہن! کبھی کبھی امی کا موڈ ہوتا ہے تو کچن دیکھ لیتی ہیں۔ ویسے مجھے اچھا بھی نہیں لگتا۔ امی کام کریں اور میں بیٹھی رہوں۔“

”جب تمہاری شادی ہو جائے گی پھر؟“ بیلا نے سیدھے سادے انداز میں ٹوکا اور وہ ہنس کر بولی۔

”اسی لیے تو میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”ہمم.....“ بیلا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ صرف اس لیے کہ وہ پھر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

”ارے ہاں۔“ شہرینہ کو اچانک یاد آیا تھا۔ ”تمہیں پتا ہے خزینہ ملایشیا جا رہی ہے۔“

”اچھا، کب؟“ بیلا نے اشتیاق سے پوچھا۔

”اگلے ہفتے یا ہو سکتا ہے اس سے پہلے۔ بتا رہی تھی، آج پاسپورٹ کے لیے گئی تھی۔ ارجنٹ تین دن میں

مل جائے گا پھر دیکھو۔“

”ماشاء اللہ بہت اچھی قسمت ہے خزینہ آپ کی۔ غزنی بھائی بھی کتنے اچھے ہیں ناں۔“

”ہاں۔“

دونوں کھانے کے ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں پھر شہرینہ چائے بنا کر لے آئی تو وی آں آن کر دیا۔ ہر

جگہ اشتہاروں کی بھرمار تھی اور ابھی وہ کسی ایک چینل پر شہرینہ نہیں تھی کہ ڈور بیل بج اٹھی۔

”آگئے۔“ شہرینہ ریوٹ کنٹرول بیلا کی گود میں پھینک کر گیٹ کھولنے بھاگ گئی تو بیلا کی سمجھ میں نہیں آیا

کیا کرے، کہاں چھپے۔ وہ اماں اور بھائی کا سامنا کرنے سے شر مار رہی تھی۔ ٹی وی آف کر کے کمرے میں جانے

لگی تھی کہ سب آگئے۔

”تم دونوں نے کھانا کھایا؟“ حمیدہ بیگم نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

”جی امی! ابھی کھایا ہے اور آپ لوگ.....“

”ہمم بھی کھا کر آرہے ہیں۔ بہت اہتمام کر ڈالا تھا ان لوگوں نے۔ ارے فاخرہ! کھڑی کیوں ہو، بیٹھو

ناں۔“ حمیدہ بیگم اسے جواب دیتے فاخرہ سے مخاطب ہوئیں۔

”بس بھائی! اب چلتے ہیں۔ بہت دیر ہوگئی۔“

”جی تائی جان! مجھے گاڑی بھی واپس کرنی ہے پھر آئیں گے ان شاء اللہ۔“ حمزہ نے کہا تو حمیدہ بیگم نے

مزید اصرار نہیں کیا۔

”ٹھیک ہے بھابھی! پھر اگلے اتوار کو تیار رہیے گا اور صبح سے ہی آجائے گا۔“

فاخرہ کی بات سے شہرینہ نے سمجھ کر شرارت سے بیلا کو دیکھا پھر اپنی سمجھ کی تصدیق کے لیے حمزہ کو اشارہ کیا

تو حمزہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

خزینہ خاصی پوکھلائی ہوئی تھی۔ ابھی شرنیل کی شادی کی تحکین اتری نہیں تھی کہ اب ملایشیا جانے کی تیاری میں پکان ہو رہی تھی۔ گوکہ تیمور غزنی نے کہا بھی تھا کہ زیادہ کچھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے بس ایک بیگ میں دو تین سوٹ رکھ لیتا۔ ہائی کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو وہیں سے لے لی جائے گی لیکن اس کا کیونکہ پہلا بیرونی سفر تھا اس لیے وہ چاہہا رہی تھی کہ اسے وہاں کوئی پریشانی نہ ہو۔ چھوٹے چنڈ کیری میں وہ اپنی ضرورت کی ہر چیز رکھ لینا چاہتی تھی۔ ہر سوٹ کے ساتھ پیکنگ سینٹر کی جگہ بناتے ہوئے وہ خاصی جھنجھلا رہی تھی کہ حیدہ بیگم کی کال آگئی۔

”جی امی! السلام علیکم۔“ اس نے کال لیتے ہی سلام کیا۔  
 ”وعلیکم السلام۔“ میں نے سوچا تمہاری خیر خبر لے لوں۔ شرنیل کی شادی سے زیادہ تحکین تو نہیں ہوگئی۔“

ادھر اگر ماسکا کی محبت تھی تو ادھر بیٹی کی فرماں برداری۔  
 ”نہیں امی! کچھ زیادہ نہیں پھرا بھی تو آگے بھی سفر کرنا ہے۔ اسی کی تیاری میں لگی ہوں۔“  
 ”اس سے پہلے ایک اور تیاری کر لو۔ اس اتوار کو بیلا کی منگنی ہے۔“ حیدہ بیگم نے کہا تو وہ خوش گوار حیرت سے چلائی۔

”کیا..... بیلا کی منگنی۔“  
 ”ہاں بیٹا! کافی دنوں سے بات چل رہی تھی پھر کل میں اور فاخرہ لڑکے کو دیکھنے گئے تھے۔ ماشاء اللہ لڑکا بھی اچھا ہے اور گھرانہ بھی۔ پھر ہم نے وہیں بات چلی کر دی تو اتوار کو وہ لوگ رسم کرنے آئیں گے۔ تمہارے لیے خاص طور سے فاخرہ نے کہا ہے کہ خزینہ کو ضرور آنا ہے۔ وہ تمہیں فون کرے گی یا ہو سکتا ہے خود بلاوا دینے آجائے۔“ حیدہ بیگم بولے جا رہی تھیں۔

”اور ہاں سنو، یہ بالکل گھر کی بات ہے۔ تمہارے میاں کو بھی آنا ہے سمجھیں۔“  
 ”جی جی امی! سمجھ گئی۔ میں کہوں گی غزنی سے۔“ اس نے کہا تو حیدہ بیگم ٹوک کر بولیں۔  
 ”صرف کہنا نہیں ہے تمہیں ہر صورت اسے لے کر آنا ہے۔ ویسے بھی زیادہ لوگ نہیں ہوں گے، بس یہی گھر کے لوگ۔“

”اچھی بات ہے۔ آپ فکر نہ کریں، ہم ضرور آئیں گے۔“ اس نے ”ہم“ پر زور دیا پھر کہنے لگی۔ ”اور امی! اب آپ بھی دیر نہ کریں، بیلا کے ساتھ ہی شہرینہ کی بھی شادی کر دیں۔“  
 ”ہاں، تمہاری فاخرہ چیخ بھی کہہ رہی تھیں۔“

”بس ٹھیک ہے، میں ملایشیا سے ہو کر آ جاؤں پھر کرتے ہیں شادی کی تیاری۔“  
 ”ہاں بیٹا! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ خبر ہے جانا آنا ہو۔“ حیدہ بیگم نے دعادی۔  
 اس نے آئینہ کہا کہ کروں رکھ دیا اور ابھی وہیں بیٹھی بیلا کی منگنی سوچتے ہوئے محظوظ ہو رہی تھی کہ تیمور غزنی نے آ کر اسے چونکا دیا۔

”بیگم صاحبہ! کن خیالوں میں گم ہیں۔“ وہ مسکرانے لگی، بولی کچھ نہیں۔  
 ”اس کا مطلب ہے کوئی خوب صورت خیال ہے۔“ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔  
 ”خوب صورت بھی اور خوش کن بھی۔“ وہ جھنگٹائی۔

”ویری گڈ۔“ کیا اس کا تعلق مجھ سے ہے؟“ تیمور غزنی نے پوچھا تو وہ بے ساختہ ہنسی پھر کہنے لگی۔  
 ”نہیں۔ اصل میں ابھی امی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اتوار کو بیلا کی منگنی ہے اور میں یہی سوچ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ وہ تو ابھی اتنی چھوٹی ہے۔“  
 ”ہوں، سیدھی بھی ہے، معصوم سی۔“ تیمور غزنی تائید میں سر ہلانے لگا۔



”بہر حال ہمیں ضرور جانا ہے۔“ اس نے کہا تو تیمور غزنی ایک دم خاموش ہو گیا۔  
 ”سنا آپ نے، میں کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ کو بھی چلنا ہے۔ شریں کی شادی میں بھی آپ نہیں گئے۔  
 سب آپ کا بوجھ رہے تھے لیکن خیر وہ تو میں نے بات بنا دی تھی کہ آپ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں لیکن یہاں  
 ایسی کوئی بات نہیں بن سکتی کیونکہ یہ گھر کا معاملہ ہے۔ سمجھے آپ۔“ خزینہ کی اتنی لمبی بات کے جواب میں بھی وہ  
 کچھ نہیں بولا تو وہ منہ پھیر کر بولی۔

”ٹھیک ہے، میں بھی اب آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔“  
 ”کیوں، تم کیوں نہیں جاؤ گی؟“ یہ دھاندلی تھی۔ وہ بھی اڑ گئی۔  
 ”بس نہیں جاؤں گی۔“

”دیکھو، میری بات اور ہے۔ میں نے ابھی تک اپنی شادی شونہیں کی ہے اور نہ کر سکتا ہوں۔ اس لیے محتاط رہتا  
 ہوں۔ تقریبات میں کوئی نہ کوئی جانے والا مل ہی جاتا ہے۔“ وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ بول پڑی۔  
 ”یہاں کوئی آپ کا جاننے والا نہیں ملے گا کیونکہ صرف گھر کے لوگ ہوں گے اور آپ کیسے کہہ رہے ہیں  
 کہ ہماری شادی شونہیں ہوئی۔ میری ڈیلیوری پر آپ کی بہن آئی تھیں تو کیا انہوں نے آپ کے ماما، بابا کو نہیں  
 بتایا ہوگا کہ آپ نہ صرف شادی کر چکے بلکہ باپ بھی بن چکے ہیں۔“  
 ”یا اللہ، معاف کر دو بیوی۔“ تیمور غزنی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میری بہن نے کسی کو کچھ نہیں  
 بتایا۔ میں نے ان سے رازداری کا وعدہ لیا ہے۔“

”میں کچھ نہیں سمجھوں گی، جب تک آپ ہلا کی مگنی میں چلنے کی ہامی بلکہ وعدہ نہیں کریں گے۔“  
 ”چلوں گا بابا! چلوں گا۔ اب خوش ہو جاؤ۔“ تیمور غزنی نے کان پکڑ کر کہا اور وہ واقعی خوش ہو گئی۔

☆☆☆

ہیلا کالج آ کر پچھتا رہی تھی کہ نویرا مسلسل اپنے بھائی کا نام لے کر اسے چھیڑ رہی تھی۔ جیسے اس دن شہرینہ  
 نے اسے عاجز کیا تھا۔ اس کی ہر بات کے جواب میں نویرا شونہیں سے کہتی۔

”ہاں شامی بھائی بھی یہی کہتے ہیں۔“  
 ”اف.....“

ہیلا اتنی تنگ پڑی کہ آخری پیر یڈ گول کر کے کالج سے نکل آئی۔ اس کی کالج وین تو اپنے وقت پر ہی آئی  
 تھی اس لیے وہ بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ ایک گاڑی اس کے بالکل قریب آن  
 رکی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی کہ فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے پکارا گیا۔  
 ”ہیلا.....“

”آپ.....؟“ ربیکا کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔  
 ”آؤ بیٹو، میں تمہیں ہی لینے آئی ہوں۔“ ربیکا نے کہا تو اس نے نا سمجھی میں اپنی طرف اشارہ کیا۔  
 ”ہاں ہاں مجھے حمزہ نے بھیجا ہے۔ کہہ رہا تھا تمہیں پک کر لوں۔ جلدی بیٹھو دیر ہو رہی ہے۔“ ربیکا نے  
 غلبت کا مظاہرہ کیا اور وہ حمزہ کا نام سن کر بیٹھ گئی۔  
 ”حمزہ تمہیں میرے گھر سے لینے آئے گا۔“ ربیکا نے کہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر گاڑی فرارٹے  
 بھرنے لگی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆☆



# حکایت حاجی

سخت گرمی کا موسم لوگوں کو گھروں میں منہ چھپانے پر مجبور کر رہا تھا، اشد ضرورت کے تحت لوگ گھر سے نکلتے۔ بچکھوں، یو پی ایس، جنرل کاکام عروج پر پہنچا ہوا تھا اور کاشانہ حرم کے مین گھن چکر بنے ہوئے تھے خصوصاً فرزندانہ کے پاؤں تو پیسے بنے ہوئے تھے، نہ چلپاتی گرمی کا خوف سر پر سوار ہوانہ لوگنے کے ڈر سے قدم رکے اور قدم رکتے بھی تو کیسے۔ اکلوتی بیٹی کے فرض سے سبک دوش جوہری تھیں۔ لڑکا کا فرم میں اچھے عہدے پر تھا، یہ بڑا بنگلہ، کار، عزت، دولت، شکل و صورت سب ہی کچھ تھا۔ بالائی سی رنگت لیے ان کی نور حرم کی لکڑ کا، دونوں کی جوڑی خوب سجھی۔ خاندان کے دامادوں میں سب سے بڑھ کر میرا داماد ہوگا۔ لوگ رشک کریں گے میری نور حرم کی قسمت پر۔

انہوں نے رشتہ قبول کرنے میں ذرا تامل نہ کیا۔ محض بات پکی کرنے کے بعد شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

”یہ دیکھو کتنا خوب صورت ڈیزائن ہے سونے کے سیٹ کا، پورے پانچ تولے کا ہے، میری نور پر خوب سجے گا۔ اس کا تو رنگ بھی سونے جیسا ہے پہنے گی تو سب کی نظریں خیرہ ہو جائیں گی۔“ فرزندانہ نے محبت پاش نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا تو وہ دبے ہونٹوں سے مسکرا دی، گلابی گال شرمیلی مسکان سے دھک اٹھے۔

تائی جیلہ کی پیشانی پر اس وقت کئی متفکر لکیروں کا جال تھا، بہت سے لفظ زبان ادا کرنے کو

بے تاب ہو رہی تھی مگر فرزندانہ کی خوشی دیکھ کر وہ خاموشی ہو گئیں۔

”بچیس کے بچیس جوڑے کا مدار، ایک سے ایک جیتی، ساس کی سونے کی بالیاں، سرگرمی بیش قیمت گھڑی، ہندوں اور دلوڑوں کے براڈڈ سوٹ، لڑکے کی بھاری انگوٹھی، گھڑی سلائی میں موٹر سائیکل۔ کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی میں نے اپنی نور حرم کے جہیز میں۔ سسرال میں بڑی شان سے قدم رکھے گی، اونچا سر کر کے رہے گی، کسی کی بات سننے کو نہیں مل سکتی۔ واہ واہ ہوگی میری بیٹی کی پوری سسرال میں۔ اس کے ابا نے شہر کے سب سے مہنگے میرج ہال میں بنگ کروائی ہے۔ لوگ مدتوں یاد رکھیں گے کہ ہاں کسی کی شادی ایشیڈ کی تھی۔“

”اللہ نصیب اچھے کرے جو کچھ دے رہی ہو اسے پہننا، استعمال کرنا نصیب کرے۔“ جیلہ ان کی بولتی زبان کے آگے فقط یہی جملہ کہہ سکیں۔

”نصیب اچھے کیوں نہ ہوں گے؟ سب کچھ تو دے رہے ہیں بیٹی کو۔ کس چیز کی کمی چھوڑی ہے ہم نے۔“

انہوں نے بیٹی کے جہیز پر تفاخر سے طائرانہ نظر ڈالی جو گھر کے سامنے خالی پلاٹ میں شامیانے لگا کر سجایا گیا تھا۔

خواتین رشک و حسد کی نگاہوں سے ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہی تھیں۔ واقعی انہوں نے اپنی نازوں ملی نور حرم کے لیے جہیز میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ہر چیز تین تین طرح کی تھی۔

چاروں بھائی لاکھوں کا کاروبار کر رہے تھے، باپ کی واپڈا سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن الگ تھی، برسوں سے بیٹی کے جہیز کے لیے پیسہ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ رشتہ داروں محلے پڑوس میں جب بھی کسی لڑکی کی شادی ہوتی، فرزندانہ بڑی تنقیدی نگاہوں سے دیکھا کرتیں۔

جیلہ کو آج بھی اچھی طرح سے یاد تھا کہ ریتی کی بیٹی کا جہیز دیکھ کر فرزندانہ نے کیسی ناک بھوں چڑھا لی



جیلہ ان کی باتوں سے اکٹا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کہاں جارہی ہوا بھی ہے۔“

”بس بھانجھی گھر چلوں، طیب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے پوتے کا نام لیا۔

”بیٹھی رہو کھانا کھا کر جانا، اللہ بہتری کرے گا۔ طیب کو سنبھالنے والے گھر میں سب ہی موجود ہیں۔“ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر انہیں پھر سے بٹھالیا تو وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

نور حرم کا جھیز لے جانے کے لیے انہوں نے لڑکے والوں کو سہ پہر کا ٹائم دیا تھا مگر سہ پہر سے شام کے سائے پھیلنے لگے لیکن ان کی طرف سے کوئی شخص نہ پہنچا۔ بار بار فون کر کے انہیں جھیز اٹھانے کے لیے اصرار کیا تو ملازم لینے آئے۔ ملازموں کو دیکھ کے اس کے بھائیوں کو تپ چڑھ گئی۔ فرزانہ کا بھی خون کھول اٹھا۔ لاکھوں کی مالیت کا جھیز انہیں دے رہے تھے اور انہوں نے آکے دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔ فرزانہ نے سہن کو نورافون کھڑک دیا

”بہن ہمارے ہاں رشتہ داروں کی موجودگی میں دولہا کے کسی معتبر رشتہ دار کے حوالے جھیز کیا جاتا ہے۔ ملازموں کے حوالے کرنا ہماری توہین ہے۔“ وہ قدرے درشتی سے بولیں۔



تھی عورتوں کے کانوں میں کھسک پھسکی تھی۔

”دیکھ لینا ان چند برتنوں اور پچھے (بیڈ) کو دیکھ کر ساس تندیں کیسے طعنے دیں گی، دن رات جگر چھلکی کیا کریں گی، آٹھ آٹھ آنسو روٹی بیٹی سیکے کا رخ کیا کرے گی۔“

کسی عورت کے کان میں کی گئی بلند سرگوشی پر رقیہ دل موس کر رہ گئیں، وہ بھی کیا کرتیں اپنی بیٹی کو ضرورت کی چند اشیاء اور فرنیچر کے نام پر فقط بید اور سنگار میز ہی تھی دینے کو۔ مزدور باپ کنبے کا پیٹ بھرتا یا بیٹی کے دان کی تیاری۔

وہ تو شکر ہے کہ رقیہ کے سہ ہیانے والے بھلے مانس لوگ تھے انہیں بہو کے جھیز سے زیادہ بہو کے اخلاق و سلیقے سے لگاؤ تھا اس لیے وہ جب بھی میکے آئی کھلکھلائی آئی۔

”سب دکھاوے کی کھوکھلی ہنسی ہے ورنہ میں جانتی ہوں کہ ساس نندوں کے طعنوں سے اندر سے کیسی رخم رخم ہے۔“ خود ساختہ قیافے لگانے میں فرزانہ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کی اس عادت کے سبب سب ہی پیٹھ پیچھے کہا کرتے تھے کہ ہاں دیکھیں گے اپنی بیٹی کو کیا کچھ دنیا کی نعمتیں دان کرتی ہیں اور واقعی دنیا نے دیکھا تھا کہ انہوں نے دنیا جہان کا سامان بیٹی کے لیے اکٹھا کر لیا تھا۔

”صوفیہ کھانا تو تیار ہے ناں؟ وہ لوگ جھیز لینے کے لیے پہنچنے ہی والے ہیں۔“ انہوں نے قریب سے گزرتی بہو کو مخاطب کیا۔

”جی امی ہر چیز تیار ہے آپ بالکل بے فکر رہیں، بس آتے ہی کھانا سرو کر دیں گے۔“

”بھئی میں نے تو آج کے دن بھی لڑکے والوں کے لیے کھانے کا اعلان کیا ہے۔ بیٹی کے سسرال کے پیٹوں میں جب تک تر توالے رہیں ان کی زبان شکوؤں سے خالی رہتی ہے۔ یوں سمجھو زبان کا ڈالفتہ بہو کی خامیوں کو زبان پر نہیں لاتا۔“ وہ اپنی عادت کے سبب اپنی تعریفوں کے پلے باندھ رہی تھیں۔



بھائیوں کے کندھے جھکتے دکھائی دیتے ہیں۔“ خالہ  
ثریا بچے دل کے ساتھ بولیں تو ممانی فریدہ نے بھی  
ان کی تائید میں گردن ہلائی۔

☆☆☆

نور حرم بچے دل کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو  
سامنے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ماں کے دل کو دھکا  
ساگنا۔ جلدی سے کھڑے ہو کر بیٹی کو گلے لگایا، داد  
کی تلاش میں لگا ہیں دوڑائیں۔

”اٹھر کہاں رہ گیا؟“

”وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں انہیں ضروری  
کام تھا۔“

لگا ہیں چرا کر ماں کو جواب دیا اور جھپٹے کو گود  
میں اٹھا کر پکار کر نہ لگی۔

بھابھیاں ایک دوسرے کو آنکھوں میں اشارہ  
کرتی کچن کی سمت چل دیں کہ آخر اکلوتی نندے  
میکے میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ خاطر داری بھی اسی  
حاب سے ہوئی چاہیے تھی۔

رات کو کھانے کی میز پر اٹھر کا انتظار نور حرم  
سمیت ہر شخص نے کیا مگر بقول اس کے، اسے  
ضروری کام تھا۔ بھائیوں کی آنکھوں میں ناگواری  
اور ماں کی آنکھوں میں فکر مندی کی جھلک اس نے  
واضح دیکھی تھی مگر اس کی آنکھوں کی نمی سب سے  
پوشیدہ رہی اور یہی بڑھتے بڑھتے جب آنسوؤں کی  
شکل اختیار کر گئی تو فرزانہ زلزلوں کی زد میں آ گئیں۔

”آخر تم مجھے بتاتی کیوں نہیں؟ کیا پریشانی  
ہے تمہیں؟ اٹھر کا رویہ مجھے تمہارے ساتھ کچھ  
مناسب نہیں لگ رہا۔ نیا تو لا دو لہذا اپنی چند مہینوں کی  
دلہن کے ساتھ ایسا خشک رویہ رکھتا ہے، تمہیں یہاں  
چھوڑ کر ایک فون تک کرنا گوارا نہیں کرتا۔ تمہارے ابا  
اور بھائی گیٹ پر سے اسے زبردستی اندر لاتے ہیں۔

ڈھیروں ڈھنسا اس کے لیے بتائی جاتی ہیں اور  
وہ انہیں ایسی نزاکت سے چمکتا ہے مبادا زہری نہ ملا  
دیا ہو، سرال والوں سے مسکرا کر دو بول بولنے پر  
وہ راضی نہیں، اپنے سرال میں تم نہیں آنے

لڑکے کی ماں نے محل سے ان کا کڑوا لہجہ  
برداشت کیا اور ڈرائیور کے ساتھ خود بہن کو لے کر  
ان کے ہاں پہنچ گئیں۔ وہاں موجود سامان دیکھ کر وہ  
متحیر رہ گئیں۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی  
طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں راز و نیاز  
ہوئے۔

”فرزانہ بہن! اس سب کی کیا ضرورت تھی،  
ہمارے لڑکے کے پاس جب گاڑی ہے تو موٹر  
سائیکل کا تکلف کیوں کیا آپ نے؟ اللہ کا دیا  
ہمارے گھر میں کبھی کچھ موجود ہے، ہمیں فقط آپ کی  
بیٹی چاہیے تھی یہ سب فضول رسمیں ہیں آپ نے ناحق  
انتا پیسہ برباد کیا۔“

”ارے کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ برادری  
میں بیٹھے ہیں، چار لوگوں میں عزت ہے ہماری اور  
پھر بیٹی کو خالی ہاتھ تھوڑی رخصت کیا جاتا ہے یہ سب  
اس کا نصیب ہے۔“

فرزانہ کی بات سن کر انہوں نے چپ سا دھ  
لی۔ کھانا انہوں نے برائے نام بھی نہ چکھا کہ  
لڑکے کی ماں کو رات کو کھانے کی عادت نہ تھی اور خالہ  
پرہیز کی کھانا کھاتی تھیں۔ فرزانہ کو تاؤ تو بہت آیا مگر  
ضبط کر گئیں۔ ناچار کھانا ڈبوں میں پیک کر کے ان  
کے ملازموں کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

بہترین ہوٹل میں کھانے کا اعلیٰ انتظام۔  
بارات کا پر تھاک استقبال۔ کسی بھی چیز میں  
ڈھونڈے سے چھی کوئی کمی نہ ملتی تھی، محلہ رشتہ دار  
دوست احباب سب ہی کی زبانیں بند تھیں۔ کسی کو  
کچھ کہنے کا موقع نہ ملا

”ہاں بھی سب پیسے کے کھیل ہیں۔ اکلوتی  
بیٹی، چار بھائی کمانے والے، باپ کی چٹن اگ۔  
بیٹی کو جتنا بھی دیتے کم تھا۔ فکر تو ہم جیسوں کو ہے،  
جوڑ تو ذکر کے ایک بیٹی کو پار لگاتے ہیں تو دوسری کی  
فکر ستانے آ جاتی ہے۔ جیسے تیسے دو کا بوجھ سر سے  
اترا تو ابھی باقی دو کے جھیر کی تیاری میں باپ



دیتیں۔ چلے بھی جاؤ تو ڈرائنگ روم سے آگے کا راستہ نہیں دیکھا ہم نے۔ آخر معاملہ کیا ہے؟ تم مجھے سیدھی طرح بات بتاؤ۔“

ماں نے آج اس سے اگلوانے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس نے بھی جیسے حلق میں پھنسے آنسوؤں کے پھندے کو رہائی دے دی۔

”وجہ بس اتنی ہی ہے کہ وہ نیا نوایلا دولہا نہیں ہے۔“ کیا مطلب.....؟“ فرزانہ کی سانس اٹک گئی۔

”ہاں امی! آپ نے میرے جہیز کا سامان اکٹھا کرنے میں دن رات ایک کرو یا، بھائیوں کی، ابا کی جمع پونجی لٹا دی، ہر چیز جانچ پڑتال سے اعلا و عمدہ خریدی۔ مگر نئی کارڈ دیکھ دیکھ کر اشیاء خرید گئیں۔ فرنیچر کی عمدہ لکڑی کا انتخاب کیا کہ دیر پا چلے، لکھن نہ لگ جائے۔ مگر جس سے بیٹی کا نصیب جزا تھا اس کے بارے میں کوئی چھان بین نہ کی۔ اس کی ظاہری

چمک، شان و شوکت پر مرمیں۔ آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ جس سے میری بیٹی کی خوشیاں وابستہ ہو رہی ہیں یہ تو یقین کر لوں کہ وہ میری نور حرم کو خوش بھی رکھ سکے گا یا نہیں؟ آپ نے داماد کے معاملے میں ایک ایسی خوب صورت ٹھوکی لکڑی کا انتخاب کیا ہے جو آپ کی بیٹی کو لکھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔“

نور حرم نے بے آواز آنسوؤں سے روتے ہوئے سرماں کی گود میں رکھ دیا اور فرزانہ کی یہ سب سن کر حالت دگرگوں ہو گئی۔ سینے میں اٹکا سانس بشکل بحال کیا۔ کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے مگر بیٹی کے دکھ نے آواز سلب کر لی۔ آنسوؤں میں بیٹی کا دامن تیزی سے بھگور رہے تھے۔

”امی اطہر کی تین برس قبل پسند کی شادی ہوئی تھی۔ ایک حادثے میں اس کی بیوی مفلوج ہو گئی۔ اسے اپنی بیوی سے عشق ہے اور اس کا بھی عشق مجھے اس گھر میں نوکرانی بنا کر لے گیا ہاں امی میں اس کی پہلی بیوی کی خدمت گار ہوں۔ اس کی بیوی کی خدمت کے عوض مجھے اچھا کھانے، پہننے اور جتنے کو دیا

جاتا ہے۔ اطہر نے ماں کی خواہش پر مجھ سے شادی تو کر لی ہے مگر میرا چہرہ میرے شوہر کی محبت و ستائش نظروں سے محروم ہے۔ کاش آپ مجھے کچھ نہ دیتیں مگر اچھے نصیب کی دعا دیتیں۔ آپ نے ہمیشہ اچھا مال دینے کی سوچی مگر میرے نصیب کا فیصلہ کرنے میں ذرا سوچ بچار سے کام نہ لیا۔“ اس نے ماں کا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ فرزانہ تڑپ اٹھیں۔

”تیرے نصیب کو ابھی کچھ نہیں ہوا۔ اس دوہا جو (دوسری شادی والا) سے تو دیکھنا میں کیسے بنتی ہوں۔ کل ہی فیصلہ لیتی ہوں میں تیرا اس سے۔“ ان کی آنکھوں میں حتی فیصلے کی جھلک بھگورے لے رہی تھی۔

”نہیں امی! وہ اگر دوہا جو ہے تو اب آپ کی نور حرم بھی اسی فہرست میں آئے گی۔ اگر میں اطہر سے طلاق لے بھی لوں تو آپ کی بیٹی وہ پیوند زدہ کپڑا ہوگی جسے کوئی بھی چاہ سے لینا پسند نہیں کرتا۔ ایسا پیوند زدہ کپڑا جسے گھر میں رف کپڑے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے مگر کسی فنکشن میں پہننے کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ میرے لیے کسی کنوارے لڑکے کا خواب محض آپ کی خام خیالی ہوگی اور اب مجھے دوبارہ کسی رنڈو بے طلاق یافتہ یا اولاد کی خاطر شادی کرنے والے شخص کی بیوی بننا منظور نہیں۔“

”مگر.....“ فرزانہ نے صدمے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”امی کچھ سزائیں اپنے حصے کی ہوتی ہیں اور کچھ ماں باپ کے حصے کی اور مجھے اپنی ماں کے حصے کی سزا ہر حال میں کاٹنی ہے۔“

آنسو صاف کر کے ہاتھ چھڑا کر وہ تیزی سے باہر گھٹ کی طرف لپٹی تھی جہاں اطہر کی گاڑی کا پارکنگ سلسلہ بند رہا تھا اور فرزانہ منوں بوجھ لیے وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔

☆☆



# زندگی کے رنگ

میں جانتا تھا وہ ایک بل بھی امی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مجھے امی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ بوکھلا گئے۔

”ارے رک۔ ورنہ میں وہ چار لفظ بول دوں گا۔“ اسے سانس میں کہہ گئے۔

”کون سے چار لفظ اچھا وہ؟“ ثریا مجھے تم سے محبت ہے۔“ آپ بھول رہے ہیں یہ چار نہیں چھ لفظ ہیں۔“ دل ہی دل میں ہنستے میں نے سچ کی۔ امی اس سچویشن میں بھی شرما گئیں۔ ابو ہنٹائے۔

”یہ ہے تمہاری ناخجاری اولاد۔“ لہجہ سخت کیا۔ روئے سخن امی کی جانب تھا یعنی اسکیم سے پیچھے ہٹنے پر تیار نہ تھے۔

”بس کر دیں ابو۔ ان ڈاکٹر گز سے کچھ نہیں ہونے والا۔ اور یہ کوئی جہیز میں مجھے نہیں لائیں۔ اس لیے یہ سیاسی حملے کرنا بند کر دیں۔“ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا میں قطعاً متاثر نہیں ہو پایا۔

”اف۔ اولاد کو دوستوں کی طرح پالتا ہی پاؤں پر کھپاڑی مارنے کے مترادف ہے۔“ دانت پیستے انہوں نے خود کلامی کی۔ جو میں نے باآسانی سن لی مگر سر سے مس نہ ہوا۔

”دیکھیں ابو! اب میں جوان ہو گیا ہوں۔ اب یہ زور بردستی مجھ پر نہیں چلے گی آخر میری زندگی کے فیصلوں پر میرا بھی کچھ حق ہے۔ اور ہاں میری بھولی بھالی امی کو پریشان نہ کریں۔“ میں مزے سے کہتا کمرے سے نکل گیا جبکہ ابو بیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

ایک منٹ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ ابو

دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پھنسائے ان پر ٹھوڑی ٹکائے، کرسی پر آگے ہو کر بیٹھا میں بڑے انتہاک سے ابو کو تنک رہا تھا جو اپنی آواز میں رعب پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے مجھے اپنا فیصلہ سنار ہے تھے۔ ان کی تقریر ختم ہوتے ہی میں اطمینان سے سیدھا ہوا۔

”بس پھر میں عظیم کو فون کر دیتا ہوں۔“ میری خاموشی کو انہوں نے غلط رنگ دیا اور خوش ہوتے ہوئے موبائل اٹھایا۔

”مجھے آپ کے فیصلے سے انکار ہے اور اگر مجھے مجبور کیا گیا تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ میں نے بڑھک ماری۔ اس سے پہلے کہ جذباتی بلیک میلنگ شروع ہو جاتی۔ ابو نے سنجیدگی سے اپنی زوجہ یعنی میری امی کو دیکھا پھر بے نیازی سے بولے۔

”ہاں تو چلے جاؤ۔“ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ اگھوٹی اولاد ہے ہماری۔“ میرے قریب پہنچی امی کی آواز بھگ گئی۔ ”خبردار جو تم کچھ بولیں۔ ورنہ تم بھی اس کے ساتھ چلی جاؤ۔“ ابو نے لہجہ سخت کیا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ سازش کی بوسہ بھتی تاک سڑ گئی اور لمحے کے ہزاروں حصے میں مجھ پر ادراک ہوا کہ جذباتی بلیک میلنگ چھوڑ کر دونوں نئی اسکیم بنا چکے ہیں۔ مگر دونوں اکثر بھول جاتے ہیں کہ میں بھی ان ہی کی اولاد ہوں یعنی ان سے دوہا تھا گئے۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ میں امی کو بھی ساتھ لے جاؤں گا جب آپ کو ان کی قدر نہیں۔ چلیں امی۔“



کالے پانی کی سزایا کسی ناکرہ جرم کی پاداش میں  
جیل کاٹا کیونکہ ماں باپ کی تمام تر توجہ کا محور اگونی  
اولاد ہوتی ہے۔ اب ہلکی سی ٹھنڈ لگ جائے تو دل  
میں غموں کے خدشہ جاگ اٹھتا ہے اور اگر  
خدا ناخواستہ بیمار پڑ جائے تو پوچھیں مت، ہر شے اولاد  
کی دشمن لگنے لگتی ہے اور اسی حساب سے بہت سے  
پایندیاں لگادی جاتی ہیں جو ہماری بہتری کے لیے

میری شادی اپنے دوست کی بیٹی سے کروانا چاہتے  
ہیں اور میں اس شادی کو رد کرنے کے لیے ان کے فیصلے  
سے انکار کر رہا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو اپنے ذہن کی  
سلیٹ کو کچھ دیر کے لیے بالکل صاف کر لیں۔ کیونکہ  
میری کہانی تھوڑی مختلف ہے۔

میں ”غموں“ مستقیم، اپنے ماں باپ کا اکلوتا چشم  
و چراغ ہوں۔ اور یقیناً ماںیں اکلوتا ہونا ایسا ہے جیسے





ہوتی ہیں۔ زندگی کا ہر چھوٹا بڑا فیصلہ کرنے کا اختیار بھی ہمارے ماں باپ کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن ابھی آپ جان ہی چکے ہیں کہ میں کسی قدر باغی واقع ہوا ہوں۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ دو مہینوں کی بھرپور کوشش کے بعد مجھے ایک نوکری ملی ہے۔ نوکری کوئی اتنی اچھی بھی نہیں مگر مناسب ہے اور میں اس پر خوش کہ ملی تو۔ خیر مسئلہ یہ ہے کہ نوکری کے لیے مجھے دوسرے شہر جانا پڑ رہا ہے۔ لچکی ہٹ کے بعد ای ابو مان تو گئے ہیں پر ابو بھند ہیں کہ میں ان کے رشتہ داروں کے ہاں ٹھہروں، وہی میرے اکیلے رہنے کا خوف جیسے کسی بچے کے میلے میں کھوجانے کا ڈر ہو۔ پر میں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر پرائیویسی بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ کچھ سمجھے آپ؟

☆☆☆

آنکھوں میں خواہش اور امیدوں کے محل تعمیر کیے میں ملتان پہنچ گیا۔ ٹرین سے اترتے ہی یوں محسوس ہوا گویا تندو میں اتر گیا ہوں۔ ملتان کی گرمی الامان، بھٹڑ سے جگہ بنانا گھرے گھرے سانس لیتا میں بشکل مطلوبہ پتے پر پہنچا۔ پرانی طرز پر بنا ہوٹل جس کی خستہ حالی دیکھ کر مجھے وہ چند سانسوں کا مہمان لگا۔ اپنے دوست پر بھی تاؤ آیا جس نے اس ہوٹل کا انتخاب کیا تھا۔ مجبوراً اسی جگہ کو قبول کرنا پڑا۔

آخر اتنی شدید گرمی میں اور کہاں پھرنا وہ بھی ایک اجنبی شہر میں۔ ابو کو پہلے ہی منع کر چکا تھا کہ اپنے رشتہ داروں کو میری آمد کی اطلاع ہرگز نہ دیں۔ حسب توقع کمرے کی حالت خاصی خندوش تھی۔ چھوٹا سا سیم زدہ کمرہ، اس پر چڑیا جتنی کھڑکی جسے کھولنے سے گرم لوسیدی منہ پر پڑی تو ہوش ٹھکانے آگئے۔ اپنا کھر، اپنا کمرہ یاد آ گیا۔ کچھ دیر بعد یادوں کا دامن چھڑاتا۔ مٹی سوچوں کو جھٹکتا میں نہانے ٹھس گیا۔ نہا کر نکلا تو کچھ طبیعت بجال ہوئی۔

امی نے کھانے کا جوشن برپا کیا تھا وہ میں ٹرین میں ہی کھا چکا تھا اس لیے اب چار پانی پر لیٹ گیا۔ سچھے

کی گونگڑ زیادہ تھی مگر میں پر امید تھا کہ جلد کوئی اچھی جگہ دیکھ کر نیا کمرہ لے لوں گا۔ اب میں کوئی بہت امیر تو تھا نہیں کہ اسی وقت ہوٹل منتقل ہو جاتا۔ مجھے اپنی جیب کی بھی فکر تھی جس میں مشکل سے چند ہزار روپے تھے۔

☆☆☆

اگلے روز میں دفتر میں حاضری دیے پہنچ گیا۔ لوگ اچھے تھے۔ کام سمجھنے میں بھی کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک موسم کی ختمی تھی جس نے بولائے رکھا۔

دوپہر کو واپس پہنچا تو نہ بجلی تھی نہ پانی۔ سینے میں شرابور، چار پانی پر چت لینا میں تین گھنٹوں تک قسمت کی اس منظر نگینی پر ماتم کرتا رہا۔ سنا تو یہی تھا کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے (جانے وہ کون خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں) خیر غصے کو حسرت سے تکتا، ساتھ والے کمرے سے آتی پستو گانے کی آوازیں سننے میں نے وہ وقت گزاری لیا۔ بجلی کو نہ آتا تھا نہ آئی۔ اس پر لعنت بھیجتا میں شام کو باہر نکل گیا۔ جلدی میں موبائل بھی بھول گیا۔ مجھے کون سا کسی کو فون کرتا تھا۔

اطمینان سے پھرتا پھراتا، ڈھابے پر کھانا کھا کر ساتھ میزے دار چائے پی کر واپس لوٹا تو بری خبر میری منتظر تھی۔ میرے کپڑوں اور موبائل سمیت ساری چیزیں غائب تھیں۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد صدمہ کم ہوا تو جب میں ہاتھ ڈالا۔ یہ کیا جیب بھی خالی تھی۔ یعنی اس پر بھی کوئی چور اچکا تھا صاف کر گیا۔ ذہن میں پارک کے فوارے کے ساتھ کمر ٹپک کر آنکھ لگانا یاد آیا تو اپنی مشکل پر ماتم کرنے کا دل چاہا۔ پریشان سا اٹھ کر ساتھ والے پتھان بھائی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ جمائیاں لیتا نمودار ہوا۔

”اس ٹیم کیا مسئلہ ہے مڑا۔“ میرا مسئلہ سن کر اس نے دانت نکالے۔

”مڑا ہمارا سامان بھی چار دفعہ چوری ہو چکی ہے۔ ہمارا شک تو مالک پر ہے۔“ آنکھ دبا کر کہا۔



”تو جبکہ کیوں نہیں بدلی بھائی۔“ میں حیران ہوا۔

”خرچا میرا باپ پورا کرے گی۔ دوسری شہر میں غربت کے ساتھ رہنا آسان نہیں لالے۔“  
”اچھا فون دے دو، مہربانی ہوگی بھائی۔“ میں نے ہلکی لہجے میں کہا۔ اس صورت حال میں ابو کو فون کرنا ہی بہتر آپشن لگا۔ وہی اکلوتے ہونے کی نشانی۔ پریشانی میں فوراً ہر بات ماں باپ کے سامنے اگل دیتا۔ ساری بات سن کر پہلے تو وہ خوب ہنسے۔ پھر طنز کے تیر چلائے جو بحالت مجبوری مجھے چپ چاپ سننے پڑے۔ ہمارا تعلق مڈل کلاس سے ضرور تھا مگر حالات کافی اچھے تھے۔ ابو کی تنخواہ میں ہمارا گزرا بغیر دخوی ہوتا آیا تھا۔ مگر چونکہ میں بغاوت کر کے یہاں آیا تھا اور ابو کے فیصلے سے انکار کر چکا تھا تو انہوں نے بھی اپنی نئی انکیم کے تحت مجھے ہر قسم کی امداد دینے سے انکار کر دیا اور اب بلاچوں وچرا۔ میں ان کا فیصلہ ماننے پر تیار تھا۔ یوں بھی اس خستہ حال ہوٹل میں رہنے سے اچھا تھا کہ میں ان کے رشتہ داروں کے گھر رہ لیتا۔

☆☆☆

صبح میں دفتر جانے کے لیے اٹھ گیا۔ کل والے جلسے میں دفتر جانے کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ کمرے سے نکلنے لگا تو عظیم بچا آگئے۔ بڑے پر تپاک انداز میں مجھی ڈال کر ملے۔ ساتھ میں شکایت بھی کی کہ ان کے گھر کے ہوتے میں یہاں دھکے کیوں کھا رہا ہوں جو ابائے میں بولنے کی کوشش کی مگر ان کی زبان کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ اپنی باری کے انتظار میں وہ الفاظ ہی بھول جاتا جو مجھے بولنے تھے۔ وہ تو شاید مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے جاتے مگر میں نے بمشکل انہیں باقاعدہ ہاتھ تمام کر اپنی دفتری مجبوری کا بتایا۔ ادبہ ہوں، ہاتھ فرط محبت میں نہیں بلکہ ان کے لبوں سے ابھرتے قہروں کو روکنے کے لیے تھا مگر پڑا درد وہ مجھے گاڑی میں ڈال کر ہی دم لیتے۔ خیر ان سے کسی طرح جان

چھڑا کر میں دفتر روانہ ہوا۔ ان کے آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ابو کی طرف سے مجھے کچھ رقم دے گئے جس کی مجھے اشد ضرورت تھی۔

دفتر سے فارغ ہو کر میں کچھ خریداری کرنے بازار چلا گیا۔ پھر عظیم منزل پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ عظیم منزل کی پرانی مگر پروقاری عمارت دیکھ کر میں کچھ مطمئن ہوا۔ دروازے پر ایک لڑکا مل گیا۔ میرے تعارف کروانے پر فوراً پہچان گیا۔

”موسیٰ بھائی۔ آئے آئے، صبح ابانے بتایا تھا آپ کی آمد کے بارے میں۔“ وہ مجھے لیے اندر کی جانب چل دیا۔ میں نے چند لمحوں میں اطراف کا جائزہ لے لیا۔ چھوٹا سا محن، کپے فرش کا برآمدہ اور دائیں طرف اوپر کو جانی سیڑھیاں جن کے نیچے غالباً اسٹور تھا۔ برآمدے سے گزرتے ہم اندرونی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ سامنے کشادہ سا ہال کمرہ تھا۔

”اباں موسیٰ بھائی آئے ہیں۔“ اونچے سے تخت پر بیٹھی زبیدہ خاتون کو مخاطب کیا تو وہ جو ہاتھ میں پکڑی سوئی میں دھاگہ ڈال رہی تھیں۔ ہاتھ روکتی متوجہ ہوئیں۔ ناک پر دھرا چشمہ آگے کو کر کے پوری آنکھیں نکال کر میرا جائزہ لیا تو میں جوان جہان ہو کر کبھی کچھ گھبرا گیا۔ میرے سلام کا جواب دیتے، تھکے تیروں سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ اپنا سامان نیچے رکھتا میں تخت کے ساتھ کبھی کبھی گری پر بیٹھ گیا۔ اور وہ لڑکا رضوان جو مجھے اندر لایا تھا وہ اپنے بیٹھ جانے کا بتاتا تاڑ پھو ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر زبیدہ خاتون کو دیکھا، فی الحال میں ان ہی کے رحم و کرم پر تھا۔ مگر انہوں نے میرا بھی مسکراتا کو اماند کیا۔

”مستقیم اور شیا کے بیٹے ہوتا۔“ انہوں نے گویا تصدیق کرنی چاہی۔  
”جی۔“

”اتنے سالوں میں مستقیم کو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ عظیم منزل میں جھانک ہی لیتا۔ اب تم آئے ہو تو ہو سکتا ہے اسے بھی اپنے تایا زاد کی یاد آئی



بہو نمودار ہوئی۔ گود میں بچی اٹھائے وہ بے حال سی چہل کھیتی تخت تک آئی۔  
 ”اماں دیکھیں نامنی دوائی نہیں پی رہی۔“  
 رو دکھنے لہجے میں بولی وہ زبیدہ خاتون کے قریب بیٹھ گئی۔

”منی نے کیوں شور ڈالا ہوا ہے؟“ ایک اور لڑکی آکر صوفے پر تک گئی۔ ہاتھ میں پکڑی نیل پالش کھول کر ہاتھ کی انگلیوں پر لگانے لگی۔ بڑی بہو نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔  
 ”دوائی روک میں خود بلاؤں گی۔“ زبیدہ خاتون نے منی کو زبردستی کھینچ کر اپنی گود میں ڈالنا چاہا جس پر منی احتجاجاً اپنی ماں کا دو ہاتھ سے مزید رونے لگی۔  
 ”دوائی تو کمرے میں رہ گئی۔“

”جاہا! دوائی لے آ۔“ زبیدہ خاتون نے منی کو بالآخر اپنے قبضے میں کر لیا، ساتھ میں بیٹی کو مخاطب کیا۔

”اماں میری نیل پالش خراب ہو جائے گی۔“ اپنی انگلیوں کو نزاکت سے حرکت دیتی وہ قطعاً ہٹنے کے سوڈ میں نہیں تھی۔ اس پر گھوڑی ڈال کر چھوٹی بہو کو دوائی کے لیے دوڑایا۔ دوائی کی بوتل دیکھتے ہی منی نے جو حلق پھاڑ کر رونا شروع کیا تو زبیدہ خاتون اسے قابو کرنے میں ہلکان ہو گئیں۔ اسی وقت اجمل اور امل صاحبان نے انٹری ماری۔

”ارے، ارے کیا ہو گیا منی کو؟“  
 ”دوائی نہیں لے رہی۔“ انہیں مطلع کرتی بڑی بہو خود بھی میدان میں کود پڑی۔ پھر کیا تھا۔ وہ دونوں مرد کے بچے بھی اپنی شرٹ کے بازو پیچھے کرتے آگے بڑھے گویا کسی پہلوان کو پچھاڑنا ہو۔ زبیدہ خاتون کی گود میں لیٹی منی جس کا آدھا ہڑ نیچے لٹک رہا تھا۔ ایک ٹانگ بڑی بہو کے ہاتھ میں بھی تو بقیہ جسے اجمل اکمل نے قابو کر لیے۔ غرض منی پوری کی پوری جکڑی گئی۔ بس ایک اس کا کھلا ہوا منہ تھا جس پر کوئی ہاتھ رکھ دیتا تو ماحول کچھ پرسکون ہو جاتا۔ خیر کسی نے کسی طرح چھوٹی بہو نے دوائی منی کے حلق

جائے۔“  
 ”ہاں ملتان تو جیسے ابو کے دفتر کے راستے میں پڑتا ہے کہ روز آتے جاتے ان کے در پر ہاتھ ٹیکنا ضروری تھا۔“ اپنے اندر کی آواز کو دہانے میں خاموش رہا۔

”خیر ثریا کا کیا حال ہے؟ گھر سنبھالنے کا ڈھنگ، سلیقہ آیا کچھ یا ابھی تک وہ پہلا سا حال ہے۔ جب بیاہ کر آئی تھی تو سرائی میں ڈوٹی تک ہلائی نہیں آئی تھی اور شاباش ہے مستقیم پر جو ہر وقت اسے ہتھیلی پر چھالنا بنائے کھوتا تھا۔ ایسی بھی کیا زن مریدی۔“ ان کے ہاتھ ہلا کر طنزیہ انداز میں بولنے پر میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر مجھے کیا رومل دینا چاہیے مگر اس گھر میں شاید دوسرے بندے کو موقع دینے کا رواج نہیں تھا۔

”بڑی بہو سے کبھی ہوں جائے بنادے، تھکے ہوئے لگتے ہو۔“ بالآخر ان کو میری دھوپ سے کملائی ہوئی شکل پر ترس آ ہی گیا۔ اسی وقت بڑی بہو دو بچوں کے ساتھ اندر آئی۔  
 ”تک کر بڑھائی کرو اب بہت ہو گیا تماشہ۔“  
 نظر نہ آؤ دھڑا دھڑ کھومتے۔“ بے صوفے پر پختی وہ ان کو بھڑا رہی تھی۔

”بڑی بہو چائے بنا دو یہ موسیٰ آیا ہے۔ رشتہ دار ہے عظیم صاحب کا۔“

”اچھا اچھا ابانے ذکر کیا تھا۔ ٹھیک ہو بھیا۔“  
 بے سے بچوں کی کایاں نکالتے بڑی بہو نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ مڑ کر اپنے سینے کو ایک ہاتھ جڑ گئی۔ ”پینسلوں کی دکان نہیں ڈال رکھی تمہارے ابانے جو توڑ دو گے تو نی آجائے گی۔“ پھر وہ مڑی۔

”جب تک ان کے سر پر نہ بیٹھو مجال ہے جو کام کر لیں۔“

”چھوٹی بہو سے کہو چائے رکھ دے۔ اجمل، اکمل بھی آتے ہوں گے۔“ زبیدہ خاتون کے کہنے کی دیر بھی بچے کے رونے کی آواز کے ساتھ چھوٹی



میں نہ ہوتا ہوگا۔ خیر اب آپ کو اندازہ ہوا کہ کن مشکلات کا سامنا ہے مجھے۔ روز رات کو بستر پر لیٹتے ہی دل چاہتا کہ سب چھوڑ چھاڑ کر اسے شہر سیدھا روں پر روزی کمانے کے لیے خواری تو سہی پڑتی ہے۔

☆☆☆

”زندگی ایک سفر ہے سہانا، یہاں کل کیا ہو کس نے جانا۔“ مزے سے گفتگو میں پاپ سے پانی اچھالتا، رگڑ رگڑ کر پانی بائیک دھور پاتا تھا جو بوکی جانب سے ملنے والی امداد سے خریدی گئی تھی۔ اس سے کم از کم مجھے بسوں میں دھکے نہیں کھانے پڑ رہے تھے۔ آخر میری قربانی (عظیم منزل میں قیام) کا اتنا انعام بناتا تھا۔

”زندگی ایک سفر ہے سہانا، یہاں کل کیا.....“ ایک لخت میری زبان کو بریک لگی۔ آنکھوں کو یہ مشکل کھول کر میں نے پانی میں دیکھ کر اپنے وجود کو دیکھا۔ پھر نکلا۔ بے اختیار اس افتاد کی وجہ جاننے کو اوپر کی جانب اٹھیں بھلائیے کس قسم کی بارش تھی جو مجھ معصوم پر برسائی گئی تھی۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ برا آدمے سے ہنستا ہوا رضوان قریب آیا۔ میں نے اسے گھورا جس کی ہنسی تھینے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”ہنس بعد میں لینا بھائی! پہلے بتاؤ یہ شرارت کس کی ہے۔“

”ہنس تو میں آپ کی سچویشن پر رہا تھا۔ کیا گانا مکتنا رہے تھے آپ۔ یہاں کل کیا ہو کس نے جانا۔“ محفوظ ہوتا وہ مکتنا یا پھر میری شکل دیکھ کر ہنسی دہاتی۔

”یہ حملہ اوپر کے رہائشیوں کی جانب سے ہوا ہے اور اگر آپ مزید کچھ دیر کھڑے رہے تو اگلے حملے کے لیے تیار ہو جائیں۔“ رضوان کے خبردار کرنے پر میں نے فوراً بائیک آگے کھسکائی مبادا اوپر سے کوئی برتن ورتن آکرے اور میرے سر کے بال بھری جوانی میں جام شہادت نوش کر لیں۔

”کیوں بھی ایسا کیا جرم کر دیا میں نے۔“

میں اٹھ بی۔ ساتھ میں سب کے مشورے چل رہے تھے کہ چپے کو کس سطح پر رکھا جانا چاہیے حتیٰ کہ صوفے پر جمی بیٹھی ہمارے زور سے بولتی اسے نادر مشوروں سے نواز رہی تھی۔ پورا گھر انہ کو پانچ کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بندھا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ طوفان تھینے کا نام لیتا منی نے ساری دوائی باہر الٹ دی۔ پھر تو وہ ہنگامہ چاکہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔

”رومال دور دال۔“

”رومال پکڑا۔“ میں جو ہونٹوں کی طرح یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا چھوٹی بہو کے مخاطب کرنے پر چونکا، مجھے خواب آیا تھا کہ رومال کہاں پڑا ہے میرے ادھر ادھر دیکھنے پر ہما بول پڑی۔

”وہ سامنے دروازے سے پکڑا۔“ اس کے اشارہ کرنے پر میں جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے اندر ایک ڈبیر سا تھا جس میں ہاتھ ڈال کر میں نے ایک کپڑا کھینچ لیا۔ یہ تھا میرا عظیم منزل کے کینوں کے ساتھ پہلا تعارف جو کسی طور بھی بھلانے کے لائق نہیں۔ اسے ٹھہریے! کچرا بھی باقی ہے۔

☆☆☆

کسی سیانے نے درست فرمایا ہے کہ پہلا تاثر چاہے وہ کسی چیز کا ہو یا انسان کا آخری تاثر پر ہماری ہوتا ہے اور عظیم منزل کے کینوں کا پہلا تاثر اس قدر وزنی تھا کہ رات تک میرے چوہہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ ابو نے مجھے ایسے جنجال پورہ میں بھیج دیا تھا جہاں پرائیویسی نام کی چیز کا نام تک نہیں تھا۔ دفتر سے گھر آتا کوئی نہ کوئی سر پر سوار ہوتا۔

اس گھرانے کی دو عادات مجھے سخت ناپسند تھیں۔ ایک تو بندے کی شکل دیکھتے ہی انہیں کام یاد آ جاتا اور دوسرا ایک چھوٹے سے مسئلے پر سارا گھر انہ اپنے کام چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتا اور اس چکر میں چاہے ناشتا کھانا ادھر اکیس نہ رہ جائے پہلے یہ سب اپنا کردار ادا کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ ویسے جتنا شور یہ لوگ مچاتے ہیں اتنا تو کسی میوزیکل کنسرٹ



چھت پر لٹکا ہیں دوڑاتے پوچھا۔  
مگر رضوان کو دوست سے ملنے جانا تھا۔ جاتے جاتے وہ مطلع کرنا نہ بھولا۔

”موسیٰ بھائی۔ دھیان رکھیے گا۔ بھولے سے بھی ان کی حدود میں کھڑے مت ہوئے گا ورنہ رباب باجی نے دیکھ لیا تو بخشش کی نہیں۔“ خالی چھت کو گھورتا میں کچھ اور دور کھسکا۔

شام میں امی سے بات ہوئی تو یہ قصہ چھیڑ دیا۔ اور آخر میں امی کو بھڑکانے کی بھی کوشش کر ڈالی۔ ”ابو پر نظر رکھا کریں۔ ان کے خاندان میں جو دوسری شادی کا رواج ہے کہیں آپ کے شوہر نامہار بھی اس کا فائدہ اٹھانے کا نہ سوچ لیں۔“

”مستقیم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم باپ بیٹا اپنی لڑائی میں مجھے نہ گھسیٹا کرو۔“ جمال ہے جواب کے خلاف وہ کچھ سن لیتیں۔ میں آہ بھر کر رہ گیا۔

امی سے بات کر کے مجھے اپنے سارے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ عظیم چچا نو جوانی میں اپنی کلاس فیلو (زبیدہ خاتون) کی محبت میں گرفتار تھے (اللہ کی شان) اور ان سے شادی کے خواہاں تھے۔ مگر ان کی بد نصیبی (میرے مطابق عین خوش نصیبی) کہ زبیدہ خاتون کے والد نے رشتے سے انکار کر دیا اور ان کی شادی اپنی پسند سے کر دی۔

عظیم چچا اپنی ناکام محبت کے غم میں ڈوبے اپنے ماں باپ کی خواہش پر اپنی خالہ زاد تابندہ بیگم سے مجبوراً شادی پر رضامند ہو گئے۔ سب ٹھیک جا رہا تھا۔ ان کی شادی کو چار سال گزر گئے۔ پانچواں سال شروع ہوا تو تابندہ بیگم کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ مگر ان ہی دونوں عظیم چچا کو خبر ہو گئی کہ زبیدہ خاتون بیوہ ہو کر اپنے دو بیٹوں کے ساتھ اپنے میکے واپس آ چکی تھیں۔ پھر کیا تھا عظیم چچا کی سوتی ہوئی محبت جوش مار کر بے دار ہو گئی اور وہ لگے دوسری شادی کا تقاضا کرنے۔ پورے خاندان نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ زبیدہ خاتون کو بیاہ کر لانے کے فیصلے پر اڑ گئے۔

تابندہ بیگم نے شوہر کا اس قدر جھکاؤ دیکھتے

”بہلا جرم یہ کہ آپ ان کی سڑھیوں کے عین آگے کھڑے اپنی بانیگ دھو رہے تھے اور سب سے سنگین جرم کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔“

”ہیں۔“ رضوان کی عجیب و غریب منطق پر میں نے آنکھیں پھیلانیں۔ عجیب بات ہے۔ ویسے بڑے ہی کوئی بد لحاظ کرائے دار رکھے ہیں تم لوگوں نے۔“

”آپ سے کس نے کہا اوپر والے ہمارے کرائے دار ہیں۔“

”میرا اندازہ ہے۔ رشتہ دار تو نہیں لگتے۔ اتنے دنوں سے میں تو یہی سمجھتا رہا۔ نہ تو کوئی اوپر جاتا دکھائی دیا نہ کوئی نیچے آیا۔ بس آتے جاتے ایک لڑکا ہلکی کود بکھا سرسری سا۔“

”ابا کی پہلی بیوی اور بچے رہتے ہیں اوپر۔“ رضوان نے اتنے آرام سے میری ساعت پر ہم پھوڑا کہ کچھ دیر کے لیے میں گنگ رہ گیا۔

”اور اس حساب سے رشتے دار بنی ہوئے۔“ مگر ایسے رشتے دار نہیں ہیں جن کے ہاں آنا جانا ہو۔“

”مذاق کر رہے ہوتا۔“ اس کے سادہ سے الفاظ پر مجھے شک گزرا۔

”لیں! سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔“ رضوان کے لہجے پر مجھے کچھ کچھ یقین آیا مگر حیرت اپنی جگہ موجود تھی۔

”رباب اور ریحان ابا کی پہلی اولاد ہیں۔ ریحان بھائی سے میری علیک سلیک ہے پر اماں کو نہیں پتا۔“ اندرونی دروازے کی جانب دیکھتے اس نے آنکھ ہٹائی۔

”رباب باجی تو ہم سے کلام کرنا بھی پسند نہیں کرتیں اور وہ ہیں ان کی والدہ تو وہ اوپر ہی رہتی ہیں اور میری مجال نہیں جو اوپر جانے کا سوچوں۔ اماں ٹانگیں تو ڈدیں گی۔“

سوال تو میرے ذہن میں بہت کلپا رہے تھے



ہوئے انہیں کھلے دل سے دوسری شادی کی اجازت دے دی، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ بھی مائیں جب بھی وہ یہ قدم اٹھا کر رہیں گے سو وہ مصلحت کی چادر اوڑھ لگیں۔ مگر زبیدہ خاتون اپنا دل بڑا نہ کر سکیں۔ انہیں تابندہ بیگم کھلتی تھیں۔ آہستہ آہستہ شوہر کو متغیر کر کے ان سے دور کر رہی تھیں اور شاید گھر سے بھی بے دخل کر دیتیں اگر عظیم چچا کے والد اپنی زندگی میں تابندہ بیگم کو اس گھر میں حصر دار نہ بنا جاتے۔ بس یہیں زبیدہ خاتون اپنے آپ کو بے اختیار پاتیں۔ ان کا بس نہ چلنا کہ تابندہ بیگم اور ان کے بچوں کو ہاتھ پکڑ کر اس گھر سے باہر کر دیتیں۔

☆☆☆

آج اتوار تھا اور میرا گھر پر نکلنے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ گھر کا کوئی فرد مجھے کام سوچنے کا سوچتا بھی، میں بائیک لے کر نکل پڑا۔ گیٹ سے بائیک باہر نکالی تو ان دونوں پر نظر پڑی جو شاید کہیں جا رہے تھے۔ گیٹ سے دو قدم آگے چلے تو ریحان کی جب سے لقاؤں گرتے دیکھ کر میں نے آگے بڑھ کر آواز دی۔

”دوست! یہ آپ کا کچھ گر گیا ہے۔“ زمین سے لقاؤں اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا جو مڑ کر میری طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

”بہت شکریہ۔“ ریحان مشکور سا مسکرایا۔  
”آپ یہاں مہمان ہیں غالباً۔“ اس کے کہنے پر میں نے اپنا تعارف کروایا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پیچھے کھڑی اس کی بہن نے آواز دے ڈالی۔

”ریحان ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ میں نے سر سری نظر اس چادر میں لپٹی لڑکی پر ڈالی جس کا ہلکا سا سانولا رنگ عینے کی پیش سے سرخی مائل ہو رہا تھا۔ ریحان خفیف سا ہو گیا۔

”چلیں پھر کسی دن ملاقات ہوگی۔ آپ بھی شاید کہیں جا رہے ہیں۔“ جلدی سے مجھ سے ہاتھ ملاتا وہ خدا حافظ کرتا چل دیا۔ میں نے سر جھٹک کر

بائیک اشارت کی۔ آج کا پروگرام میں نے پہلے ہی اپنے دوستوں کے ساتھ بتا رکھا تھا۔ آخر اپنے جیسے کنوارے دوستوں کا بھی تو فائدہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

بائیک اندر کھڑی کرتے ہی میں نے ہینڈل سے لٹکے شاپرے سے کاغذات نکالے جو میرے کوئیک نے راستے میں پکڑائے تھے اور میں جلدی میں انہیں بیگ میں نہیں رکھ سکا تھا۔ یہ کچھ ضروری کاغذات تھے اور راستے میں شاپرے پر پانی پڑ گیا تھا۔ اب میں جائزہ لے رہا تھا کہ الفاظ مٹ نہ گئے ہوں۔ گیٹ کھلنے کی آواز پر میں نے نگاہ اٹھائی۔ چادر میں لپٹی وہ اندر آ رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ غلط ڈالے بغیر وہ آگے بڑھ گئی۔ میں بیڑھیوں کے قریب کھڑا تھا مگر دھیان سارا کاغذات کی جانب تھا۔ ٹھوکر کی آواز پر میں چونک کر مڑا۔ اس کا پاؤں لگنے سے بیڑھی ہو کر کھامیرا موبائل زمین بوس ہو گیا۔ وہ رکی، پھر سرسری نظر مجھ پر ڈال کر اوپر چڑھنے کی غرض سے آگے ہوئی اور میں جو اس کی طرف سے معذرتی فقرے کا شہنشاہ تھا۔ اس بے نیازی پر چپ گیا۔

”محترمہ! کیے ذرا۔“ میں آواز دیتا رہینگ پر ہاتھ رکھتا۔ پہلی بیڑھی پر دایاں پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ میری جانب گھومی۔

”آپ میرا قیمتی موبائل گرا کر بغیر معذرت کے فرار ہو رہی ہیں۔ کوئی تمیز تہذیب نہیں ہے آپ لوگوں کے ہاں۔“

”میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی موبائل پڑا ہے نہ ہی جان بوجھ کر میں نے ایسا کیا ہے۔“

”بندہ اخلاقاً معذرت کر لیتا ہے۔“ میرا موڈ پہلے سے خراب تھا اور اب اس کھڑوس لڑکی پر مزید تاؤ آ رہا تھا۔ کیا تھا اگر وہ سوری کہہ دیتی۔

”اخلاقیات کے کچھ سبق آپ بھی پڑھ لیجئے تو بہتر ہوگا۔ یہ بیڑھیاں ہماری ہیں۔ آپ کو کوئی حق



☆☆☆

”رباب تم کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو۔ ایک ٹیوشن چھوٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“ ریحان کی آواز پر میرا سارا دھیان چھٹ سے آتی آوازوں کی جانب مبذول ہو گیا۔

”بہت فرق پڑتا ہے۔ یہ سب سے بڑی ٹیوشن تھی اور پھر پچھلے مہینے تمہاری تنخواہ بھی کم ہو گئی تھی ایسے میں ہمارے خرچے کیسے پورے ہوں گے۔ ہمارے کالج کی فیسیں بھی سر پر کھڑی ہیں۔“ رباب کی آواز میں محسوس کی جانے والی پریشانی تھی۔

”کوئی نہ کوئی سبب بن جائے گا۔ کچھ مہینے بچھان کر گزارہ کر لیں گے۔“ ریحان کی آواز میں اطمینان تھا۔ یقیناً وہ اسے پریشانی سے نکالنا چاہ رہا تھا۔

”مجھے بہلاؤ مت۔ پہلے کون سا ہم کلمے ہاتھ سے پیسے خرچتے ہیں۔ ہمیشہ سے بچھان کر ہی گزارہ کرتے آرہے ہیں۔ ہفتے میں چار دن ہمارے ہاں آلو ہی چکے ہیں کیونکہ ہم یہی افورڈ کر سکتے ہیں۔“ آواز میں کمی گل گئی تھی۔ میں جوابی کوفون کرنے باہر نکلا تھا اب خاموشی سے بیٹھ بیٹھ کی ریلنگ کے ساتھ کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ تھی تو غیر اخلاقی حرکت مگر بے اختیار ہی سرزد ہو گئی تھی اور اب شعوری کوشش کے طور پر کان آوازوں پر لگے تھے۔

”تو سات دن کھالیں گے بابا۔ تمہیں ہوا کیا ہے۔ پہلے تو اس طرح کی مایوسی کی باتیں بھی نہیں کیں تم نے۔ پھر اب کیوں؟“ ریحان نے استفسار کیا۔

”ہمارے کالج میں بتاتی پھر رہی ہے کہ اب انے اس کے پاس ہونے پر دعوت رکھی ہے۔ ہماری کسی کامیابی پر تو اب انے بھی مبارک کباد دینا تک ضروری نہیں سمجھا اور اب۔“ شکایتی لہجہ اور غم آواز ابھری۔

”کون سی نئی بات ہے اتنے سالوں میں اب

نہیں پہنچتا کہ ہماری اجازت کے بغیر یہاں اپنی قیمتی چیزیں رکھتے پھریں۔“ اس کے نئے انداز پر میرا دماغ مزید گھوم گیا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ کی بیڑیاں استعمال کرنے کا بلکہ ہو سکے تو ان بیڑیوں کو اپنے ساتھ ہی لے جائے تاکہ بندہ غلطی سے بھی کچھ رکھنے کی جسارت نہ کرے اور اس دن وہ آپ ہی محسوس نا مجھ پر پانی پھینکنے والی۔“ مجھے بروقت یاد آیا۔

”اچھا سلوک کرتے ہیں مہمانوں کے ساتھ آپ لوگ۔“

”آپ ہمارے مہمان نہیں ہیں۔“ میری بات سن کر وہ پیش میں آگئی۔ اسی وقت گیٹ سے اندر دھکی جہانے مداخلت کی۔

”رباب اچھا ہوا تم نظر آگئیں۔“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ میرے اندازے کے مطابق دونوں میں بات چیت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ وہ کالج سے ہی آ رہی تھی، بیک کندھے پر لٹکا رکھا تھا اور چہرے پر تھو پامیک اپ یقیناً واٹر پروف تھا کہ شدید گرمی کے باوجود جوں کا توں موجود تھا۔ دوپٹہ سر پر بھجور اٹکایا ہوا تھا۔ اوپر سے نیچے تک تیار وہ چلتا پھرتا فیشن میگزین تھی۔

”میرے پاس ہونے پر اباد ووت دے رہے ہیں، اپنی ساری کلاس فیلوز کو بلایا ہے میں نے۔ ہم بھی میری کالج فیلو ہو تو سوچا تمہیں بھی بلا لوں۔ آخر سینئر ہو ہماری۔“ تسخرانہ مسکراہٹ لبوں پر پھیلائی وہ اسے کچھ جتنا چاہ رہی تھی۔ میری نگاہیں بے اختیار رباب کے چہرے پر پڑیں جس کا رنگ کچھ کا پڑ گیا تھا اور آنکھیں ضبط سے گلابی ہو رہی تھیں۔

”آنا ضرور۔“ ہمارے اس کی کیفیت کے مزے لیتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے خاموشی سے بیڑیاں چھوٹی رباب کی چال میں لٹکوا کر اٹھ وائج محسوس کی۔ مجھے ندامت نے گھیرا۔ ہو سکتا ہے وہ بے چاری پہلے ہی دینی دباؤ کا شکار ہو اور ایسے میں میں نے بھی اسے بے بھاد کی سنادیں۔



کنڈوے کر لے کی طرح کا ہو گیا۔ کر بلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ خیر اس بار وہ مجھے حق بجانب ملی۔ آخر میں اس کے دشمنوں کا مہمان تھا تو اتنا حق تو اس کا بننا ہی تھا۔ کھانا میں کھا کر گیا تھا البتہ رات کی اچھی سی چائے پی کر نیچے آیا تو ذبیذہ خاتون نے جوابے تخت پر پورے لمطرائے سے براجمان تھیں، مجھے ایسے مھورا کو یا میں ان کا زور حور کر کے آیا ہوں۔ عظیم چچا برابر میں بیٹھے تھے سو میری کو غلامی ہوئی۔

☆☆☆

دفتر سے نکلے ہوئے مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ سورج نے بھی جیسے آگ سے شرط لگا رکھی تھی۔ دھوپ کی تمناز سے بدن جتنا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں سکتل پر بائیک روکے میں اطراف میں موجود گاڑیوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی کا لے سی چلائے وہ تو م خاصی بہتر حالت میں تھی۔ پھر نگاہ بائیں طرف بنے اسٹاپ پر ٹھہر گئی جہاں گرمی کے ستائے اکا دکا لوگ سواری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں نگاہ پھیرتا، کوئی میں نیچھی لڑکی پر مجھے رباب کا گمان ہوا۔ وہ نیچے جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سیدھا ہونے پر میں اسے پہچان گیا۔

”ہو سکتا ہے اسے کوئی مسئلہ درپیش ہو۔“ میرے اندر آواز ابھری تو سکتل کھلتے ہی میں اس کی جانب بڑھا۔

”خیریت تو ہے آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔“ میرے یوں انٹری مارنے پر وہ بری طرح چوکی (اوہو یقیناً مجھے قریب پہنچ کر پہلے کھنکھارنا چاہیے تھا) مجھے دیکھ کر وہ کچھ جڑبڑ ہوئی، تے ہوئے چہرے پریشانی واضح تھی۔

”کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتائیے۔ میں آپ کے کسی کام آسکوں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔“ اپنے لہجے کو جس قدر رشتہ بنا سکتا تھا میں نے بنایا۔ اگر اس لمحے ابو مجھے دیکھ لیتے تو غش کھا جاتے، وہ پہلے شیشائی پھر بولی۔

نہ کبھی اوپر جھانک کر ہماری خیریت دریافت کی نہ ہماری ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کی۔ اور صحیح بات ہے مجھے اب ان کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم بھی دل چھوٹا مت کرو۔“ ریحان کا لہجہ سادہ تھا۔

میرا حساس دل دکھ سے بھر گیا۔ عظیم چچا کی بے بسی پر بھی افسوس ہوا جو اپنی اولاد سے اس قدر لائق تھے کہ ان کے حقوق پورے کرنے تک کے روادار نہ تھے۔

☆☆☆

ابو، امی کے اصرار پر میں بہت جلد ہی جمع کرنا تائبندہ بیگم سے ملاقات کی غرض سے سیزھیوں کی جانب آ گیا۔ وہ تو اگر ریحان مجھے اوپر آنے کی دعوت نہ دیتا تو میں نے ابو امی کی بات پر کان نہیں دھرنے تھے۔ اب آپ خود سوچیے میں ٹھہرا ہوا زبیدہ خاتون کے گھر میں ہوں اور ایسے میں تائبندہ بیگم کے ہاں جانے کا سوچ کر ہی مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ پر اب میں مارادہ باندھ کر اوپر پہنچ گیا۔ سیزھیوں کے انتظام پر موجود دروازے پر دستک دے ڈالی۔ صد شکر کہ دروازہ ریحان نے کھولا ورنہ اس کی بہن سے کچھ بے پند نہ تھا کہ مجھ پر حملہ کر کے نیچے دھکا دینے کی کوشش کرنی اور میں بے چارہ دھان پان سا، یقیناً اس جی دار لڑکی کے جلالی اور وہ بھی فوری اقدام کا مقابلہ کہاں کر سکتا تھا۔ آپ مجھے کمزور ہرگز خیال نہ کریں مگر اگر سامنے والا ایک دم لوہے جیسی وزنی چیز اٹھا کر پھینک دے تو میں تو گیانا کا نام ہے۔

میری سوچوں کے برخلاف تائبندہ بیگم بہت محبت سے ملیں۔ امی ابو کے متعلق بھی دریافت کیا۔ انہیں دیکھ کر مجھے وہ کھاوت یاد آ گئی۔ ”دل آجائے گدگدی پر،“ معاف کیجئے گا زبیدہ خاتون پر تو بری کیا چیز ہے۔“ عظیم چچا کی عقل پر یقیناً پھر پڑ گئے ہوں گے جو اتنی پروقار اور نرم مزاج کی تائبندہ بیگم کو چھوڑ کر زبیدہ خاتون کو پیادہ لائے۔ بس ایک رباب تھی جس کا منہ مجھے دیکھ کر



”سوری، پانی والی حرکت کے لیے بھی اور آپ کا موبائل غلطی سے گرانے کے لیے بھی۔ غصے میں کچھ زیادہ یہی بول گئی۔“

”اس گرمی میں پانی والی حرکت اتنی بھی بری نہیں تھی۔“ میں خوش اخلاقی کے تمام ریکارڈ توڑتا مسکرایا۔ وہ الوداع کرتی مڑ گئی۔

چنگ جی والے کو فارغ کر کے میں بایک اشارت کرتا عظیم منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ دھیان بار بار اس لڑکی کی جانب پرواز کر جاتا۔ اب یقیناً آپ فوراً اس نتیجے پر پہنچ گئے ہوں گے کہ میرا دل اس لڑکی کی چادر کے پلو میں کہیں انک چکا تھا۔ آپ یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں آخر میرے سینے میں بھی مرد کے سنے کا دل تھا اور وہ بھی کنوارا مرد پھر دل کیونکر نہ پھسلے۔ مگر نہایت معذرت کے ساتھ آپ کی قیاس آرائی اس بار بھی غلط ثابت ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں نہایت حساس دل کا مالک ہوں۔ جب ہی تو اس کے لیے دل میں ہمدردی جاگ اٹھی تھی۔ اور پھر اب جس طرح وہ تنہا پریشان کھڑی تھی میرا دل گویا پھل ہی گیا۔ اب ملتان جیسے شہر میں دل کا پھل جانا ایسا بھی ناممکن نہیں ہے کہ آپ میری بات کا یقین نہ کریں۔

بارش کی بدولت موسم خاصا خوش کوار تھا۔ سو ٹھنڈی ہوا کے مزے لینے میں باہر نکلا۔ ہمارا تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں برآمدے میں ہی رک گیا۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھی رباب کے پاس جارکی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بارے میں کچھ کہنے کی۔“ رباب نے اچھٹی نگاہ اس پر ڈالی۔

”تمیز سے بات کرو میں تم سے بڑی ہوں۔“

”ہونہ بڑی تم نے میری فریڈ سے کہا کہ ہم نے تمہارے گھر پر قبضہ کر رکھا ہے۔“

”میں بچی نہیں ہوں جو اس طرح کی باتیں کروں یا اپنی مظلومیت کے قصے سناؤں۔ تم جو میرے بارے میں کالج میں باتیں کرتی پھر دے

”وہ میری بس مس ہو گئی ہے اور جوتا بھی ٹوٹ گیا ہے۔“ جھجک کر جوتے کی جانب اشارہ کیا جو پوری طرح دم توڑ چکا تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے میں بھی گھر جا رہا ہوں۔“

”مجھے ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔“ اس نے اصل مسئلہ بتایا۔

”اچھا میں وہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ آجائیں پہلے جوتا خرید لیں پھر جہاں نہیں کی اتار دوں گا۔“ میرے کہنے پر اس نے جن گھبرائی نظروں سے دیکھا اور پھر اپنی چادر درست کی اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ میرے ساتھ بائیک پر ہرگز سوار نہیں ہونا چاہتی۔

”آں۔ وہ میری بائیک کچھ مسئلہ کر رہی ہے بیچ راستے میں رک جانی ہے تو چنگ جی کر لیتے ہیں۔“ میں نے فوراً حل نکالا اور اس کو بولنے کا موقع دے بغیر چنگ جی روکنے لگا۔ روانہ تو میں اسے اکیلے بھی کر سکتا تھا مگر وہ جتنی خود ارادگی مجھ سے کراہی ہرگز وصول نہ کرتی یہی سوچ میں نے بھانا گھڑ لیا تھا۔ تھوڑی دیر میں چنگ جی روک کر ہم اس پر سوار ہو گئے۔ بائیک چنگ جی کے پیچھے باندھ لی۔ راستے سے جوتا خریدنے سے لے کر اسے چھوڑنے تک ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جوتے کے پیسے اس نے مجھے دیے نہیں دیے تھے اور میں جان چکا تھا کہ اس کا پرس اب خالی ہو چکا تھا۔ ورنہ چنگ جی کے پیسے بھی وہ دے کھڑی ہو جاتی۔ مطلوبہ گھر کے سامنے اتاری وہ کچھ شرمندہ شرمندہ ہی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”بہت شکریہ آپ کا۔“

”شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دن جو آپ نے اچھی سی چائے پلائی تھی بس اسی کے لیے یہ ٹیوڈر باپ ہے آپ کو اب یہ یقین دہانی کر ادیں کہ اگلی بار بھی دیکھی ہی چائے پلائیں گی۔“ میرے ہلکے ہلکے انداز پر اس کی پیشانی عرق آلود ہوئی۔ پھر وہ ہم لچے میں بولی۔



تھیں۔ میں نے صرف جواباً سب کو بتایا ہے کہ تم میرے والد کی دوسری بیوی کی اولاد ہو اور جلن میں ایسی باتیں کر جاتی ہو۔ باقی تو سب اپنا تبصرہ کر رہے ہیں۔“ رباب کا مطمئن انداز جی جلائے کو کافی تھا۔ ہما بھڑک اٹھی۔

”جلن مجھے نہیں تمہیں ہے۔ ابو نے میرے پاس ہونے پر دعوت جو رکھ لی ہے۔ اسی کا غصہ نکال رہی ہو۔“

”تم اپنی قیاس آرائیاں رہنے دو اور آئندہ میرے بارے میں کچھ بولنے سے پہلے ہزار بار سوچنا۔“ ٹھنڈے ٹھارے لہجے میں بولتی وہ تیز قدموں سے میز حیاں چڑھ گئی۔ ہمارے چہرے کی ٹھونکوں دیکھ کر مجھے ہلکا سا پڑا۔ آخر کو زبیدہ خاتون کی بیٹی بھی کچھ بعید نہیں تھا کہ مجھ پر ہی چڑھ دوڑنی (اس کی بے عزتی جو میں اپنے کانوں سے سن چکا تھا)۔ ساتھ ایک انجانی سی خوشی بھی ہوئی۔ خاصی جی دار لڑکی تھی جو اپنی طرف اٹھتی انگلیوں کو روکنا جانتی تھی۔

☆☆☆

میرے اوپر کے چکر بڑھنے لگے۔ اکثر میں رات کو چائے کے وقت چلا جاتا۔ مزے داری چائے کے ساتھ لوڈو کی تین چار گیمز کھیلی جاتیں۔ ایک روز میں کیرم بورڈ خرید لایا تو رباب بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئی پھر تو وہ بازیاں لگیں کہ مزا آ گیا۔ جتنا میرا آنا جانا بڑھنے لگا اتنا ان کے حالات سے واقفیت ہوتی جا رہی تھی۔ منہ سے کوئی کچھ نہیں کہتا تھا مگر ان کی سفید پوشی کے مہر کے پیچھے چھپی تنگ دستی کا مجھے اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔

پچھلی رات ریحان اور رباب کچھ پریشان سے لگے تھے یقیناً اپنی فیسوں کو لے کر فکر مند تھے۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ ابو سے بھی کچھ پیسے منگوا لیے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پیسے ان تک کیسے پہنچائے جائیں۔ وقت کم تھا۔ میں سارے دن تربیسیں سوچتا رہا۔ کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دوبار میں کھانے پینے کی چیزیں لے گیا تھا تو تابندہ

بیگم خاصی ناراض ہوئی تھیں کہ آئندہ میں ایسا تکلف نہ کروں ورنہ وہ نہیں رہیں گی۔ اب بھلا پیسے لینے پر کیسے راضی ہوتیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں رات میں اوپر چلا گیا سارے وقت اس تاک میں رہا کہ رقم کہاں رکھوں کہ کسی کو گمان تک نہ ہو کہ وہ میں نے رکھی ہے۔ کچھ سوچ کر میں نے نظر بجا کر چار پائی پر رکھے تکیے کے غلاف میں رقم چھپا دی۔ ریحان فون سننے گیا تھا اور رباب بچن میں جبکہ تابندہ بیگم عشا کی نماز ادا کرنے، سو میں مطمئن تھا۔ اگلے روز میں دفتر کے لیے نکل رہا تھا جب وہ غصے سے کھولتی ہوئی مجھ تک آئی اور زور سے رقم بانیک کی سیٹ پر پھینکی جسے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

”کیا مجھ کو آپ نے یہ رقم رکھی تھی۔“

”وہ اصل میں مجھے آپ دونوں کی پریشانی کا علم ہو گیا تھا بس اسی لیے میں نے مدد کی غرض سے.....“ میرے منہ سے پھسلا تو وہ میری بات کا ٹٹی سختی سے بولتی چلی گئی۔

”مدد کرنا چاہ رہے تھے۔ کیوں کیا ہم بھکاری ہیں خود کم نہیں سکتے جو آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی یا آپ اپنا صدقہ اور خیرات نکال رہے تھے۔“

”اب آپ غلط بات کر رہی ہیں۔ ادھار سمجھ کر رکھ لیں۔ واپس کر دیں جیسے گا۔“ غصے کو دباتے میں نے محل کا مظاہرہ کیا۔

”کب مانگا ہم نے آپ سے ادھار اور آپ ہوتے کون ہیں ہمیں ادھار دینے والے۔ ہم نے آپ کو اچھا مہمان اور اپنا رشتہ دار کیا سمجھ لیا آپ لگے ہماری خودداری کی چادر کو تار تار کرنے۔ ہمیں ہماری حیثیت جتانے سے اچھا ہے کہ آپ ہم سے نہ ملیں۔“ اس کے سخت انداز پر میرا میٹر بھی محسوس گیا۔ اتنی تو میں کسی کی نہیں سنتا جتنی اس کی سن چکا تھا۔

”یہ ساری باتیں تم خود سے گھڑ رہی ہو ورنہ میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔ بس دماغ خراب ہو گیا تھا جو تمہاری مدد کا خیال آ گیا۔“

”اپنی ہمدردی اپنے پاس رکھو۔“ مجھے غصیلی



آئے۔

”یہ شور کیا تھا؟“ ان کے استفسار پر ہما کا چہرہ بل بھر کے لیے متغیر ہوا۔ پھر میرا منہ کھلتے دیکھ کر وہ زور زور سے رونے لگی۔ آنسو تو ایک بھی نہ ٹپکا البتہ آوازیں خوب نکال لیں۔ ہم ششدر سے اسے دیکھے گئے شاید وہ خود ہی اپنے فیئر کا اعتراف کرنے جا رہی تھی۔

”بھائی یہ، یہ دونوں تھے اسٹور میں۔ میں آواز میں سن کر یہاں تک آئی تھی۔“ ہماری جانب اشارہ کرتی وہ فرائے سے جھوٹ بولتی چلی گئی۔ میری توجہ معنوں میں شمی کم ہو گئی۔

”یہ، یہ جھوٹ ہے۔“ رباب نے احتجاج کیا تو مجھے ہوش آیا۔

”یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ اپنا جھوٹ چھپانے کے لیے.....“ ہمارے میری بات کا ٹی۔

”دیکھیں بھائی وہ۔“ میری پتلون کی جیب کی جانب اشارہ کیا جہاں سے ایک سرخ گلاب جھانک رہا تھا۔ ”یہ رباب کو دے رہا تھا۔“ میرا سانس سینے میں اٹکا۔ اچھلنے آگے بڑھ کر پھول بچھ لیا۔ اب یہ تو میں نے شوق توڑ لیا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ یوں کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔

”اور اسٹور میں وہ تختہ بھی پڑا ہے جو یہ اس کے لیے لایا تھا۔“ اس مکار لڑکی نے اپنی ساری بازی ہم پر الٹ دی تھی۔ اس کے زور زور سے واڈا کرنے اور رونے کی اداکاری اتنی بہترین تھی کہ میں حیران رہ گیا۔ اور پھر چند منٹوں میں اس نے عظیم منزل کے سارے کمینوں کو اکٹھا کر لیا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ یہاں ہر ایک کو ہر معاملے کے اندر گھسنے اور شور ڈالنے کا کس قدر شوق ہے۔ ابھی ہمارے ساتھ ہونے والا تھا۔ اسی وقت ریحان آگیا۔ اچھلنے غصے سے میں اسے معاملہ سمجھایا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ میں یا رباب اسے کچھ کہتے اس کا انداز سختی تھا۔

”میری بہن ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔“ اس کے

نظروں سے دیکھتی وہ چلی گئی۔

”ہونہ۔“ میں نے غصے سے ہائیک بینڈل پر ہاتھ مارا۔ میرا چہرہ تپ اٹھا تھا۔ خود پر بھی تاؤ آ رہا تھا جو اس الٹی کھوپڑی کی لڑکی کی پریشانی کم کرنے کے لیے ہلانک ہوا جا رہا تھا۔ بس ایک چٹنی میں جیسے ہمدردی کا سارا بخار اتر گیا تھا اور اب اس لڑکی کی شکل دیکھنے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن دوستوں کے ساتھ گزار کر میں بڑے خوش گوار موڈ میں عظیم منزل آیا۔ ایک دوست نے گاڑی خریدی تھی اسی خوشی میں گھمانے پھرانے اور ٹریٹ دینے لے گیا تھا۔ دروازہ رباب نے کھولا۔ وہ شاید ریحان کا انتظار کر رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو گھور کر نگاہیں پھیر لیں۔ ایک لخت کی چیز کے کرنے کی زوردار آواز پر ہم اپنی اپنی جگہ گھم سے گئے۔ نظریں فوراً سڑھیوں کے ساتھ بنے چھوئے سے اسٹور کی جانب گھمیں جہاں سے آواز آئی تھی۔ بظاہر اسٹور تارکی میں ڈوبا ہوا تھا مگر مجھے ہلکی سی روشنی کی لکیر نظر آئی۔ بل بھر کے لیے ہماری نظریں ملیں یقیناً کوئی گڑبڑ تھی۔ دبے قدموں چلتے ہم اسٹور تک گئے۔ دروازے سے کان لگاتے ہی مجھے اندر سے آتی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میں نے جھکنے سے دروازہ کھولا تو اگلے حیران کن تھا۔

موبائل کی ٹارچ کی روشنی میں ہما کے ساتھ کھڑا لڑکا واضح نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں کے رنگ اڑ چکے تھے۔ ہما کے قدموں میں بڑا تختہ بھی مجھے دکھائی دے گیا۔ شاید اس کے کرنے کی آواز ہم تک آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کچھ بول پاتا وہ لڑکا بھاگ گیا۔ لمبے کے ہزاروں حصے میں مجھے ہوش آیا اور میں آوازیں لگاتا اس کے پیچھے لپکا مگر وہ جگہ دے کر غائب ہو گیا۔ میں پھولی سانسوں کے ساتھ دروازہ بند کرتا اندر گھسنا تا کہ ذرا اس ہما کی کلاس تولوں۔ ہما اور رباب بھی محض تک آ چکی تھیں۔ ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی اچھل، اکمل باہر نکل



قدرِ صدمہ پہنچا تھا۔ آواز جذبات سے بوجھل تھی۔  
 ”اعتبار تو مجھے تابندہ بیگم کی کود میں ملنے والی  
 لڑکی پر بھی ہے کہ وہ کردار کی ہلی نہیں ہو سکتی۔ مگر تم  
 اس قدر بدلتو ہو سکتے ہو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ کوئی  
 تمہیں ایسی چوہن میں آسانی سے پھنسا دے اور تم  
 مزے سے پھنس جاؤ گے۔ یہ تو مجھے بچی کی عزت کا  
 خیال کھینچ لایا اور نہ تمہاری وجہ سے اپنی اتنی تذلیل نہ  
 کراتا۔“ استہزائیہ انداز میں بولتے وہ گویا مجھے بھگو  
 بھگو کر مارنے آئے تھے مگر میں بھی ان ہی کی اولاد  
 تھا۔

”ہاں تو کتنا منع کیا تھا آپ کو جوان بچیوں  
 والے گھر میں مجھ جیسے شریف انٹنس کو بھیجنے کی  
 ضرورت ہی کیا تھی۔“

”غلطی میری ہی ہے۔ بچیوں والے گھروں  
 میں تم جیسے لوفروں کو گھسانا ہی نہیں چاہیے۔“ ان  
 کے دار پر میں سلگ کر رہ گیا۔ غلطی نہ ہونے کے  
 باوجود یہ طعنے مجھے اب ساری زندگی سننے تھے۔

☆☆☆

میں ایک بار پھر بے روزگار ہو چکا تھا۔ اور جو  
 اس کی وجہ تھی وہ ہمارے ساتھ تھی۔ جی ہاں واپسی  
 کے سفر میں ہم تین نہیں چار افراد تھے۔ وہ چادر میں  
 لپیٹ کر صدمی بیٹھی مجھے زہر لگ رہی تھی۔ جانے ابو نے  
 تابندہ بیگم کے ساتھ کیا میٹنگ کی تھی۔ جو انہوں نے  
 بیٹی کا سامان باندھ کر اسے ہمارے ہمراہ کر دیا۔ بھلا  
 اس امیر جمعی رخصتی کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اسے گیٹ روم میں ٹھہرائے جانے پر میں  
 خاصا مطمئن تھا۔ مگر میرا یہ اطمینان چند دنوں میں  
 رخصت ہو گیا۔ جب یہ احساس ہوا کہ اس کی  
 موجودگی میری حیثیت کو چیلنج کرنے لگی ہے۔ میں  
 اپنے ماں باپ کی اکلونی اولاد جو ہر چیز میں بلا  
 شرکت غیرے حق رکھتا تھا اس میں گویا وہ حصہ دار بن  
 کر آگئی۔ اس کو وہی پروٹوکول ملنے لگا جو کبھی میرا  
 نصیب ہوا کرتا تھا۔ سو وہ میری آنکھوں میں مزید  
 کھلنے لگی۔ بس چلا تو اسے ہاتھ پکڑ کر واپس چھوڑ

الفاظ نے گویا نئی زندگی دی تھی ہمیں۔ مگر باقی کسی  
 صورت ماننے کو تیار نہ تھے۔ زبیدہ خاتون نے اس  
 کی بولتی بھی بند کر وادی اور میرے اور میری پشتوں  
 کے وہ لٹے لیے کہ میں کانوں تک سرخ پڑ گیا۔ عظیم  
 چچا الگ بھڑک اٹھے۔ اجمل، امل کی خون خوار  
 نگاہیں بھی ہم پر جری تھیں۔ تابندہ بیگم بھی ہنگامہ ہوتا  
 دیکھ کر نیچے اتر آئیں۔ اب ریحان اور وہ لاکھ رہا باب  
 پر اعتماد کا اظہار کرتے مگر زبیدہ خاتون اور ہما (مکار)  
 جانے کیا ملے کیے بیٹھی تھیں جو کسی طرح معاملے کو  
 ٹھنڈا نہیں ہونے دے رہی تھیں۔ چھوٹی اور بڑی بہو  
 محض کھور نے پراکتیا کے تماشائی بنی کھڑی تھیں۔

”بک ہا۔ مستقیم کی اولاد سے کیا خیر پہنچتی تھی  
 ہمیں۔ سارا خاندان ہم پر تھوکتو کرے گا جب یہ خبر  
 پھیلے گی۔ بھلا یہ باتیں تھوڑی ناچھتی ہیں۔ اب سوچ  
 کیا رہے ہیں نمبر ملا میں خود بات کرتی ہوں۔  
 ایسے ہی تو نہیں یہ بھاگ بھاگ کر اوپر جاتا رہا۔“  
 ان کے آخری جملوں پر میں نے منہ کھولنے کی کوشش  
 مگر عظیم چچا نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ پھر ان دونوں  
 نے اندر جا کر ابو سے جانے کیا باتیں کیں۔ آخر میں  
 مجھے بلایا گیا، ابو کی آواز سننے ہی میں بولا۔

”ابو یہ سب جھوٹ ہے میں.....“ ابو نے  
 میری بات کاٹ دی۔ لہجہ انتہائی سنجیدہ تھا۔  
 ”تم وہی کرد جو عظیم کہہ رہا ہے۔ میں صبح پنج  
 جاؤں گا۔“ اور میں فون پکڑے تنگ رہ گیا۔ پھر وہی  
 ہوا جو ایسی صورت حال میں ہوا کرتا ہے۔ جی ہاں  
 میرا اور باب کا فوری نکاح۔

☆☆☆

اگلے روز ابو، امی پہنچ گئے۔ ابوبل بھیجنے اور امی  
 سر جھکائے زبیدہ خاتون کی باتیں سننے رہے۔ عظیم  
 چچا محض شرمندہ کرنے والی نگاہ ڈال لیتے۔ سوچ  
 لٹے ہی ابو نے میری کلاس لینا شروع کی تو میں بلبلا  
 اٹھا۔

”آپ کو اپنے بیٹے سے زیادہ دوسروں پر  
 اعتبار ہے۔“ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت مجھے کس



تھی سالن میں ڈالنے کے لیے میں پل بھر کے لیے غائب کیا ہوئی تم نے دھڑلہ پٹی کو۔“ امی نے شرم دلانے والی نظروں سے گھورا اور میری قوساری دانش مندی جیسے خاک میں مل چکی تھی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں لیے وہ تیزی سے بچن سے نکلی۔ میں نادم سامرا تو ابو کھڑے خشکیں نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

”برخوردار فضول اندازے لگانے کے بجائے نوکری ڈھونڈنے پر توجہ دیجیے۔“ نکلے پن کے طغنے تو وہ مجھے اکثر اوقات دیتے رہتے تھے۔ اپنی بے وقوفی پر میں دل موس کر رہ گیا۔

☆☆☆

اپنے ہی گھر میں، میں منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔ امی اب ایسی شرمندہ کرنی لگا ہوں سے گھورتے کہ میں خود کو وہ کرکٹر محسوس کرتا جو بیچے کلنگ کے جرم میں پکڑا گیا ہو۔ اب غلط فہمی ہو گئی تھی بندہ بشر ہوں آخر، تو کیا اب الطائف جاتا تب جان بخشی ہوئی۔

ان ہی دنوں گرنے سے امی کی ٹانگ فرپکچر ہو گئی۔ فرپکچر معمولی تھا مگر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ امی کو کب ایسی تکلیف میں دیکھا تھا۔ وہ تو ہر وقت پھر کی طرح کام کرتی، گھر سنبھالے رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر ہم انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کروا رہے تھے۔ ایسے میں رباب نے پورا گھر سنبھال لیا تھا۔ ساتھ میں امی کی دیکھ بھال حتیٰ کہ دواؤں تک کا خیال وہ خود رکھتی تھی۔ اکثر ان کے کاموں کے ساتھ میرے کام بھی خاموشی سے کر دیتی۔ مگر اس واقعے کے بعد سے مجھ سے مخاطب ہونے کی غلطی اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ اور اس کا یہ روپ دیکھ کر میں دل ہی دل میں خوب شرمندہ ہوتا۔ اب مجھے اپنے غلط رویے کا احساس ہوتا

جا رہا تھا۔ وہ بھی میری طرح اس صورت حال میں بے بس کر دی گئی تھی اور اسے نکاح کر کے لانے کے باوجود میں اس کے ساتھ اچھا خاصا بدلچاؤ ہو جاتا تھا یقیناً وہ میرے رویے سے دگنی ہوئی ہوگی۔ ایک بار

آتا۔ مگر امی اب اس کی محبت میں اس حد تک ڈوب چکے تھے کہ میری ایسی ویسی حرکت پر مجھے ہی باہر کر دیتے۔ میرا تو گویا گھر میں اٹھنا، بیٹھنا حرام ہو گیا۔ ایک طرف ابو کے طنز و دوسری طرف اس کی تعریفیں۔ دراصل یہ لڑکیاں بڑی چالاک ہوتی ہیں واہ واہ سمیٹنے کے چکر میں نیک بیبیاں بن جاتی ہیں۔ وہ بھی میرے ماں باپ کو غصے میں اتار چکی تھی۔ میں سارے وقت اس دوپٹے کی بو کو دیکھتا کڑھتا رہا۔ ایک روز میں بچن میں پانی پینے گیا تو گویا زمین و آسمان میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ میری موجودگی سے بے خبر وہ چولے پر پکتے سالن میں کاغذ کی پڑیاں کھول کر کچھ ملا رہی تھی۔ ”تعویذ۔“ پہلا خیال مجھے یہی آیا۔ ایک ہی

جست میں اس تک پہنچا۔

”یہ کیا ملا رہی ہو کھانے میں؟“ میری زوردار آواز پر وہ ڈر کر مڑی، ناگہی سے مجھے دیکھا۔

”میں نے خود تمہیں کچھ ملاتے دیکھا ہے۔ یہی تعویذ ہے نا جن سے تم میرے معصوم ماں باپ کو قابو کر چکی ہو۔“ میں نے تھوئیں اچکا کر کہا۔

”تعویذ؟“ اس کی حیرانی کی اداکاری سے میں ہرگز متاثر نہ ہوا۔

”اوہ کہیں یہ..... اچھا تو سلو پوائزنگ سے ہمیں مارنا چاہ رہی ہو تا کہ ہمارے گھر پر قبضہ کر سکو۔“ میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا (مسٹری سیریز کا میں شروع سے شوقین رہا ہوں) اب اس کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوا۔ آخر رتنے ہاتھوں پکڑا تھا میں نے۔ ”شرم نہیں آتی تمہیں، ایک تو تمہیں عزت دی۔ گھر میں رکھا اور تم.....“

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ امی کی تیز آواز پر میں چونکا۔ پھر اس کی جانب اشارہ کیا۔

”اس سے پوچھیں جو ہمارے کھانے میں زہر ملا کر ہمیں مارنا چاہ رہی ہے۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں کاغذ چٹکی میں بھر کر ان کی آنکھوں سامنے کیا۔

”یہ وہ خاص مسالا ہے جو میں تزیلہ سے لائی



مخسوس کرتی مڑی تو مجھے سامنے پا کر بوکھلا گئی۔ وہ پراٹھے ہاتھیں مڑی اور ہاتھوں پر اچھا خاصا خشک آٹا لگا ہوا تھا مگر عین پر سے ہاتھ اٹھائی وہ جلدی سے دوپٹے کو سر پر رکھتی مڑ گئی۔  
 ”ناشتا ملے گا۔“ مجھے کہنا پڑا۔

”جی میں ہاتھیں ہوں۔“ مدہم لہجہ سماعت سے نکلا۔ میں کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ جس پر وہ مزید گھبرا گئی۔ ہوسکتا ہے دل میں مجھے کوس رہی ہو۔ خیر میری نظر اس پر تنگ رہی تھیں۔ اس کا دوپٹا پھر سے پھسل گیا۔ اس نے سر پر ٹکانے کی کوشش کی مگر تک کر نہیں دے رہا تھا۔ اس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہوتا میں کچھ دیر مسکراتا رہا پھر شرارت سوچھی تو اٹھ کر اس کے سر پر جا پہنچا۔ کھٹکار کر متوجہ کیا۔ وہ بے ساختہ مڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ جھکتی میں نے آگے ہو کر اس کے دوپٹے کا پلو اٹھا کر اس کے سر پر رکھا۔ وہ شیشائی۔ چہرہ تیزی سے سرخ ہوا۔

”اسی ہی مدتوں میں کر ہی سکتا ہوں۔“ دوستانہ مسکراہٹ لیوں پر پھیلائی۔ ”جب تک ناشتا تیار ہوتا ہے میں اسی کو دیکھتا ہوں۔“ اس کی جھکی پلکوں پر سے نگاہیں ہٹاتا میں باہر نکل گیا۔ مسکراہٹ تھی کہ لیوں سے جدا نہیں ہو پارہی تھی۔ جانے کیوں؟

☆☆☆

دل بے چین، راتیں بے خواب اور آنکھیں پیاسی سی جھکتی رہتیں۔ ادھو مجھے کوئی دماغی مرض لاحق نہیں ہوا نہ ہی میرے دماغ میں خلل پیدا ہوا ہے۔ جتنی آپ اپنے ذہن کے کھوڑے دوسری جانب دوڑا لے نا۔ وہی جس میں دل جھکی جھکی صدا میں دینے لگتا ہے۔ خوابوں میں ایک صورت ابھرنے لگتی ہے۔ نہ نہ چڑیل کی نہیں۔ ادھو آپ جا کس طرف رہے ہیں۔ اب کیا میرے حساس دل میں محبت کی کوئل نہیں پھوٹ سکتی۔

جی ہاں اس بار یہ سو فیصد محبت کا جذبہ ہے جو مجھے اپنی منکوحہ کے لیے دل میں ابھرتا اور پھلتا پھوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی جو شروع سے مجھے قطعاً پسند

پھر سے میرے حساس دل میں اس کے لیے ہمدردی جاگ اٹھی۔ اب آپ سے کیا چھپانا، آپ تو میرے دل کے سب ہی رازوں سے واقف ہیں۔

☆☆☆

”سچ بتاؤ مجھے، کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“ رباب کی تشویش سے بھرپور آواز سن کر لاؤنچ کی جانب بڑھتے میرے قدم رگ گئے۔ میں اس کے کمرے کے باہر تک گیا۔ مگر تو غیر اخلاقی حرکت مگر زندگی میں بھی نہ کبھی یہ حرکت آپ سے بھی سرزد ہوئی ہوگی۔ سو میرے کان بھی کھڑے ہو گئے۔  
 ”واقعی میں.....“ اس کی آواز میں خوشی گھل گئی۔

”میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں ریحان، شکر ہے تمہیں اتنی اچھی نوکری مل گئی ورنہ میں فکر مند تھی گھر کے خرچوں کے لیے۔ اب تو میری ٹیوشنز بھی نہیں رہی تھیں۔“ دور رہ کر بھی اسے گھروالوں کی پریشانی فکر مند کیے رکھتی تھی۔

”بالکل ٹریٹ لوں گی..... ہوں آجاؤں گی ابھی آئی کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی پر میں آگے بڑھ گیا۔

رات کو دوستوں نے پارٹی رکھی تھی۔ میں خاصی دیر سے گھر آیا۔ صبح درتیک سوئے کا ارادہ تھا مگر آنکھ جلدی کھل گئی تو نہا کر کمرے سے نکلا۔ امی کے کمرے میں جھانکا تو ہاتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ اب چند دنوں سے وہ خود سے چلنے پھرنے لگی تھیں۔ لاشعوری طور پر میری نگاہیں اسے ہی تلاش کر رہی تھیں۔ کچن میں کھسا تو کچھ پل کے لیے ٹھہر سا گیا۔ وہ جو ہر وقت دوپٹے میں لپیٹ کر نظر آتی تھی اس وقت دوپٹا کندھوں پر پھیلائے کمن ہی تھی۔ کمر تک آئی اس کی سیاہ مٹی زلفیں پشت پر پٹھری تھیں جن سے پانی کی تھپی بوعدیں ٹپک رہی تھیں۔ یقیناً وہ نہا کر نکلی تھی اور میری موجودگی سے بے خبر آزادی سے اس حلیے میں پھر رہی تھی۔ اس کا نیم رخ میری جانب ہوا۔ پھر یک دم وہ کسی کی موجودگی کو



نہیں آئی تھی اب میرے دل کی مسند پر پورے حق سے براجمان تھی۔ میری خوش مزاجی کا یہ عالم تھا کہ ابودن میں پچاس مرتبہ مجھے حیرت سے نکتے جیسے کہہ رہے ہوں ”برخوردار حیرت تو ہے۔“ بس ایک وہی میری حالت ہے بے خبر، اس دن کے بعد سے مجھ سے کترائی پھرتی تھی۔

ایک روز اسے صحن میں پودوں کو پانی دیتے دیکھ کر میں دبے قدموں اس کے پیچھے جا گھڑا ہوا۔ ابھی مخاطب کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میری موجودگی سے بے خبر وہ مڑی۔ ہاتھ میں پکڑے پائپ سے پانی کے چھینٹے میری شرٹ پر پڑے تو میں اچھل کر دو قدم پیچھے ہوا۔ وہ بھی مجھے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔

”یہ ہر بار آپ مجھ معصوم پر ہی کیوں بارش برساتی ہیں۔“ ہاتھ سے شرٹ جھاڑتے میں نے پوچھا۔

”سوری میرا دھیان نہیں تھا۔“  
”آپ کا دھیان آج کل ہے کہاں۔“ شرارتی مسکراہٹ میرے لبوں پر کھل اٹھی۔

”جی“ وہ حیران ہوئی۔  
”جی، آس پاس کی خبر رکھیں گی تو معلوم ہو گا کہ کسی کو بن بادل کے برسات اچھی لگنے لگی ہے۔“ میرے ذوقی انداز پر وہ شہنائی۔

”آئی آواز دے رہی ہیں شاید۔“ بہانہ بناتی وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں اندر آیا تو وہ امی کے ساتھ بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ میں امی کے قریب صوفے پر ٹنگ گیا۔

”امی آپ کو نہیں لگتا میرے کمرے میں کچھ کی سی ہے۔“ امی سے کہتے میری نگاہیں ان کے دائیں جانب پٹی رباب پر ٹھیں جس کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوا تو میرا دل خوش ہو گیا۔

”مثوب لائٹ جو خراب ہے۔ اب انرجی سیور کی لائٹ میں روشنی تو کم محسوس ہوئی ہی۔“ امی کے جواب پر میرا منہ بن گیا مگر رباب کو اپنی

مسکراہٹ چھپاتے دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا۔  
”ایسا کریں گیٹ روم کی روشنی میرے کمرے میں سجادیں۔“ بظاہر امی سے کہتا اس پر گہری نظر ڈال میں اٹھ گیا۔  
”لو تو تنی لے آئیں گے اس میں کیا ہے؟“  
امی مصروف سی بولیں۔ ہنسی دباتا میں باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ان ہی دنوں ملتان سے عظیم چچا کا فون آیا وہ خاصے شرمندہ تھے اور اس کی وجہ ہمارا پول کھلتا تھا۔ ہم پر الزام لگا کر وہ اپنی غلطی تو چھپا گئی مگر دوسری بار رگٹے ہاتھوں پکڑے جانے پر کوئی جواز نہ پیش کر سکی سو اس کی حرکت کے بعد سب کو ہمارے ہی گناہی کا یقین آ گیا تھا۔ خوش تو میں پہلے بھی تھا پر اس خبر کے بعد سینہ کچھ مزید پھول گیا۔ اس کے شفاف چہرے پر پھیلا اطمینان اور خوشی، ہمہ وقت اس کے اندرونی سکون کا پتا دیتی جو یقیناً اپنی ذات کی سرخروئی کے باعث تھا۔

اگلے کچھ دنوں میں، میں بے حد مصروف رہنے لگا۔ میرا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرتا اور واپسی اکثر رات کو ہوتی۔ ابو مجھے مشکوک نظروں سے گھورنے لگے اور اس کا احساس تب ہوا جب کھانے کی میز پر مجھے موبائل پر مصروف دیکھ کر انہوں نے اشارتاً اپنے معمولات پر نظر ثانی کرنے کا کہا۔

”دیکھیں ابواب میں ہر قسم کے الزامات سے بری ہو چکا ہوں۔ مزید کوئی الزام مجھ معصوم اور شریف انٹرنس پر ڈالنے کی کوشش بھی مت کیجیے گا۔“ میج کا جواب دیتے میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

ان کے چہرے کے زاوے بتا رہے تھے کہ انہوں نے میرے الفاظ کس مشکل سے فہم کیے تھے۔

فون پر بات کرتا میں لاؤنج میں آیا تو وہ سامنے ڈسٹنگ کر رہی تھی۔ وہ جو مجھے دیکھ کر منظر سے غائب ہو جایا کرتی تھی وہیں بھی رہی تو میں کچھ



ایک تو نیند سے برا حال تھا اوپر سے ابو پتا نہیں کون سی کسوٹی کھیل رہے تھے۔

”دوسری شادی کی روایت بیٹا جی! جو آپ کرنے کے چکروں میں ہیں۔“ میری نیند سے بند ہوتی آنکھیں پٹا پٹا کل گئیں۔

”یاد رکھنا ہم تمہاری بارات میں ہرگز شریک نہیں ہوں گے۔ غضب خدا کا اتنی اچھی لڑکی کو چھوڑ کر دوسری کرنے چلے ہیں۔“

”آپ سے کس نے کہا؟“ میں الجھا۔

”ہونہہ ہماری آنکھیں بند نہیں ہیں۔ سب خبر ہے ہمیں تمہاری ان حرکتوں کے پیچھے کیا وجہ ہے۔ کیا نام تھا ہاں نالکہ سہی ہے نا۔“ میں نے طویل سانس لیا۔ تو یہ دیکھی ان سب کے مشکوک رویے کی۔

”ہماری بلا سے چار کرو، مگر ہم تمہارا ساتھ ہرگز نہیں دیں گے۔“ میری خاموشی انہیں کھلی۔

”میرے پاس ایک بیوی کے خرچے اٹھانے کے پے نہیں ہیں آپ مجھے چار کا مشورہ دے رہے ہیں۔“

”یہ بودے جواز اس بچی کے سامنے دو جو صبح ملتان جانے کے لیے اپنا سامان باندھ رہی ہے۔“

بات ختم کرتے وہ اندر چلے گئے تو میں جیسے ہوش میں آیا اور اڑتا ہوا اس کے کمرے تک پہنچا۔ جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر گھسا۔

”جی تو غیر اخلاقی حرکت مگر اس وقت اخلاقیات کی پروا کسے تھی۔ وہ جو بیک میں سامان رکھ رہی تھی ٹھنک کر مڑی، سر پر سے ڈھلکتے دوپٹے کو درست کیا۔

”اچھا ہوا تم نے سامان باندھ لیا مجھے کہنا نہیں پڑا چلیں۔“ میں نے قریب جا کر بچی کی سی کہا تو وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

”اس وقت، میں صبح چلی جاؤں گی۔“ لہجے میں نروٹھا پن در آیا۔

”ابھی کیا قیامت ہے۔ درست فیصلہ کر رہی لیا ہے تو عمل درآمد بھی کر گزرد۔“ ایک ہاتھ سے اس کا بیک اٹھاتا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی تھامتا

حیران ہوا۔

”ادھونا نلکہ تم سمجھ کیوں نہیں رہیں یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔“ اس کو دیکھتا میں فون پر بولا تو اس کے ہاتھ لمحے بھر کور کے۔ چہرے کی بچیدگی میں مزید اضافہ ہوا۔

”ای ابو نہیں مانیں گے تمہیں پتا تو ہے اور پھر میں.....“ ایک شکوہ بھری نگاہ مجھ پر ڈالتی وہ تیزی سے مڑ گئی تو میں دوسری جانب کی بات سننا مزید اچھ گیا۔

ابو کا رویہ طنزیہ ہوتا جا رہا تھا مگر میری سوچیں چونکہ کسی اور طرف پرواز کر رہی تھیں تو میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس دن کچھ زیادہ ہی تاخیر ہوئی۔

رات کے گیارہ بجے میں گھر میں داخل ہوا تو ابو غصے سے نتنئے پھلائے باہر کچن میں چکر لگا رہے تھے۔

”برخوردار شریفوں کے گھر آنے کا وقت ہوا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ جب منہ اٹھائے چلے آؤ۔“

دونوں ہاتھ کمر پر باندھتے انہوں نے پہلا دھاریا۔

”جی آئندہ خیال رکھوں گا۔“ میں نے سر کھجایا۔ اس سے پہلے میں نے بھی اتنی دیر نہیں لگائی تھی بلکہ ہمارے گھر کا اصول تھا کہ ہم آٹھ بجے تک گھر میں موجود ہوتے۔

”ہر باری غلطی پر سیکنڈ چانس نہیں ملتا۔“ میں نے سنا بھی سے انہیں دیکھا جن کی گہری غصیلی نگاہیں مجھ پر تھیں۔

”اب کیا کر دیا میں نے؟“

”میری اور ثریا کی شادی یاد ہے نا کیسے ہوئی تھی۔“ ان کی اس غیر متوقع بات پر میں نے جمائی روکی اور جلدی سے بولا۔

”جی مجھے وہ قصہ اچھی طرح ازبر ہے۔“ مبادا وہ رات کے اس پہر پھر سے سنا لیں۔

”تو پھر یہ بھی یاد رکھو کہ یہ کہانی تمہارے ماں باپ کی ہے اور عظیم کے گھر کی روایت میں اپنے گھر میں ہرگز نہیں پڑنے دوں گا۔“

”کون سی روایت؟“ میں نے آکٹا کر پوچھا۔



”سوری میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میرا دوسری کیا تیسری یا پانچویں کسی بھی نمبر کی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔“ بوکھلاہٹ میں میرے منہ سے نکلا۔ اس نے ٹکا ہوا ہاتھ لگائے۔ یقیناً مائے بیگنی آنکھوں کے ساتھ وہ سیدھی میرے دل میں اتاری جا رہی تھی۔

”اور وہ تاملہ؟“ وہ بے یقین تھی۔  
 ”تاملہ میری کلاس فیلو ہے۔ الحمد للہ نکاح شدہ ہے۔ وہ تو مجھے قطر میں نوکری کا بتا رہی تھی پر میں جانا نہیں چاہتا۔ اور اس نوکری کے چکر میں ہی تو سارے دن باہر خوار ہوتا پھر تلہا۔“ میں نے صورت حال واضح کرنی چاہی۔

اس کے چہرے پر اطمینان کے رنگ اترے۔  
 ”اب چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی تلہ؟“ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ تپکیں جھکا کر شرمیں انداز میں مسکرائی۔

”میکے تو ہر لڑکی جاتی ہے۔ اب آپ لے کر جائیں گے نا۔“ محبت میں ڈوبا پر یقین سا انداز مجھ معصوم پر کیسے نہ اثر کرتا سو میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔  
 اب یہ کڑوا گھونٹ تو مجھے ساری عمر بھر رہی تھا۔ یہی تاملان لانے لے جانے والا۔ کیسی لگی آپ کو میری کہانی؟ یقیناً کچھ مختلف لگی ہوگی۔ اب دیکھیں نا لوگ تاملان سے سوہن حلوہ، تاملانی کڑھائی والی چادریں اور جانے کیا کیا لاتے ہیں اور میں داہپی پر لڑکی (بیوی) لے آیا۔ یہی تو زندگی کے خوب صورت رنگ ہیں جو ہماری زندگی کو انوکھا اور خوش گوار بناتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔“

☆☆☆

### سرورق کی شخصیت

حافظل ..... واقعہ خان  
 میک اپ ..... روزی بیگنی پالواری  
 فوٹو گرافی ..... موسیقی وحشا

میں اسے لیے اپنے کمرے تک آیا اور وہ جو نا سچی سے میرے ساتھ بٹنی چلی آئی تھی کمرے میں پہنچنے ہی اس نے جھپکے سے اپنی کلائی چمڑائی۔  
 ”میں کل صبح ملتان جا رہی ہوں۔“

”شوہر سے پوچھتے بغیر میکے جا رہی ہو۔ پوچھ سکتا ہوں کیوں؟“ میں نے دونوں بازو سینے کے گرد لپیٹے۔

”شوہر کو پروا کب ہے۔“ شکوہ اس کے لبوں سے پھسلا تو میرے لبوں کے کناروں پر مسکراہٹ اُٹھ رہی۔

”اور یہ پروا کیسے کی جاتی ہے۔“  
 ”راستہ دیں مجھے نکلتا ہے۔“  
 ”تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔“ میرے اٹل لہجے پر اس کی جھکی نظریں اٹھیں۔

”یہ رعب اپنی اس تاملہ پر ڈالے گا جس سے دوسری شادی کرنے جا رہے ہیں۔“ اس کے کڑوے لہجے پر میں نے اپنی ہنسی بامشکل دبائی۔  
 ”وہ بھی آئے گی تو دیکھ لیں گے۔ یوں بھی مجھے تو چار کی اجازت ہے۔“

”میری طرف سے پانچ کر لیں مگر مجھے آزاد کر دیں۔“ میری شرارت پر وہ ایک دم ہنسنے لگی۔  
 ”میں اپنی ماں جیسی محروم زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ میرے باپ کے ہوتے ہوئے انہوں نے بیوہ کی سی زندگی گزار دی ہے۔ بڑا شوق ہوتا ہے نامردوں کو شادیوں کا، پھر یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ انصاف کے تقاضے بھی پورے کرنے پڑتے ہیں اور انصاف کے اس ترازو میں دونوں پلڑے برابر ہی کے متقاضی ہوتے ہیں۔“ اس کا جذبات کی شدت سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر مجھے شرمندگی نے گھیر لیا۔  
 وہ تو پہلے ہی اس رشتے کے حوالے سے بے یقین تھی ایسے میں، میں نے انجانے میں اس کی دھنکی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”راستہ دیں۔“ اس کی آواز جھپکی تو مجھے ہوش آیا۔



# حلقہ



سلمیٰ کب سے جاوید کو منانے کی تگ و دو میں مصروف تھی لیکن اس بار جاوید بری طرح اٹھ گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی اپنے تئیں بچوں کو نظر انداز کیے بحث کیے جارہے تھے لیکن وہ بحث ہی کیا جو سکون سے اپنے انجام کو پہنچ جائے۔  
”مان جائیں نا“ سلمیٰ نے اپنی جھنجھلاہٹ پہ

قاہ پواتے ہوئے جاوید کو مخاطب کیا۔  
”نہیں سلمیٰ! ہرگز نہیں۔ اس بار تو بالکل بھی نہیں۔“ جاوید نے فوراً ہی دائیں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے جیسے سلمیٰ کو حملہ کرنے سے روکا۔ ”ابھی یہ موبائل دلا یا ہے، جیب مزید فضول خرچی کی اجازت نہیں دیتی۔“

”میرا موبائل فضول خرچی ہے؟“ تھکے لہجے میں بولی سلمیٰ نے ایک دم پٹری بدلی۔  
”افوہ، ایک تو تم مشرق کی بات کو سمجھنے کے جنوب میں نے جاتی ہو۔“ جاوید نے فوری ہی مدھے کی طرف پلٹتے ہوئے بات ختم کی۔ ”بہر حال میں کہہ چکا ہوں اس بار.....“

”اس میں ہرج ہی کیا ہے۔“ سلمیٰ نے بات کاٹ کے پوچھا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے شاید۔“ منہ بناتے ہوئے جاوید نے سلمیٰ کو کھورتے ہوئے دیکھا۔ ”میں ہزار کی رقم مانگتے ہوئے پوچھ رہی ہو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔“

”کون سا اپنی عیاشی کے لیے.....“  
”دیکھو اپنی ماں کو، کسے منہ بھر کے سوال پوچھ رہی ہے جیسے میں ابھی باہر نکلوں گا اور درختوں سے

پیسے توڑ کے اس کے ہاتھ میں رکھ دوں گا۔“  
جاوید نے خاموش تماشا کی بنے بچوں کو پھلے ایک ہفتے سے چلنے والے سسٹلے میں گھسیایا۔  
آج اتوار تھا اگر آج سلمیٰ ہار جاتی تو شادی میں پرانے کپڑے ہی پہن کے جانا پڑتا۔ یہ بات سلمیٰ کے ساتھ چودہ سالہ رومیہ اور ستھ سالہ رشنا اچھی طرح جانتی تھیں اسی لیے نہایت صبر و تحمل سے اونٹ کو



دل نہیں چاہتا ریڈی میڈ کپڑوں کا۔“  
 ”اچھا، اچھا کچھ کرتا ہوں یار۔“ بیس سالوں کا  
 ساتھ تھا ایسے کیسے شریک سفر کو افسردہ دیکھ سکتا تھا۔  
 ”تمہارے سامنے ہی تو ساری صورت حال ہے۔“  
 ”ارے امی!“ یکا یک رشنا نے سسلی کو بلند  
 آواز میں پکارا، اسی وقت جاوید اپنے بچتے ہوئے  
 موبائل کی جانب متوجہ ہوا۔

”جی ہاجی۔“ جاوید نے بوکھلائے ہوئے انداز  
 میں سسلی کو دیکھا اور موبائل کان سے لگائے لاؤنج  
 سے باہر نکلنے کے لیے پرتولے۔ ”من رہا ہوں ہاجی!  
 آپ بولیں نا۔“

آبان ابو کو باہر جاتے دیکھ کے خود بھی پھرتی  
 سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ سسلی یہ سب دیکھ  
 کے ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

”امی سنیں نا۔“ رشنا نے ایک بار پھر سسلی کا  
 کندھا ہلایا۔

”بولو جی، کندھا توڑ کے ہی بات سنانی ہے کیا۔“  
 ”یہ دیکھیں ذرا، کیوں نا اس بار ہم لوگ.....“  
 چپٹی ہوئی آنکھوں سے رشنا نے سسلی کو دیکھا  
 جس کی پچھلی ہوئی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ  
 سکون بھی سما گیا تھا۔

☆☆☆

”امی! ہم اچھے لگ رہے تھے۔“ رومیصہ نے  
 گھوم کے اپنی فراک لہرائی، چہرے کی خوشی چھپانے  
 نہیں چھپ رہی تھی۔

”اور معلوم ہے امی! اچھو کھر رہی تھیں، اس بار تو  
 تمہاری ماں نے کمال ہی کر دیا جی۔“ رشنا نے بھی  
 قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی ماں کو دیکھا جو چہرے پہ فخر یہ  
 مسکراہٹ لیے اپنے بچوں کو ہنسا ہوا دیکھ رہی تھی۔

”شکر بھاری ذمہ داری سے خدا نے خیر  
 خیریت سے نکال دیا۔“ جاوید نے سکون کی سانس

لیتے ہوئے گاڑی کی چابی میز پر رکھی اور خود دھب  
 سے سسلی کے پاس صوفے پہ بیٹھ گیا۔ ”ہاجی کو فرائیج  
 بھی اچھا لگا، بس اب ہر مہینے قسط نکالنی پڑے گی۔“

کسی کروت بدلتے بیٹھنے کی منتظر تھیں۔ رہا آبان تو وہ  
 لڑکا ہونے کی بدولت اس فضول جھگڑے سے دور ہی  
 تھا، اسے علم تھا ماں اور دونوں بہنوں کے بعد اس کے  
 لیے بمشکل اتنے ہی پیسے نکلیں گے جس سے وہ  
 خاموشی سے جا کے سیل سے ایک کرتا لے آئے گا اور  
 ابو کی سفید شلوار کے ساتھ پہن کے بارات میں خوشی  
 خوشی چلا جائے گا۔

”اے لو۔“ سسلی نے تڑپ کے چھوٹے سے  
 لاؤنج کا ماحول اپنی حمایت میں کرنے کی کوشش کی۔  
 ”ایسے بول رہے ہیں جیسے میں لاکھ مانگ لیے  
 ہوں، اسی میں سے دینا دلانا، آنا جانا اور ہم تینوں  
 کے کپڑے لیتے ہوں گے میاں جی۔“

”ہاں تو اب جیب اجازت نہیں دے رہی تو  
 کیا ڈاکا ڈال لوں۔“ بھونپیں اچکا تے ہوئے جاوید  
 نے بے زاری بیٹوں اور خاموش بیٹے کو بغور دیکھا۔ ”تم  
 لوگ ہی سمجھاؤ اپنی ماں کو، شادی میں نئے کپڑوں  
 کے بغیر بھی لوگ ہمیں ہال میں آنے کی اجازت  
 دے دیں گے۔“

”جیسے آپ کو معلوم نہیں نا، ہاجی ذکیہ ہی سب  
 سے پہلے پوری برادری کے سامنے ذلیل کر دیں  
 گی۔“ پٹکنی نے تلخ لہجے میں پھنکار تے ہوئے جاوید  
 کی بڑی بہن کا نام لیا۔ ”انہیں تو موقع چاہیے بس  
 ہمیں بے عزت کرنے کا، اکلوتے بھائی کی جیلی کو۔“  
 ”چلو چھوڑو۔“ جاوید نے سسلی کو خاموش  
 کرانے کی ناکام کوشش کی۔

”اب کیوں چپ ہو جاؤں۔ سنیں نا آپ بھی،  
 میں اتنے لوگوں میں صفائی دیتی پھروں گی آپ کو تو  
 کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن میری شامت لے آتے ہیں  
 وہ سب مل کے۔“ روہاسی سسلی نے جاوید کو ڈیڑھائی  
 آنکھوں سے دیکھا اور بس..... جاوید ان آنکھوں  
 میں ڈوب ہی گیا۔

”کس طرح گھر چلاتی ہوں مجھے ہی معلوم  
 ہے، ہر اہم موقع پہ دینے دلانے میں ہی ہاتھ تنگ  
 ہو جاتا ہے کہ گھر میں سلائی کرنی پڑتی ہے، کیا ہمارا



نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔  
 ”جی جناب۔ یہ خرافات نہیں ہیں، لوگ اس  
 سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو اس میں موبائل کا کیا قصور۔“  
 ”کھل کے کہو۔“ جاوید الجھا۔

”یہ دیکھیں۔“ سلٹی نے یوٹیوب کھول کے جاوید  
 کے سامنے کیا۔ ”میں نے اس میں سے بچوں کے نت  
 نئے انداز دیکھ کے کپڑے سے تھے۔“ آبان کے لیے  
 آپ کی قمیص چھوٹی اور کچھ فنگ کردی تھی، اپنی ساڑی  
 سے رومیسہ کے لیے کلیوں والی فراک اور اپنے جینز  
 کے گونے والے سوٹ سے رشنا کے لیے جدید طرز کا  
 ٹراؤز، لمبی قمیص کاٹ کے چھوٹی کر دی اور بس.....

پوری تقریب میں ہماری واہ واہ ہوئی۔ ”سلٹی رکے بغیر  
 اپنی سمجھ داری اور ذہانت کا بروقت استعمال جاوید کو بتائی  
 چلی گئی۔“ میچنگ دوپٹا تین تین سو کا پڑا، ہر چیز گھر سے  
 نکل آئی۔ میں نے بھی اپنی بھاری ساڑی کاٹ کے قمیص  
 بنائی، رشنا کا ٹراؤز ریمچ کر لیا اور بس.....“

”یہ سب تم نے اس میں سے دیکھا۔“ جاوید ابھی  
 تک حیرت سے بھی سی اسکرین کو گھور رہا تھا جہاں دنیا  
 جہاں کے لوگ سلائی کی میکڑوں سائٹ چلا رہے تھے۔  
 ”اور..... یہ وہی موبائل ہے جسے آپ فضول  
 خرچی کہہ رہے تھے۔“ سلٹی نے جہانی ہوئی نگاہوں  
 سے جاوید کو مصنوعی ناراضی سے دیکھا۔ ”اسی موبائل  
 نے ہماری عزت رکھ لی آج، ورنہ مجھے کیا معلوم جدید  
 فیشن اور مشکل کیمگ کیسے کی جاتی ہے، اس موبائل کی  
 بدولت اتنی آسانی سے سارے کام کر لیے کہ بس.....“

”واقعی، چیزیں خود خراب نہیں ہوتیں ان کا  
 استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔“ جاوید نے سر  
 ہلاتے ہوئے اپنی بیوی کے دونوں ہاتھ تھامے۔  
 ”لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں، تم ہمیشہ میرے لیے  
 بہترین رفیق حیات ثابت ہوئی ہو۔ اس بار بھی  
 اتنے کم بجٹ میں میری عزت رکھ لی تم نے۔“  
 شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ سلٹی نے خود پہ ناز  
 کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

☆☆

”ایڈوانس کے میسج کم تو نہیں پڑے۔“ کچھ  
 جتاتے کچھ احساس گراتے سلٹی نے بھونکیں  
 اچکانیں۔

”تمہارے ہوتے کچھ کم ہو سکتا ہے کیا۔“  
 جاوید نے کھلے دل سے اپنی بیوی کو سراہا۔ ایسے ہی تو  
 نہیں نیک بیوی کی دعا کرتے۔

”بھائی! تم اتنے اسارٹ لگ تھے آج۔“  
 رمیسہ نے فوراً ہی آبان کو لاؤنچ میں آتے دیکھ کے  
 بلند آواز میں اسے پکارا۔ وہ جانتی تھی آبان ابوکا کرتا  
 پہنچے۔

”علی بھائی پوچھ رہے تھے، یہ اسٹائل کہاں  
 سے کا پی کیا تم نے۔“ آبان نے بالا خرشر میلے انداز  
 میں کہہ ہی دیا۔

گہری سانس لیتی ہوئی سلٹی نے آنکھوں کی نمی پی  
 لی، شوہر کا تعریف کرنا اور بچوں کے چہرے پہ سکون ایک  
 عورت کے لیے دنیا میں ملی ہوئی جنت جیسا ہوتا ہے۔

”چلو بچوں! اپنے اپنے کمرے جاؤ اور یہ سب  
 سمیٹ کے جانا۔“ جاوید نے ایک دم بچوں کو مخاطب کیا۔  
 ”ورنہ تمہاری امی کو کرنا پڑے گا، وہ ویسے بھی بہت تھک گئی  
 ہیں، دو تین دن سے تمہارے کپڑے ہی رہی ہیں۔“

جاوید نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دکھ سکھ کی  
 ساتھی کو دلاسا دیا ساتھ ہی احساس بھی دلایا کہ وہ سلٹی  
 سے غافل نہیں تھا۔

”اوکے ابو۔“ رشنا نے پھرتی سے اپنی اتاری  
 ہوئی چوڑی اور سینڈل اٹھائی۔ ”چلو روئی! تم آبان کا  
 کمرہ سمیٹ کے آ جاؤ، میں یہ سب دیکھ لوں گی۔“  
 سلٹی اور جاوید نے اپنے بچوں کو دیکھ کے  
 طمانیت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ویسے یہ آئیڈیا تمہیں آیا کہاں سے سلٹی۔“  
 جاوید نے کب سے دبا ہوا سوال پوچھ لیا۔  
 گہری مسکراہٹ کے ساتھ سلٹی نے ہاتھ میں  
 پکڑا ہوا موبائل جاوید کے سامنے لہرایا۔

”اس کی بدولت۔“  
 ”موبائل جیسی خرافات کی بدولت؟“ جاوید



# گلزار

## دوسری قسط

”ماحور۔ ماحور مغل۔“ وہ ٹھوک نکل کر مکرارتے ہوئے بولی۔ اور چہرے پر لاپرواہی کا تاثر سجائے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔

”آپ پلیز جاییے۔ اپ اسٹیر ز۔ رائٹ سائڈ، فرسٹ روم۔ آپ چاہیں تو لفٹ یوز کر سکتی ہیں۔ میم آپ کا ویٹ کر رہی ہیں۔“

ریسپنشنٹ نے اس سے کہا تو اس نے گردن اکڑائی اور شکریہ کہتی آگے بڑھ گئی۔ یعنی کہ اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ دل کا ایک کونا اپنی اہمیت پر بے ساختہ خوش ہوا تھا۔

”شان دار عمارت میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک نظر اپنے سر پے پر ڈالی۔ ہاتھ سے گھنٹوں تک آتے کھدکے کرتے کی سلوٹیں نکالیں اور اوپر پہنے شرگ کی قال درست کی۔ آج وہ پچھلی بار کی نسبت خاصی بہتر حلیے میں تھی۔ ریسیپشن پر ایرش راٹھور کے لیے میج چھوڑتے وہ خاصی براعتاؤ تھی۔ ریسیپشنٹ نے ایک اچھتی نگاہ اس پر ڈال کر ریسیور کان سے لگایا اور بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا۔

”نام کیا بتایا آپ نے۔“ ریسیپشنٹ نے ایک ہل کو رک کر اس کا نام پوچھا

اس نے میز ہیوں سے جانا مناسب سمجھا۔ وہ اپنی طرف کے پہلے کمرے کا دروازہ ناک کرتے اس نے آنکھیں بند کر کے ایک بھر پور سانس اندر کھینچا اور اعصاب کو ڈھیلّا چھوڑ دیا۔

”کیس پلیز۔ کم این۔“ اندر سے اجازت ملنے ہی وہ تاب گھما کر آفس میں داخل ہوئی۔ مسکور کن خوشبو کا جھونکا اس کی ناک سے ٹکرا کر مزاج پر اچھا تاثر چھوڑ گیا تھا۔ ریوالوگ چیز پر بیٹھا وجود چیز کا رخ گلاس وال کی طرف کیے ہوئے تھا، جہاں سے نرم گرم دیوچپ سیدی جہازی سائز ٹیبل کی گلاس ٹاپ پر پڑ رہی تھی۔

”ایلیکٹرونی۔ میں ماحور ہوں۔“ اسے مقابل کو متوجہ کرنے کے لیے یہی الفاظ مناسب لگے۔





مکمل فون

URDU TUBE

HOME OF ENTERTAINMENT

[www.urduTube.com](http://www.urduTube.com)



نے تو کئی مٹیں مان لی ہیں کہ میری شادی ہو جائے  
بس اور میری اس جنجال سے جان چھوٹے۔ تمہارا  
کام یہ ہو گا مانی ڈیر کہ سمجھو بس اس چیز پر میں بھی  
ہوں۔ لیکن اس ٹیبل پر جو آفیشل میٹر ہے وہ سب  
تمہیں ہینڈل کرنا ہے۔ فائلز، ڈیٹا، ہر چیز تمہیں اپ  
ٹو ڈیٹ رکھنی ہے۔ میری میٹنگز کی ڈیٹیلز اور ان کا  
اورجینٹ منٹ سب تمہارے ذمے۔ یعنی بابا کو مجھ سے  
کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں اچھا سلیوریٹیج  
لے گا۔ الاؤنسز بھی ہوں گے اور میڈیکل ہماری  
کمپنی کے ہر ورکر کا فری ہے۔ بس ایفی ٹینسی شو کرنی  
ہے۔ اسے ٹکس پر دو کرنے ہیں۔ رائے؟“ وہ خوش  
مزاج ہی تھیں، بے تکلف بھی تھی۔ اس نے بہت  
ہلکے ہلکے انداز میں ماحور کو ساری بریفنگ دی تھی۔ وہ  
اب خاصی مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ یہ جاب اس  
کے لیے آسان تھی۔ وہ یہ سب ہینڈل کر سکتی تھی۔  
”تو میں آج یعنی ابھی سے اپنا کام شروع  
کروں؟“ اس نے جھکتے ہوئے پوچھا۔

”اولس آف کورس! دائے ناٹ۔“ بھی میرے  
لیے ہی آسانی ہے اس میں۔ دراصل جب سے بابا  
نے مجھے باؤنڈ کیا ہے آفس میں، میں تو شاپنگ کے  
لیے بھی نہیں جا سکتی۔ اب تم آگئی ہو تو مجھ غریب کو بھی  
ذرا فرصت نصیب ہوگی۔ لیکن تمہیں میرے ہی آفس  
میں بیٹھ کر کام کرنا ہوگا۔ آج تمہاری ٹیبل بہتیں کارز  
پریسٹ کر دی جائے گی۔ رائے۔“

”جیسا آپ کو مناسب لگے میم۔ لیکن کیا آپ  
کے فادر کو اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔“ اسے  
تشویش سی ہوئی۔ کچھ عجیب لگتی تھی یہ بات۔

”ارے نہیں ہرگز نہیں۔ فرسٹ آف آل میں  
تمہارے بارے میں انہیں بتا چکی ہوں، سیکنڈ لی وہ  
میرے آفس بہت کم آتے ہیں۔ اگر آج بھی گئے دین  
آئی ول ہینڈل۔ ڈونٹ یو ڈری۔“ اس نے چٹکی بجا  
کر اسے یوں ریلیکس کیا جیسے سچ میں اسے خود پر بے  
حد مہر و سوا ہو۔ ماحور اس کی پرامن شخصیت سے بہت  
مہربان ہوئی۔

”آئیے۔ آئیے ماحور جی۔ آپ کا انتظار تو ہم  
تب سے کر رہے ہیں جب سے رائے نے آپ کا ذکر  
کیا تھا۔ لیکن آپ تھیں کہ آکر ہی نہیں دے رہی  
تھیں۔“ ریو لوگ چیز کھوی اور ایک انتہائی نازک و  
دلکش حینے نے اس کے استقبال کے لیے چیز سے  
اٹھ کر مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

ماحور جو یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی نے  
ایک دم چونک کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اپنی لٹ کان  
کے پیچھے اڑتے وہ مسلسل ایرش رائٹور کو دیکھے جا رہی  
تھی۔ جو خاکہ اس نے اپنے ذہن میں ایرش کا بنا رکھا  
تھا، وہ اس سے بالکل الٹ تھی۔ مگر کہ اس نے ایرش کو  
کوئی بڑی عمر کی سنجیدہ اور تین سی عورت گمان نہیں کیا  
تھا کیونکہ رائے کی دوست تھی تو ظاہر ہے اس کی ہم عمر  
ہوتی مگر اتنا نازک اندام اور مرمریں سادہ جود بھی اس  
کے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا۔ وہ تو حوض کالج  
گرل لگ رہی تھی جبکہ یہاں وہ اپنے باپ کے آفس  
میں بیٹھی تھی۔ ایک ٹھنڈی آہ ماحور کے سینے سے نکلی۔  
”پلیز۔“ ہو آئیٹ۔“ ایرش نے اسے بیٹھنے کو  
کہا تو وہ خاموشی سے اس کے مقابل براجمان  
ہو گئی۔

”مجھے رائے نے تمہارے بارے میں بتایا تھا  
ماحور۔“ انکیٹ میں نے اسے اپنے آفیشل پرائیو  
کے بارے میں بتایا تھا تب ہی اس نے تمہارا نام  
ریکیمینڈ کیا۔ بقول اس کے تم خاصی ہارڈ ورکنگ بھی  
ہو اور..... اور تمہیں جاب کی سخت ضرورت بھی  
ہے۔“

”وہ“ ضرورت مند“ کہتے کہتے رک گئی۔  
ماحور جھکی سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اب ایسا ہے کہ یار میں بہت بری چھنی  
ہوں۔ بابا نے مجھے زبردستی اپنے آفس میں بھرتی کر  
رکھا ہے جبکہ یہاں کا کام میرے مزاج سے میل نہیں  
کھاتا۔ لیکن میرے بابا اس معاملے میں بالکل  
کیرو مائیزنگ نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک  
تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تب تک کام کرو۔ میں



# ماہنامہ حنا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ  
لاہور

دسمبر 2018 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

2018 کی شمارہ کے ایک بھلائی

☆ "اب ہجر کا استفادہ اور ہے" ملک عمیر اکمل نادل

☆ "اک تیرے نام کی چاہ" امیرناضی اکمل نادل

☆ "تم میرے پاس رہو" درشن بلال اکمل نادل

☆ "میں تقسیم" بشری سیال کانولٹ

☆ "شہر دل کا راستہ" حسین اختر کانولٹ

☆ "بھلی باریش" تحلیہ زاہد کانولٹ

☆ رمشا احمد، محمد عابد، سیما بخت عالم، شام نول

اور نادیہ جہانگیر کے افسانے

☆ "دل گنبدہ" ام مریم کاسٹلے وارنڈال

☆ "پریت کے اس پار کھیں" ثانیہ جیلانی

کاسٹلے وارنڈال

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشلہ نامہ،  
عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور وہ قلم مستقل  
سلسلہ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

دسمبر 2018

”ویسے میرا بشورہ ہے کہ آج تم ریلیکس ہو کر  
گھر جاؤ اور کل سے پر اپر جوائننگ دو۔ کل میں  
اشاف سے تمہارا تعارف بھی کروادوں گی۔“ وہ نرم  
مسکراہٹ ہے اسے دیکھتے ہوئے بولی تو ماحور جواباً  
اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ بیک کندھے پر ڈال کر  
اٹھنے لگی تو ایرش یک دم بولی۔

”ماحور۔ یہاں کے اکاؤنٹ میں تیر  
صاحب، میں ان سے بات کر لیتی ہوں۔ تم انہیں  
ذرا ملتی ہوئی جانا۔ وہ تمہیں ایڈوانس سیکری دے دیں  
گے۔ نیچے جو رپیشنٹ تمہیں مس زد ہا، تم ان سے  
پوچھ لینا، وہ تمہیں تیر صاحب کے آفس تک گائیڈ کر  
دیں گی۔ اوکے۔ دین یو ٹو مارو۔ گڈ لک۔“ ایرش  
نے بات مکمل کر کے فوراً حیرت سے بت بنی ماحور  
کے آگے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جو اس نے  
خواب کی سی کیفیت میں تمام کر چھوڑ دیا۔ سب کچھ  
اس کی توقع سے الٹ ہو رہا تھا اور بہت اچھا ہو رہا  
تھا۔ لیکن اسے یقین کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ اسی کم  
صمیمی کیفیت میں ایرش راہشور کے آفس سے باہر نکل  
آئی۔ اس کے باہر جاتے ہی ایرش نے سب سے  
پہلی کال تیر صاحب کو کی۔ ماحور کی بابت بتا کر فون  
بند کیا اور پھر اپنا سیل فون اٹھایا اور رپو لوٹنگ چیئر  
سے کمر کا کر چھوٹے ہوئے اس نے اگلی کال ملائی۔  
”ہاں۔ ہو گیا کام رائے کی بچی۔ جسے تم نے  
کہا تھا۔ ایڈوانس سیکری بھی مل جائے گی اسے  
حالانکہ یہ بابا کی مینی کارول نہیں ہے۔ لیکن صرف  
تمہاری خاطر یار۔ یو نو ویری ویل کہ نہ تو میں  
اتنی ”ان کمپیٹ“ ہوں اور نہ ہی اتنی کمی۔ لیکن تم نے  
میری گردن پر چھری رکھ کر اس لڑکی کو جواب دلوائی  
ہے۔ اب یہ ذمہ داری مجھے اٹھانی تو پڑے گی نا۔ اچھا  
میلو ڈرامہ ہو تم بھی۔ اب بتاؤ شائینگ کا کیا پروگرام  
ہے۔ میں کل شام میں تمہیں پک کرتی ہوں۔ ذرا  
مستی کریں گے۔“

ایرش راہشور مدھری ہنسی ہستے ہوئے رائے سے  
مزید کیا کہہ رہی تھی، یہ سننے کی زحمت ماحور نے نہیں



کی تھی بلکہ وہ بے حد احتیاط سے دروازہ کھیر گئی تھی۔  
ایک دم ڈھیر سارا پانی آنکھوں میں اکھٹا ہونا شروع  
ہو گیا۔ رائے کی دوستی کمال کے درجے کو چھو گئی تھی۔ وہ  
تو ابرش راٹھور سے محض یہ پوچھنے کے لیے پلٹی تھی کہ  
صبح اسے آفس کتنے بجے تک پہنچنا ہوگا اور یہ پلٹنا  
اسے رائے کا مزید زبردبار کر گیا۔

ابرش راٹھور کو سی ہیلنگ بینڈ کی ضرورت نہیں  
تھی، اس نے بھی محض رائے سے دوستی کی خاطر ماحور  
کو جواب دی تھی۔ ماحور ابرش کی اعلاظرفی کی بھی  
قائل ہو گئی۔ بھلا کوئی خود کو دانستہ نااہل ثابت کرتا  
ہے کیا؟

لفٹ میں گراؤنڈ فلور کا مین بریس کر کے ماحور  
نے دیوار کے ساتھ سر فیک کر چند لمحوں کو آنکھیں موند  
لی تھیں۔ وہ اس وقت بے حد آسودگی محسوس کر رہی  
تھی۔ ہر شے کی آڑ میں فرار خفی چھپی ہوئی ہے۔ آج  
اسے یقین ہو گیا تھا۔

☆☆☆

گھر واپسی پر پہلی دفعہ وہ خالی ہاتھ نہیں تھی۔  
اس کے ایک ہاتھ میں موسی پھلوں سے بھرا شاپر تھا  
اور دوسرے ہاتھ میں برگرز تھے جو وہ اپنے بہن  
بھائیوں کے لیے فاسٹ فوڈ کارنر سے پیک کروا کے  
لائی تھی۔ اس نے پانی کا بل بھی ادا کر دیا تھا اور گلی  
کے کٹڑ پر دو دوہ والے کی دکان پر ٹھہر کر اس کا حساب  
چیک کیا اور آئندہ کے لیے دو دوہ میں ایک کلوا کا اضافہ  
کرواتے ہوئے اس کی گردن میں تپاؤ سا تھا۔ اس  
کے قدم آج اٹھتے کہیں تھے اور بڑتے کہیں تھے۔

اکاؤنٹنٹ سرنر سے پیشگی تنخواہ لیتے ہوئے  
ایسے زور کا چکر آیا تھا۔ دل کو دہم ہوا کہ شاید اتنی بڑی  
رقم کسی اور کو دینے لگے ہوں گے مگر جب انہوں نے  
وہ پیسے لفافے میں ڈال کر چندر کی کارروائیوں کے  
بعد اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”لجیے مس ماحور آپ کی ایڈوائس سہلری۔ لیکن  
آئندہ سے آپ کی سہلری آپ کے بینک اکاؤنٹ  
میں ٹرانسفر کر دی جائے گی۔“ تو ایک بل کو اس کے

آگے پوری بلڈنگ ہی ناچنے لگی۔ ہاتھ پاؤں شل  
سے ہو گئے۔ وہ اس تنخواہ کا تہائی حصہ کمائی تھی اور  
چار گنا محنت کرتی تھی۔ اس نے بھی خواب میں بھی  
نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اس کے بینک میں اتنے  
پیسے ہوں گے۔ آج اس کا بس چلتا تو وہ سارے  
پیسوں سے اپنے بہن بھائیوں کی خواہشات پوری کر  
دیتی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے چہرے پر  
چھائی خوشی نے سیف اور ریان کو ٹھٹکا دیا۔ وہ دونوں  
بے تابانہ اس کی طرف لپکے۔ ماحور نے ہاتھ میں  
تھامے لفافے میز پر رکھے اور دونوں کو گلے سے لگا  
لیا۔ ایک بار پھر آنسو بہتے چلے گئے۔ سیف نے بڑی  
محبت سے بہن کا ہاتھ چوم کر اسے کرسی پر بٹھایا۔  
ریان پانی لے آئی اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا  
دیا۔ جنت اور زہان بھی کمرہ سے نکل آئے۔  
دونوں چھوٹے تھے لہذا سیدھا شاپروں پر لپکے۔ یہ  
بہت بڑی عیاشی تھی جو ان کے گھر آتی تھی۔

”مجھے چاہ لگتی سیف۔ رائے کی فرینڈ کے  
آفس میں۔ اتنی تنخواہ ہے۔ اتنی تنخواہ ہے کہ.....“

”کہ میرا مینے کا سگریٹ کا کوئڈ آرام سے پورا  
ہو گا اب۔ لے بھی گھٹیل مغل، تیری بھی سنی گئی۔“

مغلیل مغل نے بڑے صوبح پر پہنچ کر اس کی  
بات کاٹی تھی۔ وہ جو بڑے جوش سے خوشی بانٹنے لگی  
تھی، بالکل چھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ سارے میں  
ایک دم خاموشی چھا گئی۔ جب سے مغلیل مغل نے  
ریان کو زخمی کیا تھا، دونوں چھوٹے تو خاص طور پر  
باپ سے کترانے لگے تھے، سیف اور ریان کی بھی  
نکوش ہوتی کہ کم سے کم باپ سے سامنا ہو۔

ماحور نے سر و نظروں سے باپ کو دیکھا، جن  
کے ہر انداز میں اسے پہلی بار ہٹ دھرمی کے ساتھ  
دیدہ دلیری بھی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا  
جیسے آج سچ پیسے چھیننے کے بعد ان کی جھجک جاتی  
رہی۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ ماحور اتنا آسان  
ہدف ہو سکتی ہے۔ ملاحق باہر ادھار کی خاطر جوتیاں



دیکھو۔ یہ چائے ”ارنج میرج“ کی طرح ہے، ایک دفعہ گلے پڑ جائے تو مرکز جان نہیں چھوڑتی۔ جو اس کے ساتھ راسی، اسے کسی اور کی حاجت نہیں رہتی۔ کچھ سمجھے بیٹا جی۔“

”آہم۔“ سالک پاشا نے گلا صاف کیا اور بولا۔ ”آپ کا یہ فلسفہ میں اوروں سے صغیر ضرور کر سکتا ہوں۔ مگر اسے اپنا نہیں سکتا۔ وہ کیا ہے نا کہ ارنج ہو یا لو، دونوں شادیوں کے لیے میں نے ”کافی“ کو بطور پینا نہ شخص کر رکھا ہے۔ اب دیکھیں میرے گلے کون سی والی میرج پڑتی ہے۔ ارنج یا لو۔ یا پھر میں کافی کو ہی خیر باد کہتا ہوں۔“

”ہالیا۔“ عادل پاشا نے بے ساختہ ہتھ بٹکا لگایا تھا۔ ”تم واقعی باتیں بنانے میں مہارت رکھتے ہو۔ تم میں مجھے اپنا آپ نظر آتا ہے۔“ بھی میں بھی ایسا ہی حاضر جواب تھا۔ اب تمہیں دیکھتا ہوں تو جیسے گیا وقت سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔“ انہوں نے محبت سے بیٹے کو دیکھا۔ سالک پاشا نے میز پر رکھے باپ کے ہاتھ کی پشت کو عقیدت سے دبا یا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ عادل پاشا کے لب وا ہوئے مگر پھر جڑ گئے۔

بہت کچھ تھا جو ان کا ہا ساز بان پر بچتا تھا مگر کافی عرصہ ہوا، ایک بے نام ساجاب دونوں باپ بیٹا کے آڑے آ چکا تھا۔ بہت وقت بیت چکا جب پورا گھر ان دونوں کے قہقہوں سے گونجا کرتا تھا۔ ناشتے اور کھانے کے وقت میز پر چھری کانٹے کے بجائے ان دونوں کی آوازیں گھنکتی تھیں اور پھر سب بدل گیا۔ جیسے سارا فسون ایک جھٹکے سے گبولے کی صورت چکر کھاتا، سکوت کے صندوق میں بند ہو گیا۔ اب دونوں پہلوں بیٹاتے تھے ایک دوسرے کے ساتھ مگر ایک ٹکلف سادہ آیا تھا، ایک دیواری اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس تمام صورت حال کی وجہ بالکل سامنے والی کرسی پر چپ چاپ بیٹھی خاشی سے سلاکس کو چھوئے چھوئے نوالوں کی صورت زبردستی حلق میں اتار رہی تھی۔ تاہم پاشا۔ عادل پاشا کی دوسری بیوی۔ سالک پاشا کی سوتیلی ماں۔

چلتے تھے۔ اب ماحور کی نوکری لگی تھی اتنی شاندار تو اس کی تنخواہ میں سے کیا وہ اتنا بھی نہ بنو کہ تمہیں بھر آرام سے چرس والے سگریٹ پی سکتے۔ انہوں نے سب کی چھتی نظروں سے خطا اٹھاتے ہوئے جیب سے ایک سگریٹ نکالی اور ماچس جلا کر اسے سلگایا۔ ماچس کی تلی دو انگلیوں سے اچھال کر سیف کے منہ پر ماری اور ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ جاتے جاتے سب سے کھڑے زوہان کے ہاتھ میں پکڑے شاپرے ایک برگر نکالا، جنت کے ہاتھ سے دو مالے پکڑے اور کمرے میں گم ہو گئے۔

پیچھے سارا ماحول ہوجھل ہو چکا تھا۔ ماحور کی آنکھوں میں تفکر لال ڈورے بن کر تیرنے لگا۔ سیف نے ایک زوردار سیٹی مار کر تالی بجائی اور اس سکوت کو توڑا۔

”چلو، چلو۔ جلدی سے برگر نکالو۔ آج تو دعوت ہے ہم سب کی۔ چلو جنت۔ کچن سے ضروری برتن پکڑ لاؤ اور زوہان تم لی وی آن کرو۔ چلو بھی چلو۔“

اس کے کہتے ہی سب میں ہلچل پیدا ہوئی اور کچھ ہی دیر میں وہ سب بہن بھائی اونچا اونچا ہنستے بولتے کھانا کھا رہے تھے۔ ماحور بھی بظاہر ان کے ساتھ باتیں کر رہی تھی مگر اندر سے ایک انجانا خوف اپنی جڑیں اس کے وجود میں گاڑے جا رہا تھا۔ اسے بابا کے تصور بہت کھل رہے تھے۔ وہ آج پہلی دفعہ ان سے بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وسیع و عریض کھانے کی میز کی آرام دہ کرسی پر بیٹھا وہ بڑے اہتمام سے ناشتا کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ میز پر پھیلے اخبار پر بھی نظر مارتا جا رہا تھا۔ ملازم گرم گرم بھاپ اڑاتا کافی کا گگ اس کے سامنے سلیقے سے رکھ گیا تھا۔ سربراہی کرسی پر براجمان عادل پاشا نے چائے کی طویل چسکی لیتے ہوئے مسکرائی نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا اور بولے۔

”بیٹا جی، ابھی چائے کا لطف بھی اٹھا کے



میں آپ کے بیٹے کے دل میں اپنے لیے جگہ نہیں بنا پائی۔ میں جس کام کو بے حد آسان سمجھتی تھی، وہ اتنا تھل نہیں تھا۔ مجھے سالک سے کوئی شکوہ نہیں عادل۔ آپ ہیں تا میرے پاس۔ آپ کا ہاتھ اور ساتھ جب تک میری پشت پر ہے مجھے کسی بات کی پریشانی لینے کی بھلائی ضرورت۔ آپ بھی فینشن نہ لیا کریں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

”ان شاء اللہ“ عادل پاشا نے محبت سے اپنی بیگم کا ہاتھ تھام کر لیوں سے لگایا۔ ان کے وجہہ چہرے پر یک دم عجب سے تاثرات نمایاں ہوئے جنہیں ناعمہ پر کھنے سے قاصر تھیں۔ اسی لمحے ان کے سیل پر کال آئی تو وہ اٹینڈ کر کے کسی سے بات کرنے لگے۔

ناعمہ نے ان کا دھیان بننے پر سکون کا سانس لیا مگر اندر سے وہ مکمل طور پر بے چین ہو چکی تھیں۔ سالک کا رویہ ہر بار انہیں توڑ کر رکھ دیتا۔ انہوں نے اس کی ماں کی جگہ نہیں لی تھی بلکہ وہ اس کی ماں کی خالی جگہ پر آئی تھیں مگر سالک نے انہیں بھی کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ ان کی آنکھوں کو کوٹنے بھیگنے لگے تو انہوں نے اپنا چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگالیا، مراد عادل پاشا کی نگاہ ان پر پڑ جائے۔ ان کے بالکل سامنے سالک کی کرسی خالی پڑی تھی اور اس کے کافی سے بھرے گگ سے ابھی تک بھاپ اٹھ رہی تھی۔ جسے وہ شادی کے ذکر پر ادھورا چھوڑ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ بڑے آف موڈ کے ساتھ آفس آیا تھا۔ اور اس کے اسٹاف کو بھی اس بات کا اندازہ بخوبی ہو گیا تھا کیونکہ جب بھی وہ بڑے موڈ میں ہوتا تو سب سے پہلے بیون کو کافی لانے سے منع کر دیا جاتا، وگرنہ آفس آنے کے بعد اسے دماغ چلانے کے لیے کافی درکار ہوتی تھی۔

مومن نے اپنے کیمین کی گلاس وال سے جھانک کر ایک نظر آفس کے بند بلائینڈز پر ڈالی اور

”ناعمہ۔ ٹھیک سے ناشتا کریں آپ۔ آپ کے ڈاکٹر نے مجھے آپ کی فزیکل فٹنس کے حوالے سے خبردار کیا ہے۔ آپ اپنی خوراک کا خیال رکھیں ورنہ مجھے مجبوراً وائٹ ڈاکٹر کسی کثیر ٹیکر کا انتظام کرنا پڑے گا، جو آپ کا مکمل خیال رکھ سکے۔“ ناشتا جوں کا توں پڑا دیکھ کر عادل پاشا کو بیوی کو کتنا پڑا تھا۔ وہ کئی دن سے محسوس کر رہے تھے کہ ناعمہ پہلے کی نسبت زیادہ کم مہم ہو گئی ہیں۔

”میں ٹھیک ہوں عادل۔ آپ وہ ہم نہ کیا کیجیے اور ڈاکٹر کی بات پر بھی کان ذرا کم دھرا کریں۔ اصل میں سارا دن گھر پر رہ کر بور ہوئی ہوں۔ میں اتنی سوکھ ہوں نہ میری اتنی فریڈز ہیں۔ بس اسی وجہ سے طبیعت میں قنوطیت بھری جا رہی ہے۔ ہاں۔ ایک راستہ ہے میرا دل لگانے کا۔ اگر رورررر۔ سالک بیٹا شادی کے لیے ہاں کہہ دیں تو۔“

”ایکسپوزی۔“ وہ بے زاری سے کرسی پیچھے کھسکا تا کھڑا ہوا۔ ہاتھ میں تھامے نیپکن سے ہونٹوں کو تھپتھپا کر اسے میز پر بچھا اور اپنا موبائل اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر بنا کسی کی طرف دیکھے ڈائنگ روم سے نکلتا چلا گیا۔ عادل پاشا نے پہلے تا سٹف سے اس کی خالی کرسی کو دیکھا اور پھر ناعمہ کی جانب دیکھ کر پھیکا سا مسکرائے، جن کا رنگ مارے خفت کے اڑسا گیا تھا۔

”میں آپ کو تسلی کے دو بولوں سے نہیں بہلاؤں گا ناعمہ، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اتنا وقت گزر جانے کے بعد ان کی قدرو قیمت صفر ہو چکی ہے۔ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔ سالک کے رویے نے مجھے آپ سے نگاہ ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ وہ شرمندہ سے سر جھکائے چائے کے کپ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولے تو ناعمہ نے فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے ان کی کلائی پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا۔

”پلیز۔ ایسا مت کہا کریں۔ شرمندہ تو میں ہوں آپ سے کہ اتنا وقت بیت جانے کے باوجود



پھر اپنی جیب سے سیل نکالا اور اسے ٹھوڑی سے ٹکا کر چند پل ریو لوگ، جیر پر جھولتے کچھ سوچنے میں بتائے پھر کانسٹیکٹسٹ میں سے ایک نمبر نکال کر کال ملائی۔ غیر محسوس طور پر اس کے لب مسکرانے لگے۔ دوسری طرف سے کال تو پک ہو گئی مگر لہجہ بے حد سرد ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ مسکراتے سے یک دم یوں لگے جیسے کسی کو گدگداتے ہوئے اچانک کس کے ”چیڑ“ مار دی گئی ہو۔ ایک پل کو تو اس کا دل چاہا کہ ابھی فوراً کال کاٹ دے مگر عین اسی پل اس کے کانوں نے ماحور کا لٹھ مار لہجہ سنا۔

”اگر بولنا نہیں تو کیا نبض چیک کروانے کے لیے کال کی ہے۔ ہاں۔ بولو؟“

”نبض تو نہیں چیک کروانی۔ ہاں دل یہ ضرور کرتا ہے کہ تمہاری زبان چپک کر واؤں۔ بہت تیز ہے۔“ وہ مدھم لہجے میں مگر چاچا کر بولا۔ ماحور اس کی آواز پہچانتے ہی ٹھک گئی۔ اسے یاد آیا کہ جس دن مومن تراب نے اسے مگر ڈراپ کیا تھا تو اس سے سیل نمبر لیا تھا۔ مگر وہ بھول گئی تھی اور خود ماحور کے پاس اس کا نمبر سینو نہیں تھا۔

”ارے آپ تھے تو تعارف تو کرا دیجئے تا فوراً۔“ مومن چار باتیں سنیں۔ ”کیسے کہیں ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ سوچا آپ کی خیریت معلوم کر لوں۔ سب کچھ ٹھیک تو رہا تا اس رات؟“ اسے پوچھنے کے لیے کوئی خاص بات نہ سوچھی تو اسی رات کا ذکر کر چھیڑ دیا۔ جواب میں پل بھر کی خاموشی کے بعد خاصا ترخ کے کہا گیا۔

”نہیں۔ بالکل بھی نہیں بلکہ اس رات زمین شق ہوئی اور آسمان ٹوٹ کر میرے سر پر گر پڑا۔ بارہ ٹانگے آئے۔ بس کچھ نہ پوچھیں۔“

”ہیں۔“ اس ”ہیں“ میں غضب کی حیرانی چھپی تھی۔ ”آریو سیر لیس۔ سیرا مطلب ہے کہ.....“

”نا تو مجھے یہ بتائیں کہ کیا سنا چاہ رہے ہیں آپ۔ یہی کہ مجھے آپ کی گاڑی سے اترتے کسی ”وبیلے“ محلے دار نے دیکھ کر بابا سے میری شکایت کر

دی اور پھر انہوں نے میری خوب درگت بتائی۔ یا پھر اس ریسٹورنٹ کے مالک مختار چول نے مجھے دوبارہ سے ہراساں کرنا شروع کر دیا ہے۔ حد ہو گئی، بندہ کوئی پوچھنے والی بات پوچھے۔ یہ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں آپ۔“

”واللہ۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں پوچھا۔“ وہ کرلا کر بولا۔

”یہ اب کہہ رہے ہیں ورنہ پوچھنا ہی تھا آپ نے۔“ ماحور کی زبان کو بریک لگنی مشکل تھی۔ ”چلو خیر۔ ان باتوں کو چھوڑیں۔ نوکری کا پوچھیں اب۔“ وہ خود ہی پلیٹ میں رکھ کے اسے سوال پیش کر رہی تھی

”نوکری۔ کیسی نوکری۔؟“ وہ اس کی بات سمجھا نہیں۔

”ایسی ویسی۔ بالکل آپ جیسی۔“ اس نے چٹکارہ بھرا۔

”اوہ۔ اچھا اچھا۔ تمہیں جاب مل گئی۔ یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ ورنہ مجھے خاصی فکر تھی تمہاری۔“

”کیوں۔ آپ میری امی لکھتے ہو۔ ہونہ۔ فکر تھی۔“ ماحور نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ ”اتنی فکر ہوئی نا تو کبھی بھی اس دن میرے ساتھ چالاکی نہ کرتے۔ سمجھے۔ یہ تو اپنی نوکری کا اس لیے بتا رہی ہوں کہ آپ کو معلوم ہو کہ مجھے کسی شان دار جاب ملی ہے۔ آپ کو کیا لگتا تھا کہ مجھے کہیں جاب نہیں ملے گی بھلا۔ ایسی شاندار جاب ہے کہ بتاؤں تو ہوش اڑ جائیں گے آپ کے۔ اسمارٹ سیلری اور دیگر سہولیات علیحدہ۔ بس سمجھو کہ جو ٹانگ آپ نے چھینے تھے نا۔ اللہ نے اسی ٹانگ پر کھڑا کر دیا دوبارہ۔“ وہ خود ہی سوالی، خود ہی جواب کی عملی تفسیر بنی اسے لگ لگائے ہوئے تھی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی آخر ہے کیا۔ حد ہو گئی۔ ہمدردی کرنے کے پکر میں ہزاروں باتیں سن لی تھیں۔ وہ بھی ایوں۔

”اچھا نہیں۔ وہ ایسا ہے کہ مجھے ابھی بہت کام ہے۔ نئی نئی جاب ہے نا تو ذرا لوڈ زیادہ ہے۔ اور آپ بھی دوسروں کی کن سونیاں لینے کے بجائے



طرف جاتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ  
ناچ رہی تھی۔

☆☆☆

انٹرکنٹیننٹل روم میں ہر سکون سی خاموشی تھی۔  
ماحور مصروف سی فائلز پر جھکی تھی جب کہ اس کے  
بالکل سامنے ریوالونگ چیز پر جھولتی ایرش نیل فاکر  
سے ناخن فائل کر رہی تھی ساتھ ہی گاہے بگاہے ایک  
اکٹائی ہوئی نظر ماحور پر بھی ڈالتی۔ کچھ دیر بعد اس  
نے فاکر میز کی دراز کھول کر اس میں پٹا اور ماحور  
سے بولی۔

”مجھے یقین نہیں ہوتا کہ تم رائیڈ کی دوست ہو۔  
اتنی ڈل اور پھمکی۔“ اس کے یوں کہنے پر ماحور نے  
ایک دم ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔

”کیوں؟ کیوں میم! مجھ سے کوئی غلطی ہوئی  
ہے کیا؟“ اس نے ایک نظر اپنے حلیے پر ڈالتے  
ہوئے پوچھا تو ایرش نے برا سامنہ بنا کر اسے دیکھا  
اور کہنے لگی۔

”تم انسان ہو یا روبوٹ؟ بس ہر وقت فائلز  
میں بندھے دیے رہتی ہو یا کمپیوٹر کی اسکرین نہار رہتی  
ہو۔ تمہیں اپنے ہی روم میں بٹھایا کہ چلو اتنی پیاری  
لڑکی ہے، باتیں بھی پیاری کیا کرے گی مگر تم تو جیسے  
گھر سے حلق اٹھا کر نکلتی ہو۔“ میں نہیں بولنا۔“ یار  
کوئی بات کیا کرو۔ فیشن کی، آرٹ کی۔ یا شاؤپنگ کی  
اور کچھ نہیں تو ”آج کیا پکانا ہے“ پوچھ لیا کرو۔ آج  
کل کی خواتین کا پہلے پہر کا سب سے زیادہ پوچھا  
جانے والا سوال ہے یہ۔“

ماحور نے فائل بند کی اور پین وولڈر میں لگاتے  
ہوئے تسخیر انداز میں بولی۔

”فیشن میں نے بھی کیا نہیں اور میرے گھر کا  
سب سے بڑا آرٹ اپنے جذبات و احساسات کو نقل  
کرتا ہے۔ اپنی ضرورتوں کو نکالا گھوٹتا ہے۔ مشکل اور  
تنگی میں بھی سروائیو کرتا ہے اور جہاں تک کچھ کہنے کی  
بات ہے تو میرے گھر ہمیشہ سے سبزی پختی آتی ہے  
جو سبزی والا اس خیال سے سائڈ پر کرتا ہے کہ وہ کہنے

کام پر دھیان دو۔ آج کل اچھی نوکریاں ملتی ہی  
کہاں ہیں۔ اچھا رہتی ہوں۔ اللہ حافظ۔“

”ائف!“ کب سے انکی ایک طویل سانس  
خارج کرتے مومن نے اپنے کالوں کو پھلایا اور  
پیشانی مسلی۔ کس قدر بولتی تھی لڑکی اور خواہ میں  
بولتی تھی۔ اس کے دماغ کی چوٹیں ابھی بھی ماحور کی  
آواز سے لرز رہی تھیں۔ اس نے ایک اچھتی نگاہ ارو  
گرد پر ڈالی۔ سب اپنے اپنے کمپیز میں مصروف  
تھے۔ سیٹ سے ٹیک لگا کر خود کو آرام دہ پوزیشن میں  
لا کر اس نے دونوں ہاتھ سر کی پشت پر باندھے۔  
شہادت کی انگلی سے سر کی جلد کو کھجاتے ہوئے بے  
اختیار اس کے ہونٹ مسکرانے لگے تھے۔

”دوسروں کی کن سونیاں لینے کے بجائے کام  
پر دھیان دو۔ آج کل اچھی نوکریاں ملتی ہی کہاں  
ہیں۔“

ماحور کی ڈنٹے والے انداز میں کہی گئی بات یاد  
آ کر اسے ہنسنے پر مجبور کر گئی۔ وہ ہنس رہا تھا۔ دیکھتے  
سے، ہولے سے۔ اتنی آواز سے کہ صرف اس کے  
کانوں کی رسیاں ہو۔ اسے ماحور کی کہی ہر بات اب  
مزادے رہی تھی۔ وہ اپنی طرز کی انوکھی لڑکی تھی اور یہ  
ماننے میں اسے کوئی عار نہیں تھا۔ اسے جاب مل  
جانے کے خیال نے اس کے اندر تازگی سی بھر دی  
تھی۔ دل پر دھرا کئی دنوں کا بوجھ یک دم ہٹ گیا۔  
اس وقت اس کا دل روئی کے گالے سا ہلکا ہلکا عجب  
ہی لے پر گنتا رہا تھا۔ ایک بیک اس کے جی میں  
ماحور کو ایک نظر دیکھنے کی چاہ آئی جسے اس نے سر  
جھٹک کر نظر انداز کر دیا۔

”ایکسیکو ز می مومن۔ آپ کو سر ساک نے  
اپنے آفس میں بلایا ہے۔ ساتھ میں ”راٹھور اینڈ کو“  
کی فائل لے جائیے گا۔ سر نے مانگی ہے۔“

کوور کرتا شانے اس کے کمین میں جھانک کر  
ساکک پاشا کا میج دیا اور چلی گئی۔ مومن کا دھیان  
بٹ گیا تھا۔ وہ فوراً سیدھا ہوا اور اپنی میز کی دراز سے  
فائل نکال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ساکک پاشا کے آفس کی



ہیں۔ منہہ!“

”اب آپ زیادتی کر رہی ہیں میم۔ ایسا بھی نہیں ہے۔“ ماحور نے ہنستے ہوئے اس کی بات کی نفی کی۔ تو وہ دونوں کہنیاں گلاس ٹاپ پر ٹکائی آگے ہوئی اور میسکین سی شکل بنا کے بولی۔

”چھوڑو ماحور۔ ماما کہتی ہیں کہ تمہیں کسی دن کچھ پکانا پڑ جائے تو صبح کے نو بجے سے لے کر بارہ بجے تک۔“ کیا پکاؤں، کیا پکاؤں ”کیا شور ڈالے“ رقتی ہوا اور پھر آخر میں آلو پکا کر بیٹھ جاتی ہو۔ چلو جی خلاصی ہوئی۔“

بھر پور ہتھ ماحور کے حلق سے آزاد ہوا اور سارے میں پھیل گیا۔ وہ ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔ اور ایسے میں اس کی سفید رنگت میں سرخی بڑی شدت سے نمایاں ہوئی۔ مدت بعد وہ کھل کر ہنسی تھی۔ آسودگی حراج بدل دیتی ہے۔ اس کے مزاج میں بھی نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ ایرش نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پھر ممسی سی صورت بنا کر لپ ٹاپ پر جھک گئی۔ کچھ دیر میں اسے میٹنگ روم میں پہنچنا تھا۔ جہاں اس کے بابا منصور راتھور کی ”پاشا انڈسٹریز“ کے ساتھ میٹنگ تھی اور اس کی موجودگی ناگزیر تھی۔ پھر بھی وہ جان بوجھ کر میٹنگ کا ٹائم گزرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بہت بوریت محسوس کرتی تھی ایسی میٹنگز میں۔ ابھی بھی اس کی کوشش تھی کہ بالکل آخری لمحوں میں وہاں قدم رنجہ فرمائے۔

آفس کے باہر چھوٹی سی لابی سے نذر کر میٹنگ روم کی طرف جاتے ساتک پاشا کے قدم مترنم ہنسی سن کے چند بل کو تھم سے گئے مگر اسے منصور راتھور کے پی اے کی تقلید میں قدم بڑھانے پڑے۔ وہ یہاں ”راتھور اینڈ کو“ کے ساتھ عادل پاشا کے کہنے پر اگلے پروجیکٹ کی ڈیل فائل کرنے آیا تھا، اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔ دھیان بار بار اسی ہنسی کی طرف لپک رہا تھا۔ دل میں یہ خواہش شدت سے بیدار ہوئی کہ بننے والی کا چہرہ بھی دیکھے۔ اس نے ایک نظر پلٹ کر آفس کے بند دروازے کو دیکھا، جس پر

کے قابل نہیں ہوتی۔ ہاں! ایسی سبزی کو پکانا اور ذائقے دار بنانا واقعی ایک آرٹ ہے جو میں نے خاصی کم عمری میں سیکھا۔“ اس کی آنکھیں خود اذیتی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اگلے ہی پل اس نے خود کو کمپوز کیا اور بامشکل مسکراتے ہوئے بولی۔ ”چلیں چھوڑیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ کی بوریت دور کرنے کے لیے میں کیا کر سکتی ہوں؟“ وہ اب بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔

ایرش کو رائے اس کے گھریلو حالات کے متعلق کافی حد تک آگاہ کر چکی تھی اس لیے وہ اس کی تکلیف سمجھ سکتی تھی۔ اس کا دھیان بنانے کے لیے وہ چلیے انداز میں بولی۔

”سوچ رہی ہوں شادی کروالوں۔ مگر ماما کہتی ہیں، پہلے کچھ عقل سیکھ لو۔ پاپا نے عقل سکھانے کے لیے اپنے آفس لانا عقل تو مجھے پھر بھی نہیں آتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو بھی اسے بھی میں سارے آفس میں تیر کا تقسیم کر چکی ہوں۔ بس ذرا سی رہ گئی ہے، وہ میں نے تمہیں وان کرنے کا سوچا ہے۔“ ایرش اوٹ پٹانگ بولنے میں طاق تھی، اس بات کا اندازہ ماحور کو ہو رہا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے پوری توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی جبکہ ایرش کے تاثرات مکمل طور پر سنجیدہ تھے۔ وہ مذاق کرتے وقت خود بالکل نہیں ہنستی تھی۔

”ماحور بی بی۔ لکھ لو میری بات۔ عقل سے گھر نہیں بستے۔ بلکہ ڈنڈے کے زور پر بستے ہیں۔ اب ریڈنڈا اچھلے بیوی برسالے پاشور۔ جس کا داؤ چل گیا سمجھو پھل گیا۔ کیا سمجھیں؟“ وہ مدبر بنی پوچھ رہی تھی۔ ماحور نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

”وہیے میں سیریسلی سوچ رہی ہوں کہ ایونٹک میں کوئٹنگ کلاسز جوائن کر لوں۔ کل کو میں بھی سسرال والوں کو ایک پلیٹ سالن پر ایک کلو کی گارزنگ کر کے کھلاؤں گی تو میری بھی شو بن جائے گی۔ آج کل اصل بکے کو کوئی بھی نہیں دیکھتا، سب ہی ”سجاوٹ“ کے ٹائمر پیاز کھا کے پیٹ بھر لیتے



”ایرش راٹھور۔ سی ای او“ کے نام کی پلیٹ لگی تھی۔ جہاں سے آتی ہنسی کی آواز اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔

☆☆☆

ماحول بہت خوش گوار تھا۔ میٹنگ کا میاب رہی تھی اور اب فارل فضا قدرے دوستانہ محسوس ہو رہی تھی۔ عادل پاشا نے بھی دوران میٹنگ ان لوگوں کو جوائن کیا تھا۔ منصور راٹھور سے اچھی علیک سلیک بھی ان کی اور اب کاروباری مراسم بھی سننے والے تھے۔ لیکن سالک سے یہ منصور راٹھور کی پہلی ملاقات تھی۔ انہیں سالک پاشا بہت پسند آیا تھا۔ ظاہر ہے بیٹی کے باپ تھے، ہر پہلو سے سوچتے اور پرکھتے تھے۔ جس وقت ایرش نے اندر قدم رکھا اور منصور راٹھور نے اس کا تعارف کروایا تو بے اختیار سالک پاشا کا جھکا سر اٹھا۔ یہی نام بالکل یہی نام ابھی ابھی وہ اس آفس کے باہر گی نیم پلیٹ پر بڑھ کر آیا تھا۔ اس کے دل نے ایک ہارٹ بیٹ مس کی۔ وہ بہت حسین تھی۔ اتنی کہ بے اختیار دوسری نگاہ پڑی تھی۔ حسن تھا تو نزاکت بھی بے بہا تھی۔ سالک پاشا چند لمبے لمبے لمبوت سا ہوا مگر پھر فوراً حواسوں میں لوٹ کر خود کو ٹھہر کا۔ عادل پاشا نے بھی اس کی محویت کا نوٹس لیا اور زیر لب مسکرا دیے۔

ایرش، سالک کے بالکل سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ چکی تھی۔ سالک پاشا پر نگاہ پڑتے ہی اس کی نگاہیں بھی چند لمبے لمبوت کیوں اور پھر بار بار اٹھ کر ہنسی رہی تھیں۔ اس قدر کشش تھی سالک پاشا کی شخصیت میں کہ وہ دم بخود تھی۔

بات چیت کا آغاز کب ہوا اور کب اختتام۔ سالک کے کان مسلسل ایرش کی جانب ہی لگے رہے۔ وہ اسے ہنستے سنا چاہتا تھا۔ ایک بار اور پھر بار بار اسے اپنی کیفیت پہ بیک وقت ہنسی آ رہی تھی اور اب محسن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ معمولی نوعیت کا بھی رنگین جڑان نہیں تھا اور نہ ہی مخالف صنف سے دوستی رہی تھی اس کی۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے شب

صورت چہرے بھاتے نہیں تھے مگر وہ خوب صورتی کے پیچھے لپٹنے والوں میں سے نہیں تھا۔ جہاں دیکھا وہیں بھول گیا۔ لیکن آج ایک ہنسی کی آواز نے اسے باندھ لیا۔ اس نے عادل پاشا اور منصور راٹھور کو آپس میں مصروف دیکھا تو ایرش کو پوچھی مخاطب کر لیا۔ ”اور آپ کے مزید کیا مشاغل ہیں مس ایرش؟“

”میں ”مس“ کو ”مسز“ میں بدلنے کے لیے پابندی پلٹی رہتی ہوں۔“ وہ مسکین شکل بنائے اس انداز میں بولی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی سالک کو ہنسی آ گئی۔ ان دونوں کے درمیان میں میز بھی، جس کی شفاف سطح پر ایرش کہیاں نکالتی ہوئی بولی۔

”ویسے آپس کی بات ہے میں شادی کروانے میں بہت انٹر سٹڈ ہوں لیکن کہا ہے تاکہ جولا کا ماما، پاپا کو اچھا لگتا ہے وہ مجھے پسند نہیں آتا ہے اور جس پر میں نظر رکھتی ہوں، اسے نظر ہی لگ جاتی ہے۔ ایک دو ہفتوں میں کسی اور بہتا کو ہنسی کی رنگ پہنارہا ہوتا ہے۔ ایڈیٹ!“

سالک جو بے نیازی سے اس کی بات سنتا پانی کے گلاس سے گھونٹ بھر رہا تھا، اسے ٹھٹکا دو بھر ہو گیا۔ اس غضب کی ہنسی ابھری تھی کہ اچھو لکتے لکتے رہ گیا۔ ”ائف! کیا ڈرامہ ہے یہ۔“ اس نے سوچا اور پھر قدرے سرسری انداز اپناتے ہوئے بولا۔

”تو مس ایرش آپ یہاں اپنے فادر کی کمپنی میں کیا کر رہی ہیں۔ مجھے تو آپ کیرئیر اور ایفڈ نہیں لگ رہیں۔ اسٹیلی!“

”میں واقعی کیرئیر بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتی مجھے تو میرے بڑے بھائی نے پھنسا دیا۔ وہ سڈنی ہائر اسٹڈیز کے لیے جانے سے پہلے پاپا کا دھیان میری طرف کروا کے گیا۔ ایسی دماغ میں ڈالی کہ وہ دن اور آج کا دن، میرے پاپا نے مجھے یہاں فٹ کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ میرے سرال میں فٹ ہونے کے دن ہیں۔ حق ہا!“ اس کے لہجے کی بے چارگی سالک کو حیرت میں ڈال گئی، آیا یہ ایکٹ کر رہی ہے



یا سنجیدہ ہے۔ منصور راضو اور عادل پاشا کا ہے لگا ہے دونوں کو کن انکھوں سے دیکھ رہے تھے مگر لا تعلق سے ایک دوسرے سے بات چیت میں مصروف تھے۔ سالک نے گلا کھکا کر ایرش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ویسے آپ کا شوق دیکھ کر یہ لگتا ہے کہ شادی آپ کی بچپن کی آرزو ہے جو پوری ہو کے نہیں دے رہی۔ رائے؟“

”ہا ہا ہا.....“ تازگی سے بھرپور خوب صورت قہقہہ ایرش کے حلق سے آزاد ہوا اور سالک پاشا کو ساکت کر گیا۔ اس کی نظروں میں اچانک سردمہری سی اتر آئی۔ اس نے میکا کی انداز میں ایرش کی آنکھوں میں مسلسل دیکھتے ہوئے ٹانگ سے ٹانگ اتاری اور سیدھے ہو کر میز پر سے اپنی گاڑی کی چابی اور سیل فون اٹھایا۔ ساتھ دالی کرسی پر پڑا لپ ٹاپ کا بیگ تھا اور اس کے محسوسات سے بے خبر بے مکان بولتی ایرش کی مزید کسی بات کا جواب دیے بغیر کھڑا ہو گیا۔

”سوری ابی۔“ اس نے عادل پاشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بہت ضروری کال آگئی ہے۔ آئی ہیو ٹو لیو۔ بائے ایوری دن۔“ سب کو الوداع کہتا وہ تاک کی سیدھے میں میٹنگ روم سے نکلتا چلا گیا۔ یہ دیکھتے بغیر کہ اس کی اس حرکت سے ایرش راضو کے چہرے کا رنگ خفت کے مارے کیسا زرد سا ہو گیا تھا۔ خود عادل پاشا بھی عجیب سا محسوس کر رہے تھے۔ سالک بھی بھی اتنا لایمز ڈنٹیں رہا تھا۔ انہیں ایک دم تشویش سی لاحق ہوئی۔ مگر ماحول پر طاری سالک کی اس حرکت کا اثر زائل کرنے کے لیے مزید کتنی ہی دیر منصور راضو اور ایرش سے چپیں مارتے رہے۔

☆☆☆

اس کا دل شدت سے ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ بے دلی سے کاریڈ ورجور کرتا اسی روم کے باہر ایک لمحے کو آکھڑا ہوا جس کے ماتھے پہ سنہری پٹی

پراشر راضو کا نام لکھا تھا۔ اس کے تصور میں اس کی بوند جیسی شفاف ایرش کا سراپا لہرایا۔ جس وقت اس نے میٹنگ روم میں قدم رکھا تھا، لمحے کے ہزاروں حصے میں اسے ایرش کی خوب صورتی نے متاثر کیا تھا مگر وہ بڑا پرسکون آدمی تھا۔ اسنے چہرے کے تاثرات کو نازل رکھنے میں ماہر۔ لیکن ایک سوچ، جس نے اسے سارا وقت بے چین کیے رکھا کہ ایک بار ایرش کو ہنستا ہے۔ وہ بانسری کے حشر جیسی مترنم ہنسی آیا یا نہ جیس کی بھی۔ اپنی عادت کے برخلاف اس نے ایرش سے بلاوجہ باتیں کیں۔ اس کے سوال کے جواب میں ایرش کلکلا کے ہنسی تو بلاشبہ اس کا ہنسا کشش رکھتا تھا مگر یہ وہ ہنسی نہیں تھی۔ اس ہنسی میں تو سحر تھا جس نے سالک پاشا کے دل کو باندھا تھا۔ قدموں سے لپٹی تھی۔ وہ ہنسی کھنڈر میں سچ سچ چلتی صندلی پیروں سے لینے کھنکھرواؤں کی چٹنگ جیسی تھی۔ ہاں۔ بالکل ایسی ہی وہ۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ نے چھب دکھائی۔ اسے یہ یقینہ اچھی لگی تھی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ لفٹ کے قریب آتے آتے اس کے سیل پر قہر قہر آہٹ ہوئی۔ مومن کی کال تھی۔ یس کا بن پر تیس کر کے اس نے سیل فون کان سے لگایا اور قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں مومن۔ میں بس نکل رہا ہوں۔ تم انہیں بٹھاؤ۔ میں۔“ وہ لفٹ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بن بن پر ہاتھ رکھتا، لفٹ کا دروازہ کھلا اور کوئی اندھوں کی طرح تیزی سے باہر نکلتا سالک سے بری طرح ٹکرایا۔ اس کا سیل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لفٹ کے دروازے کے باہر رکنے آرائشی مکلوں کے پیچھے جا کر اور بد قسمتی سے اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ گیا کہاں۔ اس کی مومن سے بات اندھوں ہی رہ گئی۔ وہ انتہائی کوفت کا شکار مگر انے والے کو دیکھنے لگا جو ڈھٹ بنی اس کے مقابلہ تن کے کھڑی اسی کی کوشالی کے لیے تیزی پکڑ رہی تھی۔ یادداشت اس کی ہمیشہ سے کمال کی تھی۔ ذرا تاخیر کے بغیر اسے



کریں کہ اپنے سیل سے میرے نمبر پر کال کریں، ابھی پتا چل جائے گا کہاں جا گھسا ہے میرا موبائل۔“

”اوئے ہوئے۔ کتنے جالاک آدمی ہیں آپ۔ اس بہانے میرا نمبر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو بہ کیسی کیسی حرکیں ایجاد ہو گئیں اور میں بس ”ضرورت ایجاد کی امی ہے“ والا محاورہ ہی آج تک ذہن میں بٹھائے ہوئے ہوں۔ تو بہ تو بہ۔“ اس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگا کر تو بہ کی۔ سالک کو شدید کوفت ہوئی۔ عجب آسٹم تھا۔ اس نے دل میں سوچا اور پھر نکل سے مخاطب ہوا۔

”دیکھیں۔ بات کا بنگلہ گومت ہتا ہے۔ میرے پاس اتفاقاً تو وقت نہیں کہ میں لڑکیوں کے نمبرز اکٹھے کرتا پھروں۔ نہ ہی میں کلنڈر انٹین ایجر ہوں۔ آپ کا نمبر حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کے سیل سے کال کی ضرورت نہیں، وہ میں اس سے زیادہ آسان طریقے سے حاصل کر سکتا ہوں۔ آپ بے کار کے شبہات میں نہ پڑیں۔ میں ابھی کسی پون کے سیل سے اپنے نمبر پر کال کر لیتا ہوں۔“ بڑے شائستہ انداز میں اس کی طبیعت صاف کرنے کے بعد وہ رخ موڑ کر کارڈیو میں جھانکنے لگا۔ ماحور کے تن بدن میں غصہ پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ اس نے سالک پاشا کے داہنے کندھے پر شہادت کی انگلی سے دستک دی۔ سالک نے چہرہ اس کی طرف واپس پھیرا تو اس نے ذرا سا جھک کر کلائی سے کوٹ کا کلف تمام کر اس کا ہاتھ ایک جھٹکے سے اونچا کیا اور دھپ سے اپنا سیل اس کی چوڑی پھٹلی پر دھر دیا۔

”زہر لگتے ہیں مجھے ایسے مرد جو مفت میں سیانے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پکڑیں سیل اور اپنے فرار شدہ موبائل کو سرچ کر لیں۔“ تجھے۔ زیادہ اودراسارٹ بننے کی ضرورت نہیں۔“

سالک پاشا اپنی پھٹلی پر رکھے اس کے چھوٹے سے عام سے موبائل کو تک رہا تھا مگر داغ ابھی تک اس لڑکی کی ”کنکٹیک“ کو سراہ رہا تھا۔ کس مہارت

یاد آ گیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو انٹرویو کے لیے اس کے آفس آ چکی ہے اور جو مومن تراب کو بلا تحقیق سفارشی کہہ کر باقی تمام امیدواروں کو بھی بد دل کر کے وہاں سے لے گئی تھی اور مقابلہ ماحور بھی جو بھی بھی سالک پاشا کو بھول سکتی ہی نہیں تھی کیونکہ اس دن کی یاد آج بھی اس کا حلق کڑوا کر دیتی تھی۔

”ایک تو یہ سوٹ بوٹ پہن کر آپ لوگ آنکھیں شاید فریزر میں رکھ آتے ہیں۔ تب ہی کہیں بھی کسی سے بھی منہ اٹھا کر کھرا جاتے ہیں۔ بندہ دو منٹ انتظار ہی کر لیتا ہے۔ لفٹ نے مجھے باہر اکل کر آپ ہی کو ٹھٹھا تھا پر مصروف نامی شے تعویذ کی صورت تھوڑی نامتی ہے ورنہ ہر شخص گلے میں لٹکا تو لیتا۔“ تز تز گولیاں برساتی ماحور کو سالک پاشا نے قدر سے اچنبھے سے دیکھا۔ پچکان کی رمتی اس کی آنکھوں میں بیدار ہوئی مگر ماحور نے زبان کو اگلے گیسر پر ڈال دیا تھا۔

”اب موبائل اللہ جانے کہاں منہ چھپا کے نکل گیا آپ کا۔ پتا نہیں کیسا خناس بھر رکھا تھا اس میں جو۔“

”محترمہ آپ ایک سیکنڈ کے لیے خاموش ہوں تو میں بھی کچھ عرض کر سکوں۔“ سالک کو اسے ٹوکنا پڑا تو وہ خاموش ہو کر اسے کڑی نظروں سے گھورنے لگی۔

”میرا موبائل آپ سے ٹکرا کر گرا تھا۔ پلیز اسے ڈھونڈنے میں میری ہیلپ کیجیے۔“

”میں ہیلپ کروں؟ میں؟ وہ کیوں جی۔ میں کوئی کھوجی ہوں۔ میرے اپنے بڑے مسئلے مسائل ہیں۔ اب یہاں موبائل ڈھونڈنے میں وقت برباد نہیں کر سکتی میں۔ ویسے بھی آپ ہی کی غلطی سے وہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔“ انکارے تو وہ ہر وقت چاہتے رہتی تھی مگر سالک پاشا کو دیکھ کر وہ مزید پت چلی جی۔ آخر یہ وہی تھا۔ مومن تراب کا باس۔

”ارے بابا تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ آپ اسے ارد گرد ہاتھ مار کر تلاش کریں۔ آپ بس اتنا



والی اور کہاں رات کے پونے دو بج چکے تھے۔  
 کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو اٹھ کر ٹیرس پر چلی  
 آئی۔ چانی سردیاں تھیں، موسم میں ابھی بھی اس پہر  
 شدت تھی۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ لان پر ڈالی۔  
 اس کے موردوں کی جوڑی اپنے پیچھے سے باہر سر  
 جوڑے آرام کر رہی تھی۔ ان ہی کو دیکھتے ہوئے وہ  
 وہیں راکنگ چیئر پر بیٹھ گئی۔ موسم کا فوس اس کے  
 حواسوں پر طاری ہو رہا تھا اور ذہن تھا کہ بھٹک بھٹک  
 کر بار بار اسی مفرد نقش اور روشن پیشانی والے  
 شخص کی طرف چلا جاتا۔ اب تو عاجز آ چکی تھی وہ۔  
 اسے غصہ بھی آ رہا تھا کہ ایسی بھی کیا بے اختیاری۔

لیکن وہ بھی کیا کرتی۔ سالک پاشا کو کی عام سا  
 تو نہیں تھا۔ وہ نہ صرف بے حد خاص تھا بلکہ اس کا  
 ادراک بھی رکھتا تھا۔ ایرش نے اسے آج پہلی بار  
 دیکھا اور دیکھتے ہی اس کے حواس جھنجھٹا گئے۔ وہ  
 مینٹنگ روم میں داخل ہوئی تو پہلی نگاہ اسی پر پڑی اور  
 ٹھہر گئی۔ وہ سارے ماحول پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ  
 ایرش کو ارد گرد کی ہر شے تحلیل ہوتی محسوس ہوئی، بس  
 اس کا عکس تھا۔ اس کے بولنے کا انداز اور بات  
 کرنے کے دوران جس طرح اس کی آنکھیں سکڑتی  
 اور پھلتی تھیں۔ ایرش نے کسی مرد کی اتنی روشن  
 آنکھیں نہیں دیکھی تھیں یا پھر اس نے کبھی کسی پر اس  
 قدر غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ دل تمام گئی تھی اس بار۔  
 سالک پاشا اس کے حواسوں پر سوار ہو گیا۔

وہ حیران رہ گئی تھی بلکہ اسے یراگنا تھا جب یک  
 دم وہ اسے بات کرتا چھوڑ کر معذرتی کلمات کہتا وہاں  
 سے چلا گیا لیکن پھر بھی دل نے اس کے اس عمل کو  
 زیادہ دیر تک مزاج پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ گھر آ کر  
 بھی وہ کھوئی کھوئی سی تھی اور وہی کیفیت ہنوز تھی۔ پر  
 اب تو وہ صبح میں تھک گئی تھی اسے سوچ سوچ کر۔ مگر  
 سالک پاشا اتنا ہٹ دھرم تھا کہ پورے کروڑوں  
 اس کے حواس سلب کیے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں آنکھیں  
 میچ کر بڑبڑاتی۔

”کیا ہے۔ دفع بھی ہو جاؤ۔ اب ایسے بھی

سے اس نے بغیر اسے چھوئے اس کا بازو اور ہاتھ  
 دونوں چھو لیے تھے۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھنے کے  
 بعد اس کے سیل سے اپنا نمبر ملانے لگا۔ پہلی ہی سیل  
 پر قریبی گھلے کے پیچھے سے آواز کا نعین ہو گیا۔ ماحور  
 نے ٹپک کر وہاں سے موبائل نکالا اور سالک کے  
 ہاتھ میں دینے کے بجائے خود ہی اس کا اسکرین  
 لاک اوپن کیا اور کال لاگ میں جا کر اپنے نمبر سے  
 کی جانے والی مسد کال کو حذف کر دیا۔ اس سارے  
 عمل کو سالک پاشا نے حقیر سے ملاحظہ کیا۔ وہ اس کی  
 حاضر دماغی پر اس اٹھ کر اٹھا۔ اگلے چند لمحوں میں  
 عمل سلی کے بعد ماحور نے اسے موبائل واپس  
 تھماتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا ہے نا۔ اب بھلے آپ کے پاس اتنا  
 فالٹو وقت نہ ہو کہ لڑکیوں کے نمبر جمع کرتے پھریں  
 مگر میرا نمبر اتنا فالٹو ہر گز نہیں کہ کسی کے سیل میں  
 یونہی ”اکٹھا“ ہوا پڑا ہے۔ یہ میں اپنا سیل اور اس کو  
 حفاظت سے رکھیے گا۔ ہوا گڈ ڈے سر۔“ اس کے  
 ہاتھ میں سیل تھمائی وہ آگے بڑھ گئی۔ سالک وہیں  
 کھڑا اس کی پشت دیکھتا رہا اور اس سے پہلے کہ وہ  
 پلیٹ کر لفٹ میں داخل ہوتا اس کے کانوں میں ماحور  
 کی ہنسی کی ٹھٹکی آواز پڑی۔ وہ وہیں ساکت ہو گیا۔  
 کارڈور کے اختتام پر کسی لڑکی کے پاس رک کر وہ  
 بات کرتے ہوئے ہنس رہی تھی اور سالک پاشا کے  
 دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس کے بس  
 میں نہ ہونے کو قید کرتا تھا نہ وقت کو تھماتا نہ وہ اس  
 پل میں ماحور کی ہنسی کی آواز کو کسی قیمتی جہر کی طرح  
 پلیٹ کر ہمیشہ کے لیے سنبھال لیتا۔ اس نے سر جھٹکا  
 اور اس کے سر اُپے پر ایک اچھتی نگاہ ڈال کر وہ  
 متانت سے مسکراتا لفٹ میں داخل ہو گیا۔ سالک  
 پاشا کے دل میں شدت سے کافی کی طلب جاگ اٹھی  
 تھی۔

☆☆☆

آدھی رات گزر چکی تھی مگر نیند تھی کہ آ کر ہی  
 نہیں دے رہی تھی۔ کہاں وہ دس بجے تک سو جانے



نہیں ہو کہ میں اتنی رات گئے تمہیں سوچ رہی ہوں۔  
 شکل دیکھی ہے اپنی۔“  
 اس نے بے چارگی سے آنکھیں کھول کر انہیں  
 گول گول گھماتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لیا اور آواز  
 کے ساتھ سانس چھوڑتے ہوئے بولی۔  
 ”شکل ہی تو اچھی ہے ظالم کی۔ افس! ورنہ  
 میمز تو نام کو نہیں۔ اس معاملے میں تو دو پڑنی چاہئیں  
 اسے۔ ہونہ۔“

اسے سالک پاشا کے ہاتھوں اپنی بے عزتی یاد  
 آئی تو گردن میں تازہ پیدار کرنی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”بدتمیز آدمی۔ ایسے لوگوں کو کیا یاد رکھنا۔ بس  
 اب بہت ہوا۔ میں اب سوؤں گی۔ بس۔“  
 وہ خود کو گھر کتنی اندر جا کر لیٹ گئی اور آنکھیں سختی  
 سے میچ لیں۔ جسم سے سالک پاشا کا سراپا اس کی بند  
 پٹلیوں پہ اتر آیا۔ اس نے بے بسی سے اپنے اعصاب  
 کو ڈھیلا چھوڑا اور ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

☆☆☆

”کیا مسئلہ ہے ایرش۔ سکون سے کھاؤ۔ پیچھے  
 کوئی لگا ہے یا تمہیں کسی کو پکڑتا ہے۔“  
 ایرش کو جلدی جلدی ناشتا کرتا دیکھ کر مسز منصور  
 نے ٹوکا۔ ساتھ ہی انہوں نے چاکلیٹ ملک کا گلاس  
 اس کے آگے کیا۔

”نانا۔ بالکل بھی نہیں۔ میں بہت لیٹ ہو گئی  
 ہوں آج ما۔ رات بہت دیر سے نیند آئی تو میج آگے  
 بھی نہیں کھلی۔ آپ پلیز اسے اس وقت رہنے  
 دیں۔“ اس نے غلت میں اُلٹے ہوئے انڈے کا بڑا  
 سا ٹکڑا نکلنے ہوئے گلاس پر بے گھر کیا۔ ساری رات  
 سوتے جاگتے کٹ گئی تھی اور نتیجتاً وہ بہت لیٹ ہو  
 چکی تھی۔ منصور را شور وقت کے بہت پابند تھے اور  
 کوئی بے برداشت نہیں کرتے تھے۔ آگے پیچھے وہ ان  
 سے بس آدھا پونا گھنٹہ ہی لیٹ پہنچتی تھی مگر آج تو  
 ساڑھے نو ہو چکے تھے۔ اس نے بانی کا اٹھ ہاتھ  
 میں تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ کندھے پر بیک  
 لٹکایا، گاڑی کی چابی اٹھائی اور بولی۔

”یہ میں راستے میں کھالوں گی۔ میں چلی۔  
 مزید دیر ہوئی تو پاپا مجھے فرانی کر دیں گے۔“  
 ”شرم تو نہیں آتی۔ ہمیشہ فضول ہی ہانتی ہو۔“  
 مسز منصور کو اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ ایرش نے جھک  
 کر ان کا گال چوما اور بولی۔  
 ”آپ کو اسے میاں کا ابھی پتا نہیں تاکہ وہ  
 باس کیسے ہیں۔ کبھی تمہارے میں خود شک میں پڑ جاتی  
 ہوں کہ آیا یہ پاپا ہی ہیں یا میرا وہم ہے۔“

”بک بک کرنی جانا بس۔ اب نکلو جلدی اور  
 گاڑی سکون سے چلانا۔ پہنچ کے کال کر دینا۔“ مسز  
 منصور نے محبت سے اسے گھر کے جوانی بوسہ دیا  
 تو وہ اللہ حافظ کہتی باہر نکل گئی۔ وہ مسکراتی نظروں  
 سے اسے دیکھتیں اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوئیں  
 ، جو مسلسل بینک کر رہا تھا۔ وہ اپنا سون فل سائنٹ پر  
 ہی رکھتی تھیں اور یہ ان کے بیٹے ارسل کی سڈنی سے  
 کال تھی۔

دو ہی تو اولادیں تھیں۔ ایک ویسے ہی اعلیٰ تعلیم  
 کے لیے سڈنی میں تھا اور دوسری کو منصور صاحب نے  
 آفس میں کھپایا تھا۔ ایسے میں سارا دن وہ ملازمین  
 کے ساتھ پکس مارا کرتیں یا پھر بیٹے سے بات کرنا  
 ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔

گاڑی میں روڈ پر ڈالتے ہی ڈیش بورڈ پر بڑا  
 اس کا موبائل اس زور سے بجا کہ وہ شیشا کر رہ گئی۔  
 ذرا سا آگے ہو کر دیکھا تو ماحور کانگ اسکرین پر  
 روشن تھا۔ اس نے انگلی کی جنبش سے کال کاٹ دی۔  
 اسے اندازہ تھا کہ ماحور سمجھ جائے گی کہ وہ گھر سے  
 نکل چکی ہے جب ہی کال پک نہیں کی۔ ایک موڑ  
 کاٹتے ہوئے اس نے ساتھ والی سیٹ پر پڑنے اپنے  
 شو لڈر بیک میں ہاتھ ڈالی کہ سن گلاسز ٹولے اور انہیں  
 آنکھوں پر لگانے ہی لگی تھی جب سامنے کا منظر دیکھ کر  
 اسے فوراً دوسرا ہاتھ بھی گلاسز سمیت اسٹیرنگ وکیل  
 پر جمانا پڑا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کی اور پللیں  
 جھپک جھپک کر خود کو یقین دلا یا کہ آیا وہ خواب دیکھ  
 رہی ہے یا واقعی اس بڑے سے کل نمائندے سے ابھی



ابھی سالک پاشا کی گاڑی ہی نکل کر گئی تھی۔

ساری رات حواسوں پر سوار رہا تھا، شاید اس لیے پتلیوں پر اس کا عکس جم گیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر زور زور سے پلٹیں جھکیں اور مخالف سمت میں مڑتی لینڈ کرورز کے اندر بیٹھے تک سسک سے تیار سالک پاشا کو ترسی نگاہ سے دیکھا اور ٹھنڈا سا تس بھرا۔

”کتنی بے نیازی چھائی رہتی ہے اس اکڑو کے چہرے پر۔“ اپنی کسی سی ناک سکیڑتے ہوئے وہ بڑبڑائی اور رشک سے اس بیٹنگے کو دیکھا، جسے آج تک ہزاروں بار دیکھتی آئی تھی۔ اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ وہ ہمیشہ اس راستے سے گزرتے ہوئے اس عالی شان بیٹنگے کو شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ حالانکہ اس کا اپنا بیٹنگے بھی شانہ منہ طرز تعمیر کا منہ بولتا ثبوت تھا مگر جو پلٹ گئی اور نفاست اس رہائش گاہ کے درو دیوار سے چھلکتی تھی وہ ہر بار اس کے اندر شدت سے یہ خواہش بے دار کر دیتی کہ کاش۔ کاش ایک بار وہ اسے اندر سے دیکھ سکے اور آج قدرت نے اسے موقع دیا تھا۔ اس نے اگلے ہی بل اندر جانے کی صفائی اور گاڑی گیٹ کے آگے روک دی۔

”بر اندر جا کر کہوں گی کیا؟“ اس نے سوچا۔ معا اس کی نظر ڈیش بورڈ پر مچی فائل پر پڑی تو اسی کو ہاتھ میں تھا اور گاڑی سے باہر نکل آئی۔

”کہہ دوں گی، عادل انکل نے یہ فائل منگوائی تھی۔ سوچا یہاں سے گزرتے ہوئے دیتی جاؤں۔“ جملہ ترتیب دیتے ہوئے اپنے آنے کا جواز گھڑا۔ ہاتھ میں گلاسز ابھی تک تمام رکھے تھے، انہیں بالوں پر لٹکایا، ایک نگاہ اپنے لباس پر ڈالی اور تیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اگلے ہی بل چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ وہ تھوک سے گلالت کرتے ہوئے بولی۔

”پاشا صاحب گھر پر ہیں۔ یہ فائل انہیں دینی ہے۔“

چوکیدار نے اسے گھور اور لٹھ مار لہجے میں بولا۔ ”چار منٹ پہلے آتا تو ساب مل جاتا۔ اب یہ

پھانسل واپس لے جاؤ اور آپس میں پہنچاؤ۔“

وہ اسے آفس ورکر سمجھا تھا۔ امیرش کا تو دماغ مگھوم گیا۔ چوکیدار کا دماغ درست کرنے کے لیے اپنے لہجے کو درست کیا اور سختی سے بولی۔

”تمہیں پتا ہے میں کون ہوں۔؟“

”تم ایک لڑکی ہے اور کیا؟“ وہ تسخرا نہ انداز میں بولا۔ ساتھ ہی کان میں انگلی بھی پھیری۔ امیرش چڑ کر رہ گئی۔ ”مغفور انسان کے ملازم بھی اسی کے جیسے ہیں۔“ دل میں کہہ کر وہ دوبارہ چوکیدار سے کڑک لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”اب تو میں سیدھا آپس ہی جاؤں گی اور جاتے ہی تمہارے ساب سے شکایت کر دوں گی، جب میری شکایت پر تمہاری چٹھنی کرائی جائے گی تا تب تمہیں پتا چلے گا میں کون ہوں۔ پھر یہی پھانسل آکر میں تمہارے سر پر بجاؤں گی۔ اب شرافت سے اندر جاؤ اور بیگم ساب کو بولو۔ امیرش راٹھور آتی ہے۔“ اس کے لہجے کے اعتدال نے چوکیدار کا اعتدال ڈکھایا۔ وہ اگلے قدموں پلٹ کے اندر گیا اور نیچٹا کچھ ہی دیر میں امیرش، ناعمہ پاشا کے سامنے موجود تھی۔

”میں معذرت چاہتی ہوں بیٹا۔ لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

بے حد خوب صورت اور سچے ہوئے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بظاہر اعتدال کے ساتھ بیٹھی امیرش سے ناعمہ پاشا نے بہت ملامت سے سوال کیا۔ وہ جو ایک ننگ ان کا حسین چہرہ دیکھے جا رہی تھی، چونک کر سیدھی ہوئی اور بولی۔

”وہ اچھے نیلی آٹنی۔ میرا نام امیرش ہے۔ امیرش راٹھور۔ میں منصور راٹھور کی بیٹی ہوں۔ عادل انکل کی فرم سے پاپا کے بزنس ٹرینر ہیں۔ یہ کچھ ضروری سپر ز تھے جو عادل انکل کو چاہیے تھے۔ پاپا گھر بھول گئے تو سوچا میں خود دیتی جاؤں۔“ اپنی زندگی میں کسی معاملے کا سب سے بخیر اجاز اس نے آج پہلی بار کسی کے سامنے دیا تھا۔



خوشبو تھی۔ کسی بہت اپنے کی۔ کسی کی؟ اس بارے میں سوچنے سے بھی انہوں نے گریز کیا۔ جس وقت امیر اس شاندار جنگل سے نکلی، بونے بارہ ہو چکے تھے۔ ہندو منٹ اسے آفس پہنچتے گئے تو بارہ بج چکی جاتے۔ گاڑی چلاتے اس کا داغ مسلسل کوئی پہاڑ نہ سوچ رہا تھا جو وہ پاپا کے سامنے کر کے جان بچائی۔ کچھ بھی تھا، وہ آج بے حد خوش تھی۔ سالک پاشا کے گھر سے ہو کر آئی تھی۔ وہاں کے چپے چپے پر اس کا بس اور خوشبو بھری تھی، اس کے بس میں ہوتا تو جلالی۔ اس کے ایک ایک سے سرت پھوٹ رہی تھی۔ اسے سالک پاشا سے محبت ہوئی تھی، ایسی محبت جو پیشگی ہوتی ہے۔ جو سدا شاداب رہتی ہے۔ سدا بہار محبت۔

☆☆☆

صحن میں بڑی پیاری دھوپ پھیلی تھی۔ کافی دن بعد ٹھہرتے بدن سینکے کے لیے باہر بیٹھنا نصیب ہوا۔ دادا اور شادی بھی سچ محسن میں کرسیاں ڈالے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ دونوں جیسے سینگ لڑانے جا رہے تھے۔ دادا کے ہاتھ میں تصویریں تھیں جنہیں وہ نظر کا چشمہ لگائے بڑے غور سے اور اکیلے دیکھنے کی کوششوں میں تھے تو دوسری طرف شادی پر بھی مسلسل ایک ایک کر اس کا رخ میں حصہ لینا چاہتا تھا مگر مجال ہے جو دادا نے ایک نگاہ بھی اس کو ڈالنے کا موقع دیا ہو۔ وہ جتنی تیزی اور چال چلوانہ انداز میں دادا کے بالکل ساتھ جڑ کر تصاویر دیکھنے لگتا، دادا اتنی ہی پھرتی سے پھدک کے کرسی سمیت پرے کھٹک جاتے۔ شادی زخون کے گھونٹ بھرتا ٹرائی ٹرائی اگیں کرتا رہتا۔ ایسی ہی ایک ٹرائی مارنے کے چکر میں شادی کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا اور اس ڈر سے کہ کہیں دادا غافٹ پھر تصویروں سمیت اس کی پہنچ سے دور ہو جائیں، اس نے ”ڈو ڈو جب“ مارا اور دادا کی گودی میں جاتا جاتا بیچ گیا۔ لیکن ٹال سے ٹال ضرور رگڑ کھا گیا۔ دادا کی بس ہو گئی۔ آؤ دیکھنا تاؤ رکھ کے چھڑی برسا دی پنڈلی پر۔ شادی نے ہزبڑا

”اجھا۔ حیرت ہے۔“ ناعمہ پاشا نے اچنبھے سے اس کی گود میں رکھی فائل کو دیکھا۔ ”پاشا نے دیے آج تک بھی آفیشل میز گھر نہیں منگوایا۔ ہو سکتا ہے یہ کنڈیشنل ہو اس لیے منگوایا ہو۔ آپ یہاں نیبل پر رکھ دو اور ایزی ہو جاؤ۔ میں آپ کے لیے کافی لاتی ہوں۔ اصل میں خانساں ابھی تک کوائرٹ میں ہے۔ میں خود اسے اتنی صبح بچن میں آنے سے منع کرتی ہوں۔ پاشا کا ناشتا میں ہی بناتی ہوں۔ اس لیے خواہ خواہ بے چارے کو بچن میں باؤنڈ نہیں کرتی میں۔“ وہ مسکراتی ہوئیں اٹھ کر ڈرائیونگ روم سے باہر چلی گئیں تو امیر نے کب کا انکا سانس بھر پور آواز کے ساتھ چھوڑا اور اطمینان سے صوفے سے کمر فیک کر ڈرائیونگ کر بیٹھتے ہوئے بڑبڑاتا شروع ہوئی۔

”لگتا ہے آٹنی کو بہت دن بعد کوئی بات کرنے کو ملا ہے۔ اتنی لمبی بات۔ ویسے ہیں کتنی حسین۔ لگتا ہی نہیں کہ جوان بیٹے کی ماں ہیں۔ سالک نے لگتا ہے سارا حسن انہی سے لیا ہے۔ ویسے کم ڈرننگ تو عادل انکل بھی نہیں ہیں۔ کیا چلی ہے بھئی اور کیا گھر ہے۔“ وہ پرستاش نظروں سے ڈرائیونگ روم کی آرائش دیکھنے لگی تو نظر ہوتے ہوتے واپس شیشے کی میز پر رکھی فائل پر پڑی۔ اس نے لمحے کی بھی دیر کیے بغیر جھپٹ کر فائل اٹھائی اور واپس اپنے بیگ میں ٹھونس دی۔ گزشتہ ہفتے بابا کا چیک اپ کروایا تھا۔ اس فائل میں ان کی رپورٹ تھیں۔ شکر تھا ناعمہ پاشا نے کھول کر نہیں دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ انہیں باتوں میں لگا لے گی تو وہ فائل شائل سب بھول جائیں گی اور وہی ہوا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں وہ گہری سہیلیوں کی طرح باتیں کر رہی تھیں۔

امیر کی بے تکی گفتگو نے ناعمہ پاشا کی آنکھوں سے مارے ہنسی کے پانی نکال دیا۔ بہت دنوں سے جی اندر کی کثافت چھٹ گئی تھی۔ انہوں نے خود کو بہت ہلکا چلکا محسوس کیا۔ امیر سے انہیں بے حد اپنائیت محسوس ہوئی۔ اس کے وجود میں کسی کی



کے بیک گیسر پر ڈوڈو چپ کیا اور ٹانگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔  
دادا نے چشمیں نظروں سے کھورتے ہوئے کہا۔  
”کاپے کو اتنا تازا ولا ہو رہا ہے۔ کیا بھی زندگی  
میں لڑکیاں نہیں دیکھیں جو یہ تصویریں دیکھ کر شوق  
پورا کرتا ہے تو نے۔ حد ہی ہو گئی۔ لے کے ایسی  
چھلانگ لگائی ہے کہ مجھے لگا میرا گال اکھاڑ ڈالے گا  
تو بے شرم۔ اتنا تیرے جذبات جاے سے باہر  
ہوئے پڑے ہیں تو اندر چوہے پر پانی ابل رہا ہے،  
وہ انڈیل لے خود پر۔ خبیث۔“

شادویر دادا کو شامی نظروں سے دیکھتا بولا۔

”کیا دادا۔ ایک تو میں ہی لایا ہوں یہ پکچر ز اور  
آپ مجھے ہی دیکھتے نہیں دے رہے۔ جب کہ آپ  
نے وعدہ کیا تھا کہ مومن کے لیے لڑکی ہم دونوں مل  
کے پسند کریں گے۔“

”ہاں تو کب انکار کیا ہے میں نے۔ ایک بار  
لڑکی پسند آئیے دے تو پھر تجھے لازمی دکھاؤں گا نا۔  
میں وعدہ خلاف نہیں ہوں۔“

شادویر دادا کی چالاکی پر انہیں بس دیکھ کر رہ  
گیا۔ اس سے زیادہ بھلا کرتا بھی کیا۔ اگلے چند منٹ  
بڑی مشکل سے دادا کو بخور لڑکیوں کا جائزہ لیتے دیکھتا  
رہا اور پھر ناچار بول ہی پڑا۔

”دادا۔ مومن کے لیے ہی پسند کر رہے نا  
آپ۔ جس طرح سے آپ تصویر کو ”تھری ڈی  
ورژن“ میں تاڑ رہے ہیں مجھے تو آپ کی نیت پر  
شک ہو رہا ہے۔“

”اے او۔ پھوٹ لے یہاں سے۔ چل  
شاہباش۔ ورنہ آج تجھے ایسی ماروں گا کہ تیرا سوجا  
مند دیکھ کر تیرے اپنے گھر والے۔ تجھے گھر میں گھسنے نہ  
دیں گے۔ سمجھا۔“

”ہاں تو وہ ابھی بھی کون سا گھسنے دیتے ہیں۔“  
شادویر معنوی آزدگی سے بولا۔ ”جب بھی رات  
کے ایک ڈیڑھ بج جائیں مجال ہے کہ میاں جی  
میرے لیے دروازہ کھول دیں۔ اندر سے ہی آواز  
لگاتے ہیں۔“ پیٹھارہ بیٹا کھڑے پر ہی۔ اب تو صبح

ہی گھسے گا تو اندر۔ بس دادا! یہ سب لاڈاں ہی دیکھتی  
ہے اور جن بچوں نے بچپن سے ماں نہ ہونے کا دکھ  
سہا ہوا ان کو یوں ہی کھڑے پر راتیں بتانی پڑتی ہیں۔“  
شادویر کی بات پر دادا نے تصویروں سے نگاہ اٹھانے  
کی زحمت کی اور انہیں تپائی پرالٹا کر رکھا۔ شادویر کی  
”ٹریجک بوہی“ دیکھی اور اپنی چھڑی پکڑ کر ایک بار  
پھر اس کی ران پر برساتے ہوئے بولے۔

”اوئے چند بچہ مہینے نہیں ہوئے تیری ماں  
کو گزیرے اور بچپن کے دکھ تو ایسے گنوار ہا ہے جیسے  
تیری ماں نے اس جہان سے گزر جانے کے بعد تیرا  
پارسل اگلے جہان سے بھیج دیا تھا کہ لو اس کا کہ منے  
کو پال لینا لوگو۔ وڈا تو ایکٹر۔ شکل دیکھی ہے اپنی تو  
نے۔ سبکی نہ ہو تو۔“

”دادا۔ آپ مجھے کچھ زیادہ ہی انڈر اسٹیمیٹ  
کر رہے ہیں۔ ورنہ میرے حسن سے تو میری ماں  
تک خائف رہا کرتی تھی۔ باہر بعد میں نکلتا تھا، کالا  
ٹیکا پہلے لگا دیتی تھی مجھے۔ امی کی اس حرکت کا تو  
میرے دوستوں میں بھی خوب چرچا تھا۔“

”ارے! آٹے کا ٹیکا لگائی تھی وہ، کچھ  
کنٹر اسٹ تو بننا تھا۔ کالا ٹیکا بھلا دکھائی کب پڑتا  
تھا۔“

دادا نے ہنستے ہوئے اس کی سانولی ٹمکین رنگت  
پر چوٹ کی تو وہ بچ میں منہ بھلا کے بیٹھ گیا۔ دادا کے  
باس بھی تو ایک یہی تفریح تھی۔ شادویر کا پتی باتوں  
سے ناک میں دم کرنا۔ اس کا چڑنا انہیں مزادیتا تھا۔  
اچھا نا تم باس تھا وہ۔ شادویر بھی ہر روز لازمی ان کے  
باس وقت گزاری کے لیے آ جاتا تھا اور پھر چوہیں  
لڑائے رکھتے تھے دونوں۔ حالانکہ گھر میں شادویر کے  
اپنے دادا بھی تھے جنہیں وہ میاں جی کہتا مگر ان  
سے ذرا کم ہی بنتی تھی اس کی۔ وہ مزاجاً خاصے روکے  
اور کرخت تھے۔ لیکن دادا واحد شخصیت تھے جو جب  
بھی میاں جی سے ملے، انہیں ہنسی کی ڈرپ ضرور  
لگاتے جو دادا کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر قطرہ قطرہ  
گرتی رہتی۔



کچھ دیر منہ پھلائے رکھنے کے بعد پھر اس کی زبان پر کھلی ہوئی۔

”ویسے دادا۔ آپ خواہ خواہ میں بچیاں دیکھ رہے ہیں۔ پہلے پوتے کی بھی تو خبر لیں کہ وہ ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کے لیے راضی بھی ہو گا یا نہیں۔ کیونکہ میں نے مومن کو موہا بل پر کسی لڑکی سے بات کرتے سنا تھا۔ بڑے دانت نکل رہے تھے اس کے اور لہجہ ایسا تھا جیسے قرض مانگ رہا ہے۔ آپ پتا کریں دادا۔ یہ نہ ہو کہ ان میں سے جو آپ کو پسند آئے، اس کے لیے مومن مانے نا اور آپ مجھے ملی کا بکرا بنا دیں اور آپ کو پتا ہے نا کہ مجھے قربانی دینے کا بہت شوق ہے۔“

دادا نے ٹیک کے اوپر سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ایک ایر وچا کر استہزاء سے اور گردن کو موڑتے ہوئے بولے۔

”نا۔ نا۔ ایسی قربانی دینے کا شوق تو میری بھی نس نس میں دوڑتا ہے۔ مجھے قربانی کا جانور بننے کی ضرورت نہیں۔ آج بال کالے کر لوں نا تو لوگ مجھے مومن کا بڑا بھائی کہیں۔“

اس قدر مبالغہ آرائی پر شادیز کا منہ کھل گیا۔ وہ چمک کے بولا۔

”اٹھکے بھئی اٹھکے۔ دادا! بال تو کالے کر لیں گے۔ لیکن تب کیا کریں گے جب ”قبول ہے، قبول ہے“ کہتے دانت باہر گر پڑیں گے۔ آپ تو ”بھئی“ والا منہ بھی بنالیں تو بھئی دوبارہ سیٹ کرتے ہیں۔“ قبول ہے“ کے لیے تو تین دفعہ بھئی والا منہ بنانا پڑے گا۔“

”اٹھ جا۔ اٹھ جا بے غیرت۔ بزرگوں کا کوئی لحاظ ہے یا نہیں۔ کندھے پر بٹھایا تو کان میں چلانے لگے۔ دُح ہو جا اور ویسے بھی آج کل دلہا کے منہ پر رومال رکھنے کا رواج پلٹ آیا ہے۔ پتا نہیں لگتا کہ منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت ہیں یا نہیں۔“

دادا کی تان وپیں آکر ٹوٹی۔ شادیز نے ہاتھ جھاڑے اور ذرا آگے ہو کر تپائی پر رکھی تصویریں

اٹھانے لگا۔ دادا نے کس کے اس کے ہاتھ پر چپٹ لگائی۔ وہ بے چارہ ہی کر کے واپس کر سی پر بیٹھ گیا۔

”ان کو چھوڑو۔ تم مجھے تین دن کے اندر مومن کے بارے میں پتا کر کے دو کہ وہ کس لڑکی کے چکر میں ہے۔ آخر چھپا کیوں رہا ہے اگر ایسا کوئی مسئلہ ہے بھی تو۔“ دادا نے پرسوج انداز میں اسے ناسک سونپا تو وہ ہاتھیں چرتا ہوا بولا۔

”تو پھر ان کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں میں لے جاتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ دوبارہ تصویروں کی طرف بڑھایا تو دادا جلال میں آگئے۔

”اتنی کیا پھوڑی ہے مجھ میں۔ ایسے ہی مروڑ اٹھنے سے تو لایا کیوں تھا انہیں۔ تم کچھ بھی کر لو بیٹا۔ تمہاری شادی فی الحال ہونا قرار نہیں پاسکتی۔ کیونکہ ابھی تم ”انڈر کنٹریشن“ ہو۔“

”کیا؟“ شادیز نے ہونٹوں کی طرح منہ کھولا۔ ”کیا مطلب ہے دادا آپ کا۔“

”او۔ او جا مل آدھی۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ابھی پڑھائی تمہاری مکمل نہیں۔ تیسرا سال ہے تمہارا ایم بی اے ہونے میں نہیں آ رہا۔ کمائی ابھی تمہاری نہیں اور جو ہے وہ بھی تمہاری نہیں، خیر سے تمہارا دادا اپنی زبانی کی طرح جھپٹ لیتا ہے۔ لہذا سکون سے دو سال اور لگاؤ ایم بی اے کرنے میں۔ اس کے بعد دو سال لگاؤ دادے سے چھپا کے اپنی کمائی میں سے بچت کرنے میں۔ اس کے بعد میں خود سر پر سر اڈال کر گھوڑی چڑھوں گا۔“

”واہ۔ بہت خوب۔ یعنی کہ اتنی جان میں ماروں اور گھوڑی آپ چڑھ جائیں۔ خاصے سیاسی نہیں ہو گئے آپ دادا۔ کیا کہنے۔ کمال است۔“ طنز سے سر دھتا شادیز دادا کو زہر لگا۔ نختے پھلاتے ہوئے بولے۔

”بات سن میری است، رست! تجھے ایک کام سونپا ہے وہ کہ مومن کی سینگ کس کے ساتھ ہے مجھے پتا کر کے دو۔ ورنہ تیرے دادے کو کہہ کر تیرا ایڈمیشن جی میں کروادوں گا۔“



چمکتے پھلتے فرش والے مال میں رش حسب معمول تھا۔ اکتائے چہروں والے شوہر اور پر جوش تاثرات والی بیویاں اور ان کے ساتھ ہر دوسری شاپ میں گھسنے بچے، جن کو ان کے باپ بڑی مشکل سے بھلا پھسلا کے باہر لے کر آتے اور وہ پھر انگلی چھڑا کر کسی اور شاپ میں جا گھسے۔

رائے کے ساتھ ساتھ زبردستی چلتی ماحور کو اپنا آپ ایسے ہی کسی بے زار شوہر جیسا لگ رہا تھا۔ وہ تھکن سے چور ہو چکی تھی۔ رائے نے آفس کے باہر سے ہی اسے پک کر لیا تھا۔ ایرش کو معلوم ہوا تو وہ اس سے زیادہ تیزی سے بیک کنڈے پر لٹکائی کھڑی ہوئی مگر عین وقت پر اس کی ماما کی کال آگئی اور اسے فوراً گھر جانا پڑا۔ ماحور نے جی ہی جی میں شکر ادا کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ایرش کو بھی رائے کی طرح شاپنگ مالٹرنگھانے کا کریز ہے۔ یک نہ شیدو شد والا معاملہ ہو جاتا اور اب اس کی بس ہو چکی تھی۔ تم یہ تھا کہ اتنی دیر میں رائے نے کچھ خاص خریدا بھی نہیں تھا۔ وہ زچ ہو کر بالا خرہ اٹھی۔

”کہاں خوار کر رہی ہو رائے کی بچی۔ سارا دن آفس میں کھنے کے بعد تمہارے ساتھ مالٹر میں پچھلے ڈھائی گھنٹوں سے چل رہی ہوں اور خریدا تم نے کیا ہے۔ یہ فلیٹ سول سینڈل اور بس۔“ ماحور نے دونوں ہاتھوں سے جوتے کا ڈبہ اونچا کر کے رائے کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ۔“ رائے نے پلٹ کے دیکھا اور ”یہ“ زور دیتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو میں نے ایویں خریدا ہے۔ ورنہ مجھے کچھ خاص پسند تو ڈی آیا تھا۔ عاقب کی جیب خالی کر دوائی ہے، بغیر کچھ لیے گی تو نیا کھانا کھل جائے گا۔ اس لیے مجھے خریدنے دو، عزت کا سوال ہے ماما۔“

رائے اتنے رساں سے بولی جیسے عاقب بھائی سے یہ پیسہ وہ شاپنگ کے لیے نہیں بلکہ خدمت خلق کے لیے لے کر آئی ہو اور چلتے پھرتے کوئی فقیر یا

”ہونہر۔ شادیز نے اتنی مکی گولیاں نہیں کھیلیں دادا۔ کل شام سے پہلے پوری رپورٹ پیش کر دوں گا۔ لیکن اس کے بدلے میں آپ کو میری بات اس سے چلوانی ہوگی۔“

”کس سے؟“ دادا نے اچنبھے سے پوچھا

”تیری والی ہے۔“

”یہ تو جھوٹی ہے۔“

”دادا آپ نے عینک اتار رکھی ہے۔ دھیان سے دیکھیں۔“

”تو تجھے لگتا ہے کہ اتنی دیر سے میں چنے بیج رہا

تھا کیا۔ دھیان ہی تو جایا ہوا تھا۔“

”نہیں خیر مجھے آپ سے اس بات کی توقع

تھی۔ بس آپ اس لڑکی سے میری بات چلوائیں

گے۔ بھیا اور بھیا بھی کو کہہ کر۔ میاں جی کو وہ دونوں

خود منالیں گے۔“

”اگر اس لڑکی پر تیری نظر تھی تو اس کی تصویر

کیوں لایا تھا غیبت۔ اگر مجھے مومن کے لیے پسند آ

جانی تو۔“

”نہیں آنی تھی نا۔ کیونکہ اس سے پہلے ہی

پلان کے مطابق مجھے آپ کو بتا دینا تھا کہ مومن نہیں

پھنسا پڑا ہے۔“

”بڑا ہوشیار ہے تو۔ کتنی حالاک آتما ہے تیری

شادیز۔ مجھے تو تیرا شوق دیکھ کر یہ گمان گزر رہا ہے کہ

اگر تیری بی بی میں نہیں بات نہ چلائی گی تو، تو اپنے

آپ سے ہی شادی نہ کر لے کہیں۔“

”استغفار۔ اتنے برے حالات نہیں میرے

دادا۔ افس۔ آپ بھی نا۔ بولتی بند کر دیتے ہیں۔“

”ہاں تو بند کر بولتی اور مجھے پتا کر کے بتا

شباباش۔ پھر میں تجھے انعام کے طور پر اس لڑکی کے

ابا سے ملوادوں گا۔ آگے کی سیٹنگ خود ہی کرنا۔“

دادا سے کوئی نہیں جیت سکتا تھا۔ شادیز بھی بے

بسی سے سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ انہیں یقین دہانی کروا

کے وہ پلیٹ میں پڑے آخری دو بیسٹ اٹھا کر نکل

گیا۔



مستحق ڈھونڈ رہی ہو جسے یہ پیسے دے کر ہی جانے ہوں۔

”اگر مجھے کچھ بھی اپنے لیے پسند نہ آیا تو عاقب کی امی کے لیے دوسوٹ لے جاؤں گی۔ ماں بیٹا دونوں خوش ہو جائیں گے۔“

”توبہ۔ کتنی چالاک ہو تم رائے! اب پلیر جلدی کرو۔ مجھ سے چلائیں جا رہا۔ ابھی کھر جا کر بھی سیکڑوں کام میرے انتظار میں ہیں، یہاں سے فارغ ہوں گی تو کچھ نشاؤں کی نا۔“

”ہمم! ایسا کرو۔“ رائے نے ایک پل کو چلنا ملتوی کر کے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”تم یہ جو سامنے شاپ ہے نا، وہاں گھسو اور میرے لیے دو تین اچھے اچھے سے پرنس چوز کر کے خرید لاؤ۔ تمہاری اور میری چوئس آل موسٹ ایک سی ہے، اس لیے مجھے پسند آئیں گے۔ تب تک میں سامنے والی شاپ“

پر کچھ دیکھ لوں۔ وقت بچے گا ایسے۔ جاؤ جلدی!“ رائے نے ہوتی بنی ماحور کو فافٹ والٹ سے پیسے نکال کر پکڑائے اور خود مڑ کر سامنے والی شاپ میں کم

ہو گئی۔ ماحور کو فٹ اور بے بسی کے طے جلے تاثرات چہرے پر سجائے ”شاپ“ میں جا گئی۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور دیدہ زیب برٹش کی

بہاریں تھیں۔ عرصہ ہو گیا تھا ماحور کو اتنی نفس لان پہنچے۔ گھر کے حالات بھی اس قابل بھی نہیں ہوتے تھے کہ وہ ٹھیلے سے چار، چار سو والے شرٹ پیس بنی

خرید سکتی۔ اس جاب کے بعد ایسی کتنی ہی حسرتیں پوری کرنے کی آرزو تھی مگر ابھی تک تنخواہ نہیں ملی تھی۔ جو ایڈوائس سیکریٹری تھی اس میں تمام بلیز اور قرض اتر

گیا تھا یہی غنیمت تھا اور جو باقی رقم پکی تھی، ماحور نے سب کے یونیفارمز خرید لیے تھے۔ اس کے تصور میں سیف اور ریان کی کتھوں سے اوپر چڑھی پینٹس اور

ز وہان کی کارل سے ادھڑی ہوئی شرٹ گھوم گئی۔ جنت کی تو شرٹ بھی بوسیدہ ہو کر بھٹ چکی تھی جسے وہ بڑے طریقے سے سیٹ کر کے اسکول جاتی تھی تاکہ کسی کو اس کی پتلی حالت کی خبر نہ ہو سکے۔ ایک طویل

سانس بھر کے ماحور نے اپنا دھیان روٹر سے لپٹے تھانوں کی طرف لگا یا اور رائے کے لیے اس کی چوئس کے حساب سے پرنٹ چوز کرنے لگی۔ ابھی اس نے دوسوٹ بنی اتروائے تھے کہ اسے شدید الجھن ہونے لگی۔ کوئی مسلسل اسے دیکھ رہا تھا یہ تو پکی بات تھی۔ مگر کون؟

اس نے زیرک نگاہی سے ارد گرد دیکھا مگر بے سود۔ جلدی جلدی ایک اور خوب صورت سا پرنٹ پسند کر کے اس نے سارے کپڑے پیک کروائے اور بل ادا کرتی باہر نکل رہی تھی جب دروازے کے بالکل ساتھ کھڑے اسٹیجو کی جیب پر لگے بٹن میں اس کے اسٹول کا ٹکسل پھنس گیا۔ گردن کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ ہڑبڑا کر رکی۔ خفت سے ارد گرد دیکھا۔ کسی کو بھی متوجہ نہ پا کر ساری جھنجھلاہٹ ایک چمٹا اسٹیجو کے کاندھے پر برار کر اتاری۔

”الو گئے ٹھٹھے۔ یہ کاٹھ کے الو راستے میں کھڑے کرنے بہت ضروری ہیں کیا۔ ابھی پھندا لگ کے کام تمام ہو جا تا میرا۔“

اسٹول کا ٹکسل کھینچ کر چمڑاتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ اتنے میں اسے محسوس ہوا جیسے اس پتلے میں حرکت ہوئی ہے اور پھر وہ چوڑا اچھلا پتلا پورے کا پورا اس کی جانب گھوم گیا۔

”تم۔“ وہ چلائی۔ ”ہاں۔ میں۔“ جواب دہ بھی چلایا۔

رائے شاپرز اٹھائے اندر داخل ہو رہی تھی، دونوں کو دیکھ کر اسے بھی چلانا یاد آیا۔

”تم..... اور تم۔ یعنی کہ تم دونوں۔ ہیں جی۔“ اس کی باجھیں چڑ گئی تھیں۔ مومن اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ اس لیے فوراً پہچان گئی تھی اور پھر ماحور رائے سے بھلا اس رات والے واقعے کا ذکر کرنا کیسے بھول سکتی تھی۔

”واہ جی واہ۔ بہت اچھے، تو یہ نوکری کرتے ہو تم۔ یہاں بت بن کے ٹھکر رہنے کی اور یہ مانی مفت میں سر کھائی رہتی تھی کہ تم اتنی اچھی جاب لے



کے مزے لہجے بس۔ آپ جیت گئیں۔ سچ میں۔“  
ایک جذب کے عالم میں اسے دیکھتا وہ رائے کو چونکا  
گیا تھا۔

اس نے کن آنکھوں سے ماحور کو دیکھا تو اس  
کے چہرے پر وہی بے نیازی کا عالم تھا۔ ویسے بھی  
اس نے اس قدر سخت زندگی گزاری تھی کہ نرم گرم  
احساسات اسے دور سے ہی سلام کرتے تھے۔ لیکن  
رائے کو کسی گڑبگڑ کا احساس صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اس  
نے گلا کھنکار کے مومن کو متوجہ کیا۔

”آہم! یہ شاپنگ مال ہے رومیو۔ یہاں کچھ  
کچھ ہوتا ہے۔“ کایسکول نہیں چل رہا کیونکہ مسئلہ یہ  
ہے کہ تم میں تو شاہ رخ والی ساری خصلتیں پائی جا  
رہی ہیں مگر تمہارے مقابل یقین مانو کا جوں نہیں  
ہے۔ ہاں اسے تم پھولن دیوی کا ایڈیڈ ورژن ضرور  
کہہ سکتے ہو۔“ رائے نے اس کے کان کے ذرا قریب  
ہو کر کہا تو وہ ایک ہل کو شپٹا گیا۔

”تو یہ استغفار۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔ ایسا  
کچھ نہیں۔ مجھے تو بس سر راہ یہ نظر آگئیں مگر نہ تو میں  
کہاں اور یہ کہاں! ہی ہی ہی!“ اسے جواب نہ سوجھا  
تو مدھم لہجے میں یونہی بے سرو پا بول کر دانت ٹوٹنے  
لگا۔ رائے نے ہاتھ میں پکڑے شاپر اس کو جھٹکنے والے  
انداز میں تھامتے ہوئے کہا۔

”یہ پکڑو۔ ہمارا گھر کہاں ہے یہ تو تمہیں یقیناً  
پتا ہی ہوگا۔ چلو شاہ رخ۔ ذرا ہمیں ڈراپ کر دو۔ اب  
کہاں دو جوان جہان لڑکیاں ٹیکسی کر کے گھر جائیں  
گی۔ سو پلینز تھوڑا کثٹ کر دو۔ گاڑی تو ہو گی نا۔  
مطلب۔ ماحور سے سنا تھا میں نے کہ.....“ رائے کی  
تیز گام کو پیچھے چھوٹی زبان کو ذرا سا بریک ملا تو  
مومن جھٹ سے بول اٹھا۔

”جی جی۔ چھوٹی سی گاڑی لی ہے میں نے  
چھلے ماہ۔ بالکل چھوٹی سی۔ آپ لوگ آئیں میں  
آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ شاپنگ بیگز بھی مجھے دے  
دیں پلینز۔“ وہ ماحور کے ہاتھ میں پکڑے شاپرز کی  
طرف اشارہ کر رہا تھا جنہیں وہ ہنوز تھامے رخ

اڑے۔ ہٹو مائی! تم سے تو چندرہ منٹ بول کھڑا ہوا  
جاتا، سارا سارا دن کھڑا ہونا کوئی مذاق تھا بھلا۔ بڑا  
اسٹینا چاہیے۔ ہر آتے جاتے کی چھیڑ چھاڑ سنی۔  
بچے تو اس حد تک چھیڑتے ہیں کہ اسٹیجو کے کپڑے  
تک اٹھا اٹھا کے دیکھتے ہیں۔ ہیں جی۔“ رائے اپنی  
بات کا مزہ لیتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسی چلی  
گئی۔ ماحور رائے کو سپاٹ چہرہ لیے ہوئے دیکھے جا  
رہی تھی جیسے اس کے پاگل پن پر کوئی شبہ نہ ہو جب  
کہ مومن سخت بد مزہ ہوتے ہوئے بولا۔

”میں یہاں جا نہیں کرتا تھرم! بلکہ.....“  
”تو کیا ای کے پکڑے لیے آئے تھے۔ ہیں  
جی!“ آگے بھی رائے تھی۔ بات اچھنے میں ماہر۔  
”امی کو تو خیر اب ان کی حاجت نہیں کیونکہ اللہ  
کو بیماری ہو چکی ہیں۔ ہاں ہونے والی بیوی کے لیے  
ایڈوائس ”ونڈہ شاپنگ“ کر رہا تھا۔ سوچا کچھ تجربہ  
حاصل کروں گا تو یہی بیوی کو راضی رکھ سکوں گا نا۔  
کیوں جی؟“ بات مکمل کر کے تائیدی انداز میں  
رائے کو یوں دیکھا جیسے تعریف کے ڈومگرے کی  
حاجت ہو اور اس نے برسا بھی دے۔

”ہائے ہائے! میرے میاں کو بھی مرید کرلو۔  
قسم سے بڑا فیض ملے گا تم سے۔ جس خاندان کو شاپنگ  
کردانی آتی ہو، سمجھو دنیا میں تو اس کا بیڑا پار ہے  
کیونکہ آئندہ آل ایک اچھے خاندان کی دنیا اس کی بیوی  
کے ارد گرد ہی تو چکر کھاتی ہے۔ ہیں جی!“

بڑے بڑے باتوں کے وحشی دیکھے تھے مگر ایسا  
پس نہیں ملا تھا ابھی تک۔ مومن لا جواب سا ہو کر  
بظلمتیں جھانکنے لگا۔ ماحور کو اس کی حالت دیکھ کر مزہ  
آ گیا اور آنکھیں سکڑ کر دھکتی ہوئی بولی۔

”آپ کی جاب کیسی جا رہی ہے؟ آپ کے  
باس سے ملاقات ہوئی تھی میری۔ ہماری کمپنی کے  
ساتھ ڈیل فائل ہوئی ہے آپ کی کمپنی کی یعنی کہ خود  
کو پرود کرنے کا وقت آ گیا مومن صاحب۔ ہم  
دونوں کے لیے! اب آئے گا مزہ۔“

”آپ خود کو پرود کر چکی ہیں ماحور۔ اب جیت



”وہیے بندہ دھانسو ہے۔ وہ کون سا ہیرو ہے بھلا۔ کیا نام ہے یار۔“ اسے مومن میں کسی ہیرو کی شبیہ دکھائی دی گئی

”ابے دیو یکن۔“ ماحور نے سڑک کے جواب دیا ”فٹے منہ۔ وہ کوئی ہیرو ہے۔ اسے تو کاجول نے منہ لگا لیا ورنہ تو اس کا منہ پرائی لائین سے نکلنے ہوئے کیلے دھویں جیسا ہے۔“ ایسی لمبی چوڑی اور تھوڑا کلاس مثال پر بے اختیار ماحور کے حلق سے تھپتھپ برآمد ہوا جسے اس نے اپنا بیگ منہ کے آگے کر کے روکنے کی ناکام کوشش کی۔ مومن ٹپٹا کر کن انکیوں سے خود کا جائزہ لینے لگا۔ اسے شک گذرا کہ ماحور اسی پر ہنسی ہے۔ لیکن سب کچھ فٹ تھا۔ اس نے قدرے مطمئن انداز میں دونوں کے قریب آنے پر گاڑی کے پچھلے دروازے کھولے۔ رائے اس کے اخلاق جتانے پر مسکراتی ہوئی اسے دیکھتی بیٹھ گئی جبکہ ماحور نے اچھی طرح اسے گھورا اور احسان جتاتے ہوئے بیٹھی اور زوردار آواز کے ساتھ گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ مومن نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھا اور منہ ہی منہ میں اسے ”ظالم“ کہتا ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ سارا راستہ رائے اور مومن چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے تھے۔

رائے نے اس کا تفصیلی انٹرویو لے لیا تھا۔ مومن نے بیک ویو مرکوز ماحور پر سیٹ کر رکھا تھا جس کے چہرے کے زاویے بگڑے بگڑے سے بھی اس کے جی کو بھارا ہے تھے۔ وہ اپنے ہی حساب کتاب میں کھوئی خود سے الجھ رہی تھی۔

”ایک دن ایسی ہی گاڑی لوں گی میں مومن تراب! اور جتنا تم۔ تم نے لی بھی ریڈ کٹر کی ہے۔ بھلا اور کوئی رنگ نہیں رہا تھا شوروم میں۔ ہونہ! اس کی گاڑی کو سٹائش اور رنگ سے دیکھتی وہ مستقبل کے پلانز بنا رہی تھی ساتھ میں اسے کوس بھی رہی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ اسے ایک بہترین جاب بھی مل چکی تھی اور گھر کی حالات بہت اچھے تھیں تو دیگر کون بھی نہ رہے تھے کم از کم جب وہ جاب لیس تھی اور گھر

موڑے کھڑی تھی۔ یوں جیسے وہاں ہے ہی نہیں۔ رائے نے ٹھوکا دیا پر جب وہ کس سے کس نہ ہوئی تو اس کے ہاتھ سے شاہرز جھپٹ کر بناؤ کی مسکراہٹ لیوں پر سجاتے ہوئے مومن کو پکڑائے اور ہاتھ سے اسے آگے چلنے کا اشارہ دیا۔ مومن جزیب ہوتا کن انکیوں سے ماحور کو دیکھتا، سامنے چل دیا۔

”یہ سڑک کر اس کر کے بالکل فرنٹ میں میری گاڑی ہے، ریڈ کٹر کی۔“ جاتے جاتے وہ ذرا جتانے والے انداز میں انہیں گاڑی کی نشاندہی کروا گیا۔ ماحور نے خفہ سے نتھنے بھلائے اور دل میں اسے ان گنت بار کہنے لگا تھا۔

”اب چل بھی پڑو ماہی۔ یا ادھر ہی خیمہ ڈلوانا ہے۔ شکر نہیں کرتیں کہ اتنی خوراک کے بعد سواری مل گئی ورنہ آٹو میں جل خوار ہو کے گھر جاتے۔ چلو اب۔“ رائے اسے ہلکا سا دھکیلتے ہوئے بولی تو جواباً اس نے کھاجانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

”تم تو جب سے شادی ہو کے میرے پڑوس میں آئی ہو، مجھے یقین سا تھا کہ نیم پاگل ہو۔ پر میرے ہوش ابھی مارے نہیں گئے۔ سمجھیں۔ بابائے اگر اس گھونچو کے ساتھ ہمیں دیکھ لیا تو نشے کی حالت میں وہ آتما رو لیں گے تا تمہاری اور میری کہ مرتے دم تک یاد رہے گا۔“

”او بی بی! اور اگر ہمیں مزید کچھ اور وقت یہاں لگ گیا تا تو میری ساس نے میری آتما کو تیلی لگا کے بھڑکی کی طرح قضا برد کر دینا ہے۔ اس لیے خاموشی سے اس نیک لڑکے کی گاڑی میں گھر چلو۔ آؤ جلدی اسی بھانے ذرا دیکھیں تو سہی کس ماڈل کی کار لی ہے اس نے۔“

وہ اشتیاق میں اسے چنگی بھرتی منک منک آگے چل دی اور ماحور چہرہ پختی اس کے پیچھے۔ روڈ کر اس کرتے ہی وہ ریڈ کٹر کی ونڈ کے ساتھ فیک لگائے غضب کا لگ رہا تھا۔ آف وائنٹ جنیز پرنٹری بلوشرٹ کے بازو کہنیوں سے ذرا نیچے تک فولڈ کر رکھے تھے۔ رائے اس کے کان میں بد بدائی۔



تھا۔ ہاں دل کا پتا معلوم کرنے کی کوششوں میں ہوں۔ اب تو وہاں تک رسائی چاہیے۔“ گھیر لہجہ۔ بھاری آواز۔ یہ وہ مومن تراب تو نہیں تھا جسے وہ اب تک جانتی تھی۔ اس گھڑی تو اس کی آنکھوں کے انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ بیک ویو مر سے جھانکتی اس کی لائٹ براؤن آنکھوں پر ماحور کی نگاہ پڑی تو دل کی ایک دھڑکن جیسے اچھل کر سماعت کے پاس آ دھڑکی۔ اس نے فوراً نظریں چرائیں اور چہرے پر لا پر داسے تاثرات طاری کرتے ہوئے بولی۔

”گھر کے اندر تک آئے۔ دل کا پتا میرے بھائی سمجھا دیں گے۔ انہیں شارٹ کٹ معلوم ہے۔“ مومن نے استعجاب سے اسے گاڑی سے اتر کر گھر کے اندر جاتے ہوئے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بالوں میں ہاتھ پھیر کر گاڑی اشارت کرنے لگا کہ اتنے میں ہی رائے پر نگاہ پڑی۔ وہ ماحور کے گھر کے گیٹ پر کھڑی اسے ہاتھ سے باہر آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ دوڑ کے بھی کھڑے تھے جن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر گاڑی کے شیشے میں منہ گھسا کر اپنا تعارف کروایا۔

”السلام و علیکم۔ میرا نام سیف ہے۔“  
”میرا نام مومن تراب ہے۔“ مومن نے سیف سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”اپنا سے ایک دو بار آپ کا ذکر سنا ہے۔ آئیے اندر چلیے۔ ایک کپ چائے ہو جائے۔ آئیے پلیز۔“

”ارے نہیں پلیز۔ پھر کبھی سہی۔ مناسب نہیں لگتا۔“

”پلیز مومن بھائی! تکلف نہیں۔ آجایے۔“ سیف کے اصرار پر اسے اترنا پڑا۔ پروردِ حقیقت وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اور قدرت نے موقع فراہم کر دیا تھا۔ سیف نے مومن کو ریان سے متعارف کروایا اور گھر کے اندر لے گیا۔ رائے بھی شوشی سے مسکرائی ساتھ ساتھ تھی۔ موسم بے حد خوش کوار تھا، مومن کے کہنے پر وہ سب وہیں ٹھن میں لگی کرسیوں پر بیٹھ

میں جس طرح سے فاقے اتر آئے تھے، وہ وقت یاد آتا تھا تھا تو اس لمحے خود کو بہت آسودہ محسوس کرتی تھی۔ لیکن جب بھی مومن تراب کو دیکھتی یا کبھی بیٹھے بٹھائے اس کا خیال آ جاتا تو دل بے کار میں اس سے الجھنے کے لیے مٹنے لگتا اور جب کوئی وجہ سمجھ نہ آتی تو مومن کی جاب ایک اچھا بہانہ بن کر اس کے سامنے سر اٹھائے کھڑی ہو جاتی جس کو جواز بنا کر وہ بلا وجہ کی خار کا اظہار کرتی۔ مگر نہ اس نے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھا تھا، اسے مومن سے اس کی جاب کے حوالے سے اب نہ تو کوئی گلہ تھا نہ حسد اور جو تھا اس جذبے سے ابھی اس کے دل کو آشنائی نہ تھی۔

وہ بیک ویو مر سے مومن کی خود پرکھی نظروں سے بے نیاز باہر بھاگتے مناظر کو دیکھتی فصول۔ باتیں سوچنے میں مگن تھی جب گاڑی اس کے گھر کے چھوٹے سے گیٹ کے آگے جا ٹھہری۔ غائب دماغی سے اس نے اپنا ہی گیٹ دیکھا اور گردن نظر ڈالی۔ اگلے ہی پل حواس چوک ہوئے اور بولکھلا کر رائے کی ٹانگ پر زور سے چپکی کاٹی۔ وہ بے چاری سی کرنی غصے سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ چوک پر گاڑی رکواتیں۔ سیدھا گھر کا راستہ دکھایا دیے وقوف۔“ وہ رائے کے کان میں گھسی کہہ رہی تھی۔ جواباً رائے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔

”ابویں چوک میں اتر جاتے۔ عاقب کی امی وہاں آنٹی نصرت کے ساتھ کھڑی تھیں۔ تمہارے بابا کا ہمیں دیکھ لینا تو چانس پر ہے مگر میری ساس اگر ہمیں دیکھ لیں تو میرے گھر پہنچنے سے پہلے عاقب کو کال جا چکی ہوتی اور تمہیں پتا ہے کہ وہ سیاق و سباق معلوم کیے بغیر ہانچ رہا ہوتا ہے۔ اترو اب۔ یہ گاڑی ہم دونوں میں سے کسی کے جھینڈی نہیں۔“ تجھیں!“ رائے کے اپنے ہی تحفظات تھے۔ وہ ماحور کو آنکھیں دکھائی گاڑی سے اتری اور گیٹ کے دونوں طرف لگی چھوٹی سی تیل دینے لگی۔  
”ویسے گھر کا راستہ تو میں نے پہلے بھی دیکھ رکھا



☆☆☆

چھوٹی سی میز کے گرد وہ پانچوں بہن بھائی خاموشی سے کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ماحور چہرے پر بھرپور سنجیدگی طاری کیے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کے منہ میں رکھتی چلی جا رہی تھی جیسے اسے چابی دی گئی ہو۔ ایک اچھٹی نگاہ وہ سب کی پلٹیوں پر بھی ڈالتی تھی کہ کسی کو کوئی چیز تو نہیں چاہیے۔ کچھ فاصلے پر سنگل صوفہ پر رائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں پرانا بوسیدہ سافٹن میگ تھا جو اللہ جانے کہاں سے عقیل منغل ہی پکڑ لائے تھے۔ اسی کی آڑ سے وہ گاہے بگاہے سیف کو دیکھتی ہاتھ سے ”کیا ہوا ہے؟“ کے اشارے بھی کر رہی تھی۔ سیف ٹیبل کے نیچے ہانپا ہاں ہاتھ لے جا کر جوابی اشارہ کر رہا تھا۔ ”پتا نہیں۔“

ریان کو اس ساری صورت حال پر ہنسی آ رہی تھی جسے وہ بمشکل روکے ہوئے تھا۔ ان سب کو خبر تھی کہ ماحور کا غصہ کس بات پر اور کیوں ہے مگر انجان بنے رہنے میں ہی عافیت تھی تا وقتیکہ وہ خود نہ چھ کھتی۔ اسے سب چا چل رہا تھا کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے اور تو اور زوہان اور جنت بھی پہنچی پہنچی مسکراہٹ لیے رائے کو دیکھتے اور پھر ماحور کو۔ صورت حال اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ اب کے سیف نے اسے کن آنکھوں سے دیکھا تو اس نے وہیں دھر لیا۔

”کیا ہے۔ ہاں۔ کیا دیکھتے ہو بار بار۔ میری شکل پر کوئی دوسری ٹاک اگ آئی ہے یا تمہاری آنکھوں کی الائنمنٹ خراب ہے۔ اپنے کروت سے تم سب باخبر ہو۔ سمیت اس ”آستین کی گنڈوئی“ کے۔“ یہ اس نے رائے کو کہا تھا، جس نے یہ لفظ سنتے ہی زوردار ”ااااا“ کے ساتھ میز پر تپائی پر پٹخا اور آستینیں چڑھا کے میدان میں اتر آئی۔

”تو یہ تو یہ۔ کوئی شرم ہے تمہیں ہاں۔ مجھے۔ مجھے کہہ رہی ہو تم وہ۔ وہ کیا بولی ہو تم۔ گنڈوئی کی گھر والی۔ انف! مجھے تو کہا ہی ساتھ میں عاقب کو گنڈو یا

گئے۔ رائے نے فوراً اندر چکن کارخ کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ چائے بنانے کی زحمت اسے ہی کرنا پڑے گی، ماحور تو جان بوجھ کر کمرے میں اوبھل ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ چائے بنا کر باہر صحن میں لے آئی تو وہاں کا ماحول بے حد خوش گوار تھا۔ مومن، سیف اور ریان کے ساتھ یوں کھل مل گیا تھا جیسے کب سے جانتا ہوا اور وہ دونوں بھی دوستانہ انداز میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے بے تکلفی سے نہ جانے کون سے لٹھے چھیڑے بیٹھے تھے۔ رائے نے ایک پرسوںچ نگاہ تیلوں پر ڈالی اور آسودہ سی مسکراہٹ چہرے پر بجا کر ان میں شامل ہو گئی۔

کچھ دیر بعد جب ماحور اپنے ہی دھیان میں کمرے سے باہر آئی تو صحن سے آتے بلند وبا ٹگ تھہروں پر بری طرح چوکی۔ چکن کی جالی سے جھانکا تو موصوف صحن کے پیچوں بیچ راجا اندر بنے بیٹھے باقی تمام رعایا کو متاثر کرنے کے لیے شیخیاں بکھا رہے تھے اور وہ سب اتنے انہماک سے کن رہے تھے جیسے روئے زمین پر اس سے ضروری کام فی الوقت اور کچھ نہیں تھا۔ رہی سہی کسر زوہان کو کود میں بٹھا کر نکال رکھی تھی۔ عاقب بھائی بھی آئے بیٹھے تھے اور یہ رائے کی بیٹی۔ اس نے رائے کو دیکھ کر دانت میسے۔

”حد ہو گئی۔ یہ موصوف تو پورے گھر میں جراثیم کی طرح پھیل گئے اور دیکھو زوہان نمونوں کو۔ ابھی جو آجائیں نا جھومتے جھاتے بابا تو ان کی ساری محفل پر ایسی عطر کی پھوار پڑے گی کہ سب کے حواس کئی دن تک معطر رہیں گئے۔“ وہ ہی دل میں سوچ رہی تھی اور کڑھ رہی تھی۔ مومن کی چالاکی پر تاؤ بھی آ رہا تھا۔ کیونکہ تو نظر میں اس پر گاڑیں جو فرمت سے کف فولڈ کیے، دونوں ٹانگیں قد پر پھیلا کر بیٹھا تھا جیسے ہمیں رہنے کا ارادہ ہو۔ سلیقے سے جے پال اب گھر کر پیشانی پر پڑے تھے۔ ماحور نے اس پر سے بے ساختہ نظر ہٹائی اور خود بھی وہاں سے ہٹ گئی۔ مگر تک تو آ گیا تھا، دل تک آنے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔



میں ہے وہ میں پوری ہونے نہیں دینے والی۔ سمجھیں۔“ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتی ماحور کو رائے نہ سیز فائر کا سٹیل دیا اور جنت اور زوہان کو کمرے میں بیچنے کا اشارہ کیا۔ وہ آج خلاف معمول وہاں اس وقت تک بیٹھی تھی تو یقیناً کوئی مسئلہ تھا۔ اس طرف ماحور کا وہ بیان ہی نہیں گیا تھا۔

جنت اور زوہان کھانا کھا چکے تھے، انہیں فوراً اندر بھیجا۔ صبح ان کا اسکول تھا اور ماحور انہیں رات ساڑھے آٹھ تک لازم سلا دیتی تھی۔ وہ دونوں جا چکے تو رائے تھوڑا سا کھک کر آگے ہوئی اور مدہم آواز میں گویا ہوئی۔

”ماہی! مجھے عاقب نے بتایا ہے کہ اس نے عقلی انکل کو پھیلے چوک میں الیکٹریک پول کے نیچے آوارہ اور بدتماش آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر جوا کھیلنے دیکھا ہے۔ انکل جوا کھیلنے لگے ہیں ماہی۔ جوا بچتی ہو۔“ اس کے لہجے کی سراپسکی نے ان تینوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔

ریان نے بے بسی سے اپنی خالی کلائی کو دیکھا جس میں موجود گھڑی بابا نے تین دن پہلے ہی پہننے کے لیے اتروائی تھی اور ابھی تک واپس نہیں کی تھی۔ ماحور کا تو اگلے ہی پل سر چکرانے لگا۔ پھیلے مہینے میں گھر کی چند چیزیں غائب ہوئی تھیں۔ لیکن انہیں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ پر یہ کڑی عقلی مصل کے جوا کھیلنے سے جڑی تھی۔ آج چھوٹی موٹی چیزیں تو کل بڑی بھی۔ یہ تو نہ تھمنے والا سلسلہ تھا۔ اور ان بہن بھائیوں کے لیے پریشانی کا ایک نیا درمحل گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کہہ ڈالا ظالم۔ مانا کہ ان کو دیکھ کر کسی لڑکی کی ٹھنڈی آہیں نہیں نکلیں، لیکن اب وہ ایسے بھی گئے گزرے نہیں۔ سمجھیں تم ماحور مغل۔“ رائے کی جذباتی قہروں کا ماحور پر چنداں اثر نہیں ہوا، ہنوز وہ کھانا کھانے میں مگن رہی۔ رائے نے سیف اور ریان کو دیکھ کر بھنوں اچکا میں اور کچھ بولنے کا اشارہ کیا۔ بھی سیف نے ہمت کی۔

”اپیا!“

”کیا اپیا؟ کون اپیا۔ بھاڑ میں لگی اپیا۔“ ماحور چیخ پختی ہوئی غصے سے بولی۔

”اپیا۔ وہ ہمارے گھر آئے تھے۔ ہم بھلا کیسے انہیں انکور کر سکتے تھے اور پھر۔ اور پھر یاد ہے آپ نے ہی تو مجھے بتایا تھا کہ اس رات مومن بھائی نے ہی آپ کی مدد کی تھی۔ آپ کو بخیریت گھر تک پہنچایا تھا۔ وہ ہمارے محسن بھی ہیں اپیا۔“

ماحور سیف سے کچھ نہیں چھپاتی تھی۔ اس رات کا سارا قصہ ذرا سی کانٹ چھانٹ کے ساتھ وہ سیف کو بتا چکی تھی۔ یعنی غائبانہ وہ مومن سے واقف تھا۔

”اچھا۔ ایک ہی ملاقات میں وہ مومن ”بھائی“ بھی بن گیا۔ واہ کمال ہے۔ مجھے تو حیرت تم لوگوں پر ہے کہ کیسے تین گھنٹے تک اسے محسن میں بٹھائے باتیں مٹھاتے رہے ہو۔ جیسے ہاتھیں کب کا پھڑا رشتے دار ملا تھا تم لوگوں کو اور..... اور اس کو دیکھو ذرا۔“ ماحور نے زوہان کے سر پر چپٹ لگائی۔

”یہ اس کی گود میں جا بیٹھا، ننھا کا کا نا ہو تو۔ شرم نہیں آئی اسے۔“ زوہان خاموشی سے سر سہلاتے ہوئے کھانا کھانے میں مگن رہا۔ وہ کسی بھی بات کی ٹینشن کم ہی لیتا تھا۔ ماحور نے اسے چھوڑ کر اس کے عقب میں دکھائی دیتی رائے کو گھورا تو وہ ہٹا کر گردن کھانے لگی۔

”تم..... تمہیں تو میں اکیلے میں بنتی ہوں۔ تمہاری ساری جالا کی سمجھ گئی ہوں میں۔ لیکن میں بتا رہی ہوں تمہیں کہ ایسی کوئی بات جو تمہارے گمان



# صَدِّقِ مَہارِے

”نفق۔ یہ رضیہ کی بیچی بھر دروازہ لاک کر کے نہیں گئی۔“ جب تک وہ برآمدے کے دروازے پر بیچی بیرونی دروازہ کھول کر ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے کوئی عورت اندر داخل ہو چکی تھی۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

”کون ہوتا؟ اندر کیوں آئی ہو؟“ اس نے اندر کے خوف کو چھپاتے لڑکھ آواز میں پوچھنا چاہا، مگر آواز حلق میں ہی دب گئی تھی اور ایک منہنا بیٹ سی باہر نکل آئی۔ شکر کہ وہ عورت مانگنے والی ضرور تھی، لیکن غلط ارادے سے اندر داخل نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ ہاتھ میں تھامے ڈاکٹر کی پرچیاں اور ایک سرے دکھائے اس سے مدد کی درخواست کر رہی تھی۔ خوف کا غلبہ ختم ہوا تو خدیجہ نے دیکھا کہ عورت کی گود میں موجود بچے کے ہاتھ پر پٹی بندھی تھی۔ وہ شاید اس بچے کے علاج کے لیے ہی مدد گئی آئی تھی۔

خدیجہ کا سدا کا نرم دل ہمدردی اور محبت کے جذبات سے بھر گیا اور وہ جلدی سے اندر گئی۔ اپنے بیک کی تلاشی لی، ایک سوکا نوٹ دو چاروں بیس کے نوٹ اور چند سکے۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور جاکرامی کی دروازے سے پانچ سوکا نوٹ نکال لائی۔

”دوائیاں، ایک سرے علاج پر تو پیسہ پانی کی طرح بہتا ہے۔“ دل میں سوچتی جب تک وہ واپس آئی امی اور ماریہ بھی کھلے دروازے سے اندر آ چکی تھیں اور امی اب سختی سے اس عورت سے استفسار کر رہی تھیں۔

”کون ہو بی بی، یہاں کیوں کھڑی ہو۔“  
”یہ دیکھو اماں، میرا چھوٹا سا بچہ، گر کر ہڈی توڑوا

وہ گود میں کتاب رکھے صوفے سے ٹیک لگا کر کارپٹ پر بیچی سر صوفے پر لڑکھائے بہت فرصت سے اٹکھ رہی تھی۔ پاس ہی موبائل چارجنگ پر لگا تھا۔ جس کی آخری دم پر جا کر دوبارہ زندہ ہوئی بیٹری بتا رہی تھی کہ اسے بمشکل آرام کا موقع ملا ہے۔ کل آخری اور سب سے مشکل پیپر تھا، ایک طرف پیپر ختم ہونے خوشی اور دوسری طرف کل والے پیپر کی ٹینشن وہ دہری کیفیات میں غرق، تصور ہی تصور میں پیپر کے بعد آنے والی چٹھیوں کے مزے لے رہی تھی۔ امی اور ماریہ بازار گئے تھے۔ ابو اور طلحہ اپنے اپنے کاموں پر، امی جاتے ہوئے ماسی کے سر پر گھرے ہو کر صفائی کروانے، دل لگا کر پڑھنے، موبائل سے ددرا اور احتیاط سے رہنے کی ہدایات دے کر گئی تھیں۔ وہ تمام ہدایات کی خلاف ورزی کرتی مطمئن بیٹی تھی، لیکن اسے اس بات کا احساس تک نہ تھا۔ اگر اب بھی امی غصے سے ڈانٹیں تو فوراً رو ہانسی ہو جاتی کہ ”میں آپ کی سب باتیں مانتی ہوں پھر بھی آپ مجھے ڈانٹتی ہیں۔“ اس معاملے میں وہ بالکل سیاست دانوں جیسی تھی۔ ساری دھاندلی کے بعد بھی روتی شکل بنا کر ووٹ مانگ لیتا۔

ماسی کا کام ختم ہو گیا تو وہ اللہ حافظ کہہ کر چلی گئی تھی۔ جب کہ آنسہ خدیجہ ابھی تک خوابوں کی دنیا میں مدھوش تھیں، دروازے پر آٹھویں لاک لگا تھا سو امید تھی کہ کام والی رضیہ لاک کر کے چلی جائے گی، لیکن جو اس تب بچال ہوئے جب پہلے دروازے پر دستک اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ کتاب پھینک پھا تک ایک دم اٹھ کر بھاگی۔



”جاؤ مدد ہو گئی تمہاری جاؤ اب، یوں گھر کے اندر رحمت گھنسا کرو۔ جو بات ہو باہر سے کیا کرو۔“  
 امی ڈپٹی ہوئی اندر آ رہی تھیں اور وہ عورت خوشی سے ہاتھیں پھیلائے سر ہلائی رفو چکر ہونے کے چکر میں تھی، جب ماریہ نے اس کے ہاتھ سے ایک سرے رپورٹ پکڑ لی۔  
 ”یہ ایک سرے تو ٹانگ کا ہے اور پٹی تم نے ہاتھ

بیٹھا، پلاسٹر چڑھانے کے لیے نہیں۔ اللہ کے واسطے میری مدد کرو۔“ وہ بچے اور ایک سرے کو لہرا لہرا کر مدد طلب کر رہی تھی۔ اس نے برآمدے کا دروازہ کھول کر پانچ سو کا نوٹ عورت کی طرف بڑھایا۔ جو اس نے فوراً جھپٹا تھا جب کہ رحم سے اس عورت کی بات سننے کی بات کے تاثرات بدلے تھے اور وہ اسے گھورنے لگی تھیں۔





کر دی۔“

”امی تم سے زیادہ غریبوں کی مدد کر دیتی ہیں، تم یہ زحمت نہ ہی کیا کرو۔ خود قابل ہیں نہیں دوسروں کی مدد کرنے چلیں۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ جب تم ایلی تھیں تو اسے اندر بلانے کی کیا ضرورت تھی۔“ ماریہ نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

”میں نے نہیں بلایا تھا، وہ تو خود ہی اندر آ گئی تھی۔“ جھجکا کر کہتے آخر میں اس کا لہجہ دھیمہ پڑا۔ ماریہ آنکھوں میں حیرانی اور غصہ بھرے اسے گھور رہی تھی۔ ویسے تو وہ اس کی چھوٹی بہن تھی، لیکن غصہ بالکل بڑی باجیوں جیسا کرتی۔

”خود ہی آ گئی تھی، یعنی دروازہ کھلا تھا، یقیناً تم نے رضیہ کے جانے کے بعد دروازہ بند نہیں کیا جب کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ دروازہ لاک نہیں کرتی۔ پھر بھی تم نے چور جاچوں کے لیے کھلا دعوت نامہ چھوڑ دیا اور یقیناً تم نے صفائی بھی ڈھنگ سے نہیں کروائی کیونکہ کونوں میں مٹی صاف نظر آرہی ہے۔ تمہاری حرکتیں ہیں ہی اس قابل کہ امی کی ڈانٹ کھاؤ میں بلاوجہ تمہاری مدد کو آ جاتی ہوں۔“ وہ جملہ جو ماریہ نے انتہائی غصے سے شروع کیا تھا آخر میں تجزیاتی رپورٹ میں بدل گیا تھا، رپورٹ بھی وہ جس سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

”شرم کرو بڑی بہن سے بات کرنے کی تمیز نہیں، کیا حرکتیں ہیں میری۔“ وہ ڈانٹ کا صدمہ بھلائے کمر کسر کر میدان میں آ گئی۔ اگر امی ماریہ کی بات سن لیتیں تو منقطع نشریات دوبارہ بحال ہو جاتیں سو بہتری اسی میں تھی کہ وہ پہلے حملہ کر کے اسے دبا لیتی۔ ماریہ بھی اس کی بہن تھی، اس کے تیز لہجے سے ذرہ بھر مرعوب نہ ہوئی۔

”کوئی ایک بے وقوفی ہو تو یاد کرواؤں، جھپٹے مہینے جو تم نے پڑوسیوں کی ماسی کو گھر میں بٹھا کر کھانا کھلایا تھا، یہ جانے بغیر کہ وہ ان کے گھر سے سونے کے زیور چوری کر کے نکلی ہے اور پھر تم سے بھی بٹی کی شادی کے لیے پیسے لے گئی جب کہ اس کی کوئی بیٹی

پر باندھی ہے۔“ ایک سرے کا معائنہ کرتی ماریہ بلند آواز میں استفسار کر رہی تھی۔ اندر جاتی امی ٹھٹک کر رک گئی تھیں۔ خدیجہ نے آنکھیں پھاڑ کر اس عورت کو دیکھا تھا جو ایک سرے ماریہ کے ہاتھ میں ہی چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکی تھی، اسے ڈرتا کہ ہاتھ آتے پیسے واپس نہ چلے جائیں۔ خدیجہ کو اپنی عزت افزائی کا اندیشہ تھا سو وہ بھی تیزی سے لاؤنج میں جا کر بے یار و مددگار کھی کتاب اٹھا۔ ایسے خشوع و خضوع سے پڑھنے لگی کہ دنیا کی خبر نہ رہے، لیکن وہی ہوا جس کا ڈرتا تھا۔ دروازہ بند کر کے امی اور ماریہ اب اس کے روبرو تھیں۔ امی انتہائی غصے سے اسے ڈانٹ رہی تھیں جب کہ ماریہ بہت سلی سے اس کی بے عزتی انجوائے کر رہی تھی۔ انہیں پیسوں کے نقصان سے زیادہ اس کی لاپرواہی پر غصہ تھا جو اب ہر صورت نکل رہا تھا۔

”غضب خدا کا، پہلے اس نو سر باز کو گھر میں گھسایا اور پھر پانچ سو کا نوٹ نکال کر بھی تھما دیا۔ درخت سے ہیں توڑتے پیسے ہم۔ خود کھاؤ تو قدر آئے پیسوں کی۔“

”خود ہی تو کہتی ہیں کہ صدقہ بلاؤں کو ملتا ہے، اُس کا جھوٹ کس کے سر، ہماری نیت تو صاف ہے نا۔“ اس نے صفائی پیش کرنی چاہی جس پر امی مزید چراغ باہو گئیں۔

”صدقہ بلاؤں کو ملتا ہے، لیکن یہ جو تمہاری حماقتیں ہیں یہ تو سر اسر دعوت نامہ ہیں میسٹیس انکھی کرنے کا۔“ لگتا تھا امی باہر سے ہی خراب موڈ کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ کان لیٹے، سر جھکائے سستی رہی۔ آخر ماریہ نے ہی پانی لا کر امی کو پایا اور خالہ کے فون کی اطلاع دی تو وہ موبائل لیے کراپے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ جیسے ہی امی گئیں اس نے آنسو بھری آنکھوں سے روہانے لہجے میں ماریہ سے شکوہ کیا تھا۔

”دیکھا تم نے، ایسا سلوک کرتی ہیں امی مجھ سے جیسی سوتیلی ہوں، کیا ہوا جو کسی غریب کی مدد



”کون سلمان؟ کیوں تمہیں کیا کام ہے۔“ وہ فوراً مشکوک ہوئی۔ صبا بھی متوجہ ہو گئی تھی۔

”مجھے کیا کام ہوگا اس سے، کسی کام کا ہے بھی نہیں وہ۔“ اس کے چوتھے انداز بروہ چڑ گئی تھی۔ پھر انہیں ہنوز، سوالیہ انداز میں متوجہ دیکھ کر بولی۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ اب چھٹیاں ہیں تو کوئی جاب وغیرہ کر لوں، وہ کرتا ہے تا پارٹ ٹائم جابز اور آن لائن کام وغیرہ۔“

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا، مہینے دو مہینے کی جاب تمہیں کون دے گا۔ ویسے بھی انکل سے پوچھ لو پہلے، نکال دیں گے تمہارے دماغ سے فتور۔“ صبا نے اسے گھر کا تھا۔ وہ اس کی اسکول کے زمانے کی دوست تھی۔ گھر والوں اور گھر کے ماحول سے اچھی طرح واقف۔

”لیکن مجھے کچھ کر کے دکھانا ہے دراصل.....“ اس نے کل کا قصہ پورا کہہ سنایا۔ اس کی ڈانٹ سے خوب لطف اٹھانے اور اسے چڑانے کے بعد رپا گویا ہوئی۔

”یہ تو بہت آسان ہے۔ تم ٹیوشن دے لو۔ یونیورسٹی کے ساتھ بھی کر لوگی۔ سب ہی لڑکیاں کرتی ہیں گھر بیٹھے یہ کام۔“ رپا کا آئیڈیا بہت اچھا اور قابل عمل تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ خوشی سے اچھلتی، صبا نے طنزیہ اضافہ کیا تھا۔

”سب ہی کر لیتے ہیں، لیکن اگر تم کر سکو تو اتنا آسان نہیں ہوتا پڑھانا۔“

”لفظ۔“ وہ تپ ہی تو گئی تھی۔ ”بس یہی انداز ہیں تم لوگوں کے جو مجھے اس کام پر اکسار ہے ہیں، اب دیکھنا میں کیا کر سکتی ہوں۔“ ان کے چہرے پر پچھلی دل جلانے والی مسکراہٹ دیکھ کر اس نے ایک عزم سے کہا تھا۔ اتنے دعوے کرنے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ گھر جاتے ہی اس بات کو ڈسکس کر دیتی، لیکن بھلا وہ اس کی آرام پسند طبیعت کا کہ وہ گھر جا کر لمبی تان کر سو گئی۔ عصر کے وقت امی کی مسلسل ڈانٹ پر انہی اور نماز پڑھ کر چائے کا کپ

ہی نہیں۔“ ماریہ نے استہزاء ایسے انداز میں اسے پچھلا کر نامہ یاد کروایا۔ محال ہے جو کوئی بات وہ بھول جائے۔ اس واقعہ میں بھی شکر ہے انکل کے ابو سے اچھے تعلقات کام آئے ورنہ ان کی بہو تو ایف آئی آر میں اسے بھی مازمہ کر دیتی۔

خدیجہ دل میں شرمندہ ہو گئی، لیکن چہرے پر ذرا بھی شرمندگی کا تاثر لائے بغیر دھٹائی سے بولی۔

”تو کیا ہوا، مجھے تو نیت کا ثواب ملے گا نا۔“ ”نیت کا ثواب نہیں، گداگری کو پیشہ بنانے والوں کی حوصلہ افزائی کا میڈل۔ اب یہ ہمارے گھر سردی گرمی کا کام کرنے آتی ہے ناراضیہ۔ جب تم بستر میں گھس جاتی ہو سردی میں تب وہ کپڑے دھو رہی ہوتی ہے۔ تم جیسے بے وقوف ہی انہیں باور کرواتے ہیں کہ محنت مت کرو، مائیکنا شروع کر دو۔ اور یہ تم نیت کا ثواب امی کی دراز سے پیسے نکال کر کیوں لیتی ہو۔ اگر اتنا ہی شوق ہے تو اپنے کپڑے، جوتے مت بناؤ، مدد کرو سب کی۔ سچ کہتی ہیں امی، خود کماد تو خرچ کرتے بھی درد ہو۔“ ماریہ نے اچھی طرح بے عزتی کر دی تھی۔ تب ہی وہ تپ گئی۔

”بس کر دو، میرے ابو کے پیسے ہیں۔ جہاں مرضی خرچ کروں اور خود بھی کما سکتی ہوں، کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“

”دیکھتے ہیں تمہاری کمائی۔“ ماریہ نے گویا چیخ دیا تھا اور اس نے قبول بھی کر لیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن اس سمسٹر کا آخری سیمپر تھا اور پھر سمسٹر بریک۔ سیمپر دینے کے بعد وہ اپنی دوستوں کے ساتھ کینیڈین آگئی۔ سیمپر مشکل تھا اور کسی کام بھی اچھا نہیں ہوا تھا، لیکن ایک ٹیلنٹس ختم ہونے کی خوشی منانا بھی ضروری تھا۔ تب ہی چاٹ اور کولڈ ڈرنک انجوائے کرتے وہ تینوں کہیں لگا رہی تھیں جب اسے کل کا واقعہ یاد آ گیا۔

”سنو یار، وہ تمہارا بھائی کہاں جاب کر رہا ہے۔“ اس نے رپا کو مخاطب کیا۔



باریہ نے ہٹائی لی ہوگی۔“ وہ اپنی ہی سوچوں میں گن  
تھی جب اسے کسی نے متوجہ کیا۔

”کیا نام ہے آپ کا؟“

”خدیجہ۔“ اس نے ہونٹ پھیلا کر زبردستی کی  
مسکان سے جواب دیا، دھیان تو سارا بریانی پر تھا۔ وہ  
نئی سنووری پیاری سی لڑکی کیا توجہ نہ دیتی۔

”میں سمجھتی ہوں، سیکنڈ فلور پر رہتی ہوں اور یہ  
میرا بیٹا نفل، پڑھتی ہو آپ؟“ اس نے مسکرا کر اپنا  
اور ساتھ بیٹھے دو تین سال کے بچے کا تعارف کر دیا  
اور ساتھ ہی سوال داغا۔ اسے باتوں کے موڈ میں  
دیکھ کر وہ مجبوراً متوجہ ہوئی تھی، لیکن یہ جان کر کہ وہ  
اپنے بچے کے لیے ٹیوشن ڈھونڈ رہی ہے، اس کی  
پانچویں خود بخود کھل گئی تھیں۔ کھانا کھا کر واپس آتے  
تک سمجھتی نہ صرف اس کا بیٹا نفل لے کر کھل گھر آنے  
کا عندیہ دے چکی تھی۔ گھر آتے ہی اس نے اپنے  
پہلے اسٹوڈنٹ کی خبر بہت خوشی سے شریکی تھی جو امی  
نے بے توجہی سے سنی تھی اور واضح کر دیا تھا کہ وہ  
ٹیوشن پڑھانے یا کچھ بھی، لیکن گھر کے کام تو اسے  
کرنے ہی پڑیں گے۔ وہ منہ ہٹائی ماریہ کی طرف  
مڑی جو انتہائی فکر مند سی کھڑی تھی۔

”خدیجہ میرا تو خیال ہے کہ منع کر دو، چھوٹے  
بچوں کو پڑھانا آسان نہیں ہے۔“

”کرنے والوں کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا  
بچے۔“ خود کو عظیم استاد کے روپ میں دیکھتے اس نے  
کمال بے نیازی سے جواب دیا تھا۔

اگلے دن سمجھ آئی۔

”اصل میں آج کل میری اپنی طبیعت بھی  
ٹھیک نہیں، ساس بھی بیمار ہیں ورنہ تو میں اسے خود ہی  
پڑھا لیتی، بچوں کو مکمل توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ پھر  
ڈانٹ ڈپٹ سے بھی وہ سیکھ نہیں پاتے۔ تم اسے پیار  
سے پڑھانا، تھوڑا ضدی ہے، لیکن سیٹ ہو جائے گا تو  
ذہن بہت ہے۔“ سمجھتی بی بی کی باتیں، منہ مانگی فیس  
کے لالچ میں وہ مسکرا مسکرا کر سنتی رہی، امی تو پہلے ہی  
چکن میں چلی گئی تھیں۔ ماریہ البتہ وہیں کتا ہیں

لے کر فرصت سے ٹائم ضائع کرنے لگی، حد تو یہ تھی کہ  
موبائل استعمال کرنے کا بھی موڈ نہیں تھا۔

”تمہارے پاس کوئی کام نہیں ہے کرنے کو،

اپنی الماری ہی ٹھیک کرلو۔ آٹا گوندھ رہی ہے  
ماریہ..... رات کو روٹیاں بنا دینا۔“ امی اس کے  
کمرے میں آئیں تو اسے فارغ بیٹھا دیکھ کر بولیں۔

”جائے تو پیسے دیں سکون سے۔“ وہ حسب  
عادت چڑھئی جس کا امی نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

ایسا کرو، میرے ساتھ برابر میں چلو قرآن  
خوانی میں، اسی بہانے سارہ پڑھ لوگی دیے تو چارہ  
چار دن قرآن نہیں کھولیں۔“ امی کی بات اسے  
شرمندہ کر گئی تھی، تب ہی اثر مٹانے کو بولی۔

”برابر میں کہاں؟ اتنی اونچی تو بلندنگ کھڑی  
کر لی آئی نے، دو پورشن فرسٹ فلور پر، دو سیکنڈ پر،  
گھر ہی گھر، ہماری دھوپ رک رہی ہے، ہم پڑوسی  
ہیں، ہم سے تو اجازت لی نہیں۔“

”تمہیں تو واقعی دھوپ لگوانے کی ضرورت  
ہے تاکہ دماغ کے کیڑے مریں۔“ امی اسے گھور کر  
مڑی تھیں۔

☆☆☆

قرآن خوانی میں نئے نئے لوگ تھے اور بچے  
کے فلیش اور پھر ادھر ادھر کے محلہ دار جلد ہی قرآن  
پاک مکمل کر کے سب خواتین اصل مقصد پر آ گئیں  
یعنی باتیں۔ دو، دو تین کے گروپ میں سب لوگ  
اپنے اپنے من پسند موضوعات پر لگے تھے۔ کوئی  
کپڑوں کی قیمت اور برانڈز پر تیرہ کر رہا تھا تو کوئی  
بھری ہوئی سرچوں کی ترکیب پوچھ رہا تھا۔ امی زور و  
شور سے لیموں سے داغ دے جیسے صاف کرنا سکھا رہی  
تھیں، یہ اور بات کہ سیکھ کوئی نہیں رہا تھا۔ خدیجہ کو کوئی  
ہم عمر نہیں ملا تھا سوادہ نظر بہت مدد پرستی پیشی باہر سے  
اٹھتی بریانی کی خوشبو پر نوکس کے ہوئی تھی۔

”کب لگائیں گی کھانا، تھی ابھی خوشبو ہے،  
اگر ایک ڈش آئی نے گھر بھجوا دی تو روٹی بنانے کی  
ضرورت نہیں، ویسے بھی اتنی دیر ہو گئی ہے، اب تک تو



”یو والی۔“ بچے نے آنسو صاف کرتے

جواب دیا۔

”یہ آکس کریم فیس سے جائے گیا الگ سے  
پینکے ملے گا اس کا۔“ ماریہ نے شوخی سے پوچھا تھا اور  
اس کے گھورنے پر سہنے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

سہلا دن تھا وہ بچے سے چھوٹی چھوٹی باتیں  
کرتے لگی، لیکن وہ جواب دینے کے بجائے آکس  
کریم کی رٹ لگائے بیٹھا تھا۔ اتنے میں باہر سے  
میوزک بجا اور بچہ خوشی سے اچھلا۔

”آگیا آکس کریم والا۔“ بھد مجبوری وہ اٹھی  
اور پیسے نکال کر ایک ونیلا آکس کریم لے آئی۔  
”نہیں مجھے یہ نہیں کھانی میں دوسری کھاؤں گا۔“  
نوفل نے رونا ڈال دیا۔ پہلے اس نے پیار سے سمجھایا  
کہ یہ وہی یو آکس کریم ہے جو آپ نے مانی تھی،  
لیکن اسے شاید رنگوں کی پہچان نہ تھی۔ ایسے ہی بول  
دیا تھا۔ جب اس کا باجا بند نہ ہوا تو وہ اپنے اصل  
روپ میں آئی۔

”چپ۔ شور مچا رکھا ہے، کوئی آکس کریم نہیں  
ملے تمہیں۔“ بچہ ایک دم چپ ہو گیا اور وہ تسلی سے خود  
آکس کریم کھانے لگی۔

”کوئی بات نہیں آئی، مجھے یہ بھی اچھی لگتی  
ہے۔“ نوفل نے اس کے ہاتھ سے آکس کریم لے کر  
سمجھ داری سے کہا تھا۔

”بدتمیز، پہلے تو اسے آبی سکھانا پڑے گا۔“ وہ  
بڑبڑاتی تھی۔ آکس کریم اور پیسے جانے کا غم اور پھر  
آئی اسے دل برداشتہ کر گیا تھا۔

مسلل کوشش اور آکس کریم کا خرچہ برداشت  
کر کے نوفل اس سے مانوس ہو ہی گیا تھا۔ پہلے پہل  
اس نے بنیادی رنگوں کی پہچان کر دانی، پھر پڑھنے پر  
آئی، وہ سلیٹ پر چاک سے لکھتا تھا، یہ بھی سمجھ ہی  
کی فرمائش تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لکھنا سکھاتے وہ  
تھک جاتی تھی، لیکن شکر ہے کہ اب وہ الفاظ پہچاننے لگا  
تھا۔ ایک دن سمجھ گھبرائی ہوئی آئی۔

”یہ تم نے کیا کر دیا، حد ہوتی ہے۔“ اس کا

پھیلائے اس کی حالت سے محفوظ ہو رہی تھی۔ آخر  
سمیعہ نے نوفل کو بھیجا۔

”بیٹا جاؤ، آئی کو سلام کرو، آپ کی ٹیچر ہیں  
یہ۔“ اس سے پہلے کہ وہ آئی پر برامنائی، بچے نے ٹٹی  
میں سر ہلایا۔

”نہیں، یہ آئی گندی ہیں، میں ان سے  
پڑھوں گا۔“ وہ ماریہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس  
سے پہلے کہ بچے کی محبت میں چور ماں اسے ماریہ کی  
طرف متوجہ تھی، ماریہ نے فوراً کہا۔

”نہیں بھئی، آپ کی ٹیچر وہی ہیں، میں نہیں  
پڑھاتی۔“ سمیعہ کو برا تو لگا، لیکن نظر انداز کر دیا۔ اب  
صورت حال یہ تھی کہ خدیجہ بچے کو بلارہی اور وہ نہیں،  
نہیں کرتا ماں کی گود میں گھستا جا رہا، ماں پریشان  
مشورے دیے جا رہی۔

”آپ کے پاس چاکلیٹ نہیں، وہ دکھا دو، کوئی  
کھلونا نہیں آپ کے کمر۔“

”حد ہو گئی یعنی آپ کے بچے کو پڑھانا ہے یا  
گود لینا ہے۔“ خدیجہ دل میں ہمنائی اور بولی۔

”آپ اسے روتا چھوڑ جائیں گی تو یہ چپ  
ہوگا، ورنہ جب تک آپ ہیں یہ میرے پاس نہیں  
آئے گا سمیعہ آئی۔“ آپنی پرزور آئی کا بدلہ لینے کے  
لیے دیا گیا تھا۔ آخر سمیعہ جانے کو اٹھی، نوفل کو خدیجہ  
نے قابو کیا وہ روتا ہوا ماں کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور  
ماں رحم طلب نظروں سے خدیجہ کو دیکھتی دروازے  
تک جاتی اور پھر واپس آ جاتی، آخر دل پر پتھر رکھ کر  
سمیعہ چلی ہی گئی اور ان کے جاتے ہی ایک فلک  
شکاف تہتہ ماریہ کے حلق سے نکلا تھا۔

”پیارے رکھنا، ڈانٹنا نہیں۔“ اس نے سمیعہ  
کی نقل اتاری۔

”تو سب بچوں کی اماں ہی ایسی ہوتی ہیں۔“  
اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا اور نوفل کو صوفے پر  
بٹھایا۔ ”بس بیٹا، اب چپ ہو جاؤ، پھر میں آکس  
کریم منگوائی ہوں، کون سی آکس کریم کھاتے ہو  
آپ؟“



غصیلہ انداز خدیجہ کو ڈرا گیا۔  
”کیا کرو یا میں نے“

”یہ کیا سکھایا ہے اسے بیوقوف۔“ اس نے کتاب کھولی اور نوفل سے پوچھا۔ ”نوفل پڑھو۔“  
”اے، اے فار اپیل“ نوفل نے بالکل درست پڑھا تھا، لیکن سمیعہ بدستور اسے غور سے سن رہی تھی۔  
”اے نہیں ہوتا آج کل فائیک سسٹم ہے۔“ وہ گویا اپنا سر پیٹ رہی تھی۔

”حد ہوئی، ایک تو اتنی محنت کر دیکھ باتیں سنو، مجھے نہیں آتا یہ ساؤنڈ سسٹم لے جائیں اپنا بیچ، ساری فیس کی تو آٹس کریم کھالی اس نے اور دماغ الگ کھا گیا میرا۔“ اس کے ایسے بولنے پر سمیعہ نے بھی سارا لحاظ سائڈ پر رکھ دیا۔

”جب کچھ آتا نہیں تو کیوں بچے کا مستقبل خراب کرنے لگی تھیں، شرم نہیں آتی میرے چھوٹے سے بچے کا کھایا پیا کتے، تب ہی اتنا کمزور ہو رہا ہے۔“ سمیعہ تو نوفل کو لے کر چلی گئی اور خدیجہ ماریہ سے مذاق اڑوانے کو رہ گئی۔

☆☆☆

کچھ دن سکون سے گزرے تھے پھر جیسے اللہ تعالیٰ شکر خورے کو شکر دے دیتے ہیں۔ خدیجہ کو بھی نئی ٹیوشن مل گئی، یہ آنٹی بھی سمیعہ کی بلڈنگ سے ہی آتی تھیں۔

”سمیعہ نے ہٹا لیا نوفل؟ ایسی ہی ہے وہ غریبی سی، اے لے لاؤں سے بھلا پڑھتے ہیں بچے۔“ غیبت کو تو می فریضہ جانے نئی آنے والی خاتون دیکھی سے انجام دے رہی تھیں۔ یہ اس کی نئی کلائنٹ تھیں، زارا، سارا کی والدہ۔

”یہ دونوں جڑواں بہنیں نویں کلاس میں پڑھتی ہیں۔ انہیں ٹیوٹر کھر آ کر پڑھاتا تھا، لیکن چونکہ ابھی وہ اپنے والد کی وفات کی وجہ سے گاؤں چلا گیا تھا تو وقت ضائع نہ ہو کے خیال سے میں انہیں یہاں لے آئی۔“

”یک نہ شد و دشد، ایک کے بدلے دو اور وہ

بھی اتنی بڑی سمجھ دار بچیاں، لگتا ہے اللہ پاک مجھے کامیابی دینے والا ہے۔“ خدیجہ خوش ہو گئی تھی۔

”میں تو اپنی بچیوں کا بے جالا ڈ نہیں کرتی، بچوں پر سختی ضروری ہے۔ تم جیسے جاہو انہیں پڑھاؤ، مجھے پتا ہے بعض جگہ پیار کی نہیں ماری ضرورت ہوتی ہے۔“ خدیجہ کا دل بلیوں اچھلا تھا۔ نئی اچھی ماں ہیں، اب نوفل والے جو بچکوں سے تو جان چھوٹی، وہ مدد برینی بولی۔

”نہیں، نہیں آنٹی اتنی بڑی بچیوں پر سختی اچھی بات نہیں، میں پیار سے پڑھانے پر یقین رکھتی ہوں۔ اس نے ہر بڑا کران کے بیان میں رخصتہ والا۔“ سختی بھی بھلائی کے لیے ہی کرتے ہیں اور کتنے بڑے ہو جائیں بچے والدین کا تجربہ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ آنٹی کو اس کا کون سا گوار لگا تھا۔ آنٹی امی کے مطلب کی تھیں سو وہ دونوں مل کر بچوں پر ڈانٹ ڈپٹ کے فوائد ڈسلس کرنے لگیں۔ چند دن میں ہی خدیجہ کی خوشی کا فور ہو گئی تھی۔ پڑھانے کا کوئی مسئلہ نہ تھا کہ ان کا ٹیوٹر فقیر یا سارا کی بیس پڑھا چکا تھا بلکہ یاد کروا چکا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ بظاہر ایک جیسی نظر آنے والی دونوں بچیاں مزاجاً بالکل مختلف تھیں۔ زارا پڑھا کو، سنجیدہ مزاج اور امی کی چچی تھی۔ یہاں ہونے والی ہر بات سے اپنی امی کو آگاہ کرنا اس کا فرض تھا اور خدیجہ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا، وہ کوئی ہیروئن نہیں بیچ رہی تھی جو ڈری، لیکن اعتراض تھا اس کی بہن سارا کو۔ جس کا دھیان کتابوں کے سوا ہر جگہ ہوتا۔ خدیجہ، ماریہ کے پاس لپ اسٹک، ٹیل کلرز کے کون سے شیڈز ہیں، ان کے لیپ ٹاپ میں کتنی سوویز ہیں اور ان کی امی چاٹ مسالا کھر میں کیسے بنا رہی ہیں، وہ ہر بات پر دھیان دیتی۔ کبھی کبھی کتابیں بھی کھول لیتی، اگر وہ نصائی کتب نہ ہوتیں۔ چند دن میں ہی ماریہ سے اس کی گامی چھیننے لگی تھی۔ وہ بے فکری سے خدیجہ کو لپی دیتی۔

”باجی آپ فکر نہ کریں، ہمارا رزلٹ اتنا



شاعر آئے گا کہ امی آپ کا شکریہ کرتے نہ جھکیں گی۔“

دوسری طرف زار تھی جسے فضولیات میں بالکل دلچسپی نہ تھی۔ اپنا سلیبس وہ گھول کر پی چکی تھی اس لیے اکثر ماریہ یا خدیجہ کی کتابیں پڑھتی اور سمجھ میں نہ آنے کی صورت میں خدیجہ کا ہی دماغ چاٹتی کہ وہ اس کی نیچر تھی۔

خدیجہ کا خود یونیورسٹی میں پہلا سال تھا، ابھی تو کینٹین کی خاک چھاننے سے فرصت نہ لی تھی پڑھائی پر کیا دھیان دیتی۔ مسٹر بریک ختم ہو چکا تھا، اب وہ تھکی ہاری یونیورسٹی سے آ کر ابھی سوئی ہوئی کہ وہ دونوں کتابیں لیے اس کے سر پر سوار ہو جاتیں۔ ایک دو دفعہ ان کے آنے پر وہ فوراً نہیں اٹھتی تو بعد میں سارا ہفتہ بھر اس کا مذاق اڑاتی ہیں۔

”باجی آپ تو منہ گھول کر سو رہی تھیں۔ خواب میں کیا دیکھ رہی تھیں، جواتا مسکرا رہی تھیں۔“ امی کا حکم تھا کہ شام میں ابو بھائی کے آنے سے پہلے انہیں قاریغ کر دو اور وہ خود اسکول سے آ کر اپنے گھر میں اتنا بور ہو تیں کہ سر پڑھنے کے بہانے یہاں آ کر بیٹھ جاتیں۔ دو بجی اس سے یونیورسٹی کی چاٹ منگواتیں، تو ابھی سموسے اور یہ واحد معاملہ تھا جس پر دونوں بہنوں میں اتفاق تھا۔ اتنے رش میں کس کر یہ چیزیں لانا اسے بالکل پسند نہیں تھا، لیکن اس کے انکار پر وہ اسے پڑوسیوں کے ایسے ایسے حقوق ہے آگاہ کر تیں کہ اپنی آخرت بچانے کے لیے اسے چل خوار ہونا ہی پڑتا۔

اس نے بہت دفعہ انہیں پڑھانے سے معذرت کرنا چاہی، لیکن اب آئی امی کی دوست تھیں۔ فیس کا تو کوئی معاملہ ہی نہ تھا دونوں مل کر بکڑتے ماحول اور نئے علاقے میں بچوں کی تعلیم کے مواقع پڑوسکس کرتیں اور طے یہ پایا کہ ان کے ٹیوٹر کے آنے تک تو اسے ہی پڑھانا ہے، بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔ پھر ایک دن تو اس کے جھنجھلا نے پر ابونے بھی پیار سے سمجھا دیا۔

”نیکس یہ نہیں کہ اسے اخراجات سے اضافی پیسے کسی کو تھا دے جائیں بلکہ اسے مسلمان بھائی کا خیال رکھنا، خود مشکل برداشت کر کے اس کی مدد کرنا ہی اصل نیکس اور اعلا اخلاق کی پہچان ہے۔“

”لیکن یہ تو بہن ہیں نا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی تھی، لیکن ابو کی بات پوری ہو چکی تھی سو اسے بڑھانا ہی تھا۔ ایسے ہی ایک دن سمعیہ بھی نوفل کے اسکول میں ایڈمیشن کی مٹھالی لے کر آ گئی۔

”میں نے تمہیں اتنا کچھ کہہ دیا، تم نے تو اسے کافی کتنی اور رنگ بادر دیا ہے سمعیہ، وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی تو خدیجہ بھی مسکرا دی۔“

”نہیں سوری کی کیا بات، میری بھی غلطی ہے کہ آپ سے بوجھ لیتی کیا پڑھانا ہے اور یہ سب سیکھنا آج کل کیا مشکل، نیٹ برس مل جاتا ہے۔“

”خدیجہ اب بس نوفل تمہارا اسٹوڈنٹ ہے پکا، تم ہی پڑھاؤ گی، سمعیہ اس کے الفاظ دل پر ہی لے گئی اور لاڈ سے بولی۔“

”نہیں، نہیں سمعیہ آئی مجھے نہیں آتا کچھ بھی، میں تو نیٹ سے بھی نہیں سمجھ سکتی، ابھی اپنے پیپر ز میں بھی قفل ہوتے ہوتے رہ گئی ہوں میں تو۔“ وہ بوکھلا کر الٹا سیدھا بولنے لگی، ٹیوشن پڑھانے کا بھوت سر سے اتر چکا تھا، لیکن اب پڑوسیوں سے جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔

☆☆

ایک نیا نیا اور دلکش اور دلچسپ اور دل

**فصل غم کا گوشوارہ**

راضیہ جمیل

300

کتاب کی قیمت: 37 - مردانہ/مراہمی - فون نمبر: 32735021



# خمارِ رنگِ سیلہ

## دوسری قسط

ہیں۔ وہ خاموش رہی تھی۔ اسے نہ سہولت محسوس ہوتی تھی اور نہ ہی درد..... وہ ان دنوں پتھر ہو چکی تھی۔ شوکروں کی زد میں آیا ہوا پتھر..... جو شوکروں کے باعث اپنے کونوں کھدروں سے جتنا مرضی ہموار ہو جائے۔ اس کے باوجود ہیرا نہیں بن سکتا۔

لیکن چکی گھر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔ انہیں بعد میں پتا چلا کہ اماں اس کے جہیز کے لیے کمپنی والوں سے کافی پیسے لے چکی تھیں۔ وہ کس چیز کی تیاری کر رہی تھیں؟ کیا انہیں اپنی موت کی پہلے سے خبر ہو گئی تھی یا موت کے فرشتے نے چپکے سے ان کے کان میں کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے فرائض پورے کر لیں، ان کے پاس بہت کم مہلت رہ گئی ہے، اور انہوں نے اس آواز کو اچھا یا برا شکلون سمجھتے ہوئے پورا کیا تھا۔ کیا فائدہ ہوا تھا اس سب کا..... اسے اماں کے ہاتھوں جوڑی ہوئی کسی چیز کو نئے گھر لے جانے کی خواہش نہیں تھی۔ لیکن کمپنی والوں کو پیسوں کی واپسی کی طلب ضرور تھی۔ جس کی ادائیگی وہ آئے کی صورت میں ہی کر سکتی تھی، اور آٹا بنا چکی کے پس نہیں سکتا تھا۔

رات گئے تک وہ چکی چلائی رہتی، دو وزنی پتھروں کے باہم تصادم سے پیدا ہونے والی گھوگھوکی آواز اس کی سماعتوں پر کاری دار کرتی رہتی، محسوس قطب اس کے ہاتھ کی پتھلی میں گڑ جاتا، وہ جتنی تکلیف محسوس کرتی اتنی ہی مزید شدت سے اسے گھمانے لگتی، دانوں کا برادہ اچھل اچھل کر دائیں بائیں گرتا رہتا، اور وہ دیوانگی میں تیز تیز ہاتھ چلائی اس برادے میں اپنے آنسو بھی شامل کرنے لگتی۔

زندگی پرانی ڈگر پر چل رہی تھی اور پتھلی سے مزید بری حالت میں چل رہی تھی۔ ایک فرد کی عدم دستیابی کی بھینک تبدیلی کے باوجود گھر کا سارا ماحول حسب معمول تھا۔ ڈال کے پتے جامد تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو.....

کان میں سین اور زیادہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔ لڑکیوں نے اس کی احساس کتری میں مبتلا طبیعت کا علم ہونے کے باوجود اسے اس کی بد مزاجی جانا تھا۔ صرف اس کی ایک دودھتیل ایسی تھیں جو اس کی حالت سے واقف تھیں اور کسی حد تک اس کے غم سے بھی..... وہ اسے رحم کی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں۔

اپنے گروپ میں شامل کر کے اسے ہنسانے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ اس کا دل لگانے کے لیے جتن کرتی تھیں۔ اور وہ ان سب میں ایسے رہتی تھی جیسے کوکوں کی ڈار میں کوا..... اُن کی ساری کوششیں عث کرتی تھیں۔

خود بابا کی کمر بھی ٹوٹ گئی تھی۔ غموں نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا اور شاید تنہائی نے بھی..... جس عورت کے ساتھ انہوں نے زندگی کے پچیس سال گزارے تھے وہ ایک دم سے انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ آدھے راستے میں..... دو، دو ذمہ داریوں کے ساتھ..... وہ اپنا غم کس کے کندھے پر سر رکھ کر ہلکا کرتے..... سین کو دیکھ دیکھ کر وہ مزید بوڑھے ہوتے جا رہے تھے۔

”میں چکی کو گھر سے اٹھوا رہا ہوں۔“ ایک دن بابا نے اس سے کہا تھا۔ اس بتانے میں پوچھنے کا عنصر بھی پوشیدہ تھا کہ اگر وہ چکی چلانے میں سہولت محسوس کرتی ہے تو پھر وہ اپنا لیک دار ارادہ بدل بھی سکتے



چکی چلا ہتی ..... زویا کا کام احسان لینے کے مترادف تھا۔

چکی سے بمشکل فراغت کے بعد وہ بابا کا بھی پیادیا کرتی۔ کھانے کو ایک فرد کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی گھر کے اخراجات تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

زویا بھی اکثر چکی پر بیٹھ جاتی۔ وہ اس کی مدد کروانا چاہتی تھی۔ وہ چکی کو سستی سے ہی سہی لیکن چلا لیتی تھی۔ وہ اپنے فرض کو بھی بھٹانا چاہتی تھی۔ گھر کی خاموش کال کو گھری جیسی فضا میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی۔ لیکن زویا کے چکی پر بیٹھنے میں ایک قباحت تھی۔ وہ چکی پر بیٹھ جاتی تھی لیکن دانے اس کے ساتھ بیٹھ کر خود ڈالنے پڑتے تھے۔ کیونکہ زویا چکی کی ہلکی ہوتی آواز سے یا اس کے آرام سے چلنے پر بھی اندازہ نہیں لگا سکتی کہ وسط میں دانے ختم ہو گئے ہیں اور اب اسے چکی میں نئے دانے ڈال دینے چاہئیں۔ اب یاس بیٹھ کر دانے ڈالنے سے بہتر تھا کہ بسن خود ہی





سے مل جاتے ہیں۔ بس وہاں قطب نہیں گھمانا پڑتا،  
ذہن گھمانا پڑتا ہے۔“

”کسی ہینک اسکول میں پتا کرنا تھا تم نے..... تم  
ایک لائق اسٹوڈنٹ ہو۔ اپنی سند دکھاؤ ان کو.....“ بابا  
کے لیے باہر کی دنیا کیا تھی۔ وہ تاسف سے سوچ کر رہ  
گئی۔ پتا نہیں ساری زندگی وہ کس جنگل میں دھونی  
رہائے بیٹھے رہے تھے۔

”مہنگا اسکول کے کہتے ہیں آپ.....؟ جہاں  
بچوں کی فیس زیادہ ہوتی ہے۔ وہ مہنگا اسکول ہوتا  
ہے۔ لیکن وہاں کی استانیوں کی تنخواہوں کے حساب  
سے اسکول کو نام دیا جائے تو وہ اسکول کم یتیم خانہ  
زیادہ لگے گا۔“ بابا بلا جواب ہو گئے تھے۔ جوان ہوتی  
اولاد کا تجربہ اور مشاہدہ ان سے کہیں زیادہ تھا۔

”بچپن سے اس کام کو ہی دیکھی آ رہی ہوں۔  
اس میں ہی چار پیسے کا سکتی ہوں۔“ اس نے بابا کا دل  
رکھنے کو کہہ دیا تھا۔ یہ سوچے بنا کہ یہ دونوں کام کرتے  
وقت اس کا خود کا دل کس قدر دکھی ہو جاتا تھا۔

”چوتھ سفید ہوتا ہے اس کے لیے دل کا سفید  
ہونا بھی ضروری ہے۔ تم خون سفید کر کے بیٹھی ہو، اس  
طرح سے تم یہ کام نہیں سیکھ سکو گی۔ یہ بے ضرر پتھر کیسے  
تمہارے لیے اپنی انا کو توڑ کر تمہیں کسی قالب میں  
ڈھالنے کی اجازت دے گا۔“

وہ بابا کی منطق سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی اور نہ  
ہی انہیں اپنی سمجھانے کے موڈ میں تھی۔ وہ کیا بتاتی کہ  
گھر کی چوکھٹ سے باہر زمانہ بدل گیا ہے۔ کام کے  
بدلے ہی اناج ملتا ہے۔ کوئی فلسفوں کو سن کر پیٹ بھر  
سکتا ہے اور نہ ہی پیٹ بھرنے کے لیے کچھ دینا  
ہے۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا چونے کے لیے من  
صاف کرنے کا..... وہ تو صرف اس لیے یہ کام کر رہی  
تھی کہ چار ہاتھل کر یقیناً کام کو آسان بھی کر سکتے  
تھے اور زیادہ بھی..... اسے اب زویا کا آپریشن بھی  
کر دانا تھا۔ اپنی شادی کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اتنے  
بہت سے خرچے منہ کھولے کھڑے تھے۔ اس کے  
آٹھ ہاتھ بھی ہوتے تو تھک جاتے جتنا کام وہ ان

”میں کر لوں گا۔“ بابا اسے اپنے قریب بیٹھے  
سے روکتے۔

”کیا کر لیں گے آپ..... صحت دیکھیے کتنی گر چکی  
ہے آپ کی چونا پھاٹک پھاٹک کر.....“ چونے کا نام  
آتے ہی اس کے لہجے میں نفرت در آتی۔ یہ بات بابا کو  
بری لگتی۔ وہ جانتی تھی لیکن وہ اس کو چھپانے سے بھی  
قاصر تھی۔ وہ ڈھیلوں کی طرح بابا کے پاس بیٹھ جاتی،  
چونے کے ڈھیر میں گڑھا نکال کر پانی ڈالتی، ڈوٹی کھا  
کر اسے کچا کر لیتی، پھر سانچوں میں ڈالتی اور بھی خاموشی  
سے مال پر ریگ مال مارنا شروع کر دیتی۔ اڑتا رہا وہ اس  
کی نفرت انگیز سانسوں سے پرے ہٹا جاتا، اور بابا  
خاموشی سے اسے دیکھتے جاتے۔

وہ دونوں وہ والے کام کر رہی تھی جن سے وہ  
بارہا نفرت کا اظہار کر چکی تھی۔ چکی اور چونا..... چکی  
کی ٹھوکھو اسے ناپسند تھی اور چونا..... اس سے منسلک  
اسے کوئی ایک ذرہ بھی پسند نہیں تھا۔ اسے سب سے  
ابکائی محسوس ہوتی تھی۔ ڈوٹی سے، بڑے قدر نما  
پیالے سے جس میں چونے کا آمیزہ بنایا جاتا تھا۔  
سانچوں سے، خاص کر ریز کے سانچوں سے، جو بار  
بار کے استعمال سے بعض زندہ سے ہو گئے تھے۔ اسے  
ان سب سے گھن آتی تھی۔ لیکن شاید وہ اس طرح خود  
سے کوئی بدلہ لے رہی تھی۔ اپنی تقدیر سے، اپنی قسمت  
سے..... بابا سے..... یا شاید مری ہوئی اماں سے.....

”تم مت کرو یہ کام..... کچھ ادھر کر لو..... بچوں  
کو ٹیوشن پڑھا لو.....“ بابا چار پانی پر کھانتے ہوئے  
کہتے۔ وہ ایسے کھانتے تھے کہ ان کے ساتھ ساتھ ان  
کا پورا وجود بھی کھانے لگتا۔

”جس محلے میں ہم رہ رہے ہیں یہاں بچے  
اسکول پڑھنے ہی بہت مشکل سے جاتے ہیں۔  
میرے پاس ٹیوشن پڑھنے کوں بھیجے گا اپنے بچوں  
کو.....“

”تو پھر کسی سکول میں استانی لگ جاؤ.....“  
”میں پتا کر آئی ہوں اسکول میں بھی..... وہ  
اتنے ہی پیسے دے رہے ہیں جتنے چکی چلنے سے آسانی



”مال لے کر کریم کے پاس چلی جاؤ، اس سے

پیسے بھی لے آنا“

بابا نے ایک دن اس سے کہا تھا اور اس کا دل بگولے کی زد میں آئی چڑیا کی طرح کانپ کر رہ گیا تھا۔ وہ کوئی پہلی بار تو نہیں جا رہی تھی چچا کریم کے پاس ایک بار پہلے بھی جا چکی تھی۔ پھر اس کے دل کی دھڑکن کیوں زنجیروں سے اکھڑنے لگی تھی؟ اسے وہاں جانے سے ڈر لگا تھا یا اکیلے بازار جانے سے؟ یا وہ اس راستے پر دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی جہاں ایک دن اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ایک اجنبی سے، جو کسی ملک کا بھٹکا ہوا شہزادہ لگتا تھا۔

”میرا نام میران ہے۔“ آواز اس کی سماعتوں میں قید تھی۔ اس کا خیال ہی جیسے اس کی کل متاع بن گیا تھا۔ وہ اب نکاح شدہ بھی اور اس راستے پر پھر سے جا کر اس محرم کو غیر محرم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

چادر اوڑھ کر ایک بہت لمبا چکر کاٹ کر وہ دوسرے راستے سے چچا کریم کی دکان پر پہنچی تھی۔

”قطب الدین کو کیا ہوا ہے؟“

”ان کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں ہے۔“

”تب ہی تو میں بھی کہوں کہ مال اتنا خراب کیوں آ رہا ہے۔ اس نے پچھلے بیس سالوں میں ایسا برا کام نہیں کیا جیسے وہ اب کر رہا ہے۔ وہ تو چوہے کو الماس برادہ کہتا ہے۔ جانتا ہے کہ اس برادے کو پھر سے الماس کیسے بنانا ہے۔“ چچا کریم اس کے سامنے اس کے باپ کی تعریف کر رہے تھے۔ اسے کوئی سروکار نہیں تھا کہ بابا چوہے کو کیا کہتے ہیں اور لوگوں کے لیے یہ بات کس حد تک باعث فخر ہے۔

”کیا مال زیادہ خراب ہے؟“

”بہت.....“ چچا کریم افسوس سے سر ہلانے لگے۔ ”بہت زیادہ شکایتیں آ رہی ہیں۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس بار اسے گاتوا سے کہوں گا۔ طغرے میڑھے ہوتے ہیں یا اندر کے الفاظ کی اچھی تراش خراش نہیں ہوتی، چونا بھی صحیح پکا ہوا نہیں ہوتا، اس کے پچھلے مال کے بہت سے طغرے تو دکان میں پڑے پڑے اپنے ہی وزن سے

دنوں کر رہی تھی۔

”آپ اس کام کو جدید طریقے سے کریں

اب..... منفرد رنگوں کا استعمال کریں۔ جیسا دوسرے لوگ کرتے ہیں۔“

”رنگوں سے میرے ہاتھ جلنے لگتے ہیں۔ ایک بار پہلے بھی میں نے کوشش کی تھی۔“

”تو میں کر لیا کروں گی۔“

”مجھے اس کی بو سے الرجی ہے۔“

”پھر گولڈن سلور پتی یا گنگ لگانے کا کام کر

لیتے ہیں۔“

”وہ سب کام ڈائی سے نکلے ہوئے مال پر ہوتا

ہے۔ ہمارے سانچے پرانے ہیں۔ ڈائی لگانے کے لیے کافی سرمایہ چاہیے اور نئے سانچے بھی بہت مہنگے ہیں۔“

”لیکن ہم افشاں تو اسی مال پر لگا سکتے ہیں ناں۔ میں نے چچا کریم کی دکان پر دیکھا ہے۔ لوگوں نے اسی مال پر افشاں لگائی ہوئی ہے۔“

”افشاں سانسوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس کا کام میں تمہیں ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔

وہ لوگ کار میگوں سے کام کرواتے ہیں۔“

”ہونہر..... جو فائدہ مند تھا اس نے کیا فائدہ پہنچا

دیا تھا ان سب کو.....“ وہ نخوت سے سوچی اور ایک بار پھر سے پرانے سانچوں میں گاڑھا آئینہ ڈال دیتی۔

شاید بابا اس کے کام کو ہاتھ لگانے کے انتظار میں ہی تھے۔ وہ جوانی کی کمزوری کو لپیٹ لپیٹ کر کام پر بیٹھے تھے اب بالکل ہی چار بانی سے لگتے جا رہے تھے۔

ایک دن انہوں نے وہ پیر بھی سنبھال لی تھی جس پر کبھی اماں بیٹھا کرتی تھی۔ کیونکہ اب بابا سے بھی نہیں چلا جاتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے بابا کو بھی اماں کی

طرح ہی بری طرح کھانتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس دن اسے اندازہ ہوا تھا کہ اسے تیز تیز ہاتھ چلانے پڑیں گے۔ ورنہ وہ پھر سے کچھ کھودنے کے لیے خود کو تیار کر

لے۔ دولت کی کمی کیسے سانسیں کم کر دیتی ہے یہ اس نے ایک بار دیکھ لیا تھا۔ دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆



گھر جانے کے بجائے سیدھا دریائے راوی چلی جائے اور چیکے سے چھلانگ لگا دے۔  
گھر آتے آتے اس کا دماغ آتش فشاں کی طرح کھولنے لگا تھا۔ اس کی نس نس میں سوئیاں سی چھینے لگی تھیں اور اس کا روم روم نفرت انگیز غضب کا فکار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”ایڈم رائل۔“ وہ نہ ہندو تھا، نہ مسلمان، نہ سکھ، نہ پارسی، نہ یہودی اور نہ ہی عیسائی..... بلکہ وہ ان سب مذاہب کی پیروی کرتا تھا۔ ان کی عزت کرتا تھا۔ اس نے اپنے نام کے آگے رائل کا اضافہ بھی اسی وجہ سے کیا تھا۔

”اس نام کو مسلمان بھی رکھتے ہیں اور ہندو بھی..... بدھ کے لیے یہ مقدس نام ہے۔ پارسی، عیسائی اور یہودی بھی اسے رکھتے ہیں۔ لائی لوگ بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ اس لیے میں آج سے اس نام کا اضافہ کر رہا ہوں۔ میں تمام مذاہب کی پیروی کرتا ہوں۔ عزت کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمام مذاہب کا احترام ہے۔ میں تمام مذاہب کی اکائی بنا چاہتا ہوں۔“

اس نے تیس سال کی عمر میں یہ اعلان کرتے ہوئے اپنے نام کے آگے ”رائل“ کا اضافہ کیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اس کی سوتیلی ماں، جس نے اسے یتیم خانے سے لے کر پالا تھا، کے بعد اس کے سوتیلے باپ کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔ دونوں کی موت نے اسے غم زدہ کر دیا تھا اور اس نے زندگی کو اکیلے اور ایک نئے انداز میں گزارنے کا تہیہ کیا تھا۔ زندگی کی وہ محرومیاں جو اپنا بچپن ایک یتیم خانے میں گزارنے کے بعد اس کے چہرے پر ثبت تھیں عائب ہو گئی تھیں۔ اسے کتابیں پڑھنے کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ کسی تحریر کا نچانے اس پر کیا اثر ہوا تھا کہ اس نے اپنا مذہب چھوڑ دیا تھا اور تمام مذاہب اپنا لیے تھے۔ شاید اس کی وجہ دنیا میں مذہب کے نام کی وہ شدت پسندی اور انتشار تھا جو بہت سے فساد کا باعث بن رہا۔  
وہ اسے اس کا خود کا پیدا کسی مذہب کیا تھا اس کے

ٹوٹ گئے تھے جبکہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ چونے کو پتھر کر دیتا ہے۔ پانی کی مقدار اور دھوپ کی آج کا اس سے زیادہ کس کو پتا ہوگا۔  
”کیسی عجیب بات ہے۔ اپنے فن میں اتنی مہارت بھی پایا کو اسودہ حال نہیں کر سکی۔“ وہ دُکھ سے بڑبڑا کر رہ گئی۔

”جو لوگ فن کو ایمان بنا لیتے ہیں ان کے لیے ذریعہ معاش اتنی اہمیت نہیں رکھتا جی! چچا کریم نے شاید اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ ان کی بات نے اسے شرمندہ کر دیا۔ چچا کریم نے اسے پیسے پکڑا دیے تھے۔ اس نے پیسے گئے تھے۔ جو اس کی توقع سے بہت کم تھے۔“ کیا اتنے ہی بنتے ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ چچا کریم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا میں تمہارے ساتھ بے ایمانی کر سکتا ہوں بیٹی؟“  
”نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔  
”یہ دیکھو!“ چچا کریم نے اپنا دراز کھول کر وہاں سے ایک کیش میونکالی۔ اور اسے پچھلے مہینوں کی رسیدیں دکھانا شروع کیں۔ ”ہمیشہ تقریباً اتنے ہی پیسے جاتے ہیں میری بیٹی۔“ اس کا دماغ کھولنے لگا۔ اس کام کے اتنے کم پیسے ملتے رہے ہیں باپا کو، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے چچا کریم پر غصہ نہیں تھا۔ اسے تو..... کس بات کا غصہ۔ تھا اسے آخر؟

پچھلے بار جب چچا کریم نے اسے پیسے دیے تھے تو ساتھ ہی بھی کہہ دیا تھا کہ باقی حباب کتاب میں قطب الدین سے خود کرو لوں گا۔ وہ بھی تھی کہ عید کی وجہ سے بچا کے پاس پیسوں کی کمی ہے۔ لیکن اب؟  
اس نے اس مال پر بابا سے زیادہ خود محنت کی تھی۔ اسی لیے اتنے زیادہ مال پر اتنے کم پیسوں کو وہ اپنی جگہ محسوس کرنے لگی تھی۔ تین ماہ سے بجلی، گیس کے بل جمع نہیں ہوئے تھے۔ باورچی خانے میں راشن کے خالی برتن اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج چچا کریم سے جو پیسے ملیں گے ان سے وہ یہ یہ کام کرے گی۔ اور اب اپنے دوپٹے کے پلو میں پیسے باندھتے ہوئے اس کا دل لرز رہا تھا کہ وہ



ابھی سے اپنی این۔ جی۔ او۔ کے نام کر دی تھی۔ ایسا درویشانہ فیصلہ لیتا بہت کم لوگ ہی کر پاتے ہیں۔ ایڈم ان ہی کیا ب لوگوں میں سے ایک تھا۔ اخبارات اس کے بارے میں آئے دن کچھ نہ کچھ شائع کرتے ہی رہتے تھے۔ اس کی پچھلی زندگی سے متعلق اور اس کے آنے والی زندگی کے ارادے..... جو کہ زیادہ تر تجزیے اور پیش گوئیوں پر مبنی ہوتے تھے۔ اگر وہ تمام مذاہب کی عزت کر رہا تھا اور ان کے لیے کام کر رہا تھا تو بدلے میں اسے بھی اتنی ہی عزت مل رہی تھی۔ ہر قوم سے اور ہر فرد سے..... یہ ہی وجہ تھی کہ آج حاجی صاحب کی محفل میں شریک ہونے کے لیے بھی اسے خوشی اجازت دے دی گئی تھی۔

”میرے لیے یہ بہت اعزاز کی بات ہے کہ حاجی صاحب نے مجھے اپنی محفل میں شرکت کی اجازت دی ہے۔ مجھے پتا چلا تھا کہ ان کے سماع سے چیدہ چیدہ لوگ ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ جو کہ پہلے سے ہی طے شدہ تھے۔ لیکن میری درخواست کو بھی عزت بخشی گئی۔ اس کے لیے میں حاجی صاحب کا دل سے ممنون ہوں۔“ باہر نکل کر وہ ریس والوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ اس کی جھکی آنکھیں اور نرم لہجہ اس بات کا غماز تھا جیسے وہ ابھی بھی ”صوفی رقص“ میں موجود ہو۔

”آپ کے لیے اس محفل میں شرکت کرنا اتنا ضروری کیوں تھا؟“ ایک صحافی نے پوچھا تھا۔ ”جیسے کہ آپ سب ہی جانتے ہیں کہ میرے دل میں تمام مذاہب کا احترام موجود ہے۔ اس لیے میں ہر مذہب کی تمام چیزوں کو فالو کرتا ہوں۔ میں نے عمرہ بھی کیا ہوا ہے، میری کارنوٹیا بھی، میں بدھ دانت کے مندر بھی جاتا ہوں اور پلوڈا بھی..... اس لیے میری لیے یہ محفل بھی اتنی ہی اہم تھی۔ کسی بھی مذہب کو جاننے کے لیے ان کے تہوار اور ان کی مقدس محفلوں کو جاننا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔“

”لیکن سر کچھ لوگ تو آپ پر یہ بھی الزام لگاتے

بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ یتیم خانے کے فارم میں اس کے پیدا ہونے کا خانہ خالی تھا۔ اور وہاں سیکور لکھا ہوا تھا۔ لیکن وہ سیکور نہیں تھا۔ وہ غیر مذہبی ہوتے ہوئے بھی سارے مذاہب کے ماننے والوں کا پسندیدہ شخص تھا۔ کیونکہ آج تک اس کے ساتھ کوئی ایک بھی تنازع مسلک نہیں ہوا تھا

رفتہ رفتہ اس نے تمام مذاہب کی عزت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ان تھک محنت کے بعد وہ معاشی لحاظ سے بھی آسودہ تھا۔ ایڈم رائل ایک معروف ادارے ”آل ریلیجن“ (تمام مذاہب) کا مالک تھا۔ اور جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے یہ ادارہ دنیا بھر کے سارے مذاہب کے لیے کام کرتا تھا۔ اس ادارے کے تحت تمام مذاہب کی مقدس کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ مقدس کتابوں کی آڈیو کیسٹ، ترجمے اور ہر وہ کام جو کسی بھی مذہب سے منسلک تھا وہ یہاں سے نکلتا تھا۔ جیسا اس نے اپنے بچپن میں کہا تھا دیا کر دکھایا تھا۔ وہ تمام مذاہب کی ترویج کی واحد آکاکی بن چکا تھا۔ تصعب سے پاک، بغض سے پرے.....

آل ریلیجن مذہبی نقطہ نظر سے بہت وسیع پیمانے پر کام کر رہا تھا۔ جس کے باعث ایک عالم ایڈم رائل کا دیوانہ تھا۔ جن میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ وہ اس حسن کے دیوانے کے چروں میں بیٹھ کر اس کی سیوا کرنا چاہتی تھیں لیکن یہ اس کی فطرت کی کجی تھی یا عدم دلچسپی کہ کوئی بھی لڑکی ابھی تک اس کے التفات کی حق نہیں ٹھہری تھی۔ ججز کے بیٹے بھرنے میں ابھی اسے کسی فریق کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی تھی۔

ایڈم کی اپنی ایک این۔ جی۔ او۔ بھی تھی۔ جو یتیم اور بے سہارا بچوں کے لیے کام کرتی تھی۔ اس کے لیے وہ فنڈ ریزنگ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ دنیا بھر میں ہونے والی مختلف مذہبی تقریبات میں وہ بذات خود شریک ہو کر چندہ مانگا کرتا تھا۔ اپنی ساری دولت جو اس وقت اس کے پاس تھی اور جو وہ آنے والے وقت میں کما سکتا تھا اس نے



گناہی ثابت کرے گا۔ کیونکہ خدا خود کہتا ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔“

”لیکن آپ تو خود کسی مذہب کو نہیں مانتے سر! آپ کیسے کسی کی اصلاح کر سکتے ہیں؟“

”میں کسی ”یک“ مذہب کو نہیں مانتا..... ورنہ تو

میں سب مذاہب کو مانتا ہوں۔ خدا کے وجود سے میں کیسے انکار کر سکتا ہوں جو ہرہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں مسلمان نہیں ہوں، نہ عیسائی، نہ ہندو، اور نہ ہی یہودی..... اس نے اثبات آلود مسکراہٹ جس میں صرف اور صرف خلوص تھا سے جواب دیا..... وہ بہت سہولت سے بر بات کا جواب دیتا رہا تھا۔ حاجی صاحب ”ساع“ سے باہر نکلے تو سب کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ ایڈم حاجی صاحب سے مصافحہ کر کے، پشت سے ان کے ہاتھ کا بوسہ لے کر، کار میں بیٹھ کر اپنے آفس کے لیے نکل پڑا تھا۔

☆☆☆

”بابا یہ دیکھئے..... ٹھیک بتا ہے۔“

بابا سو رہے تھے یا شاید سو نے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب وہ تاج محل کا ایک ماڈل لے کر ان کے پاس آئی تھی۔ یہ تاج محل سارا کا سارا اس نے خود ہی بنایا تھا۔ چونے کو سانچے میں ڈالا تھا۔ اسے نکھایا تھا۔ پھر سانچے میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ باہر نکالا تھا۔ اس کی باریکیاں بنائی تھیں۔ نیا چونا کھول کر اس کی اس اس جگہ سے لپیلا پونپی کی مٹی جہاں سے ماڈل سانچے سے سج نہیں نکل سکا تھا۔ یار یک یار یک اوزاروں سے اس کی تراش خراش کی تھی۔ پھولیں مار مار کر اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ وہ تھک گئی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ اب تو وہ اس کام کو ٹھیک سے سیکھ ہی گئی ہے۔

بابا نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اسے اور پھر تاج محل کے ماڈل کو دیکھا۔ پیلے وہ مدد کرنی تھی اب خود یہ سارا کام سنبھالنا چاہتی تھی۔ کیا وہ بھی قطب

ہیں کہ آپ یہ سب دکھاوا کرتے ہیں۔ درحقیقت آپ کچھ اور ہیں۔“ ایک صحافی نے چپچہتا ہوا سوال کیا تھا۔ ایڈم نے مسکرا کر اس کے سوال کی کٹی کو برداشت کیا تھا۔ غصہ میں آنا اس کی شخصیت کا خاصا نہیں تھا۔

”جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں وہ بھی درحقیقت کچھ اور ہیں۔ مجھے اپنے دشمنوں کو کچھ نہیں کہنا..... مجھے ان کو معاف کرنا ہے۔“

خدا یہ ہی سکھاتا ہے۔ ہماری دنیا میں مذہب کی منجائش کم ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ لوگ مذہب کو ماننے والوں کے ہی خلاف ہیں۔ ایسے میں مجھ جیسے آدمی کا وجود جو سارے مذاہب کی ترقی کا کام کر رہا ہے۔ جس کے ادارے سے ہر ہر مذہب کی ترقی ہو رہی ہو، انہیں کیسے برداشت ہوگا۔“

ایڈم کے بارے میں شک کی صرف ایک ہی وجہ پچھلے دنوں سامنے آئی تھی جب اس کی ایک ایسی فوج منظر عام پر آگئی تھی جس میں اسے کچھ مجرمانہ قسم کے لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ یہاں صحافی نے اسی کے بارے میں ہی بات کی تھی۔ یہ قصہ فوراً شروع ہو کر ایڈم کے جواب کے بعد فوراً ختم بھی گیا تھا لیکن اس صحافی کی جیسے ایک بار میں تسلی نہیں ہوتی تھی۔

”لوگ اگر اپنی اصلاح کے لیے میرے پاس آتے ہیں تو میں ان کا ماضی نہیں دیکھتا۔ کیونکہ خدا بھی ہماری توبہ کے بعد ہمارے ماضی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اب جو لوگ خود کو بہتر کرنا چاہتے ہیں ان کا تعلق مجرموں کے قبیلے سے ہو یا مومنوں کی صفوں سے ہو..... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا..... وہ لوگ مجرم تھے۔ گناہ مار، قاتل..... مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا، وہ میرے پاس اصلاح کے لیے آئے تھے۔ اور اپنے طور پر ان کی اصلاح کرنا مجھ پر میری ذات کا فرض تھا۔ جسے میں نے ادا کیا۔ اسی لیے میں خود پر الزام لگانے والوں کو معاف کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ روزِ محشر خدا مجھ پر الزام لگانے کی وجہ سے انہیں دوزخ میں ڈالے..... مجھے خدا پر یقین ہے کہ وہ میری بے



ٹوٹے ہوئے تاج محل سے سفید چوڑے کا ایک ٹھکانا  
 بادل بلند ہوا۔ یہ بادل دونوں کے درمیان گئے بھر کو  
 حائل رہا۔ بابا خاموش تھے۔ اس کی صورت دیکھ رہے  
 تھے۔ بادل ہٹا تو وہ پھر سے پھٹ پڑی۔

”ماں کو آپ سے بہت محبت تھی بابا! آپ پر  
 کبھی اس گھر کا بوجھ پڑنے ہی نہیں دیا انہوں نے۔  
 آپ یہ سمجھتے رہے۔ کہ آپ کے ان نمونوں اور  
 طغروں نے گھر کو چلایا ہے۔ اس کے کتے پیسے ملتے  
 ہیں یہ تو مجھے آج چچا کریم کے پاس جا کر پتا چلا ہے۔“  
 نفرت سے کہتے ہوئے اس نے دوپٹے کے پلو سے  
 پیسے نکالے تھے۔ ”یہ..... یہ پیسے دیے ہیں انہوں  
 نے مجھے۔ ان ذمیر سارے ماڈلز کے۔“ اس نے چند  
 تڑے مڑے سے نوٹ نکال کر بابا کے سامنے پھینکے۔

وہ غصہ جو صبح سے اس کے سر پر سوار تھا وہ اس نے  
 پیسوں کو زمین پر نخوت سے پھینک کر نکالا تھا۔

بابا کچھ نہیں بول سکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ  
 کیا کہہ رہی ہے۔ وہ سب کچ کہہ رہی تھی۔ ان کا فن  
 بس اتنی ہی قیمت رکھتا تھا۔ آج ان کے ماڈل سمیت  
 ان کی قیمت بھی عیاں ہو چکی تھی۔ انہوں نے دوا ایک  
 آنسو بہائے تھے۔ آنسو سین کی آنکھوں سے بھی نکل  
 آئے تھے۔

کانچ کے ہرپل نے سو روپے کا نوٹ دیتے  
 ہوئے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ”اگر یہ چھپیں کم لگ رہے  
 ہیں تو جان لو کہ..... یہ بہت زیادہ ہیں۔ اس ماڈل کی  
 حیثیت سے بھی اور تمہاری اوقات سے بھی۔“ آج اس  
 نے جان لیا تھا۔ بعض جان کارایاں اس قدر سفاک  
 کیوں ہوتی ہیں وہ یہ نہیں جان سکتی تھی۔

”اس چوڑے نے ہماری زندگی تباہ کر دی ہے  
 بابا! اس چوڑے نے، آپ کہتے ہیں کہ اس کے لیے  
 دل کا سفید ہونا ضروری ہے۔ دل کیسے سفید رہے۔  
 جب اس سے روح کو سیاہ غم لگ چکے ہوں۔“ وہ بھی  
 رونے لگی تھی۔

ساری رات روتے ہوئے اور سوچتے ہوئے  
 اسے یہ احساس کھاتا رہا تھا کہ وہ بابا کا بھرم ہی رکھ

الہ دین بننا چاہتی تھی۔ بابا اسے کتنی بار تو منع کر چکے  
 تھے لیکن وہ باز ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر وہی  
 کام کے بارے میں بھی جو اس سے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس  
 کام کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔ وہ صرف بابا کو تنگ کر  
 رہی تھی۔ کیونکہ جب وہ بابا سے کہا کرتی تھی کہ اس  
 کام کو چھوڑ دیں تو وہ بھی نہیں سنا کرتے تھے۔ اب وہ  
 بھی نہیں سن رہی تھی۔

”دیکھیے..... کیا پتا ہے؟“ بابا کی سمجھ میں نہ آیا  
 کہ وہ اسے کس طرح منع کریں اور کس طرح بتائیں  
 کہ اس کا بنایا ہوا ماڈل ٹیڑھا ہے اور اس میں خوب  
 صورتی نام کو نہیں۔ تاج محل کے مقبرے کی تصویر کشی کو  
 نظر انداز کر کے جیسے صرف اس کے اندر کی قبر کی  
 وحشت کو ابھارا گیا ہے۔

”سانچے کے پچ ٹھیک سے کسے تھے تم نے؟“  
 ”ہاں..... بہت اچھے سے۔“

”دلکش چھوٹی جینس سے ابھارے ہیں؟“  
 ”جی.....“ اس کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔ اسے پتا  
 چل گیا تھا کہ اتنے سوال کیوں پوچھے جارہے ہیں۔  
 ماڈل ٹھیک نہیں تھا یقیناً..... بابا نے اس کی آواز کی  
 مایوسی پر کھ لی تھی۔

”تم مت کرو یہ کام بیٹی!“  
 ”کیوں؟“ نظریں اٹھا کر اس نے بابا کو  
 دیکھا۔ اس کے سوال میں طغ تھا۔ بابا کے چہرے کے  
 تاثرات بدلے تھے۔

”آپ کو پتا ہے بابا! اماں کی جان کس نے لی  
 ہے؟“ اس نے پوچھا۔ بابا اس اچانک سوال سے  
 چونکے اور ہٹا گئے۔

”ان کی بیماری نے نہیں..... آپ کے اس کام  
 نے۔ ہماری زندگی پتا ہے کس نے خراب کی ہے؟  
 ہمارے حالات نے نہیں..... آپ کے اس کام نے  
 اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ میں یہ کام چھوڑ دوں۔  
 کیوں..... کیا پتا رہ گیا ہے پچھے؟“

اس نے تاج محل کا ماڈل پوری طاقت سے  
 زمین پر دے مارا۔ ایک شور اٹھا تھا کمرے میں اور



اخراجات کا بھوت سوار تھا۔ وہ جلدی میں معیار کو نظر انداز کر کے تعداد کا اصول اپنائے ہوئے تھی۔ آمیزہ بنا کر وہ انہیں سانچوں میں ڈالتی..... پھر اگلے دن بڑی احتیاط کے ساتھ سانچوں میں سے نکال کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھتی۔ ساری احتیاط کے باوجود بھی کتنے ماڈل ٹوٹ جاتے تھے۔ کچھ وہ غصے سے مزید توڑ دیتی تھی۔ بابا اسے دیکھتے رہتے اور کچھ نہیں کہتے۔

میں نے پھر بعد کافی ماڈل بن گئے تو وہ پھر چچا کریم کے پاس گئی تھی۔ اس نے اور بابا نے مل کر اس بار بہت سا کام کیا تھا۔ مال اتنا زیادہ تیار ہو گیا تھا کہ اسے دو تانے کروانے پڑے تھے۔ وہ کافی سارے پیسلے مل جانے کا سوچ کر آئی تھی۔

”مال بہت خراب آ رہا ہے میری بیٹا! مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔“ چچا کریم بے بسی سے بولے۔

”آپ اس دفعہ والا کام دیکھیے۔ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“

لڑکا جو کارٹن لے کر گودام میں جا رہا تھا اس نے اسے روک کر کارٹن وہاں ہی میز پر رکھ لیا۔

”میری بیٹی تم تو صرف بلکان ہو رہی ہو۔ یہ دیکھو..... مجھے یہاں سے ہی بلبلہ نظر آ رہا ہے۔“ چچا

کریم نے کہہ کر ماڈل پر ہلکے سے ہاتھ مارا تھا۔ ان کا شک ٹھیک تھا۔ چاک کے نیچے بلبلہ تھا۔ جہاں ہاتھ مارنے سے گڑھاڑ چکا تھا۔ وہ زمین میں گڑ جانے کی حد تک شرمندہ ہوئی۔ زیادہ مال بنانے کے چکر میں وہ پیشہ کا ایمان بھول گئی تھی۔

”میں معافی چاہتی ہوں چچا..... اگر میں دوبارہ ایسا مال لاتی تو بے شک آپ ہم سے کام لینا ہی بند کر دیجیے گا۔“

”گھر میں ڈائی لوگ میری جان..... لیکن تم اسے نہیں چلا سکتیں۔ تمہارے کمزور ہاتھ ڈائی کو نہیں چلا سکیں گے۔ اب سب ارد گرد کے لوگوں نے ڈائی ہی لگا لی ہے۔ جتنا کام تم میں نے بعد لائی ہو لوگ اتنا ایک ہفتے کے اندر اندر کر لیتے ہیں۔ لوگ اسی کام سے

لتی..... جو اسے ایک بات پتا چل ہی گئی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ اسے بابا کے سامنے عیاں ہی کرتی۔ زندگی کی تلخیوں کا بابا سے بدلہ لینا ضروری تو نہیں تھا۔ اگر وہ ساری زندگی اپنے کام سے خوش رہے تھے تو اسے کیا ضرورت تھی اس عمر میں ان کی خوشی اور راحت ان سے چھیننے کی۔

صبح وہ بابا کے کمرے میں گئی تھی۔ بابا اسی حالت میں تھے جس حالت میں وہ رات انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ شاید انہوں نے رات سے کروٹ بھی نہیں بدلی تھی۔ اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔

”مجھے معاف کر دیں بابا! میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔“ ایک دم سے وہ کہتے ہوئے بابا کے سینے پر گر گئی تھی۔ ”مجھے معاف کر دیں۔ اپنی بیٹی کو معاف کر دیں۔“ بے بسی سے اسے کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کر رہی ہے اور اس نے کل رات کیا کیا ہے۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں آج ہی اس کام سے جان چھڑا لوں گا۔ اپنا سارا سامان باہر پھینک دوں گا۔“ بابا خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔ ”میں نے تم سب کی زندگی برباد کر دی ہے۔ اب مزید نہیں کرنا چاہتا۔“

لیکن سینا جانتی تھی کہ بابا کا اس کام سے چھٹکارے کا مطلب تھا جان سے ہاتھ دھونا۔ چونے کی مالا جیتے جیتے وہ خود کو مٹی کے بجائے چونے کا انسان سمجھنے لگے تھے۔ ان کے لیے وہ ہوا بھی مضر تھی جس میں چونے کی خوشبو نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے سینا نے چونے کے پیالے میں پانی ڈال کر ایک بار پھر سے آمیزہ تیار کر لیا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ آپ نہ سہی..... لیکن میں آپ کو اسی کام میں ترقی کر کے دکھاؤں گی۔“ اس نے ایک عزم سے کہا تھا۔ بابا اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

آنے والے دنوں میں وہ پہلے سے زیادہ دل جمعی سے کام کرنے لگی تھی۔ اس کے سر پر گھر کے



اب وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا تھا اور سین کا چبھا کرنے لگا تھا۔ پیچھے پلٹ کر اسے اپنے سامنے دیکھ کر سین کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

لڑکا کمال کا ڈھیٹ تھا۔ اسے رکنا دیکھ کر وہ اس کے پاس چلا آیا تھا۔ سین اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھے۔

”معاف کرنا میں دکان کے مالک کے ساتھ تمہاری گفتگو سن چکا ہوں۔“  
”تو؟“ ”وہ سوالیہ گویا ہوئی۔“

”وہ..... میں.....“ اس کے ہونٹوں اور دانتوں میں دبلی ہوئی ماچس کی تیلی دانتوں سے بائیں کنارے کو چھوئے لگی۔ اگر یہ ماچس کی تیلی بھی اس کی کوئی ادا تھی تو..... وہ غلیظ لگ رہا تھا۔  
”مجھے لگتا ہے وہ تم پر ناحق بول رہے تھے۔“

”وہ میرے بچے ہیں۔ جو کہہ رہے تھے ٹھیک کہہ رہے تھے۔“ اس نے صاف گوئی اور درستی سے کہا۔  
”میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اگر تم برانہ مانو تو مجھے اپنے ماڈل دکھا سکتی ہوں۔ میں تمہیں اس کام کے زیادہ پیسے دوں گا۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا کام زیادہ اچھا نہیں ہے؟“ اس نے ابرو اٹھائے۔

”ہاں“  
”ٹھیک ہے۔ تو دکان میں جا کر دیکھ لو۔“  
”مڑنے لگی۔“

”نہیں“ اس نے اسے پکارا۔ ”مجھے تمہارے سارے ماڈل دیکھنے ہیں۔ جو کام میں تمہیں دوں گا۔ اس کے پیسے اس سب سے کہیں زیادہ ہیں۔ جتنا تم کمائی ہوں۔ بلکہ اس کام کے اتنے پیسے اس پورے شہر میں کوئی نہیں کماسکتا۔ جتنے میں تمہیں دوں گا۔“

بات کچھ ایسی تھی کہ سین کو پلٹنا پڑا۔ لڑکا طمانیت سے مسکرایا۔  
”بس تم پہلے میری تسلی تو کرو کہ تم یہ کام کر سکتی ہو۔“

زیادہ کمار ہے ہیں اور ایک قطب ہے کہ اس نے کبھی میری بات نہیں مانی..... خیر اس کے باوجود قطب کی بات اور تھی۔ اس کے ہاتھ میں کافی مہارت تھی۔ وہ ایک دن میں کافی کام کر ہی لیتا تھا۔ لیکن تم، انہوں نے فقرہ درمیان میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ بابا ٹھیک کہتے تھے۔ چونے کے لیے اس کا خون سفید ہو چکا تھا۔ بے ضرر پچھرنے اپنی انا کو تو ذکر ایسے کسی قالب میں ڈھالنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اور بابا سے اب اتنا کام ہوتا نہیں تھا۔

چچا کریم نے اس فرد کی سر ہلاتے ہوئے دراز میں سے پیسے نکال کر اسے تھما دیے۔ وہ پیسے بنا گئے ہی دکان میں سے باہر نکل آئی۔ اسے سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر پیسے کے قطرے نمایاں تھے اور پیاس سے اس کی جان لگی جا رہی تھی۔

تھوڑی دُور آنے کے بعد اپنی چھٹی حس کے الارم پر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اس کا شک ٹھیک تھا۔ کوئی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

وہ ایک جوانی اور بڑھاپے کے درمیان میں جھولتا ہوا شخص تھا۔ یا شاید اس کی سخت ہی ایسی تھی کہ وہ جوانی میں بھی بوڑھا دکھ رہا تھا۔ اُس نے خاکی رنگ کی انتہائی تنگ پینٹ پہن رکھی تھی۔ جسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ پینٹ پہنی نہیں مگر بلکہ جسم کے ساتھ کسی گوند سے چپکائی گئی ہے۔ شرٹ کی رنگت اور چستی بھی پینٹ سے مطابقت رکھتی تھی اور اس کے سر پر کالے رنگ کی سولہ ہیٹ تھی۔ وہ لڑکا چلتا پھرتا مچھیتوں کا باگڑیلا لگ رہا تھا۔ اس لڑکے کو وہ دکان میں بھی دیکھ چکی تھی۔ جب وہ چچا کریم کو وضاحت دے رہی تھی۔ یہی لڑکا شیلفوں پر پڑی چیزیں دیکھتے ہوئے اسے ترچھی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور انتہائی برا لگ رہا تھا۔ اگر وہ اس چیز کو اپنے حسن میں اضافے کی کوئی چیز مانے ہوئے تھا تو سین اسے اچھی طرح سمجھا سکتی تھی کہ وہ یہ حرکت کرتا ہوا کتنا اچھا لگتا ہے۔



بڑی آسانی سے کر لیں گے۔“  
تیزی تیزی سے بولتی دراصل وہ چاہتی تھی کہ  
اجنبی کی کسی بھی طرح ان کے کام سے سلی ہو جائے۔  
”یہ سب کام تم بھی کر سکتی ہو؟“

”ہاں..... میں بھی..... میں تو بچپن سے ہی  
کرتی چلی آ رہی ہوں۔ یہ دیکھو یہ میں نے بنایا  
ہے۔“ وہ نئے ماڈل اس کو دکھانے لگی جو واقعی اس  
نے بنایا تھا اور کسی حد تک لا جواب بنایا تھا۔

لیکن وہ لڑکا ماڈل سے زیادہ اس کو دیکھ رہا تھا۔  
کھوجتی نظروں سے..... اسے جیسے ماڈل دیکھنے میں تو  
کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں کی چلیوں  
میں کسی جرم کی چمک تھی۔ جسے گھر کی غربت میں  
دھنسی بین نہیں دیکھ پارہی تھی۔

”کون ہے بنی؟“ اندر سے بابا کی  
کھانسی ہوئی آواز آئی تھی۔

”بابا کسمر ہیں۔ مال بیوانا چاہتے ہیں۔ کسی نئی  
دکان سے آئے ہیں۔“ اس نے وہاں سے ہی تیز  
آواز سے کہا تھا۔ بابا نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔  
”لگتا ہے تمہارے بابا بیمار ہیں۔“ اس نے  
شاید بابا کی کھانسی آواز سے اندازہ لگا لیا تھا۔  
”ہاں.....“ اس کے پاس اس بے محل سوال کا

یہی جواب تھا۔  
”یہ پھونکی بہن ہے تمہاری؟“ اس نے صحن کے  
ایک کونے میں بیٹھی ہوئی زویا کی طرف اشارہ کیا۔ جو  
آسمان کو دیکھ رہی تھی۔  
”ہاں.....“

”یہ ٹھیک ہے؟“ اس نے اس کی ظاہری  
حالت دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا جو کہ کوئی بھی لگا سکتا  
تھا۔

”نہیں..... یہ بول نہیں سکتی۔ اس کا آپریشن  
ہونے والا ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ اجنبی  
کے چہرے پر مسکراہٹ آئی

”اور امی؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔  
”کیا تم کچھ خریدنا چاہتے ہو۔ کوئی کام کروانا

بین نے کچھ لمحے سوچتے ہوئے اس کی طرف  
دیکھا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے لگی تھی۔ خود کے ساتھ  
جوڑ توڑ..... باورچی خانے اور راشن کے ڈبوں کے  
ساتھ میل ملاپ..... کام ہی تو کرنا ہے۔ پھر یہ کیوں  
دیکھنا کہ کروانے والا کیسا ہے۔ بھلا مزدور کو اس سے  
کیا کہ اسے کمائی دینے والے ہاتھ کالے ہیں کہ  
گورے..... اسے تو مزدوری سے مطلب ہے۔

”ٹھیک ہے۔ میرے گھر چلو..... یہاں قریب  
ہی ہے۔ پیدل کی مسافت پر.....“ اس نے کہا۔  
اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ سہارے ڈھونڈ  
رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس وقت اس اجنبی کو اپنے  
گھر لے کر جانا اس کی آنے والی ساری زندگی تباہ و  
برباد کر کے رکھ دے گا۔

اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا..... کچھ  
بھی تو نہیں۔

☆☆☆

”یہ دیکھو..... یہ سب میرے بابا نے بنائے  
ہیں۔“ وہ اس اجنبی کو گھر لے آئی تھی۔ ”یہ دیکھو.....  
یہ بھی..... یہ بھی.....“ وہ صحن میں بکھرے سوکھتے  
ہوئے وہ ماڈل اسے دکھانے لگی جو ابھی پوری طرح  
تیار نہیں ہوئے تھے۔

”پہلے ہم بس سادے ماڈل بناتے تھے لیکن  
اب میں نے بابا سے کہہ دیا ہے کہ ہم رنگوں والے  
ماڈل بھی بنائیں گے۔ انسانی شکلوں والے بھی،  
گولڈن اور سلور پتی کے کام والے بھی، نگینے اور  
افشاں والے بھی۔ پہلے اتنا سرمایا نہیں تھا نا ہمارے  
پاس۔ تم تو جانتے ہی ہو گے کہ آج کل یہ سب چیزیں  
میں قدر مہنگی ہو گئی ہیں۔ گولڈن پتی تو جیسے واقعی میں  
گولڈ کی بننے لگی ہے۔ سلور پتی کے نرخ بھی آسمانوں  
سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ لیکن میں نے چچا کریم  
سے بات کی ہے۔ وہ ہمیں ادھار دے دیں گے۔ جسے  
دو ہر ماہ مال کی رقم سے ہی کاٹ لیا کریں گے۔

میں آج ہی جا کر گولڈن، سلور پیتاں، مور پنکھ،  
نگ اور افشاں خرید لاؤں گی۔ میرے بابا وہ کام بھی



نے بھیجا تھا۔ لیکن پیسے کم دینے لگا۔ تو مجھے غصہ آ گیا۔

رشید کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اس نے سین کی بات پر یقین نہیں کیا ہے۔

”آئندہ کے بعد تم چچا کریم کے پاس نہ جانا۔ مجھے مال دینا میں دے کر آیا کروں گا۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ بس یہ ہی کہہ سکی تھی۔

”کنی بار کہہ چکا ہوں۔ تم اچھا کہہ کر پھر خود ہی چلی جاتی ہو۔ مجھے نہیں پسند کہ میری ہونے والی بیوی اس طرح گھر سے باہر نکلے۔“ رشید غصے سے کہہ کر چلا گیا۔

سین اس لیے خود ہی ہر بار چچا کریم کے پاس چلی جاتی تھی کیونکہ اسے پچھلا بچہ یاد تھا۔ جب اس نے رشید کو مال دے کر چچا کریم کے پاس بھیجا تھا۔ واپسی پر جو پیسے رشید نے اسے پکڑائے تھے وہ دیکھ کر اس کا خون چل گیا تھا۔ وہ جانتی تھی اتنے کم پیسے چچا کریم نے نہیں دیے ہیں۔ وہ جا کر ان سے پوچھتا بھی نہیں جانتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ رشید کا ہی کام ہے۔

دن سے شام اور پھر شام سے رات تک وہ اس خبیث لڑکے کی بات پر جلتی رہی تھی۔ آخر اس کی ہمت کیسے ہوئی تھی اس سے اس طرح کی بات کرنے کی۔ اور پھر اوپر سے وہ اسے اپنا کارڈ دے رہا تھا کہ اگر اس کا ارادہ بدلے تو۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔ تھو۔۔۔۔۔

چولے کے باس بیٹھی وہ روٹیاں بناتے ہوئے خود کو نائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بھی دستر خوان پر کھانے کے دوران اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ساری روٹیاں جلا چکی ہیں۔

☆☆☆

”تمہارے تایا تمہاری رخصتی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“ بابا نے ایک دن کھانے کے دوران اس سے کہا۔ نوالہ اس کے ہاتھ سے منہ میں نہیں جا سکا تھا۔ بابا نے اس کا تاثر دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے گہری سانس جموڑی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

چاہتے ہو۔؟“ اسے اس کا سوال پر سوال پوچھنا برا لگا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ بھر بھید بھری مسکراہٹ سے مسکرایا۔ ”کروانا تو چاہتا ہوں۔ لیکن صرف تم سے، تمہارے بابا سے نہیں۔“

”میں کروں گی۔ میں بھی کافی ماہر ہوں۔ بولو۔ کیا کیا بنانا ہے تمہیں، کس طرح کا مال چاہیے؟“

”تو سنو۔۔۔۔۔ تمہیں ان ہی ماڈل میں سے ایک ایسا ماڈل بنانا ہے جس میں تم سب سے زیادہ ماہر ہو اور۔۔۔۔۔“

لڑکا آگے بولتا جا رہا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ ٹھیک دو منٹ بعد کا منظر تھا۔ وہ اسی لڑکے کو دھند مار کر گھر سے باہر نکال رہی تھی۔ لڑکے کے چہرے پر ابھی بھی ویسی ہی مسکراہٹ تھی۔ ”سوچ لو۔۔۔۔۔ سوداہنگا نہیں ہے اور۔۔۔۔۔ اتنا برا بھی نہیں ہے۔“ وہ مہکا اور برا کو کھینچتے ہوئے بولا۔

”دبّے ہو جاؤ یہاں سے خبیث۔۔۔۔۔“ وہ غصے سے چلائی تھی اور اس نے اس پر تھوک دیا تھا۔

رشید اس کا ہونے والا شوہر جو گھر سے کافی فاصلے پر کھڑا سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی گھر کے دروازے کے پاس آ گیا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ رعب جو اس پر چچا نہیں تھا۔ اس نے اسی رعب سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ دروازہ بند کر کے اندر جانا چاہتی تھی۔ ابھی وہاں ہی کھڑا تھا۔ اسے رشید تانی لڑکے سے ذرا برا خوف نہیں تھا۔

”اگر پھر بھی تمہارا ارادہ بدلے تو میرا کارڈ رکھ لو۔۔۔۔۔“ اس نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

رشید سب دیکھ رہا تھا اور کچھ سمجھ نہیں رہا تھا۔ سین نے رشید کے سامنے کارڈ پکڑ لیا اور اندر آ کر پھاڑ کر تانی میں بھاگا۔

”کون تھا یہ۔؟“ رشید بھی اندر آ گیا تھا۔ ”کوئی نہیں۔۔۔۔۔ مال خریدنے آیا تھا۔ چچا کریم



اگلے ایک دو دن بھی اسی طرح گزرے تھے۔  
تایا ابو آتے تھے، بولتے تھے، لڑتے تھے اور چلے  
جاتے تھے۔ کیا ہو رہا تھا وہ کچھ نہیں جان پاری تھی۔  
”کیا کہتے ہیں تایا ابو.....“ وہ مختلف طریقوں  
سے انہیں کریدنے لگتی تھی۔

”وہ چاہتے ہیں کہ میں یہ گھر رشید کے نام لگا  
دوں۔“ بابا نے ایک دن ہار مان لی..... سین دھک  
سے رو گئی۔  
”یہ کیسا مطالبہ ہے۔“

”تمہاری تائی ایسا ہی چاہتی ہیں۔ ورنہ.....“  
بابا خاموش ہو گئے۔

”ورنہ کیا؟“ اس نے پوچھا کس بات کی  
تقدیق چاہتی تھی وہ..... جبکہ وہ جانتی تھی کہ تائی کی  
مرضی اس نکاح میں نہیں ہے اور وہ اپنی ضد کی کس حد  
تک پکی ہیں۔ اگر اس کی شادی رشید سے ہو چکی ہوئی  
اور اس کے دو تین بچے بھی ہو چکے ہوتے اور جب تائی  
یہ مطالبہ کرتیں تو بچی بابا کو اتنا ہی پریشان ہوتا تھا۔  
کیونکہ تائی اپنی ضد میں انتہا تک جانا جاتی تھیں۔  
”ورنہ..... وہ رخصتی نہیں لیں گے۔“ بابا کہہ کر  
چارپائی پر گر گئے۔

”مجھے ایسے لالچی لوگوں میں جانا بھی نہیں.....  
ان کے ذہن میں یہ بات آئی ہی کیوں۔ کیسے؟ آپ  
انکار کر دیں۔“

”پاکل مت بنو تمہارا صرف رشتہ نہیں طے ہوا  
جو میں انکار کر دوں۔ نکاح ہو چکا ہے..... مجھے کچھ  
کرنا ہوگا۔ کرلوں گا میں کچھ.....“

”آپ یہ گھر ان کے نام نہیں لگائیں گے  
بابا۔“ اس نے سنبھہ کی اس کی آواز میں استقلال تھا۔  
”میں آگے ہی بہت پریشان ہوں سین! مجھے  
مزید پریشان مت کرو۔“

وہ پیر پختی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔  
شادی کی تاریخ بھی اسی اٹھن میں رکھی گئی  
تھی۔ تایا ابو وقفے وقفے سے گھر کے چکر لگانے لگے  
تھے۔ ایک طرف شادی کی تیاری تھی اور دوسری

”پھر آپ نے کیا کہا ہے۔“  
”ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔“  
”پھر ابھی آپ انہیں منع کر دیں۔ ابھی مجھے  
زویا کا آپریشن کروانا ہے اور یہ گھر پھر.....“  
”اس گھر کی اتنی فکر مت کرو..... اور تم کون سا  
دوسرے شہر چلی جاؤ گی۔ پچھلی گلی ہی تو ہے۔“  
”ٹھیک ہے..... پھر جو آپ مناسب سمجھیں۔“  
اس کی اس عام بات میں غصہ تھا۔ کہ ٹھیک ہے پھر  
سب جنم میں جائیں۔ وہ کیوں سب کی فکر کرے۔  
”میں آج ہی بھائی کے گھر جا کر بات کرتا  
ہوں۔ اس فرض سے جتنی جلدی سبک دوں ہو جاؤں  
بہتر ہے۔“

رات میں بابا، تایا ابائی کی طرف گئے تھے اور وہ  
کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس ٹھہر چکی خزاں کو دیکھ رہی  
تھی جو آکر جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اندھیاری  
میں چاند چمک رہا تھا اور اس کی چاندنی کسوف سے  
لرزاں تھی۔ دن کے پرندے، درختوں کی بے برگ  
اور بے پتا شاخوں پر دن کے اجالے کی گرمی کو اپنے  
اندروں سے ہٹا کر آرام کر رہے تھے۔ اور رات کے  
شب بے دار چند کامود راگ الاپ رہے تھے۔  
”کامود راگ“ جو اداس کو اداس دیز کر دیتا ہے اور  
خوش کو خوش کن..... اور اس کا دل اس وقت غم ناکی  
سے پھٹنے پر آگیا تھا۔ نیند کے بجائے اس کی آنکھوں  
میں رنجش کی ملک بھردی گئی تھی۔ زویا سو چکی تھی اور  
اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔ بابا وہیں گھر آئے تو وہ  
تب بھی جاگ ہی رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟ کیا کہہ دیا ہے انہوں نے۔“  
اس نے بابا کا اترا ہوا منہ دیکھا تو پوچھے بنا رہ نہیں سکی  
تھی۔ ”تائی نے یقیناً جہیز کا مطالبہ کر دیا ہوگا۔“  
”کاش..... جہیز کا مطالبہ ہی کر دیا ہوتا.....“ بابا  
غمگین تھے۔

”مجھے کچھ بتائیں گے؟“  
”کچھ نہیں..... سو جاؤ۔“ اسے سونے کا کہہ کر  
وہ دوسری رات جاگتے رہے تھے۔



رہے ہیں کہ وہ سب ٹھیک ہیں۔ میں نے شکیلہ سے ابھی کچھ نہیں کہا۔ یہ ہی کہا ہے کہ قطب پیر بنو ابراہم ہے۔“

تایا ابوروز آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ سین نے اس معاملے میں مداخلت کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس نے یہ معاملہ بابا کے ہاتھ میں دے دیا تھا کہ وہ جو مناسب سمجھیں کر دیں۔ اب وہ بھی تایا بابا کی طرح ہی سوچنے لگی تھی کہ تائی کا مطالبہ واقعی اتنا بھی برا نہیں ہے۔

اسے اندازہ ہی کہاں تھا کہ یہ معاملہ جسے وہ صرف مطالبہ سمجھ رہی ہے کتنا سنگین ثابت ہوگا۔

☆☆☆

یہ اس کی مہندی کا دن تھا۔ گھر تقوں سے روشن تھا۔ صحن میں دریاں بچھی تھیں جہاں تھوڑی دیر کے بعد اے بٹھایا جاتا تھا۔ ہر طرف گلاب کے پھولوں کی چٹاں بکھری ہوئی تھیں۔ گھر سے باہر دال چاول کی دہلیں بن رہی تھیں۔ یکم مہمان ہونے کے باوجود بھی ہر طرف افراطی تقریبی سی تھی۔ اس کی ساری محلے کی اور ایک دوکان کی سہیلیاں بھی آئی تھیں۔ زویا پاس بھی اس کے گجروں سے ٹھیل رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ تمام باتیں بھول کر اور نظر انداز کر کے وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ پیا گھر جانے کے سینے کون سی لڑکی نہیں دیکھتی۔ وہ تو اس لیے بھی مطمئن تھی کہ اس کا سرال گھر کے قریب ہی ہے۔ وہ جب دل کرے گا، یہاں آجایا کرے گی۔

تائی اس کی مہندی لے کر آئی تھیں اور اب ساتھ والے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ رشید بھی آیا تھا۔ جسے اس کی سہیلیاں کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی اور آپس میں ہنس رہی تھیں۔ اسے بھی اس کا نام لے لے کر چھیڑ رہی تھیں۔ اسے آج کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔

اچانک ہی ساتھ کے کمرے سے تائی کی تیز آواز آنے لگی۔ اس کی سہیلیاں جو پہلے ہی۔ ٹرکی میں کھڑی چمک رہی تھیں ایک دم سے چپ ہو گئیں۔

طرف یہ پریشانی..... اس کا کوئی بھی چیز خریدنے کو دل نہیں گر رہا تھا۔ پھر بھی بابا کے کہنے پر وہ اپنا جینر مکمل کر رہی تھی۔ کچھ چیزیں تو اماں ہی اس کے لیے چھوڑ کر گئی تھیں۔ بانی وہ لے رہی تھی۔ اپنے اور زویا کے کپڑے تیار کر رہی تھی۔ پڑوس کی سہیلیاں بھی آجانی تھیں۔ سب مل کر کام کرتی تھیں۔ رضائی، مگدوں میں ٹکنڈے ڈالنا، چاول صاف کرنا، اس کے داج کے کپڑے ٹانگنا، بیڈ شیٹوں پر کڑھائی کرنا۔ کمرے میں بند کر کے اسے ابٹن لگانا، ایسے ہی اور بہت سے چھوٹے موٹے کام تھے جو سب بٹتے بٹتے کیا کرتی تھیں۔ شادی کی عجیب سی خوشی تھی جو گھر کی پریشان فضا میں بھی اس پر چھانے لگی تھی۔

”اتنا بھی برا نہیں ہے رشید جتنا میں سوچتی ہوں۔ ٹھیک ہے اسے اس پر ہی گزارا کرنا ہوگا۔ اب اس پرانے مندر میں کوئی شہزادہ تو آنے سے رہا۔“ اس نے کسی اور ہی نظر سے رشید کو دیکھا تو سلوٹ زدہ سی شرمائی۔ اب وہ کسی حد تک مطمئن تھی۔

لیکن تایا بابا مطمئن نہیں تھے۔

”دیکھ قطب الدین..... شکیلہ کا مطالبہ کچھ ایسا بھی برا نہیں..... شادی کے بعد تم بھی ہمارے ساتھ ہی رہنا۔ تمہیں اور کس نے سنبھالنا ہے۔ ہانڈی روٹی خود تو کرنے سے رہا، زویا بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔ اس گھر کو کرائے پر چڑھا دیں گے۔ رشید کو اپنا بیٹا کہا ہے تو اب بنا کر بھی دکھا..... آخر اس میں برائی کیا ہے۔ بھر جانی مرنے والی تھی۔ شکیلہ نے احساس کیا۔ جب کہ وہ رشید کی بات اپنی بہن کے گھر کر چکی تھی۔ اب تم بھی اس کی لاج رکھو۔ اس کی ضد پوری کرو۔“

”یہ نہیں ہو سکتا.....“

”میں سب گھروالوں کی دشمنی مول نہیں لے سکتا قطب..... سب بچے ماں کے ساتھ ہیں۔ میں نے تیرا ساتھ دیا بھی تو کچھ نہیں ہوگا۔ سب میرے خلاف ہوں گے۔ کیونکہ سب اس وقت یہ ہی سمجھ



کی اماں کا ذکر جس نخوت سے کیا تھا اس کا دل کیا وہ  
تائی کا منہ نوچ لے یا خود پٹھے سے لٹک جائے۔

”بابا!“ تائی چپ ہوئیں تو اس نے بابا کو  
پکارا۔ بابا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”گھر رشید کے نام کر دیں۔“ اس نے اس  
طرح کہا کہ بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چاہے  
اب رشید سے شادی کرنی یا نہ کرتی لیکن وہ چاہتی تھی  
کہ اب یہ گھر رشید کے نام لگ جائے۔ تائی نے اسے  
اور اس کی اماں کو گالی دی تھی۔

”یہ گھر رشید کے نام نہیں لگ سکتا کیونکہ.....

کیونکہ یہ گھر بک چکا ہے۔ سال پہلے.....“ بابا نے  
خاموشی میں وہ دھماکا کیا جسے وہ کافی دنوں سے  
چھپاتے طے آرہے تھے۔ یہ دھماکا سیدھا تائی امی  
کے سر پر جا گر گرا تھا۔

”کیا..... کب..... کس کو.....؟“ وہ منجھوٹ

الحواسی میں بولیں۔ ”ہاں“ کے علاوہ اس جواب کی  
انہیں توقع ہی کبھی۔

”کریم کو..... جب خدیجہ بیمار ہوئی تھی۔“ بابا  
نے سچائی بتادی تھی۔ کمرے میں کوئی ایسا نہیں تھا جو

اس بات پر یقین نہ کرتا..... سب جانتے تھے کہ جودہ  
ن رے ہیں سب سچ ہی ہے۔ سین کی سب

سہیلیاں بھی اسی کمرے میں آگئی تھیں۔ سارے  
مہمان بھی..... تایا ابو نے بھی آنکھوں سے بابا کو

دیکھا تھا۔ اور تائی..... ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ  
وہ کیا کریں اور کیا کہیں۔ محفل سے ٹھٹکتے لے کر گھر

جانا انہیں منظور نہیں تھا۔ ان کی لومڑی صفت آنکھوں  
میں بال آگیا تھا۔ ابرو اتنے تک جا لگے تھے۔

”چونکہ رشتہ کے بدلے گھر نام کرنے کی بات  
طے پائی تھی اور اب گھر بک چکا ہے تو رخصتی بھی نہیں

ہو سکتی۔“ تائی امی، بابا سے بھی بڑا دھماکا کرنے کی  
ٹھان چکی تھیں۔

”رشید!“ تائی امی نے رشید کی طرف دیکھ کر  
آواز لگائی تھی۔ یہ آواز اشارہ ہی۔ حکم تھا۔

آنے والے لمحوں کو سوچ کر سین کی روح تڑپ

تائی کی آواز بڑھنے لگی۔ پریشانی نے اسے ایک دم  
سے آن گھیرا۔ لباس سیٹ کروہ دروازے کی طرف

بڑھی اور جھری سے دوسرے کمرے میں جھانکنے لگی۔  
”جب تک گھر میرے بیٹے کے نام نہ لگ

جائے یہ شادی نہیں ہوگی۔“ تائی امی وہی بات کر رہی  
تھیں جو تایا ابو بار بار دفعہ کہہ چکے تھے۔ لیکن تایا کے

کہنے میں اور تائی کے کہنے میں زمین آسمان کا فرق  
تھا۔ وہ اندر تک کانپ کر رہ گئی۔ تائی اپنے مطالبے پر

اس بری طرح سے ڈٹی ہوئی ہوں گی اسے اندازہ ہی  
کہاں تھا۔

بابا سب کے درمیان خاموش بیٹھے تھے۔  
”ابھی تک پیپر زئی تیار نہیں ہوئے۔ آپ تو

کہہ رہے تھے کہ سب تیار ہیں۔“ وہ بابا تایا پر برس  
رہی تھیں۔ تایا بابا اُمید بھری اور ہنسی نظروں سے بابا کی

طرف دیکھ رہے تھے۔  
”پیپر ز تیار نہیں ہیں قطب الدین.....؟“

انہوں نے آنسو بھری آواز سے اپنے بھائی سے  
پوچھا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے آگے بے بس

تھے۔  
”نہیں..... اور نہ ہی ہوں گے۔“ بابا نے سر

جھکائے دو ٹوک کہا تھا۔  
”کیوں نہیں ہوں گے؟ میرا بیٹا کو! گرا پڑا

نہیں ہے۔ جسے میں کسی بھی قیمتی مسکین کے ساتھ نہ دے۔“  
دوں..... آپ کی بیٹی میں سے ہی کیا.....؟“ تائی امی

نے اپنا ظرف بالا لے طاق رکھ چھوڑا تھا۔ انہیں اس  
بات کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی

ہیں۔ سین کمرے سے باہر نکل کر اس کمرے میں  
چلی آئی تھی جہاں سب بیٹھے تھے۔ تائی نے اس کی

طرف دیکھا تھا اور پھر منہ پھیر لیا تھا۔  
”صرف سفید رنگ کے کن پر میں اپنے بیٹے کو

قربان نہیں کر سکتی..... میری اپنی بھانجی ڈاکٹری کا  
امتحان دینے والی تھی لیکن میں نے اسے چھوڑ کر ایک

باسی روٹی کھانے کو ترجیح دی..... ایک“ مرتے  
ہوئے“ بندے کا خیال کر گئے۔“ تائی امی نے اس



اٹھی۔ کیا رشید وہی کہنے والا تھا جس کا اشارہ اس کی ماں نے اسے کیا تھا اس کی آنکھیں خطرے کو بھانپ کر میٹھے پر آگئی تھیں۔

”میں رشید ولد صلاح الدین..... سین قطب الدین کو تین بار طلاق دیتا ہوں۔“ رشید نے ایک لمحہ سوچے بنا طوطے کی طرح رٹا ہوا جملہ تین بار دہرایا تھا۔

بجلی کی کڑک سے سارا آسمان بھٹ گیا تھا۔ دھرتی کا سینہ جاک کر کے سارا لاوہ اٹل کر باہر کو آ گیا۔ دنیا کا کوئی آفت ایسا نہیں تھا جہاں اس دن بجلی نہیں کڑکی تھی اور یہ تمام بجلیاں سین پر آ کر گری تھیں۔ جل کر وہ محلوں میں راگھ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

جانی صاحب کی محفل سے ایڈم رائل سیدھا اپنے آفس میں آیا۔ اس کے سیکرٹری نے اسے بتایا کہ جن لوگوں سے اس کی آج میٹنگ ملے تھی وہ لوگ آفس میں موجود ہیں۔ اس نے دیوار کچر کھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے چار بجتے ہیں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ ملاقات کا وقت چار بجے ہی ملے تھا۔ اس کا مطلب کہ وہ لیٹ نہیں ہوا تھا۔

سادگی میں نفاست سے سجے وہ اپنے آفس میں پہنچا تو چار افراد وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ چاروں نسلی ایشین تھے اور مذہبی طور پر بدھ مت کے پیروکار..... اس لیے ایڈم ان سے ان کے ہی انداز میں ملا تھا۔ پہلے اس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور پھر جڑے ہوئے ہاتھوں کو ماتھے تک لے گیا۔ یہ مشرقی انداز اس پر اتنا عجیب تھا کہ وہ جوں و نس کے لامہ تھے مگر عورت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

”آپ سب کو انتظار تو نہیں کرنا پڑا..... مجھے لگتا ہے کہ میں وقت کا باندھ ہوں۔“..... دیر جو اس سے ہوئی نہیں تھی وہ اس کی شرمندگی کے تحت بولا۔ اسے ان لوگوں سے پہلے آفس میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات اس کے اصولوں کے خلاف تھی کہ مہمانوں کی آمد کے وقت میزبان موجود نہ ہو۔

”بالکل نہیں۔ ہمیں انتظار کی کوفت نہیں ہوئی۔ ہم نے امریکا میں ہونے والی سرگرمیوں سے دل لگائے رکھا ہے۔“ ایک نے جواب دیا۔ اس کا اشارہ سائیڈ کی دیوار پر چلتی لی وی اسکرین کی طرف تھا۔ جہاں نیوز چل رہی تھی۔

اپنی گھونٹنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایڈم نے دیکھا ان کے آگے بڑے مشروب کے گلاس خالی ہو چکے تھے۔ مطلب اس کی غیر موجودگی میں انہیں اچھے سے ”خوش آمدید“ کہہ دیا گیا تھا۔ اسے خوشی ہوئی اس کے ملازم اس کی ہدایت نہ صرف سنتے تھے بلکہ ان پر بڑی دل جمعی سے عمل بھی کرتے تھے۔

”ہم سب نے ایک این جی او بنانے کا سوچا ہے۔ آپ کے پاس ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ.....“ ایک نے اصل بات برآتے ہوئے کہا تھا۔ شاید وہ ایڈم کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایڈم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے درمیان میں ہی روک دیا۔ ان کی آمد کی کیا وجہ اسے معلوم تھا۔ وہ اپنے آفس میں آنے والے ہر فرد کے بارے میں پہلے سے ہی جان جاتا تھا۔ اس میں کچھ تو اس کے سیکرٹری کی معلومات کا عمل دخل ہوتا تھا اور کچھ اس کی قافہ شناسی..... جس میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ سامنے والے کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ ان لامہ لوگوں کی آمد سے پہلے بھی اس کے سیکرٹری نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ تینیم بچوں کی سرپرستی کرنے کے لیے ایک این جی او کو ملنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہاں بیٹھ کر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اس کے پاس فنڈز کے لیے آئے ہیں تاکہ این جی او کھلنے کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی دعوت لے کر.....

”میں جانتا ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میں بھی تینیم اور بے سہارا بچوں کے لیے کچھ کر سکوں۔“ اس نے کہا۔ سامنے والوں کے چہروں پر حیرت آئی تھی۔ ایڈم کو یہ حیرت سب سے زیادہ پسند ہوئی تھی۔ خصوصاً تب جب وہ سارے اندازے اپنی مضبوط قوت کے



ہوئے کہا تھا۔ خبر کچھ اس انداز سے سنائی جا رہی تھی کہ ایڈم سمیت باقی چاروں لامہ بھی خبر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”ڈان پیٹر سن بہت سے جرائم میں ملوث ہے۔ اسمگلنگ، بردہ فروشی، انسانی اسمگلنگ، جوا، شراب کے کارخانے، بھتہ خوری،..... یہ سب تفصیل پولیس کو ڈان پیٹر سن کے ہی ایک آدمی نے نام اور شناخت نہ ظاہر کرنے پر بتائی ہے۔ تاہم ابھی پولیس کو مختلف جرم میں ملوث ڈان کا صرف نام ہی پتا چل سکا ہے وہ ڈان پیٹر سن تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔“

”خدا ان لوگوں کو جہنم میں جلائے۔“ ایڈم نے تیز آواز سے کہا۔ چاروں لامہ پھر سے ایڈم کی طرف متوجہ ہوئے۔

”یقیناً..... اور خدا بے شک ایسا ہی کرے گا۔“ دولت کی ہوس ان لوگوں پر اتنی چڑھ چکی ہے کہ یہ لوگ یہ بات بھول گئے ہیں کہ یہ معصوم جانوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے.....“ لامہ کو اس بات کی خوشی تھی کہ ایڈم کے خیالات بالکل ایسے ہی تھے جیسے کسی بھی نیک انسان کے ہونے چاہئیں۔ کون کہتا ہے کہ ایڈم کا کوئی مذہب نہیں..... ایڈم کے پاس ہی تو سب مذاہب موجود ہیں۔

”سوچیں جس آدمی کا نام ہی اس قدر دہشت ناک ہے وہ خود کس قدر دہشت انگیز ہوگا..... ڈان پیٹر سن.....“ ایڈم بھول گیا تھا کہ وہ اس طرح کی اور اس انداز میں گفتگو نہیں کرتا ہے۔ وہ کسی کو بھی پرانی کا ایک لفظ نہ کہتا تھا۔ بدو عادی تا بہت دور کی بات تھی۔ شاید اس پر اس وقت ”ڈان پیٹر سن“ سے نفرت کا غبار کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا تھا۔ جو وہ یہ سب کہنے لگا تھا۔

کھانے کے سارے وقت کے دوران وہ ہی نیو چلٹی رہی تھی۔ ”ڈان پیٹر سن.....“ کے متعلق ایک جانح رپورٹ تھی جو پیش کی جا رہی تھی۔ اس بحرمانہ خبر نے فضا کو بو جھل کر دیا تھا۔ ایڈم نے جھپٹل نہیں بدلتا تھا۔

زور پر ہی لگاتا تھا۔ اسے لوگوں کو حیران کرنا پسند تھا۔ ”یہ آپ کی نوازش ہے۔“ ان میں سے کسی ایک نے سنبھلتے ہوئے کہا تھا۔ ان کا مدعا ان سے پہلے ہی ایڈم تک پہنچ چکا تھا۔ کس ذریعے سے.....؟ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

”آپ بتائیں میں اس کام میں کتنا شریک ہو سکتا ہوں۔؟“

”جتنا آپ مناسب سمجھیں۔“ ایڈم نے ایک چپک بک نکالی تھی اور خاصی بڑی رقم کا چپک لکھ دیا۔ لامہ کے ہاتھ چپک پا کر کانپ اٹھے۔ انہیں امید نہیں تھی کہ انہیں اتنی بڑی رقم مل جائے گی۔

”خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔“

”مجھے آپ سے بس جنت کی دعا کی طلب ہے۔“ ایڈم نے رقت سے کہا۔ لامہ جیسے اسی وقت اس کے لیے دعا کرنے لگے۔

”اب ہمیں اجازت دیں۔“

”نہیں..... یہاں آتا ہر کوئی اپنی مرضی سے ہے۔ مگر جاتا میری مرضی سے ہے۔“ اس نے فلموں کے ڈان کے سے انداز میں کہا تھا

”مطلب؟“ لامہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ایڈم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”میں صرف مشروب کو آپ کی خاطر مدارت نہیں سمجھتا۔ آپ کو میرے ساتھ کھانا کھا کر مجھے اعزاز بخشا پڑے گا۔“

ایڈم نے پیار بھرے کچھ اس انداز سے کہا کہ چاروں نے بنا ایک لمحہ سوچے رخصانہ مندی دے دی۔

ایڈم فون پر کھانے کی ہدایت دینے لگا۔ آفس میں ایک لمحے کو خاموشی ہوئی تھی اور تب ہی اس خاموشی میں ٹی وی کی آواز پھیلی تھی۔

”جرائم پیشہ گروپ ”پی۔ ٹی۔“ تھری سکس ”یو“ (P.360) کے ایک مرکزی ڈون کا نام سامنے آیا ہے جو اپنے گروپ میں ”ڈان پیٹر سن“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“ اسکرین پر نیوز-ٹکڑے چلائے۔



نکال کر اس نے اپنے سامنے پھیلا دیا۔ وائٹ شرٹ اپنے بدن پر چڑھا کر وہ اس کے ٹخن بند کرتے ہوئے بھی بدستور خود کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے شرٹ پر گولڈن ٹیس ٹائی کی گرہ باندھی۔ شرٹ کے کٹھنوں پر کف لٹک لگائے جو کہ بیش قیمت ہیرے سے مزین تھے۔ ٹائی پن خالص سونے کی تھی۔ گردن کے اطراف میں ”ٹام فورڈ“ پرفیوم کا اسپرے کر کے اس نے اپنی ہی گردن پر کسی نازم اندام حسینہ کی طرح ہاتھ پھیرا تھا اور خود کو آئینے میں دیکھ کر مسکرا اٹھا۔ نجانے کس بات پر۔

دراز ٹھول کر اس نے ”رائل اوک“ کی قیمتی گھڑی نکال کر پہنی اور سگار کیس نکالا۔ سگار کیس سونے کا تھا جس کے اندر ”سنگ آف ڈنمارک“ کے انتہائی مہنگے سگار موجود تھے۔ اس نے ”برلونی“ کے لائٹس سے سگار سلگایا۔ اور ایک لمبا کش لے کر دھواں آئینے میں نظر آتے اپنے ہی عکس پر چھوڑا۔ اس کی آنکھیں پرسوج تھیں، وہ۔ کوئی بہت ہی گہری بات سوچ رہا تھا۔ سگار کے انتہائی باریک سے شعلے اس کی آنکھوں میں جل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں کسی ایک غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں اور سوچ اتنی گہری جس نے اس کا باقی جسم ساکت کر کے رکھ دیا تھا۔

جفرسن..... اس کا سوتیلا بھائی جو باہر سے اسے ایک دو بار آواز دے چکا تھا اور جسے ایڈم نے سن کر بھی ان کی کر دیا تھا اسے تلاش کرنا ہوا اندر آیا تھا۔  
”آپ یہاں ہیں؟“ توقع ہونے کے باوجود بھی وہ ایڈم کو اندر پا کر پوچھ بیٹھا۔ ایڈم نے آئینے پر سے اپنی نظریں ہٹائیں اور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نیچے والی ہلک نے ذرا سی جنبش کی۔ اتنی سستی سے کہ جیسے ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا انہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ جنبش سوال ہی کہ سوال کیا ہے؟  
”چارلس آپ سے فوری بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پیغام دیا ہے کہ ایڈم رائل آئے تو اس سے کہنا کہ.....“

بلکہ کھانے سے کہیں زیادہ اس کی توجہ اس رپورٹ پر ہی مرکوز رہی تھی۔

کھانے کے بعد چاروں افراد نے اس سے اجازت چاہی۔ ایڈم نے ایک بار پھر سے اپنے ہاتھ جوڑے اور پھر جڑے ہوئے ہاتھوں کو ماتھے تک لے جاتے ہوئے انہیں الوداعی سلام پیش کیا تھا۔ وہ چاروں پھر سے ایڈم کو مرحومیت سے — دیکھنے لگے۔

اُن کے جانے کے بعد ایڈم آفس سے منسلک واش روم میں آیا۔

سفید توپ کو اس نے جلدی سے اتار دیا تھا۔ یہ حاجی صاحب کی محفل والی توپ تھی۔ توپ اتار کر اس نے ایک بھر پورا آزادی والا سانس لیا۔ اس غیر مانوس لباس نے اس کا جسم تھکا دیا تھا۔ اپنے ہی جسم کی خوشبو میں گہرا سانس لیتے اس نے خود کو آرام پہنچانے کی کوشش کی۔

سفید اور چیلی روشنیوں والے چمکتے واش روم کے آئینے میں اس کا جسم نمایاں تھا۔ اس کی چھائی چوڑی اور اٹھی ہوئی تھی، گردن قدرے موٹی اور مضبوط، اس کا کمر پی بدن نوجوانی کی بھرپور نمائش تھا۔ چوڑا دھن، جڑے کی ہڈی کا نمایاں پن، گلابی ہونٹ، رنگ بدلنے والی آنکھیں..... ان سب عوامل نے مل کر اس کی شخصیت کو مزید نکھار دیا تھا۔ اس کے سینے کا سنہری رواں چیلی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ہتھوڑوں اور پٹلیں سونے کے تاروں جیسی تھیں اور اس وقت وہ یونانی دیوتا ”اپالو“ لگ رہا تھا۔

اس کی کرنچی آنکھوں میں کسی کو بھی اپنے قریب کھینچ لینے کی پوری طاقت موجود تھی اور یہ بات وہ بہ خوبی جانتا تھا۔ حسن کے معاملے میں اگر اسے پرکھا جاتا تو ایک لمحے میں ہٹا کسی جھٹ کے وہ دنیا کا خوب صورت ترین مرد شمار کیا جاسکتا تھا۔ ایسا مرد جو اپنی خوب صورتی سے غافل بھی ہو..... اور اس کی یہ غفلت اس کے حسن کو مزید جلا بخشتی ہو۔  
وارڈروب میں سے ایک گرے رنگ کا سوٹ



☆☆☆

دھرتی سے بادِ سموم کے بھجھو کے اٹھ رہے تھے۔ چمن کر آتی نپش بھی اتنی لرزہ خیز تھی کہ مردہ گھاس پر دھرے اس کے گال چلنے لگے تھے۔ پردہ ظلمت جاک ہو چکا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں جیسے جلی ہوئی تھلی پھیر دی گئی تھی۔ وہ آنکھیں کھول کر بھی اندھی تھی۔

”اٹھو لڑکی.....“ اسے اپنے بازو کے پہلو میں کسی چھڑی کی چپھن کا احساس ہوا۔ جس نے اس کے ماس میں گڑھا ڈال دیا تھا۔

آفتابی چھتری تھلی تھی اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سمجھ ہی نہیں سکی کہ وہ کہاں ہے۔

”کدھر سے آئی ہو تم..... کیا یہاں پر بڑھتی ہوں؟“ اس کے سر پر کھڑا کالج کا گارڈ اس سے پوچھ رہا تھا۔ اپنے اوپر ایک ڈھلتی عمر کے آدمی کو جھکے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ رات وہ باغ میں نکل آئی تھی۔ جیسا کہ وہ ہر بار کرتی تھی۔ اپنے اوپر ہوئے ظلم کو آہوں اور چیخوں سے نکالنے کے بعد وہ یہاں ہی ڈھیر ہو گئی تھی۔ وہ مریکون نہیں گئی تھی اتنی سردی میں؟

”لڑکی کہاں کی ہو تم.....“ اس نے ارد گرد دیکھ کر نظر ڈالی۔ آرٹ کالج کے لڑکے لڑکیاں اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کالج اوپن ہو چکا تھا۔ سورج چڑھ آیا تھا۔ انہوں نے باغ میں بیٹی ایک لڑکی کو دیکھا تو گارڈ کو بلا لیا۔ اب وہی گارڈ اس سے سوال کر رہا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر اس نے چادر کو اپنے گرد لپیٹا اور ارد گرد سے نظریں بچا کر وہ سرونٹ کو اٹریک طرف چلی گئی۔ لڑکے لڑکیاں عجیب اور ترس بھری نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھنے لگے تھے۔

کھڑکی پھلانگ کر وہ اپنے گھر میں واپس آ گئی تھی۔

زویو دیوار کے ساتھ لگی صحن کے فرش کے اس حصے کو دیکھ رہی تھی جہاں چوٹے کے مسلسل کام کے

جیفرن کے الفاظ اس کے منہ میں ہی قید ہو گئے تھے۔ ایڈم نے ایک زمانے دار پھڑاس کے منہ پر مارا۔ جیفرن کا منہ دوسری طرف کروٹ بدل گیا تھا۔

”پیٹرن.....“ اس نے پیٹرن کے ایک ایک بچے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈان پیٹرن نام ہے میرا..... صرف پیٹرن کہا کرو مجھے..... یہ بات تم بھی سمجھ لو اور چارلس کو بھی سمجھا دینا.....“

”او کے ڈان پیٹرن.....“ جیفرن نے ہلکے سے مسکرا کر کہا۔ وہ اس کا سوتیلا بھائی تھا۔ اسے اس کی مار میں بھی پیار محسوس ہوتا تھا۔

”نفرت ہے مجھے ایڈم رائل کہلوائے جانے سے۔“ ”ڈان پیٹرن“ نے ایک اور کش لگا کر آئینے پر دھواں چھوڑا۔ اس کا عکس دھوئیں میں تحلیل ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

زندگی ایک فریب کی مانند ہے جس کے دام میں ہم جان بوجھ کر عقل و شعور رکھتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ یہ نازک شاخ پر جھولا جھولنے کی خواہش کا نام ہے۔ اپنے شوق کی سر بلندی میں ہم اس خطرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ جھولا ہمیں منہ کے بل گرا بھی سکتا ہے۔ ہم صرف تکمیل چاہتے ہیں۔ آرزوؤں کی، خواہشات کی، مانگ کی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی بھی ہر لمحہ اپنی تکمیل ہی چاہتی ہے۔

تقدیر اپنے ظرف میں جو کچھ ہمارے لیے رکھتی ہے ہم اسے یک مشت حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ سب ہمارا ہے۔ ہم آگاہ ہیں اور بے خبر بھی..... ہم حق جانتے ہیں اور حقوق سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔

زندگی ہمارے لیے لمحوں میں خوب فائدہ اٹھاتی ہے۔ جس روشنی کو ہم نیا آغاز سمجھتے ہیں زندگی اس سے اپنی آخری رات طے کر لیتی ہے۔ ہمارے اصل آغاز پر زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ فریب پورا ہوتا ہے اور زندگی کا آپ سے۔



ادھر ایک کر کے بڑی ترتیب سے شلیف پر رکھ گئے تھے دھڑام کی آواز کے ساتھ نیچے گرے۔ چونے کا ایک بادل اٹھا۔ سفید..... جس نے اسے سیاہ کر دیا تھا۔

”ان ہی ٹکڑوں کی طرح ٹوٹ چکی ہوں اب میں بھی..... ان ہی ٹکڑوں کی طرح..... آپ کو فن عزیز تھا۔ دیکھیے آپ کے فن نے کیسا شاہکار بنایا ہے۔ ایک اجڑی ہوئی دہن کا..... جس کے دلہانے اسے شادی سے ٹھیک بارہ گھنٹے پہلے طلاق دے دی تا کہ وہ بھی اپنی ماں کی طرح کسی کم نام بیماری سے مر جائے۔“ وہ کمرے کی دوسری چیزوں کی طرف بڑھی اور اس نے انہیں بھی توڑ دیا۔ مال جو اس کی شادی کی وجہ سے ایک کمرے میں رکھ دیا گیا تھا اب سب اس کے ہاتھوں ٹوٹنے والا تھا۔ بڑے بڑے دان، پانسی گھوڑے، عقاب، کسلے وہ سب کو کراتی جا رہی تھی۔ اور جتنی جا رہی تھی۔ چونے کی بوری جو آدھی کھلی ہوئی تھی اس نے اسے بھی زمین پر اوندھا کر دیا تھا۔ بابا نے اسے نہیں روکا تھا۔ وہ چیزیں توڑ کر نارمل ہو سکتی تھی تو ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ اسے یہ سب توڑ کر بھی مبرا نہیں آئے گا۔

”ہانس میں سوراخ کر کے آپ بانسری بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ شاہکار بنانا ہی تھا تو اپنی زندگی کا بناتے..... مجھ پر آپ کا کوئی حق نہیں تھا۔“ وہ چیزیں توڑتی جا رہی تھی، روٹی جا رہی تھی، جینتی جا رہی تھی اور بد دعائیں دیتی جا رہی تھی۔ خود کو اور..... نجانے کس کس کو..... اور جب سب چیزیں ٹوٹ گئی تو وہ زمین پر ڈھس گئی اور ان ٹوٹی ہوئی چیزوں پر ہی بیٹھ کر رونے لگی۔ پوری طاقت سے..... طعن پھاڑتے ہوئے۔ اتنی بلند آواز سے کہ اس کی چیخ و پکار تانی بھی سن سکتی تھیں اور رشید بھی..... لیکن شاید خدا انہیں.....

بابا نے اسے چپ نہیں کروایا تھا۔ زویا بہم کر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ کمرے میں ایک سفید بادل بن گیا تھا جو باہر نکلنے کی راہ مانگ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ چونے کا براہہ گرتے ہوئے نیچے بیٹھ رہا تھا۔ سین

باعث بڑے بڑے سفید داغ پڑ چکے تھے اور جو رگڑ رگڑ کر دھونے سے بھی نہیں جاتے تھے۔ بابا گودام والے کمرے میں چار پانی پرانے پکڑے بیٹھے تھے۔ اس کے قدموں کی آہٹ پا کر انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کی حالت اجڑی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور ان میں جھپکے جھپکے ہوئے تھے۔ بابا کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ کہاں تھی۔ کہاں سے آ رہی تھی وہ جانتے تھے۔

”سین.....“ انہوں نے پیار اور درد بھری آواز میں اسے پکارا تھا۔ وہ اسے اپنے گلے سے لگنا چاہتے تھے لیکن اس نے انہیں دُور سے ہی پرے رہنے کا کہہ دیا تھا۔ شیش ٹاگوں نے اس وقت اس کی آنکھوں میں آسن جمائے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھوں سے پھینکار نکل رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے باپ کی قاتلہ کے نام سے شہرت پائے۔

”آپ نے گھر کیوں بیچا؟“ وہ بے حد ضبط کر کے پوچھ رہی تھی۔ اس کا روم روم کا پ رہا تھا۔ بوٹی بوٹی ٹھہر رہی تھی۔ آواز آنسوؤں، بے بسی، دکھ اور غصے کے باعث اس قدر ڈمک گاہٹ کا شکار تھی کہ بابا کو کہتے لگے اس کا سوال سمجھ میں ہی نہیں آیا۔

”تمہاری ماں کو بچانے کے لیے.....“ بابا جانتے تھے کہ ان کے حساب کا وقت آ پہنچا ہے۔ اور یہ حساب کتاب روز محشر کے حساب کتاب سے بھی انہیں زیادہ اذیت ناک ثابت ہونے والا ہے۔

”ماں تو نہیں بچ سکی..... مجھے بچانے کے لیے کیا تھا آپ کے پاس؟“ بابا خاموش رہے۔

”بولیے۔“ وہ ایک دم سے چلائی تھی۔

”کیا ہے آپ کے پاس..... یہ..... یہ چونا۔ یہ چونا..... جواب میری قبر پر لیٹ دیجیے گا آپ.....

اس سے مقبرہ بنائے گا میرا..... یہ ہی چونا پھانک پھانک کر اماں مریں گی۔ اسی نے میری جان لی اور اب اس سے آپ مریں گے.....“ وہ پرانے آتش

دان کی چولی شلیف کی طرف بڑھی تھی اور اس نے ایک جھٹکے میں شلیف کو نیچے گر ادیا۔ ماڈل جو ایک کے



کے لفظ پر خاص زور دیتے ہوئے بالآخر پیٹرک بولا تھا۔ وہ صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ یہ جرأت کس نے کی ہے اور کیوں؟

یہ ایک نیا آفس تھا۔ پہلے والے آفس سے یکسر مختلف..... یہاں لکڑی سادی کی حدود سے تجاوز کر چکی تھی۔ تین چار لوگ دائیں بائیں کھڑے تھے۔ بلوری سطح والی میز کے پیچھے ایڈم بیٹھا تھا۔ جو ٹیبل کی سطح پر پیپر ویٹ کو کھمارہا تھا۔ پیپر ویٹ گھومتا تھا، رکنے لگتا تھا اور پیٹرک اسے پھر سے گھما ڈالتا تھا۔

گرے ٹیس ٹائی سوٹ پہن کر وہ اس آفس میں آیا تھا۔ وہ اب وہ والا ایڈم ہرگز نہیں تھا جو آج صبح ہی حاجی صاحب کی محفل میں موجود تھا اور مجھوم مجھوم کر صوفیانہ رفص کر رہا تھا۔ یا وہ جس نے صحافی کے حیلے سوال کا مسکرا مسکرا کر جواب دیا تھا۔ نہ یہ وہ جو چار معزز لامہ کے ساتھ بیٹھانی دی پر اپنے نام کی ہی چوٹی خبر سن کر..... خود پر لعنت بھیج رہا تھا۔

اب وہ وہ والا ایڈم تھا جو امریکا کے ایک تیزی سے ترقی کرتے بجرمانہ گروپ ”پی۔ تھری سکس زیرو“ کا بانی تھا۔ پی۔ تھری سکس زیرو (P.360) کے کارندے ملک میں پھیلے بہت سے غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے۔ اس گروپ کا نام سن کر پولیس آفیسر ذبھی لمحے بھر کو اپنی کپکپاہٹ قابو میں نہیں رکھ پاتے تھے۔

پیٹرک پچھلے دس سال سے ڈان پیٹرک تھا اور بیک وقت ایڈم رائل بھی..... وہ دونوں پچھانوں کو بہت خوبی سے لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسا اس کے ”گرینڈ فادر“ چاہتے تھے۔

صرف دس لوگ جانتے تھے کہ ایڈم رائل ہی اصل میں ڈان پیٹرک ہے۔ یہ دس لوگ اس کے ارد گرد کے ”خصوصی“ لوگ تھے۔ ان دس میں صرف صرف پانچ جانتے تھے کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ ان پانچ میں سے صرف ایک جیفریک یہ جانتا تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے۔ اور صرف ایک پیٹرک خود یہ جانتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور اس کا ماں ہی کیا ہے؟

کے اوپر ہی..... اس برادے کو اپنے اور گرنا محسوس کرتے ہوئے وہ جیسے کسی تیزابی بارش میں جلنے لگی۔

اس کی طاقت نے جواب دے دیا تو آنسو بھی خشک ہو گئے اور آواز بھی بند ہو گئی..... زرد دھوپ جھجک جھجک کر اندر داخل ہونے لگی۔ برادہ جو باہر نہیں نکل پایا تھا زمین پر سین کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ مٹی کا فرش سفید ہونے لگا تھا۔ وہ ساکت آنکھوں سے اس سفید ہوتے فرش کو دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت بالکل بے حس و حرکت تھی۔

تب ہی ایک سازشی سا جھونکا کمرے میں آیا تھا۔ سفید برادہ اٹھ کر اس کے پاؤں پر ایسے اچھلا تھا جیسے کسی جادو کرنے وہاں پھونک ماری ہو..... کی نے جیسے اسے کوئی تسبیح کی مٹی کوئی راز کی بات بتانے کی کوشش کی تھی۔ کان میں سرگوشی کرتے ہوئے آنے والی زندگی کی پیشین گوئی کی تھی۔ سین کی آنکھوں کی پتلیاں تباہ کن حد تک سکڑیں۔

یہ فیصلہ کرنے کی لکڑی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ اس کی تقدیر، اس کی تدبیر، قدرت، ہوا..... سب جیسے اس کی مرضی جاننے کے منتظر تھے۔ وہ اس بار کسی کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کسی ایک کو بھی نہیں..... اور خود کو تو ہرگز نہیں.....

”الماس برادہ.....؟“ اس نے دوبار اس لفظ کو ذہن میں دہرایا تھا۔ پھر تیسری بار جیسے اس نے فیصلہ کن کہا تھا۔

”الماس برادہ.....“ اس کی آنکھوں میں الاؤ سا روشن تھا۔ جہنم کی آگ سے بھی زیادہ بڑا۔

وہ جان لئی تھی کہ برادے کو پھر سے الماس میں کیسے بدلنا ہے۔ ”چھتائی الماس“ میں..... جو ساری خواہشیں پوری کر دیتا ہے۔

ایک بڑا اعم اٹھانے کے بعد..... ہاں..... اب وہ جان لئی تھی..... بالآخر.....

☆☆☆

”ہم میں سے..... کون ہے وہ.....؟“ ”ہم“



ہے اور کیوں؟

”اولیور.....“ چارلس سے کسی ایک نے بتایا۔

”اولیور؟“ پیٹرک کو جیسے یقین نہیں آیا۔ بلوری

سطح پر اس نے جھکے سے گھومتے ہوئے پیپر ڈیٹ کو

روکا۔ اس کے ہاتھوں کی شدت ششے کے اس پیپر

ڈیٹ پر اتنی سختی سے بڑی تھی کہ وہ پیپر ویٹ مضبوط

ششے کا نہ ہوتا تو یقیناً ٹوٹ چکا ہوتا۔

”لیکن فکر کرنے کی بات نہیں ہے ڈان

پیٹرک..... اولیور نے صرف پیٹرک کی معلومات دی

ہے۔ پولیس کو یہ نہیں بتایا کہ ایڈم رائل ہی اصل میں

ڈان پیٹرک ہے۔ وہ یہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بے

شک اپنی جان عزیز نہ ہو..... مگر اپنے پیاروں کو اپنی

آنکھوں کے آگے بے دردی سے مرنا ہوا دیکھنا کون

پسند کرتا ہے۔“ پیٹرک کو ناول کرنے کے لیے

وضاحت دی گئی۔

”اولیور تو چٹانی یا قوت تھا..... کیا وہ یہ بھول گیا

کہ میں نے اسے تھی محبت سے تراشا ہے۔ اس نے

یہ کیوں ثابت کیا کہ وہ انجی بھی کانٹے دار ہے۔ مجھے

بتاؤ..... میرا ہنر تھک نہیں یا اس کے اندر جڑ دار کانٹے

ہیں۔ جو پھر سے نکل آتے ہیں۔؟“ کوئی کچھ نہیں

بول سکا تھا۔ خاموشی چاروں طرف پھیل کر تین کرنے

لگی تھی۔

”خیر اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ لاچ یا مجھ سے

جلن..... جس باعث بھی اولیور نے یہ کیا ہے ثابت

کر دیا ہے کہ اب وہ ہمارے کسی کام کا نہیں..... اور جو

ہمارے کسی کام کا نہیں وہ دنیا کے بھی کسی کام کا نہیں

ہوتا۔“

ایڈم نے برنابی کو اشارہ کیا تھا۔ جسے وہ خوب

سمجھتا تھا۔

”جواب کہیں.....“ برنابی کہہ کر آفس سے باہر

چلا گیا تھا۔ باقی سب کے لیے یہ فیصلہ متوقع تھا۔

پھر بھی انہیں اُمید تھی کہ پیٹرک اولیور کے معاملے میں

زبردستی برے نہ گئے۔ وہ سب آپس میں سناہمی تھے۔ نہیں

چاہتے تھے کہ ان کا ایک ساتھی کم ہو جائے۔

ان ہی دن ”خاص“ میں سے کسی ایک نے پولیس

کے پاس جا کر پیٹرک کے بارے میں تفصیل دی تھی۔

ڈان پیٹرک کو دلچسپی نہیں تھی کہ اس کے بارے میں

پولیس کو کس حد تک بتا دیا گیا ہے۔ اگر کسی نے اس کے

بارے میں ایک ایک بات بھی پولیس کو بتادی تھی تو اسے

کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ابھی امریکا کی پولیس اتنی

مضبوط نہیں ہوئی تھی کہ ڈان پیٹرک اور ایڈم رائل پر بیک

وقت ہاتھ ڈال سکے..... دوسرا اس کے خلاف کوئی بھی

ثبوت نہیں تھا۔ اسکا رٹ لینڈ یا رڈ کو بھی بلوا لیا جاتا تو

پولیس اس کے خلاف کوئی ثبوت اکٹھا نہیں کر سکتی

تھی۔ پیٹرک نام کے کسی شخص کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اور

ایڈم کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ہی

پیٹرک ہے۔ پیٹرک کو تلاش کرنے کی غرض سے اگر

پولیس کو ایک ایک آدمی کو شک کی نظر سے دیکھنا پڑتا تو وہ

امریکا کے ایک ایک بندے سے پوچھ پڑتا ل کر سکتی

تھی۔ لیکن ایڈم سے نہیں..... شک کے معاملے میں اس

کا نام کروڑوں کی آبادی میں سب سے آخری نمبر پر ہی آ

سکتا تھا۔ یہی تو ”گریڈ فار“ نے اسے سکھایا تھا۔

تمام مذہب کو اپنانے میں بھی اس کی شاطرانہ

سوچ شامل تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سادہ لوگ مذہب کے

نام پر کس طرح جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اس کے خیال

کی اس کی موجودہ حیثیت تصدیق کر رہی تھی۔

اس وقت اس کے چہرے کا نود کہیں کا فور ہو گیا

تھا اور اب وہ خالص ایک کاروباری شخص تھا۔ اس سے

عام حالات میں ملنے والے اگر اسے اس روپ میں دیکھ

لیتے تو کسی بھی صورت یقین نہ کرتے کہ یہ وہ ہی رائل

ہے جسے وہ میڈیا پر دیکھتے ہیں۔ اس کی سادگی آنکھوں

میں بہت سے سوال تھے۔ جسے کچھ تو سامنے بیٹھے پہلے

سے ہی جانتے تھے کہ آج ان سے کیا پوچھا جائے گا اور

انہیں کیا کہنا ہے۔ پیٹرک کے عتاب سے بچنے کے لیے

انہوں نے پہلے ہی سے اس کے جوابات ڈھونڈ رکھے تھے۔

”ہم میں سے..... کون ہے وہ.....؟“ ”ہم“

کے لفظ پر خاص زور دیتے ہوئے بالآخر پیٹرک بولا

تھا۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ جرأت کس نے کی



پٹرین نے جیسے سب کی آنکھوں میں اپنے فیصلے کے خلاف تاثرات پڑھ لیے تھے۔ وہ ایسا ہی چاہتا تھا۔ اب سب ٹھیک رہے گا۔ کوئی دوبارہ ایسی جرأت نہیں کرے گا۔ سب جان لیں کہ P.360 میں بغاوت کی گنجائش نہیں تھی۔

”کارزل کہاں ہے؟“ ڈان نے سگار کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے پوچھا اور سوگووار آفس کا ماحول یکسر بدل دیا۔

☆☆☆

اگلے دن شاہ عالمی میں سین ایک ایک بندے سے پوچھتی پھر رہی تھی۔ ایک لڑکے کا حلیہ بتا کر جواب دے لے جے قد کا ہے۔ انتہائی تنگ پیٹت شرٹ پہنتا تھا، سر پر سولہ پیٹ ڈالٹا ہے اور دانٹوں میں ماچس کی ٹپا پھسائے رکھتا۔ لیکن کسی نے بھی اس کی مدد نہیں کی۔ تمام دکان داروں نے بھی اس طرح کے حلیے کے کسی آدمی کے بارے میں لاعلمی ظاہر کر دی تھی۔ اس نے اپنی یادداشت پر اہستہ نیچتی تھی کہ وہ اس کا مختصر سامان نہ یاد کر سکی اور اس نے اس کا وزٹنگ کارڈ بھی پھاڑ کر ٹاپی میں پھینک دیا تھا۔

اسے اس اجنبی کو ہر صورت میں ڈھونڈنا تھا لیکن وہ ناکام ہوئی تھی۔ اگر اس اجنبی کو ڈھونڈنے کے لیے اسے روز بھی بازار جانا پڑتا تو وہ جاسکتی تھی۔ ایک سال مسلسل بھی جانا پڑتا تو وہ اب جانے والی تھی۔ ہر گز سمجھنے والی نہیں تھی۔ گھر واپس آنے سے پہلے وہ چچا کریم کے پاس بھی گئی۔

”چچا کریم آپ نے ہمارا گھر ہم سے ہتھیالیا ہے۔“ وہ چچا کریم پر چا کریم جیٹی۔ اسی طرح جس طرح ایک دن پہلے بابا بچتی تھی۔

”بیٹی میں نے کون سا گناہ کر لیا ہے۔ تمہارا باپ آیا تھا۔ جب تمہاری ماں کی طبیعت خراب تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے اپنا گھر مجھے بچا ہے۔ میں نے کون سا زبردستی کی ہے۔ پھر بھی میں نے تم لوگوں کو وہاں رہنے کی اجازت دی ہوئی ہے یہ کیا کم ہے۔ تم الٹا مجھ پر ہی جلا رہی ہو۔“ چچا کریم نے وضاحت دی۔ وہ جھاک کی طرح بیٹھتی تھی۔ اس کی

بربادی میں وہ شامل نہیں تھے۔

”میرا وہ مطلب نہیں تھا چچا کریم! اس گھر کے ساتھ میری ماں کی یادیں جڑیں ہوئی ہیں۔“

”تو بیٹی پھر سے خرید لو۔۔۔۔۔ اسی قیمت پر خرید لو۔ میں حلال کھانے کا عادی ہو۔ قیمت بڑھ چکی ہے۔ پھر بھی میں تمہیں اسی قیمت پر دوں گا۔“ چچا کریم نے جیش کش کی۔ وہ چند لمے ان کو دیکھتی رہی۔

”ٹھیک ہے۔ میں جلد ہی یہ گھر آپ سے واپس خرید لوں گی۔ آپ یہ گھر کسی اور کو مت بیچئے گا۔“ اس نے ایک عزم سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا واقعی کرے گی اور ہر صورت کرے گی۔

اگلے دن پھر شاہ عالمی جانے کا پروگرام بنا کر وہ واپس گھر آئی تھی۔

شام کے قریب جب وہ کچن میں خاموش بیٹھی چلتے ہوئے چولہے کی برہنہ، لپکتی شعاعوں کو دیکھ رہی تھی تو باہر دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ دروازہ کھولا تو آگے وہی اجنبی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سین و ہیں بت بن گئی۔

”خادم کو۔۔۔۔۔ ڈینی۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔“ اس نے اپنی سولہ ہیٹ سر سے اتار کر تقطیم کے سے انداز میں نیچے کی اور سر کو جھکا یا۔ سین نے دیکھا کہ اس کے سر پر بالوں کی تعداد خاصی کم تھی۔ شاید اسی لیے وہ ہر وقت سولہ ہیٹ پہن رہا تھا۔

”اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔۔۔ اندر آنے کو نہیں کہو گی۔ شاہ عالمی میں ایک ایک سے میرا ہی تو پوچھتی رہی ہو آج تم۔۔۔۔۔ ڈینی نے توقف کیا۔“ جن کو کم نے میرا حلیہ بتایا میں نے ان سے تمہارا حلیہ پوچھ لیا۔“ اس نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔ سین چونکی۔

خاموشی سے دروازے کے آگے سے ہیٹ کر اس نے اسے اندر آنے کی جگہ دی۔ ڈینی بیٹی بجاتا ہوا مطمئن انداز میں اندر داخل ہو گیا۔

”کون ہے؟“ اندر سے بابا کی آواز آئی تھی۔ سین نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

☆☆☆



”ایک کی سولہ سال اور ایک کی اٹھارہ سال۔“  
 ”ہرگز نہیں..... ذیل کی شکل کرو۔ اتنی عمر میں  
 جاؤ نہیں سیکھا جاسکتا۔ کم عمر لڑکے دولت کی ہوس میں  
 ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ایسی دولت کے انجام  
 کو بھگتنا کتنا مشکل ہے۔ بعد میں وہ ہمارے لیے  
 مشکلات کا باعث بن سکتے ہیں۔“

”جو آپ چاہیں۔“ کارزل پھر شیب پر اگلی  
 معلومات چیک کرنے لگا۔

”اور سر پاکستان سے ایک لڑکی آرہی ہے۔“  
 ”لڑکی؟ کیا واقعی میں.....؟ اس کا مطلب  
 پاکستان واقعی ترقی کر رہا ہے۔“ ایک خفیف سی  
 مسکراہٹ پیٹرین کے ہونٹوں پر چمکی تھی۔

”جی سر.....! سر ڈینی نے زیادہ تفصیل نہیں دی  
 مگر کہا ہے کہ کام مکمل گارنٹی والا ہے۔ وہ لڑکی لائم  
 (چونے) سے بنے ڈیوڈیشن پیسنر کے ذریعے  
 اسمگلنگ کرے گی۔ ڈینی نے کہا ہے کہ ایر پورٹ  
 انتظامیہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہونے پائے گی کہ  
 لڑکی اصل میں اسمگلر ہے۔“

”عمر کیا ہے؟“

”تیس سال.....“

”نام.....؟“

”سراسے ”بیلا ڈونا“ کا نام دیا گیا ہے۔ لفظ  
 ”بیلا ڈونا“ کارزل نے ایک فخر سے بتایا تھا۔ جیسے  
 اپنے ہی انتخاب پر نازاں ہو۔

پیٹرین نے گردن کو حرکت دیے بغیر کارزل کی  
 طرف دیکھا۔ کارزل کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔  
 اسے لڑکی کی حقیقی معلومات دینی تھی بس..... یہ سیکنڈ  
 نام رکھنے کی آپشن اور کام صرف اس کا ہی تھا۔

”اصل نام کیا ہے؟“ پیٹرین نے پوچھا۔

”سین قطب الدین.....“ کارزل نے بتایا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☆☆☆

کارزل آگیا تھا۔ باہر ہوتی بارش اور اس کی کاری  
 خرائی نے اسے لیٹ کر دیا تھا۔ درندہ عموماً سب سے پہلے  
 وہی اس آفس میں موجود ہوتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ  
 پیٹرین کو وقت کی پابندی کرنے والے اپنے درکر کس قدر  
 پسند ہیں۔ اور وہ تو ویسے بھی پیٹرین کے التفات حاصل  
 کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

کارزل کے ذمے اسمگلنگ کا کام تھا۔ اس کے  
 حصے میں ایشیاء کا خطہ تھا۔ ایشیاء جو جو لوگ چرس،  
 افیون، ہیرونن اور دوسری غیر قانونی اشیاء لے کر آتے  
 تھے۔ کارزل کے پاس سب کا ریکارڈ موجود ہوتا تھا۔  
 اس نے ہی ان ممالک میں اپنے ورکر پھیلائے ہوئے  
 تھے۔ درندہ پہلے یہ کام صرف یورپی اور افریقی ممالک  
 تک ہی محدود تھا۔ اس کی کوشش سے کاروبار کو وسعت ملی  
 تھی اور اس کی اس محنت کے صلے کے طور پر اس کا ”رتبہ“  
 بھی بڑھا دیا گیا تھا۔ اب وہ ہی سب پاس کرتا تھا لیکن  
 سب پاس کرنے سے پہلے ڈان پیٹرین کی اجازت لینا  
 ضروری تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں شیب تھا۔ جہاں  
 پر اس کی ساری رپورٹ مرتب تھی۔  
 ”ایران سے کیا خبر ہے؟“

”سر وہاں سے ایک آدمی آ رہا ہے۔ تقریباً  
 چالیس برس کا..... وہ قانونوں کے دھاکوں کے  
 ذریعے ہیرونن کی اسمگلنگ کرے گا۔“

”نہیں.....“ پیٹرین نے دھوکا کہا۔ ”یہ قانونی  
 طریقہ اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ جمادی سے کہو کوئی  
 اور انتظام کرے۔ اولیور نے معاملے کو سنگین بنا دیا  
 ہے۔ پولیس اب پیٹرین کی بولسی پھر رہی ہے۔ کسی  
 بھی طرح کی بے احتیاطی نہیں چلے گی۔“ کارزل نے  
 تائید اور عمل میں سر ہلایا کہ جو آپ کہیں۔

”بجگہ دیش.....؟“

”وہاں سے دو بھائی آرہے ہیں۔ دونوں جادو  
 کا کام کرتے ہیں۔ وہ اپنے جادوئی مجسمے کے ذریعے  
 ”حشیش“ کی اسمگلنگ کریں گے۔“

”کیا عمر ہے دونوں کی.....؟“ پیٹرین نے پوچھا  
 تو کارزل شیب پر تفصیلات چیک کرنے لگا۔



حمیرا رضا

# تھوڑی سی سچواری

وقت صبر کرو بیٹا اور میں تمہارے لیے دعا کے علاوہ کچھ  
کیا سکتی ہوں۔“ ثریا بیگم اپنے آنسو چھپاتی اُس کے  
لے جانے بنانے کچن کی طرف چل دیں۔ بیٹی کی اتری  
ہوئی شکل ہمیشہ انھیں احساس دلا جاتی کہ ان سے حوریہ  
کارشہ کرنے میں جلد بازی ہوئی ہے۔

”صبر بھی کوئی کتنا کرے پورے آٹھ ماہ ہو گئے  
اس جاہلانہ ماحول میں رہتے۔ شوہر کے شکوے کہ یہ  
کام نہیں ہوا۔ یہ کام ٹھیک نہیں کیا۔ تمہاری میری تو  
سوچ ہی نہیں ملتی۔ ساس کے یہ اعتراضات بہو نہیں  
تو کوئی کام نہیں آتا۔ تمہاری ماں نے تو کچھ بھی نہ  
سکھایا اور تندوں کی فضول گویاں بھابھی پر رنگ تو  
آپ پر اٹھتا نہیں۔ ہائے بھابھی آپ کی اسکن تو  
بہت ہی خراب ہے۔ ہر وقت یہی جلی گئی باتیں اور  
پیٹھ پیچھے میری برائیاں الگ۔“

حوریہ کہاں بیٹھنے والی تھی وہ بھی سارے رونے  
روتی ماں کے پیچھے کچن میں چلی آئی۔ ثریا بیگم نے  
نازوں پٹی حوریہ کو افسردگی سے دیکھا۔ کچھ باتوں  
سے انھیں بھی تکلیف پہنچتی تھی۔

☆☆☆

ثریا بیگم بیوہ ہوئیں تو انھیں اپنے سر پر حوریہ کی  
ذمہ داری دینی محسوس ہونے لگی۔ کچھ مہینوں کی بھاگ  
دوڑ کے بعد حامد کارشہ ملا تو انھوں نے سکھ کا سانس لیا۔

”بہت مبارک ہو بابی اب تیری ساری  
پریشانیوں ختم ہونے والی ہیں۔ حوریہ بیٹی کی شادی کے  
بعد یہ نوا بلنڈ پریش بھی حد میں آجائے گا اور یہ منحوس شوگر  
بھی۔ یہ فیکریں ہی بیماریاں لگاتی ہیں، یہ فیکریں ہی

”صبح صبح حامد نے پھر سے لڑائی کر لی، بات  
کیا تھی شرٹ پر ایک چھوٹا ساداغ۔ بد مزہ اموڈ لے کر  
کچن میں گئی تو ساس کی پھر وہی باتیں، بہو ٹھنڈے  
ٹانگ پر مشین لگا لیا کرو، یعنی بندہ اُٹھتے ہی مشین بن  
جائے۔ ایک ایک گونا گشتا کرا، جھاڑو دے، برتن دھو،  
سبزی بنا کر نکلی ہوں اور لپکانے بھی کیا ہیں آج  
کر لیے۔ پتا ہے میری ساس کو مجھے کر لیے تالپند ہیں  
جان بوجھ کر بیٹھے میں تین دن پکواتی ہیں۔ کبھی کر لیے  
پیاز، کبھی کر لیے آلو، کبھی کر لیے گوشت اور جس دن  
بندے کا دماغ نیند کی کمی سے خالی ہوا اُس دن کہیں گی  
قیمہ بھرے کر لیے بنالو۔“

حوریہ دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے خربوزے  
سے بھری پوری پلیٹ سے انصاف کر گئی۔

”بیٹا چار دن تو سب کے ہی مشکل ہوتے  
ہیں۔ یہاں بھی تو کام کرتی تھیں وہاں کر لو گی تو کوئی  
حرج نہیں۔“

گئی باری سنی باتوں پر ثریا بیگم نے بیٹی کو تسلی  
دی۔

”چار دن کی مثال کو بھی آٹھ مہینے ہو گئے ہیں  
اور بات کام کی نہیں ہے لٹاں اتنا کچھ کر کے بھی وہی  
ٹھنڈے۔ وہی اعتراضات۔ وہی بے ہودہ مذاق۔ مجال  
ہے جو کسی کے منہ سے تعریف کے دو بول نکلیں۔ آپ  
کو بھی پورے شہر میں یہی لوگ ملے تھے۔“

حوریہ نے سر ایلوں کے ساتھ ساتھ ماں پر بھی  
غصہ نکالا۔

”ایتھہ رشتے ملنا آج کل بڑا ہی مشکل ہے۔ کچھ



حور یہ کو عزت سے رخصت کر دیا تھا۔ وہ مطمئن ہوئیں  
کہ اب باقی زندگی پر سکون گزرنے والی ہے۔

شادی کو آٹھ ماہ ہو چکے تھے۔ لیکن سسرال میں  
اب تک حور یہ کا دل نہیں لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں  
اُسے دل پر چالکتیں اور بڑی بڑی باتیں ذہن پر سوار ہو  
جاتیں۔ اُس کی عادت تھی وہ ہر بات اپنی ماں کو ضرور  
بتاتی۔ صبح سارے کاموں سے فارغ ہو کر اور شام کو چھ  
بجے فون کرنا اُس کی دن بھر کی روٹین کا حصہ تھا۔ حور یہ کی

بیاریاں بڑھاتی ہیں۔ بس اب سوچ تیرے اچھے دن  
شروع ہونے والے ہیں۔ ”ثریا بیگم کی ہمسائی اور سہیلی  
شمشاد نے نا صرف سب سے پہلے مبارک باد دی بلکہ  
اچھے دنوں کی امید بھی دلائی تھی۔

حور یہ کی بات سنی ہوئے کچھ دن ہی گزرے تھے  
۔ ثریا بیگم بہت خوش تھیں کہ انھوں نے نبی کے لیے ایک  
اچھی شہابی ہوئی فیملی کا انتخاب کیا ہے اور حامد کی شرافت  
سے تو وہ خود بھی متاثر تھیں۔ کچھ ماہ بعد ہی انھوں نے





ثریا بیگم اپنے دل کو ہشکل سنبھالتے بیٹی کو دلا سا دیئے لگیں۔

”جذبات ہوتے تو وہ ایسی بات کرتا۔ سب سیکھی کھائی پٹی ہے۔ کسی کو میری قدر نہیں، کسی کو میرا خیال نہیں۔ آپ کو بھی مجھے گھر سے نکالنے کی جلدی تھی اب یہ گھر بھی مجھ پر تنگ پڑ رہا ہے۔“ اُس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے غصے میں فون بند کر دیا۔

ثریا بیگم بھی اسیا چھوٹا سا موہاں ہاتھ میں دبوچ کر سوچ میں گم ہو گئیں۔ بیٹی کے آنسو اُن سے برداشت نہیں ہو پا رہے تھے۔ اُنھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بیٹی کی آسانی کے لیے ہلکی آنکھوں سے دعاماننا شروع کر دی۔

☆☆☆

سارے کام کاج کر کے بھی توجہ حامد کی بات سے نہ ہٹی تو اُس نے دل بہلانے کوئی وی آن کر لیا۔ مارننگ شو سے بیوٹی ٹیس پڑتی، ریٹیٹی شو سے ہمت ادھار لیتی، مزاحیہ پروگرام پر قہقہہ لگاتی وہ آج کل کے بے شکم گانوں سے لطف اندوز ہونے لگی۔ کچھ چلنے کی پو آئی تو وہ چن کی طرف بھاگی۔ بنایا موڈ چلی ہوئی ہانڈی دیکھ کر پھر سے خراب ہو چکا تھا۔ اُس نے صحت سے فون اٹھایا اور فیس بک آن کر کے یہ اسٹیٹس اپ لوڈ کر دیا۔

”کچھ شوہر بے وفا ہوتے ہیں اور اُن کے گھر والے ظالم۔“ دس منٹ کے اندر اُس کی پوسٹ پر جمع سا لگ گیا۔ ”بہن تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی اور دل کی بات لکھ دی۔“ کسی دل جلی نے فوراً کمنٹ کیا تھا۔

”سچ لکھا ہے۔ کسی کے لیے جتنا مرضی کرلو۔ کوئی خوش نہیں ہوتا۔“ ایک دکھاری کا نا امید کمنٹ اُس کے دل پر جا لگا تھا۔

”ایسے شوہر اور سسرال کو تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے۔“

کہانی میں ہر بات شامل ہوتی کہ آج کتنے لوگوں کا ناشتا بنایا۔ کتنے بچے مشین لگائی۔ برتنوں کا کتنا ڈمیر تھا۔ کھانے میں کیا کیا لپکایا۔ کس نے منہ بنایا۔ کس نے طعنہ کسا۔ کس نے مذاق اڑایا ساری باتیں ماں کے کان میں ڈال کر وہ قدرے ہلکی پھلکی سی ہو جاتی۔

شروع شروع میں ثریا بیگم حور یہ کو سمجھاتیں، تسلیاں دیتیں، لیکن اب ان باتوں کی عادی ہو کر چلنے کڑھنے لگی تھیں۔ ہر وقت اُنھیں یہ ملال گھیرے رکھتا کہ اُنھوں نے پھول جیسی بیٹی کو غلط جگہ بیاہ دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی بیماریوں میں بھی کمی کے بجائے زیادتی ہونے لگی۔ بلڈ پریشر کی گولی اب روزانہ کھانی جاتی، بوہتی ہوئی شوگر کے لیے دوائیوں کے ساتھ سخت پرہیز بھی کیا جاتا، سر کا درد تو مستقل رہنے لگا اور فکریں عذاب کی طرح ایسے پیچھے پڑیں کہ نیند کے لیے نیند کی گولیوں کا سہارا لینا پڑا۔ دیگر ہمسایوں نے شور مچا دیا کہ اُنھیں ماہر نفسیات کی ضرورت ہے، مگر یہ اُن کا دل جانتا تھا کہ اُنھیں زندگی میں تھوڑی سی خوشی اور سکون کی خواہش تھی۔

☆☆☆

”اماں..... اماں حامد نے آج یہ تک کہہ دیا کہ وہ مجھ سے تنگ آچکا ہے اور جلد ہی دوسری شادی کر لے گا۔ دیکھا اماں! وہ کس قدر ظالم ہے۔ اس شخص کی خوشی کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ سارا سارا دن اُس کی اور اُس کے گھر والوں کی خدمت میں گزر جاتا ہے۔ ساس مندوں کی جلی لٹی باتیں کم تھیں کہ اب وہ بھی زہر اگلنا شروع ہو گیا ہے۔ اُس نے ایسا قدم اٹھایا تو میں برباد ہو جاؤں گی۔ یہ صلہ دے گا وہ میری ساری محنت..... محبت اور قربانیوں کا۔“

فل ولیم میں بولتے بولتے وہ سسک پڑی تھی۔ آج گھر میں ایسی ہونے کی وجہ سے اُسے دل کی جھڑاس نکالنے کا پورا موقع مل رہا تھا۔

”نہ میری پگڈنڈہ۔ اُس نے غصے اور جذبات میں کہہ دیا ہو گا وہ ایسا سچی نہیں کرے گا۔“



ایک جلابھنا کمنٹ آیا تو اُس نے فوراً لک کر کیا۔  
 ”لوگوں کو بس مفت کی نوکرانی چاہیے۔“  
 اس بات پر اُس نے جلدی سے جھٹک لکھا۔  
 ”نی لی کچھ بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔“  
 اس کمنٹ پر تو اُس کی ہنسی ہی چھوٹ گئی۔  
 فیس بک پر کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ تازہ دم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

آج بھی وہ ثریا بیگم کو اپنے شوہر اور ساس  
 نندوں کے ظلم و رور کو بیان کر رہی تھی اور ثریا بیگم نے  
 اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے شفقت آمیز لہجے میں  
 بتی کو حوصلہ دیا۔  
 ”اچھا لتاں بعد میں کال کروں گی اتنے دن  
 بعد صوبیہ کا فون آ رہا ہے۔“  
 حوریہ نے غلٹ میں ماں کو خدا حافظ کہا اور خوش  
 گوار حیرت سے صوبیہ کی کال اینڈ کی۔

”کیسی ہو حوریہ میڈم؟ تم نے کئی دن سے  
 رابطہ نہیں کیا تو تم نے بھی نہیں پوچھا اور کس سے اتنی  
 دیفون پر مصروف تھی۔ کوئی نئی ٹیکنی بیانی کیا۔“  
 حال احوال کرنے اور شکوے کے بعد صوبیہ  
 نے تجسس سے پوچھا۔

”تم بھی تو شادی کے بعد غائب ہی رہتی  
 ہو۔ لتاں سے بات کر رہی تھی۔ ایک دھکی بتی ماں کو  
 ہی اپنے حالات بتا سکتی ہے۔ شوہر اور سسرال نے تو  
 جینا مشکل کر رکھا ہے۔“ حوریہ جوابی شکوہ کرتے  
 ہوئے بچھے بچھے انداز میں بولی۔

”حوریہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ  
 شروع شروع کے دن سب کے مشکل ہوتے ہیں۔  
 کیا تم سارے حالات اپنی ماں کو بتاتی ہو؟“

”ایک وی تو واحد سہارا ہیں اور کس کو بتاؤں؟“  
 صوبیہ کے سادہ سے لہجے میں پوچھے گئے سوال  
 پر حوریہ نے ترح کر جواب دیا۔

”پاگل لڑکی میرے حالات تم سے مختلف  
 نہیں۔ دل بڑا اور مضبوط کرنا پڑتا ہے، بہت سی باتیں

درگزر کی جاتی ہیں، کئی مسائل کو فراست اور محبت سے حل  
 کیا جاتا ہے۔ تب جا کر ہی زندگی آسان ہوگی۔ ہر  
 بات آٹنی کو مت بتانا کرو۔“ صوبیہ نے سرزنش کرنے  
 والے انداز میں اُسے کبھی چوڑی نصیحت کی۔  
 ”تم بھی کمال کرنی ہو ایک بتی جب دھکی ہو تو  
 کیا وہ اپنے دکھ ماں کو بھی نہ بتائے۔ گھٹ گھٹ کر  
 مر جائے کیا؟“

حوریہ ساری باتیں نظر انداز کرتی آخری بات  
 پر تپ سی گئی۔

”دکھ بتانے میں اور ہر وقت دکھ بتانے میں بڑا  
 فرق ہوتا ہے۔ کبھی کوئی تکلیف برداشت نہیں ہوتی تو  
 انسان ماں کے سامنے دل کا کر لیتا ہے، لیکن ہر چھوٹی  
 چھوٹی بات میکے جانتا کوئی متصل مندی نہیں۔“ صوبیہ  
 اُس کی پریشانی محسوس کر کے محبت سے سمجھانے لگی۔  
 ”تم اپنی جگہ ٹھیک ہوگی مگر اماں کو ہر بات  
 بتائے بنا تو میرا دل ہی نہیں گزرتا۔“

حوریہ نے قائل ہوتے ہوئے بے چارگی سے  
 کہا۔

”تو انہیں اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنے سکھ  
 بھی بتاؤ۔ بیٹیوں کو ہنسا بتا دیکھ کر مائیں بھی برسکون  
 ہو جاتی ہیں۔ صرف منفی باتیں کیوں؟ اپنی زندگی کے  
 مثبت پہلو بھی بتاؤ۔ کیا ان اٹھ مہینوں میں تمہارے  
 شوہر نے تمہارے لیے کچھ اچھا نہیں کیا؟ تمہاری  
 ساس اور نندوں نے کوئی بھلائی نہیں کی؟“ صوبیہ  
 نے اپنی جذباتی سبیلی کی توجہ دوسرے پہلو پر دلائی تو  
 حوریہ سوچ میں پڑ گئی۔

”میری باتیں غور سے سنو! اگر آج کچھ برا ہو  
 رہا ہے تو ہو سکتا ہے کل وہ اچھے میں بدل جائے۔ جلد  
 بازی سے کام مت لو۔ وقت سے پہلے فیصلہ نہیں  
 کرتے۔ ہر بات کے لیے بوڑھے ماں باپ کو  
 پریشان نہیں کرنا چاہیے اور تمہاری امی بیوہ ہیں۔ سوچو  
 وہ اکیلے کسے ان باتوں سے لڑتی ہوں گی۔“ صوبیہ  
 نے بہتر مستقبل کی امید دلا کر اُسے مزید سمجھایا۔  
 ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو صوبیہ آج بھی میں نے



”یہ کیا کہہ رہی ہیں شمشاد خالہ؟“

حور یہ کہ اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تو صدے سے صوفے پر ڈھلے گی۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے اُن کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔ ثریا باجی نے تو تمہیں بتانے سے منع کیا تھا۔ اُن کے نمبر پر تمہارا فون آیا تو میں نے بتانا مناسب سمجھا۔ پریشان نہ ہو بیٹا تمہاری اماں اب بالکل ٹھیک ہیں۔“

خالہ شمشاد تفصیل بتاتے ہوئے تسلی دینے لگیں۔ ثریا یکدم صبح سے ہی اُس کے لیے سخت پریشان تھیں۔ سارا دن انھوں نے بیٹی کے اچھے نصیب کے لیے دعا کیں کیں، سجدے میں روئیں۔ شام کو بیٹی گھبرایا تو۔ ہمسائی شمشاد کے کمر چلی آئیں وہیں بی بی زیادہ ہونے کی وجہ سے اُن کی طبیعت بگڑی گئی تھی۔

حور یہ کچھ دیر بیٹھی خود کو کوئی رہی۔ ایک اُس کی ماں بھی جس نے اس حالت میں بھی اُسے پریشان نہ کیا اور ایک وہ بھی جس نے شادی سے پہلے اور بعد میں اپنی ماں کو تنگ ہی کیا تھا۔ اُس نے فون بیڈ پر پھینکا اور چادر سنہلائی دروازے کی طرف بھاگی۔ اُسے اپنی ماں سے ملنے کی بہت جلدی تھی۔ وہ اُنھیں اب اپنے حالات سے دیکھ نہیں خوش کرنا چاہتی تھی۔

☆☆



لٹاں کو پریشان کر دیا۔“

حور یہ نے افسوس بھرے لہجے میں ساری باتیں صوبیہ کو بتائیں تو وہ مہکڑ کر رہ گئی۔

”کم عقل لڑکی اگر تم اپنے شوہر پر رشک کر دو گی تو وہ بھی ایسی باتیں کرے گا۔ اُس نے ابھی بات کی اور تم نے اپنی امی کو پریشان کر دیا۔ ہم آج کی نسل ہیں ہمارے پاس ان پریشانیوں کو رفع و دفع کرنے اور جی بہلانے کے کئی طریقے بھی ہیں۔ کام کاج کر لیا۔ فی دی دیکھ لیا۔ فیس بک پر نکل گئے۔ دوستوں سے ٹک شب ہو گئی۔ ہم تو اپنی ماؤں کو ٹینشن دے کر اپنی رد بین میں بات بھول بھی جاتے ہیں، لیکن ہماری سادہ مائیں دن رات ان فکر وں میں کل کر اپنی صحت خراب کر لیتی ہیں۔“ صوبیہ نے اچھا خاصا ڈانٹا تو حور یہ کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُسے دل ہی دل میں سخت پشیمانی ہوئی کہ اُس نے کتنی معمولی باتوں کے لیے لٹاں کو ستایا تھا۔

☆☆☆

آج شام حامد جلدی گھر آ گیا تو وہ حیران رہ گئی اور اُس کے ہاتھ میں گجرے دیکھ کر تو اُس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔

”صبح میں غصے میں کچھ زیادہ ہی کہہ گیا۔ بس مجھ پر رشک نہ کیا کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا کہتا تو دور سوچوں گا بھی نہیں۔“ وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو کر بال بنار ہی تھی جب آئینے میں حامد کے شرمندہ وجود کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوئی۔

”اچھا اب ناراضی چھوڑو۔ تیار ہو جاؤ چیزا کھانے چلتے ہیں۔“ حامد کی اگلی آفر پر تو وہ مسکرائے بنانہ رہ گئی۔

”آپ باہر چل کر بیٹھیں میں ذرا دو منٹ امی سے بات کر کے آئی۔“

”اچھا ابھی جلدی آتا۔ دو منٹ کے بیس منٹ نہ کر دیتا۔“ حور یہ کے محبت سے اجازت طلب کرنے پر حامد شرارت سے کہتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆



رُخ پودھری

# سچائی کی سر

”سلیم منزل“ کے اکلوتے چشم و چراغ سلیم الدین کی والدہ حمیدہ خاتون ان کی شادی اپنی برادری میں کرنا چاہتی ہیں لیکن سلیم الدین کو اپنے والد کے دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ بیگم آ جاتی ہیں۔ لیکن حمیدہ خاتون دل سے اپنی کم تعلیم یافتہ بہو شگفتہ بیگم کو قبول نہیں کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزاجاً انتہائی بد مزاج، اکڑ۔ ظہیر احمد کے اور رقیہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں۔ اسماء، شمینہ، شکیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد کے دو بیٹے عابد اور ساجد جن کی شادیاں اسماء اور شمینہ سے ہوئی ہیں اور تین بیٹیاں جن میں دو شکیل اور جمیل کی بیویاں ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔

پھر موسم آتے جاتے رہے، رتیں بدلنے لگیں۔ سلیم منزل میں ابا جان، اماں جان رخصت ہو چکے تھے البتہ آنگن پھولوں اور گلیوں سے مہک اٹھا تھا۔ زبیر اور شہلا گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ان کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ وسیم، کلیم اور غیر کے بیٹے بیٹیاں، شگفتہ بیگم اور سلیم میاں کو دادا جان اور دادی جان کہہ کر لپٹا کرتے۔ میزہ کے بچے نانا جان اور نانی جان کہتے۔

غیر اور گلشن کا ایک بیٹا سفیر اور چار بیٹیاں شفق، مہک، عاتکہ اور صبا تھیں۔ وسیم کی دو بیٹیاں عازہ اور فائزہ اور تین بیٹے روحیل، فیصل اور جمیل تھے جبکہ کلیم اور نفیسہ کے دو بیٹے ہارون، شمعون اور بیٹیاں ثناء اور زینب تھیں۔ میزہ کی دو بیٹیاں شابی اور تاندہ تھیں اور ایک بیٹا غزین تھا۔

ساجد نے شمینہ کی اجازت سے دوسری شادی کر لی تھی لیکن گھر والے اس شادی سے لاعلم تھے۔ ساجد کی شمینہ سے تین بیٹیاں سار، زارا اور عمارہ تھیں اور منیہ سے سے تین بیٹے ارمغان، داؤد اور زین تھے۔ ساجد کے بیٹے اپنے









باپ سے ناراض رہتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے دادا کے گھر میں پچان اور رشتے چاہئیں۔ خاص کر کے ارمغان باپ کو بہت ناپسند کرتا ہے۔

سارا کی معافی اسماء اور عابد کے بیٹے سعد سے ہو جاتی ہے لیکن فہد کو زارا انکار کر دیتی ہے۔ اسے فہد پسند تو ہے پر خاندانی غصے اور غور توں کو ان کا حق نہ دینے کی وجہ سے وہ فہد سے شادی کرنے سے انکاری ہے۔

ارمغان کا دوست سرد جس کی دو بہنیں ہیں، حادیہ اور سعدیہ۔ ان کے والدین وفات پا چکے ہیں۔ سعدیہ اپنے کزن ہمالوں کو پسند کرتی ہے۔

راعی اور رویکا کی ایک بیٹی ٹی ہے جو مغربی ماحول میں بگڑ گئی ہے۔ جس کا ذمہ دار راعی، رویکا کو سمجھتا ہے۔ اس کا ایک دوست ہے انور جس کی ان کی فیملی سے دوستی ہے۔

راعی اپنے اسٹور میں ایک پاکستانی فرجاداتی لڑکے کو نوکری دیتا ہے جو بہت ایمان دار ہے۔ فرجادی کو دیکھتے ہی اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔

ایک رات فرجادر راعی کے گھر پہنچتا ہے تو ٹی اس کو مدہوشی کی حالت میں گھر سے باہر لٹی ہے۔

اب آگے بڑھیے:-

## خونِ قہر

ارمغان نے سگتے لہجے میں زہر میں بجا جملہ باپ کی طرف اچھالا جو تیر کی طرح سیدھا ساجد کے دل کے آر پار ہو گیا۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ہاتھ میں پکڑا داؤد کا ہاتھ غصے میں جھٹکا، قریب تھا کہ ان کا ایک بھی جملہ منیبہ کی تربیت کو جلا کر خاکستر کر دیتا۔ منیبہ پہلے ہی ارمغان کو باپ کے ساتھ کی گئی اس گستاخی پر گھوڑی تھی۔

”ارمغان! تمہیں کچھ خیال ہے کہ تم باپ کے سامنے کھڑے ہو۔ ان سے مخاطب ہو اور تمہیں جرات کیسے ہوئی ایسی بات کرنے کی۔“

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بیوی کی طرف داری پر ساجد کا غصہ کچھ کم ہو جاتا، وہ اور سلگ اٹھے۔

”بولنے دیجیے بیگم صاحب، بولنے دیجیے۔ یہ تو تربیت کی ہے آپ نے اپنے صاحب زادے کی کہ تن کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا ہے۔ مجھے میری بزدلی، میری کم ہمتی کا طعنہ دے رہا ہے۔ شاباش صاحب زادے شاباش۔“ ساجد کی آواز کی گونج سے گھر کے در و دروازے دھل گئے تھے۔ ارمغان اب سر جھکائے کھڑا تھا۔ منیبہ کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

”تم سے تو میں بعد میں نشوں گی ارمغان۔ ساجد میری بات سنئے اتنا غصہ مت کیجیے۔ آپ خود ہی تو کہا کرتے ہیں کہ ارمغان کا غصہ، ضد اور ہٹ دھرمی باپ کے لیے تھی آپ پر، اور دھرمینہ بتا رہی تھی کہ زارا کا غصہ اور ضد بھی آپ پر گیا ہے تو.....!!“

منیبہ نے کہا تو ساجد کا غصہ کا پارہ مزید اوپر چلا گیا۔ وہ داؤد کو دھکا دے کر آگے بڑھے تو باہر نکلا ارمغان رک گیا کہ کہیں اس کی ماں پر ہاتھ نہ اٹھ جائے۔ مگر ساجد کے الفاظ کی تیز دھار آ لے سے کم نہیں تھے۔

”او! تو کو کیا سفارتی تعلقات شروع ہوتے ہی شوہر کی برائیاں ایک دوسرے سے بیان ہونے لگیں۔ تمہارا یہ ناخجار بیٹا ارمغان اور شمینہ کی بیٹی زارا اپنے باپ پر گئے ہیں۔ ضدی، ہٹ دھرم اور غصیلے اور کیا کیا برائیاں کی ہیں شمینہ نے میری۔ یہ بھی نا کہ میں اسے مارا کرتا تھا۔ ذلیل کرتا تھا۔“



ساجد کے منہ سے شعلے نکل رہے تھے۔ منیہ بچوں کے سامنے شرمندگی سے گڑی جارہی تھی۔ بھلا ایسی باتیں ان کو کہاں معلوم تھیں جو والد صاحب اپنے منہ سے ارشاد فرما رہے تھے۔

”ساجد! بس کیجیے چپ کر جائیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شمیم نے کچھ نہیں کہا ہم سے۔“

”شٹ اپ! میں سب جانتا ہوں اس نے تمہیں یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں اسے رات بھر ایک پاؤں پر کھڑا رکھتا تھا۔ اور یہ بھی بتایا ہوگا کہ جب اسے استھما کا ایک ہوتا تھا تو میں غالم شوہر اس کا ان ہیلر چھادیتا تھا۔ اسے سرد موسم میں باہر نکال دیا کرتا تھا۔ اور یہ تو اس نے لازماً بتایا ہوگا کہ اس کے جلا دشوہر نے جلنے لگے اس کے اس کی پھٹی جلا دی گئی اور.....“

ساجد حسب عادت، غصے میں چیخے جا رہا تھا۔ اس کے الفاظ اور اس کے بیان کردہ حقائق میں سب جل رہے تھے۔

ارمغان غصہ سے مٹھیاں پھینکتا ہر نکل گیا۔

”کاش ابو میں آپ جیسے حیوان مفت باپ کا بیٹا نہ ہوتا۔“

ارمغان کی یہ سوچ اگر لفظوں میں ہوتی تو شاید باقی کچھ نہ بچتا وہ جا چکا تھا۔ منیب کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ پڑی۔

”بس کر دو ساجد! اللہ کے واسطے بس کر دو..... اس بد نصیب نے کچھ بھی ایسا نہیں کہا البتہ آپ کے اس اقبال بیان سے شمیم کے لیے میرے اور بچوں کے دل میں عزت مزید بڑھ گئی ہے۔ اور..... اور.....“

منیہ ڈوبتے دل کو سنبھالتی صوفے پر گر گئی تھی۔ ساجد غصے میں گہرے گہرے سانس لیتا آگے بڑھا۔ داؤد نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر ماں کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔

”ابو! مجھے دادا ہاؤس نہیں جانا۔“

داؤد کا مضمون سب رشتوں کی محبتوں سے لبریز دل ٹوٹ گیا تھا ان کا باپ غصہ کا تیز ہے اتنا تو وہ جانتا تھا اور اس حقیقت کے ساتھ جی بھی رہے تھے وہ لوگ مگر یہ نہیں جانتا تھا۔ ان کا باپ ایک جلا دھمی ہے۔ جو شمیم نامی جیسی محصوم عورت پر اتنا تشدد کرتا رہا ہے۔ ساجد کو شدید جھٹکا لگا۔ داؤد ساری اولاد میں چھوٹا تھا ان کی آنکھ کا تارا تھا، اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ مگر اپنی غلطی مان لینا ان کی مردانگی کی توہین تھی۔

”کیا کہا؟ نہیں جاؤ گے؟“ ساجد کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلے داؤد کی طرف بڑھے منیہ خوف زدہ ہو کر باپ بیٹے کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی۔ داؤد کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

”جائے گا ساجد، کیوں نہیں جائے گا بچہ ہے ناں اور آپ کو پہلی بار اتنا غصے میں دیکھا ہے۔ تو سہم گیا ہے۔ جائے گا کیسے نہیں۔ اور یوں بھی ہم سب کا اصل ٹھکانا وہی تو ہے ناں بس ڈر گیا ہے۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم سب نہیں ضرورت مجھے کسی کی۔ اور تم کان کھول کر سن لو۔ شمیم کے ساتھ لگائی بجھائی کرنا بند کر دو ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ میرا ہاتھ تم پر بھی اٹھ جائے.....“

ساجد نے خود پر کنٹرول کیا مگر پھر بھی ہاتھ منیہ کے بالوں تک پہنچ گئے تو اس سب کے دوران زمین جو خاموش کھڑا تھا ماں کی ڈھال بن گیا۔ ماں کے بال باپ کی گرفت سے آزاد کرائے۔

”ابو پلیز یہ ہماری ماں ہیں آپ ان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ شمیم نامی نہیں کہ چپ چاپ سہکتی رہیں گی



کیونکہ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ یہ تین جوان بیٹوں کی ماں ہیں۔“  
 ”اوہو تو گویا تمہیں بھی زبان لگ گئی۔ منیب یہ سب کیا ہے یہ ہے میری محبتوں کا صلہ کہ میری ہی اولاد۔“  
 ”ساجد..... ساجد۔“ منیب نے صفائی دینے کی کوشش کی۔  
 ”بھڑا میں جاؤ تم سب۔“ ساجد شدید غصے میں راستے میں آئی چیزوں کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گئے۔

☆☆☆

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ساجد میرے اور منیب کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی سوائے آپ کی محبت کے جس کو اس نے بھی تسلیم کر لیا اور میں نے بھی۔“  
 ساجد کے غصے سے ثمنینہ کا دل خوف سے لرز گیا۔ وہ قسمیں کھا کر اپنی اور منیب کی بے گناہی ثابت کر رہی تھی۔

”بکواس بند کرو..... تم دونوں نے اب ایسا کر لیا ہے مجھ سے انتقام لینے کے لیے۔ تم نے ہی کہا تھا کہ زارا غصے اور خد میں اپنے باپ پر گئی ہے اور اپنی مظلومیت کی داستان سنائی ہے۔“

”بس کر دیجئے ساجد! جو باتیں میں بھول چکی ہوں وہ وہ..... میں ان کو کیوں بتاؤں گی۔ اور جب میں نے منیب سے ایسا کہا تھا تو میں ہے تو۔ پھر وہ ایسا کیسے کہہ سکتی ہے کہ میں نے ان کے لیے کچھ بتایا ہے۔“

”شٹ اپ!“ ماں کے چہرے پر بڑنے والے کھنکھری گونج بابر کھڑی زار نے اپنے دل پر محسوس کی۔ خنکی کے باوجود سارا وجود پسینے میں نہا گیا۔ سانس اکھڑنے لگی تو اس کا ہاتھ بے ساختہ ہاتھ میں پکڑے ان ہیلر پر مضبوط ہو گیا اسے اس وقت خود ان ہیلر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ اگر دروازے پر زور کی دستک نہ دیتی تو شاید ان ہیلر میں موجود ساری دوا اپنے اندر اتار لیتی۔

”زارا!“..... ثمنینہ اس دستک کو جانتی تھی صرف بچپن اور جوانی کا وقفہ آیا تھا۔ ہمیشہ ہی سے جب جب ساجد کا ہاتھ ثمنینہ پر اٹھا اس وقت زارا کی دستک ہوتی۔ ثمنینہ نے ساڑھی کے پلو سے چہرہ رکڑا، ساجد کو دیکھا جو خوں خوار نظروں سے اب دروازے کو گھور رہے تھے۔ دوسری دستک پر ساجد نے شدید غصے سے دروازہ کھول دیا۔

”امی آپ کا ان ہیلر لے کر آئی ہوں آپ کچن میں بھول آئی تھیں۔“ دوبارہ دستک کے لیے زارا کا ہاتھ اٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا سامنے آگ بگولا کھڑے اپنے باپ پر نظر پڑی۔

”اطلاع مل گئی تمہیں کہ اس وقت تمہاری ماں کو ان ہیلر کی ضرورت ہے۔“ زارا نے ایک گہرا سانس لے کر باپ پر نظر ڈالی جو لگ رہا تھا کچا چبائیں گے۔

کچھ باتیں اتنی یقینی ہوئی ہیں کہ ان کے وقوع کی اطلاع نہ بھی ملے تو پتا چل جاتا ہے۔

☆☆☆

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو، مسٹر فرجاد!“ فرجاد کی بات پر ٹپی سلگ اٹھی۔

”جو آپ نے سنا میڈم، کہ ہر تھوڑے کسی بھی گدھے کی ہونٹ بے گا اور بے بھی ہوگا۔“ انس ڈن۔“  
 فرجاد اس کے حسن میں کھویا ضرور مگر لا کھڑا یا نہیں مضبوط لہجے میں اپنا فیصلہ سن کر کاؤنٹر پر کھڑا ہو کر رجسٹر دیکھنے لگا۔

ٹی نے بلٹ کر مائیکل وغیرہ کو دیکھا۔ کتنی بے عزتی ہوئی تھی اس کی۔



اس سے قبل تو یوں ہوتا تھا کہ اس کے لائیو دوست مفت خوری کے چکر میں کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ کر آیا کرتے اور آتے بھی اس وقت جب رو بیکہ ہونی اور جو جی میں آتا کرتے چاہتے گاتے، کھاتے پیتے ہلاک کرتے۔ مگر پھر راہی کو پتا چلا تو رو بیکہ پر بھی پابندیاں لگ گئیں..... اور جب سے فرجاد آیا تھا پابندیاں مزید سخت ہو گئی تھیں۔

”ہو مار پو!“ ملکیت کے احساس نے ٹی کو ہر قسم کی بات سے بے نیاز کر دیا اس نے رجسٹر بند کر کے چیخ کر کہا تو فرجاد اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اتنے غصے میں وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ فرجاد کا دل چاہا کوئی شوخ سی بات کہہ دے مگر اس نے اپنے دل کو اتنا بھی..... آزاد نہیں چھوڑا ہوا تھا کہ ہاتھوں سے نکل جائے۔

”میڈم! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟“ اس نے بلاوجہ ہی رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہوئے نظریں اس پر سے ہٹائیں۔ مگر ٹی نے غصے سے رجسٹر اٹھا کر دور پھینکا۔ جسے دوسرا دیر اٹھانے کے لیے بھاگا۔

”یو چیئر، شاید ابھی تک نہیں جان سکے میں کون ہوں۔ آئی ایم اوور، انڈر اسٹینڈ۔“

ٹی کے نازک ہاتھوں میں فرجاد کا گریبان تھا۔ گریبان پر ہاتھ کوئی بھی مرد برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر فرجاد کو کرنا پڑا۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھوں کو گریبان سے ہٹایا اور قدرے جھٹکے سے دور کیا۔

”ہینڈ رڈ پرسنٹ انڈر اسٹینڈ میڈم۔ اس کے باوجود میں آپ کو من مانی کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ آئی ایم آن جاب اور راہی سر نے مجھے سب کچھ ہینڈل کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اور میں اپنے پالک کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ پہنچانے دوں گا۔“ فرجاد کے ٹھہرے پانی جیسے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ ایک پل کو ٹی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت کہنے میں وہ لوگ چونک کر دیکھ رہے تھے جو جوتے تھے، ان میں ایسے بھی توجہ کے لیے یہ ہر وقت کا معمول تھا۔ وہ ایک نظر ڈال کر اپنے آپ میں مگن ہو گئے۔

یہ سب نیا تو ماریہ بیٹا اور کوئل کے لیے بھی نہیں تھا مگر پھر بھی وہ تینوں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹی اور فرجاد کے

www.urdutubes.com

قریب آ گئے۔

”ٹی! پلیز لیواٹ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔“

ماریہ نے ٹی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اس کا ہاتھ پکڑ کر دور لے جانے لگی مگر ٹی نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔

”ماسٹر یو راون بزنس ماریہ۔ آئی ڈونٹ لائیک کہ کوئی میرے معاملات میں انٹرفیر کرے۔ آئی ول ہینڈل مائی پرائلم۔ گٹ اے سائڈ۔“ ٹی نے کسی بھی تعلق کا خیال کیے بغیر بیٹا کو پیچھے کیا اور دراز کی طرف بڑھی اور حسب عادت پاؤنڈ نکالنے کے لیے ہاتھ اندر ڈالا۔ فرجادی شریانیں غصے سے تن گئیں حکم کھلا غنڈا گردی تھی یہ۔ ہر چند کہ ٹی مالک تھی مگر وہ اس وقت نگران تھا، ہر نقصان کا ذمہ دار۔ اس نے ایک بار پھر ٹی کے نرم و ملائم نازک ہاتھوں کو اپنے سخت ہاتھوں میں لے کر دیا۔

”پلیز میڈم۔ ڈونٹ ڈو دوس در نہ مجھے راہی سر کو کال کرنی پڑے گی، اگر آپ اپنی حرکت سے باز نہ آئیں تو

فرجاد کے سامنے اس وقت اس کے فرائض تھے مالک نے اس پر بھروسہ کیا تھا۔ وہ کیسے یہ سب ہونے

دیتا۔



”فرجاد! میڈم ٹی ایسا ہی کیا کرتی ہیں۔ ابھی بھی کرتے دو۔“ ندیم نے آہستگی سے فرجاد کے کان میں سرکشی کی تو فرجاد ندیم کو کھورنے لگا۔

”برائی کاراستہ نہ روکا جائے تو بدعتی چلی جاتی ہے۔ برائی کو بڑھاوا دینا..... مجرم کی پشت پناہی کرنا، یہ میری تربیت کا حصہ نہیں۔“

”لیو مائی ہینڈ اسٹوپڈ آدمی!“ ٹی زور سے چلائی تو فرجاد نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ تو ٹی تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی فرجاد راستے میں آگیا۔ وہ خوں خوار انداز میں اس پر چبھتی۔

”اگر اب تم نے میرے کسی کام میں انٹرفیر کیا تو آئی ول کال دا پولیس۔ مائیکل! کال دا پولیس۔“

ہٹ جاؤ فرجاد! یہ پہلے بھی کئی بار کئی لوگوں کو پکڑا چکی ہے۔ جیل بھجوا چکی ہے۔“

”پلیز ندیم، کرنے دو کال میڈم کو یا اس کے پیٹ کو۔“

فرجاد نے مائیکل کو دیکھا ماریہ اس کے قریب گئی۔

”مائیکل آریو میڈ۔ ڈونٹ کال دا پولیس۔“

☆☆☆

”سنو رانی۔ مجھے تم ذرا کیونٹی سینٹر تک ڈراپ کرو، وہاں نجمہ بھی آئی ہوگی۔ یونو واٹ؟ وہ آج کل بڑی پریشان ہے اپنی لڑکیوں کے رشتوں کی وجہ سے۔ انور نے اپنے گاؤں سے اپنے مزارع کے لڑکے کو بلا کر کسی بیٹی کی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ نجمہ پریشان ہے، اب ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ اب اپنے مزارعوں کے بیٹوں کو داماد بنائیں گے!!“

رانی کو گیٹ سے باہر نکلتے دیکھ کر رو بیکا انا اسکارف گردن اور منہ پر لپیٹے ہوئے تیز تر قدموں سے چلتی رانی کے پیچھے آگئی تو رانی نے سخت سے اسے دیکھا۔

”کیوں! مزارع انسان نہیں ہوتے یا ان کے لڑکے..... تم اور نجمہ بھابھی تو انسان کو اپنی سوچ اور پسند کے ترازو میں تولتی ہو۔ رنی ماشہ اوپر نیچے ہو گیا تو رنجکٹ، انسانوں سے نفرت۔ رشتوں سے نفرت۔ کیا چیز ہو تم عورتیں بھی!“

رانی کو نجمہ اور رو بیکا کی دوستی پسند نہیں تھی کیونکہ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ ایک جیسی سوچ رکھنے والی یہ عورتیں اب ان کی ایک بات بھی نہیں سنتی تھیں۔

”اف! رانی تمہیں کچھ دینے کا موقع چاہیے۔ اب بیٹیاں ہیں کچھ بے میں تو نہیں پھینک دیتا ان کو اور مجھ سمیت کوئی ماں اپنی حسین پردھی لکھی بیٹیوں کو پاکستان کے سچ ان پڑھ گھرانوں کے لڑکوں کے حوالے نہیں کر سکتی۔“

”اگر بیٹیوں سے اتنی ہی محبت ہوتی ہے تو ناخنوں سے گوشت کو الگ مت کیا کرو۔“ رانی کی بات ادھوری تھی کہ ندیم کی کال آگئی رانی نے کال ریسیو کی۔

”لیس ندیم کیا ہوا آل از ویل!“ ندیم نے ساری بات بتا دی۔

”اوکے، اس گدھے کے بچے مائیکل کو روکو پولیس کو کال مت کرے۔ میں ابھی دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

”خیریت ہے رانی! پولیس کو کون اور کیوں کال کر رہا ہے۔“



رائی نے شعلے برساتی نظر سے رویکا کو کھورا گاڑی اشارت کر دی۔  
 ”جہاں تمہاری صاحب زادی ہو وہاں کوئی ہنگامہ کوئی بدتمیزی نہ ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ رائی نے غصے میں اسپینڈ بڑھادی۔

رویکا اندر سے فرجاد کو کستی رہی تھی کہ جب سے وہ آیا تھا کافی ہاؤس ان کے بجائے اس کا ہی لگنے لگا تھا۔ اس کے بنائے گئے اصولوں پر سب کام کر رہے تھے۔

”اسپینڈ کم کرو رائی۔ ایسی بھی کوئی قیامت نہیں آئی ہوگی کہ تم ایکسٹنٹ کرنے کے ورپے ہو جاؤ۔“ جواباً رائی نے اک انگارہ سی نظر اس پر ڈالی اور چپ چاپ گاڑی چلاتا رہا اور اپنے کافی ہاؤس کے سامنے ہی جا کر بریک لگائے۔ اندر کا مظہر صاف نظر آ رہا تھا۔ کافی ہاؤس کا بڑا سا ہال کسمٹرز سے بھرا تھا ہر کوئی اپنا اپنا کام کر رہا تھا ندیم ساری صورت حال کو دیکھتے ہوئے سب کو سنبھال رہا تھا۔ کاؤنٹر پر فرجاد اور بی آئنے سامنے کھڑے تھے ایک دوسرے کو کھو رہے تھے۔ بی کا ادبائش گرد پ اس کی سائڈ پر تھا جبکہ ماریٹینا اور کوئل فرجاد کی طرف تھے۔  
 ”آئی دل ہی پو، میں تمہیں یہاں ٹکے نہیں دوں گی یہ سب میرا ہے۔ اوکے اور تم یہاں سرونٹ ہو۔“

ٹی نے پھر دراز کی طرف ہاتھ بڑھایا فرجاد نے پھر روک دیا۔  
 ”آئی نو میڈم کہ میں یہاں ملازم ہوں۔ لیکن شاید آپ یہ بات نہیں جانتیں کہ جو ملازم اپنے مالک کے ساتھ وفادار ہوتے ہیں وہ مالک کو نقصان پہنچنے نہیں دیتے اور.....“

”کیا ہو رہا ہے یہاں پر؟..... رویکا تقریباً بھانسی ہوئی رائی سے آگے نکل گئی وہ رائی سے اصل صورت حال چھپانا چاہ رہی تھی رویکا اور رائی کو دیکھ کر سب چونکے ہو گئے۔  
 رائی نے سسکتی نظر ٹی پر ڈالی جس کی ہاتھ میں ابھی بھی ان گنت پاؤنڈز تھے اور فرجاد اسے روکے ہوئے تھا۔ رویکا نے ایک تیز نظر فرجاد پر ڈالی۔

”فرجاد! میری بیٹی کا ہاتھ پھوڑو۔ اب ہم آگئے۔ خود ہیٹڈل کر لیتے ہیں۔“

”دیس میم!“ فرجاد نے ایک گہرا سانس لیا۔

”تم سب میرے آفس میں آؤ۔ ندیم میرے آفس کا لاک کھولو۔“

”دیس خیر!!“ ندیم تیزی سے دوسرا جانب مڑا۔

☆☆☆

شائع ہوئے ہیں

☆ فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم	راحت جمیل	قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	قیمت: -/400 روپے

32216361 - 37 -

30/5 139 دسمبر



بھائی اس بار چھٹیوں میں ہم سنگار پور جائیں گے۔ میری فرینڈز جاری ہیں اپنی فیملی کے ساتھ ہم بھی جائیں گے۔ ہیں ناں آپنی۔“

حادیہ نے کان سے آتے ہی اعلان کر دیا تو سرد اور سعدیہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔  
”ایکلیکوزمی! میں نے کوئی لطفہ نہیں سنایا کہ بہن بھائی بننے لگے ہیں اور بھائی آپ بھول رہے ہیں میں آپ کی بہن کم، بیٹی زیادہ ہوں۔“ وہ سرد کے شانے پر جھول گئی تو سرد نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔  
”اس میں کوئی شک ہے سعدیہ۔ بتاؤ ذرا۔“

”تو پھر جو میں نے کہا اس پر عمل ہوگا کہ نہیں۔ اگر نہیں تو میری آپ سے کئی ہے۔“ اور حسب عادت حادیہ نے اپنے انگوٹھے کا ناخن دانتوں سے کاٹ کر گویا کٹی کا اعلان کیا۔

”یہ بہت بڑی چیئر ہے بھیا اس کی باتوں میں نہ آئیں۔“ سعدیہ، سیکنہ ماسی کے ساتھ مل کر کھانے کے برتن لگا رہی تھی ٹیبل پر۔

”کیوں نہیں آئیں گے میرے بھیا ہیں بس بتائیں ناں بھیا!“  
”جائیں گے! ضرور جائیں گے ہم چھٹیوں میں مگر فی الحال اسلام آباد اپنے ملک کے تمام شمالی علاقہ جات بھور بن وادی کا خان اور.....“

”جی نہیں، ہر سال وہیں جاتے ہیں اس بار ہم کہیں باہر جائیں گے آؤٹ آف کنٹری۔“  
وہ ہاتھ دھوئے بغیر کباب منہ میں ڈالنے لگی تو سعدیہ نے اس کے ہاتھ پر چپت ماری۔  
”ہاتھ دھو کر آؤ، گندی لڑکی کی چیچن کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔ دیکھیں بھیا اس کو۔“ اف گندی انگلیاں جاٹ رہی ہے۔“

حادیہ ہمیشہ کی طرح اسے چڑانے کے لیے اپنی انگلیاں مزید چاٹنے لگی، سرد اسے دیکھ کر ہنستا رہا۔ حادیہ ڈائننگ روم سے نکل کر باہر گئی، ہاتھ دھو کر سعدیہ کے منہ پر چھینٹے اچھا تھی بیٹھ گئی۔ سعدیہ چڑ گئی۔  
”بد تمیز لڑکی! محال ہے جو اس کو تمیز چھو کر گزر جائے۔“

”اسے کچھ مت کہو سعدیہ یہ تو اس گھر کی رونق ہے۔“  
”آیا عقل شریف میں۔ جی تو پھر بھیا یہ طے ہو گیا کہ ہم اس بار چھٹیاں گزارنے سنگار پور جا رہے ہیں۔“  
”السلام علیکم۔ ارے بھئی کہاں جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس وفد میں ہمارا نام بھی شامل ہے کہ نہیں۔“  
اسی دوران ہمایوں بھی آفس سے آ گیا۔ سعدیہ خود ساختہ محبت کے بحر میں کھو گئی۔ کئی رنگ سانولے چہرے پر چمکائے۔ جن پر اس ستم کرنے سرسری نگاہ بے زاری سے ڈالی اور حادیہ کے برابر بیٹھ گیا حادیہ اور ہمایوں کی جیمسری خوب لٹی تھی۔

”علیکم السلام۔ ہمایوں جاؤ ہاتھ دھو آؤ ورنہ تمہیں بھی سعدیہ میڈم سے ہاتھ پر مار کھانی پڑے گی۔“  
”جی جی، ہمایوں بھیا جاے اچھے بچوں کی طرح ہاتھ دھو کر آئے۔“ حادیہ نے بھی سرد کی تائید کی۔  
”میڈم سعدیہ میں ہاتھ دھو کر آیا ہوں سخت بھوک لگی ہے، اجازت ہے کھانا نکالوں۔“ ہمایوں نے سعدیہ کو دیکھا جس کا دل اور ہاتھ ہمایوں کی اک نظر پر ہی لرز جاتے تھے۔

”جی ضرور نکال لے یہ حادیہ تو بس ایویں۔“  
”ارے بھئی سعدیہ۔ ہماری حادیہ ایویں شوئیں نہیں ہے، یہ بہت قیمتی ہے ہمارے لیے۔“ ہمایوں نے بریانی پلیٹ میں ڈالی۔  
”صرف آپ کی نظر میں ہوئی بھیا۔ ورنہ یہاں تو ہماری کسی کو پروا ہی نہیں..... حادیہ نے منہ پھلا کر سعدیہ



اور سرمد کو دیکھا۔

”جانتا ہوں یہ بہت ناقدرے لوگ ہیں۔ تم مجھ سے بات کرو کیا چاہیے۔“  
”میڈم چٹھیوں میں سنا پورا جانتی ہیں۔“ سرمد پیار سے مسکرایا۔  
”سو داٹ سنا پورا تو کیا۔ ہم اپنی بھی گڑیا کو پیرس لے جائیں گے۔“  
”ہائے سچ ہوئی بھیا!“ حادیہ ہمایوں سے لپٹ گئی۔  
”سو فیصد سچ۔“

ہمایوں نے ایک نظر سرمد پر ڈالی وہ اسے دیکھ کر یا تو شرما رہی ہوتی یا گھبرا رہی ہوتی خود پر اٹھی۔ بار بار ہمایوں کی نظر پر خود کو سنبھال رہی ہوتی تو ہمایوں کو بہت اچھا لگتا۔  
کیوں لڑا کی بلی کو پیچھے لگا رہے ہو۔ چھوڑے کی نہیں جب تک نہ لے کر جاؤ گے۔“ سرمد نے نیپکن سے ہاتھ اور منہ صاف کیا اور کرسی گھسکا کر اٹھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔  
”سرمد تم بھی ناں حد کرتے ہو میں حادیہ سے جھوٹ نہیں کہہ رہا اگر یہ اس بار کہیں جانا چاہتی ہے تو ہم پیرس جائیں گے اور خوب گھومیں گے، شاپنگ کریں گے۔“  
”مگر یارا! میرے مذہرم ہونے والے ہیں میں بالکل بھی فری نہیں۔“

”تو نہ ہو فری۔ تمہیں ساتھ لے جانا بھی کون چاہتا ہے۔ مطلب بھی دیکھو ناں ہماری حادیہ انٹر کے امتحانات سے فری جائے گی، لمبی چٹھیاں ہوں گی۔ سرمد یہ میڈم ویسے بھی ہر قسم کی تعلیمی سرگرمی سے فارغ ہیں مطلب ہر وقت چٹھیوں پر ہوتی ہیں اور میں بھی وقت نکال لوں گا تو ہم تینوں جائیں گے اور خوب انجوائے کریں گے۔“

ہمایوں نے سرمد پر نظر ڈالی منجانبے کیوں وہ اس نظر سے گڑی گئی اور تعلیم چھوڑ دینا اسے اپنا جرم لگا۔ سرمد بل بھر کو خود کو بہنوں کی زندگی میں غیر اہم سا لگا۔ لیکن پھر حادیہ کے تھمتاتے چہرے نے اس پر بل بھر کے احساس کی وحدت کو منادیا۔

”او کے پلان تو اچھا ہے۔ لیکن اگر سب ساتھ جاتے تو اچھا تھا۔“  
”بالکل بھیا! میں بھی یہی جانتی ہوں۔ بھلا آپ کے بغیر خاک مزا آئے گا۔ ہے ناں!“ سرمد نے ڈرتے ڈرتے ہمایوں کو دیکھا جس کے چہرے پر اس کی بات پر ناگوار تاثرات ابھرنا شروع ہو گئے تھے۔  
”ٹھیک ہے آپ نہ جائیں اسے بھیا کے بغیر مگر ہم دونوں بہن بھائی تو جائیں گے۔ کیوں حادیہ؟“ ہمایوں بھی ہاتھ صاف کر کے سرمد کے برابر کھڑا حادیہ سے پوچھ رہا تھا۔  
”جی..... مگر ہوئی بھیا، اگر بھیا نہیں جائیں گے تو مزا بھی تو نہیں آئے گا ناں!“ حادیہ سرمد کے شانے سے لگی کہہ رہی تھی۔

”اس کا صاف صاف مطلب تو یہ ہوا ناں کہ میں ہی بے وقوف ہوں کہ تم لوگوں کی محبت میں مرا جارہا ہوتا ہوں۔ کھانا تک گھر میں کھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ہر وقت ہر پل تم تینوں کے ساتھ گزاروں اور تم لوگ پر اپنا کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ ویسے سرمد بھیا یہ ٹور میں اپنی جیب خاص سے کروارہا تھا۔ مگر یہ بھول گیا کہ میں تو غیر ہوں۔ ابھی ہوں۔ تم لوگوں کے بابا کالے بالک ہوں۔“

ہمایوں کو اینٹیک پر کمال حاصل تھا جذبات سے کلیانا سے خوب آتا تھا کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا اس کا بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے اس نے سرمد کے دل پر گرتے آنسو بھی دیکھ لیے تھے سرمد کے چہرے پر نہ امنت بھی محسوس ہوئی تھی۔



”ایسا نہیں ہے بھیا!“ حادیہ آکر اس سے لپٹ گئی۔ وہ تو بہت چھوٹی تھی اسے تو کبھی بھی ہمایوں اور سرد میں فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ اسے تو بہت دیر میں پتا چلا تھا کہ ہمایوں ان کا سکا بھائی نہیں درندہ تو وہ ایک عرصے تک اپنی اور ہمایوں کی اچھی شکل و صورت دیکھ کر تو رگڑا ہی جھکتی تھی۔ سعد یہ یہ سب برداشت نہیں کر سکی اور وہاں سے جانے لگی۔

”سوری! اگر تمہیں ایسا کچھ قیل ہوا ہے تو مگر آخر تم کب اس کمپلیکس سے باہر آؤ گے کہ تم ہم میں سے نہیں۔“

”شاید جب تک زندہ ہوں۔“ ہمایوں نے سڑھیاں چڑھتی سعد یہ کو سنانے کے لیے آواز میں درد پیدا کیا اور تیزی سے — اس کے قریب سے گزرا، اور ناراضی کا تاثر دینا چلا گیا۔



”زارا! تمہیں اپنے ابا کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے وہ پہلے ہی ارمغان کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔“

شمینہ نے چوٹوں کو سہلانا سکھ لیا تھا یا گزرتا وقت ان کی محبت میں اور برداشت میں اضافہ کر گیا تھا۔ اسی لیے وہ اب زارا کو باپ کے سامنے ایسی بات کرنے پر سر دوش کر رہی تھی۔ وہ جو فائل کھولے نوٹس دیکھ رہی تھی۔ ارمغان کے نام پر چونگی اور فائل بند کر کے شمینہ کے سامنے کھڑی ہوئی۔

”ابھی کیا کہا ابی آپ نے کہ ابا پہلے ہی ارمغان کی وجہ سے پریشان ہیں۔ کون ہے یہ ارمغان اور ابا کی پریشانی کا سبب کیوں بن رہا ہے۔ کیا وہ ابا کی زندگی میں ایسی کوئی اہمیت یا حیثیت رکھتا ہے کہ ابا اس کی وجہ سے پریشان ہو جائیں۔“

وہ باقاعدہ وکیلوں کی طرح مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے سوال پر سوال کر رہی تھی شمینہ کی پیشانی پر پسینے آ گیا۔ شمینہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کیا بولتی۔

”ای کی سوچوں میں ہیں۔ بتائیے ناں کون ہے یہ ارمغان۔“

اتنی دیر میں شمینہ کھینچ چکی تھی اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے دیکھتی رہی کتا دل چاہا تھا کہہ دیں کہ ارمغان تمہارا تمہارے جیسا خندی اکھڑ بھائی ہے۔ مگر ابھی اس تعارف کا وقت نہیں آیا تھا۔

”بہلے تم یہ بتاؤ۔ تم ارمغان کے نام پر کیوں چونگی ہو۔ تم کسی ارمغان کو جانتی ہو۔“ نرم ملائم لہجے میں شمینہ پوچھ رہی تھی تو ارمغان کا سر اپا نظروں میں محسوس کیا۔

”ایک نام کئی لوگوں کا ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے امی کہ میرے کلاس فیلو سرد ہے ناں اس کا دوست ارمغان ہے این ای ڈی میں پڑھتا ہے وہ سرد سے ملنے آیا تھا۔ تو اس لیے یہ نام یاد رہ گیا۔“

”خیر چھوڑو، تم نے آج جس طرح اپنے ابا سے بات کی ناں مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ میری پھولوں جیسی بیٹی آگ کیسے اکل سکتی ہے۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو آئندہ تم اپنے ابا کے سامنے کوئی بد تمیزی نہیں کرو گی۔ وعدہ کرو۔“

ماں کے ملائم لہجے میں ڈھلے الفاظ اس کے دل میں اتر گئے اس نے ماں کے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیے۔

”ایسا وعدہ کر لوں آپ سے جیسا آپ نے اپنی برداشت سے کیا ہوا ہے۔ اپنے احساسات سے کیا ہوا ہے۔ اپنے زخموں کے درد سے کیا ہوا ایسا وعدہ کر لوں آپ سے، امی ایسا وعدہ کر لوں خود سے کہ چپ رہنے کا سہہ جانے کا..... نہیں امی! ایسا مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔“ وہ ماں کے سینے سے لگ گئی اور بے شمار آنسو ماں کی ساڑھی



میں جذب ہو گئے۔ اس سے کہیں زیادہ آنسو ماں کے اس کے پاؤں میں جذب ہو گئے۔

”نہ کہو ایسا میری شہزادی۔ وہ جی نہیں پائے گا تمہارے بغیر۔“

اس سوچ کے آئینے میں فہد کی تصویر دھندلا گئی۔

”امی! یہ کسی منیبہ آٹنی کا فون ہے کہہ رہی تھیں آپ کی دوست ہیں آتے آتے کال کٹ گئی۔“ عمارہ ماں کا موبائل لیے اندر آئی تو دونوں ماں بیٹی حواسوں میں آ گئیں۔ منیبہ کے نام پر شہینہ بری طرح چوٹیں چور نظروں سے بیٹیوں کو دیکھا۔

”ہاں ہاں میری دوست ہیں لاؤ میں خود کر لیتی ہوں ان کو کال بیک۔“

شہینہ نے نظریں چراتے ہوئے موبائل لیا اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”کیا بات ہے امی! آج نئے نئے نام ہم سے متعارف نہیں ہو رہے ہیں آج تک تو ہم نے کبھی منیبہ کا نام نہیں سنا اور.....!“

شہینہ چند لمحے زارہ کی بات پر رک کر واقعی آج اچانک ان ناموں کو سنا جا رہا تھا اب وہ زارہ کو کیسے بتاتی کہ جس دن ان ناموں والے رشتوں سے جب تم لوگوں کا تعارف ہوگا تو کیا حال ہوگا تمہارا۔

”وہ دودھ اصل اس روز چیک اپ کے لیے ہاسپٹل گئی تھی وہیں یہ خاتون آئی ہوئی تھیں۔“

”امی ان کو کبھی استھما تھا۔“ عمارہ نے پلٹ کر ماں کو دیکھا۔

”نہیں ان کو تو نہیں ان کے بیٹے کو ہے اسی کو دکھانے لائی تھیں۔“

”امی یہ استھما کا مرض کیوں ہو جاتا ہے۔ مجھے ایسے لوگوں پر بہت ترس آتا ہے۔ جن کو یہ بیماری لاحق ہوتی ہے۔“

”کاش! یہ مرض ہمیں بھی لاحق ہو جائے کہ کسی کو ہم سے محبت نہ سکی ہمدردی ہی ہو جائے۔“ فہد نے اندر آتے ہوئے زارہ کا جملہ سن لیا تھا۔ اور اب سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا اندر آ گیا۔ زارہ نے حسب عادت نخوت سے منہ موڑ لیا۔ عمارہ شوخی سے مسکرائی باہر جانے کے لیے بڑھی۔

”فہد بھائی آپ بھی ناں بہت مستقل مزاج ہیں۔“

”نہیں، مستقل مزاج تو تمہاری آپنی ہے۔ مستقل نفرت کی پٹری پر چل رہی۔ بحال ہے جو ذرا بھی پاؤں محبت کی پٹری پر آئے۔ کیوں خالہ ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ زارہ کو دیکھتا وہ شہینہ کے ساتھ لگ گیا تھا۔

”میرا بیٹا بالکل درست کہہ رہا ہے اور یوں بھی مستقل مزاجی تو محبت کی پہلی شرط ہے اور یہ مستقل مزاجی تمہاری منزل بنے گی ایک دن۔“

”ان شاء اللہ..... ان شاء اللہ۔“ فہد نے باہر نکلتی زارہ کو سنانے کے لیے بلند آواز میں کہا تو وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

”خالہ بھانجا خوش فہمی کی دنیا سے نکل آئیں تو بہت اچھا ہوگا دونوں کے لیے۔“

”امی بھی اس بد دماغ کی باتوں میں آ جاتی ہیں۔“

زارہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھی، میز پر سے اپنی فائل اٹھائی اور باہر نکل گئی۔

”تمہیں بھی یہ ہری مرجع ہی پسند آتی تھی۔“ شہینہ کو دکھ ہوتا جب زارہ، فہد کو نظر انداز کرتی۔

”اچھا، آپ بھی بتائیں ناں، آپ خود اتنی اچھی ہیں، آپ کو سڑیل سے، مکڑوں سے چچا جان میں کیا نظر آیا۔“ فہد نے جوانی حمل کیا۔

”محبت ایک طرف۔ ہم تو ایسے بھی پابند تھے کہ کزن ہی سے شادی کرنی ہے اور یہ روایت نہ جانے کب



سے چلی آ رہی ہے اور.....“  
 ”اور اسی لیے آپ کی بیٹی اب یہ روایت توڑنا چاہ رہی ہے۔“ فہد کا لہجہ اداس شام جیسا ویران ہو گیا تھا۔  
 شمیمہ کا دل مٹھی میں آ گیا۔

”میرا بچہ ایسا نہیں ہے، وہ چاہ کر بھی یہ روایت نہیں توڑ سکتی۔ اسے ابھی تک اپنے باپ کے غصے اور ہٹ دھرمی کا اندازہ نہیں ہوا۔ ان شاء اللہ زار اتہاری ہی دہن بنے گی۔“ شمیمہ نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر ڈولتے یقین کے ساتھ کہا تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا، اس کے قہقہے میں اتنا یقین تھا کہ شمیمہ کی نظریں جھک گئیں۔  
 ”قسم کھائیں، وہ میری ہی دہن بنے گی۔ یا رخالہ! میں اگر زار کو ذرا سا بھی جانتا ہوں ناں تو یہ جان گیا ہوں کہ زار کسی کے رعب میں، کسی کی دھمکی میں آ کر کوئی بات نہیں مان سکتی اور شادی تو..... اپنی دے، آخر کو مستقل مزاج عاشق ہوں، تادم آخر کوشش جاری رکھوں گا۔“ فہد کا شونہ لہجہ بھیک گیا تو وہ پھر مسکرانے لگا۔  
 جاتے جاتے پھر پلٹا۔

”وہ ایک بات ہے خالہ! اگر میں اس کا کزن نہ ہوتا کوئی یونیورسٹی فیلو یا کوئی غیر اجنبی ہوتا تو..... تو وہ یقیناً مجھ پر مرتقی، جیسے کہ دوسری لڑکیاں..... ہے ناں خالہ!“

وہ اپنی ناکام محبت اور بے تعبیر خوابوں کا سارا درد اپنی بیمار خالہ کے دل میں اتار کر چلا جاتا اور وہ پہرہوں اس کی محبت کا سوگ منائیں اور اس وقت وہ جانے کب تک فہد کی محبت اور اپنی بیٹی کی بے حسی کا ماتم کرتیں کہ شمیمہ کی پھر کال آ گئی۔

”السلام علیکم! کیسی ہو منیبہ؟“  
 ”وعلیکم السلام شمیمہ! تم سناؤ، تم کیسی ہو؟ تمہارے میاں کل یہاں خوب گرج کر گئے ہیں۔“ منیبہ کا لہجہ قدرے شونہ تھا۔

”اور برس ادھر گئے۔“ شمیمہ بھی دھڑکے سے مسکرائیں۔

”کیا مطلب؟ تم پر ہاتھ تو نہیں اٹھا یا موصوف نے حسب عادت۔“  
 ”چھوڑو ناں، اب تو عادت ہی ہو چکی ہے مار سہنے کی۔ اچھا اب صورت حال خاصی گھیر ہوتی جا رہی ہے۔ ادھر زار اور ادھر ارمان کو کسی نہ کسی طرح نئے رشتوں کے لیے تیار کرنا ہے اور سنو! داؤد کو ضرور بیچ دینا۔“  
 ”نہیں شمیمہ! ساجد صاحب نے وہ باتیں، سمجھوائے کر قوت..... تم پر مار پیٹ کے سارے واقعات خود اپنی زبان سے بیان کر دے ہیں کہ داؤد الجھ کر رہ گیا ہے۔ کہہ رہا تھا اب میں دادا ہاؤس نہیں جاؤں گا اور شمیمہ امی اپنی اچھی ہیں ابو نے ان کو کیوں مارا۔“

”اف میرے اللہ! یہ ساجد بھی ناں کیا ضرورت تھی، بچوں کے سامنے اپنے مظالم کی نقاب کشائی کرنے کی۔ داؤد میرا بچہ کتنا ہرٹ ہو گیا ہوگا۔ کتنا شوق تھا اسے یہاں آنے کا۔“ شمیمہ کو بہت دکھ ہوا تھا یہ بات سن کر۔  
 ”کیا کریں بھئی، ہماری قسمت میں ایسا ہی شوہر لکھا تھا۔“

”دیکھو بھئی منیبہ! میرے شوہر کو کچھ مت کہنا، ہاں اپنے شوہر کو جو چاہو کہو اور سنو! اب ہمیں ہمت ہار کر نہیں بیٹھ جانا۔ میں اور آپا تم سب کو اس گھر میں لا کر رہیں گے۔ میرا داؤد، میرا بیٹا ضرور یہاں آئے گا۔“  
 رشتے کے اعتبار سے دونوں خواتین سو کُن تھیں مگر کچھ داری نے دونوں کو دوستی کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔

☆☆☆

”کوئی ضرورت نہیں انجینئرنگ میں ایڈمیشن لینے کی۔ پڑھتی پڑھاتی ہیں نہیں، درمیان میں شادی ہو گئی تو چھوڑ چھاؤں کر چلی جائیں گی۔ بلا وجہ کی سیٹ ضائع کر دینی۔“



ثانیہ نے پری انجینئرنگ میں بہت اچھی پرنسٹنچ حاصل کی تھی اور اب انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن چاہ رہی تھی تو سعد جو سرے سے لڑکیوں کی زیادہ تعلیم ہی کے حق میں نہیں تھا۔ کچا انجینئرنگ یا خالی خولی ایم اے وغیرہ کے تو قطعی حق میں نہیں۔ ہاں اگر میڈیکل ہو تا تو وہ اجازت دے دیتا مگر اب ہر کوئی ڈاکٹر تو نہیں بن سکتا تھا اور ثانیہ کو بھی شروع ہی سے انجینئرنگ پڑھنے کا شوق تھا اور یہ ہی شوق اس کی کامیابی کا سبب بنا۔ اب جب کہ وہ اپنی منزل حاصل کرنے کے قریب تھی تو سعد بھائی نے منع کر دیا جب کہ اور کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا، وہ منہ بسورنی باہر نکل گئی۔ کوریڈور میں سارہ اور زارا راہ لگیں۔

”کیا ہوا؟“ دونوں نے ایک ساتھ پوچھا تو وہ زارا کے گلے لگ گئی۔

”سعد بھائی نے انجینئرنگ پڑھنے سے منع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں بے کار ہے لڑکیوں کے لیے یہ۔“  
 ”ویسے ثانیہ! تمہارے بھیا کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں۔ کئی ہی لڑکیاں پہلے ایڈمیشن لیتی ہیں پھر درمیان میں چھوڑ دیتی ہیں۔ اس سے کسی حق دار کا نقصان ہوتا ہے۔“  
 ”دیکھ رہی ہوں نا زارا! ہماری بھابی کس طرح اپنے ہونے والے میاں کی غلط بات کو ڈیفینڈ کر رہی ہیں۔“

”کیا کریں، غلامی کا طوق ہمارا مقدر جو ٹھہرا۔“

”آپ ہی کو مبارک ہو غلامی کا یہ طوق آیا! ثانیہ تم میرے ساتھ آؤ۔“ زارا، ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر لان میں آ گئی۔

”تم بھی کچھ صبر کرو۔ میرا کلاس فیلو ہے ناں سرمد، ہمارا گروپ کیپٹن بھی ہے۔ میں اس سے کہوں گی کہ وہ تمام معلومات رکھے، جیسے ہی ایڈمیشن اوپن ہوں وہ ہمیں بتا دے۔“  
 ”زارا! مسئلہ معلومات کا نہیں، پرمیشن کا ہے۔ جب پرمیشن ہی نہ ملے گی تو معلومات کا کیا کرنا۔“  
 ”تمہیں اجازت چاہیے ناں، چلو یہ میری ذمہ داری ہے۔“

☆☆☆

ساری رات سعد نے ہمایوں کی ناراضی کے انگاروں پر گزری تھی۔ ایک ہمایوں کی توجہ کا دیا ہی تو تھا جو اس کے افسردہ اور مردہ دل میں روشن تھا اور یہ روشنی ہی اس کی زندگی کے لیے ضروری تھی اور وہی ناراض تھا اور ناراضی بھی اسی کی وجہ سے تھی۔

”ہمایوں کب تک ناراض رہیے گا، سوری۔“  
 وہ با مشکل چلتی ہوئی نیچے آئی۔ ہمایوں تیار ہو کر آفس جا رہا تھا۔ حادثہ اور سرمد یونیورسٹی جا چکے تھے۔ ہمایوں جان بوجھ کر لیٹ ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ محبت کی ماری سعد یہ ضرور آئے گی، منائے گی اور وہی ہوا جو اس نے سوچا تھا تو وہ ناشتے کے لیے میز پر بیٹھا درودہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔ وہ اس خوب رو سے انسان کو دیکھتی رہی اور وہ اپنی اہمیت کا بھانڈا بڑھانے ناشتا کرتا رہا۔

”ناراض نہ ہوں ہمایوں! ڈانٹ لیں، کچھ بھی کہہ لیں مگر ناراض نہ ہوں۔“  
 ”کیوں؟ اب ناراض ہونے کا حق بھی چھین لینا چاہتی ہو۔ تو ٹھیک ہے، نہیں ہوتا اور یوں بھی مجھے ایسا کوئی حق ہونا بھی نہیں چاہیے۔ آخر میری حیثیت ہی کیا ہے اس گھر میں۔ ایک لے پالک ہوں، تمہارے باپ بھائی کے بڑے کس کا کینٹر ٹکر ہوں۔ دوسرے الفاظ میں ملازم ہوں اور ملازم کی بھی کوئی حیثیت ہوتی ہے۔“  
 وہ زہر خند لہجے میں زہر میں بجھے تیر۔ دل کے آپار کرتا رہا، وہ کھنکھاتی۔

”ایسا نہ کہیں ہمایوں! آ..... آ..... آپ ہماری زندگی میں اپنی اہمیت کو نہیں جانتے۔ آپ میرا سب کچھ



ہیں۔ پلیز، آپ خفا نہ ہوں۔ میں..... میں آپ کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کو میری بات بری لگی ہے ناں تو..... تو میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ لیجئے اپنے ہاتھوں سے میرا گلادبا دیجیے، مجال ہے جو چوں کر جاؤں۔ آپ کی ناراضی لائق کا کرب، برداشت کرنے سے کہیں بہتر ہے آپ کے ہاتھوں مر جاؤں۔ پلیز ہمایوں دبا لے ناں میرا گلاد۔“

محبت کی ماری سحد نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھیں بند اور ہاتھ گلے پر رکھے۔ آنکھوں سے بہتا ساون سحدیہ کا چہرہ تر کر رہا تھا۔ ہمایوں مکاری سے مسکراتا ہوا سے دیکھتا رہا۔  
”تمہارا گلاد کیسے دبا سکتا ہوں لڑکی! تم تو میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔ تم تو وہ کارڈ ہو جس سے میں تمہارے باپ بھائی کے تمام بزنس پر قبضہ کر سکتا ہوں۔ تمہاری موت نہیں، تمہاری زندگی میرے لیے زیادہ فائدہ مند ہے۔“

وہ اپنی آلودہ سوچوں میں گم تھا اور وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ محبت میں کوئی قدم نہیں اٹھا رہا۔  
”ہمایوں پلیز، مارڈ الیس مجھے۔ میں آپ کے ہاتھوں مرنا اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی، پلیز۔“  
”پاکل ہوگی ہو سحدیہ! کچھ اندازہ ہے تم مجھ سے کیا کروانا چاہ رہی ہوں۔ ارے الحق لڑکی! میں تمہیں مار دوں، ارے تم تو میری زندگی ہو، میری جان ہو۔ تمہیں مار دوں، مطلب خودکشی کر لوں۔“  
”سچ کہیں ہمایوں! کیا..... کیا میں آپ کے لیے اتنی اہم ہوں کہ.....“

”اہم..... ارے پاکل لڑکی! تم ہی میری زندگی ہو۔ میرا سرمایہ حیات ہو۔ میں تم سے کیسے خفا ہو سکتا ہوں۔“ ہمایوں نے اس کے آنسو صاف کیے تو وہ شدت جذبات سے اس کے شانے پر سر رکھ کر شدت سے رو پڑی اور اس باریہ آنسو خوشی کے تھے۔  
”تو آپ ناراض نہیں ہیں ناں۔“ وہ یقین دہانی کے لیے پوچھ رہی تھی۔  
”قطعی نہیں۔“

”تھینک یو سوچ۔“ سحدیہ خوشی سے پاکل سی ہو گئی اور اسی پاکل پن کر تو وہ کیش کرانا چاہتا تھا۔  
”اجھا اب تو میرے ساتھ نہیں جانے سے انکار تو نہیں کرو گی۔ اپنے بھیا کو ساتھ لے جانے کی شرط نہیں رکھو گی۔ آخر تمہیں شادی ہو کر بھی تو میرے ہی ساتھ جانا ہے ناں۔ اب میں نیگم کے ساتھ سالے صاحب کو تو برداشت نہیں کروں گا۔“ وہ اسی طرح اسے مستقبل کے حسین خواب دکھاتا رہا اور وہ کھوی گئی۔

☆☆☆

”کیا بات ہے سرمد! آج تم کچھ اچھے اچھے سے ہو۔“  
یہ بات زارا نے بھی محسوس کی تھی مگر چونکہ سرمد کی انجمن اسے کچھ ذاتی لگی اس لیے اس نے کہا نہیں لیکن حتماً تو اگلے کے گھر تک پہنچ جایا کرتی تھی اور یہ تو سرمد تھا، سہیلیوں جیسا دوست ہمدرد۔

”ہوں..... ہاں کچھ ایسا ہی، خیر میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، اب ان شاء اللہ سنڈے کو ملے ہیں۔“ سرمد تیزی میں اپنا بیک کھول کر فائلیں اندر رکھ کر پلٹا۔

”کیا مطلب، تم دوبارہ یونیورسٹی نہیں آرہے ہو۔ میں سوچ رہی تھی سارے ہفتے کے لیکچررز کو ڈسکس کر لیتے۔“ انٹرویو کا سوال نامہ تیار کر لیتے۔ “سرمد زارا کی طرف پلٹا۔

”سوری زارا!! آج کچھ کام ہے۔ کل ہفتہ ہے اگر تم چاہو تو ہم کل آ سکتے ہیں یونیورسٹی مگر آج۔“ سرمد نے ایک نظر زارا پر ڈالی۔ زارا کچھ کہے اور وہ ٹالے لیا تو اس نے سوچا بھی نہیں مگر آج اسے ہر صورت جانا تھا۔  
”نہیں سرمد! ایسا بھی ضروری نہیں۔ ایسا کروں گی، میں اپنے طور پر سوال نامہ تیار کر لوں گی پھر تینوں مل کر



فائل کر لیں گے اس وقت تمہیں جلدی ہے جاؤ۔“

”اوکے۔ اللہ حافظ۔“ سرمد جا چکا تھا۔

”لگتا ہے کچھ زیادہ ہی خاص کام ہے ورنہ وہ تمہاری بات تو ٹال ہی نہیں سکتا۔ ویسے زارا مجھے دال میں کچھ کالا کالا لگتا ہے اور جو مجھے لگ رہا ہے تمہارے منگیتر فہد صاحب کو یہ کالا کالا نظر آ گیا تو..... اس کلوی خیر نہیں۔“

”جو کمات اور یہ جو تمہاری عادت ہے نا لوگوں کی آنکھوں میں جھانک جھانک کر کالا یا گورا موتیا تلاش کرنے کی، چھوڑ دو اس عادت کو۔ ورنہ میں تمہارے منگیتر کو بتا دوں گی۔“ زارا نے فائل حنا کے سر پر ماری جو بنے جا رہی تھی۔

”اچھا جی، منگیتر کی دھمکی دی۔ تم منگیتر پر اترا آئیں۔ خیر چلو، کہنے چلتے ہیں۔ کچھ کھاپی کر نکلتے ہیں۔ اب تو اور کوئی کلاس بھی نہیں، مگر چلتے ہیں۔“ حنا بھی بیک لپکا کر سیمینار سے نکلی۔

”تمہیں بچوں کی طرح کھر جانے کی پڑی ہوئی ہے۔ بیٹھو آرام سے، کھاپی کر لائبریری جائیں گے، مجھے ایک بک ایڈیٹر کو دانی ہے۔“

”اف..... ایک تو بس یہ تمہارا اس کتابی عشق۔ چلو ناں پلیز۔ آج آپا کے رشتے کے لیے مہمان آنے والے ہیں، امی اسکی ہیں۔ ان کی کچھ مہلیب ہو جائے گی۔“

”بہنیز۔ یوں کہو ناں کہ آج بے کار مچی کا رآمد ہونے والی ہے۔ چلو۔“

”فہد کو کال تو کرو۔“

”فکھٹی نہیں۔ پڑھنے دوا سے، ہم واک کر کے مین روڈ تک جائیں گے، کب سے گھر جائیں گے۔ اب ہم بڑے ہو گئے، کاکیاں نہیں ہیں کہ مرد کے سہارے کے بغیر کچھ بھی نہ کر سکیں۔“

”تمہاری یہ آزادیاں، یہ باغی پن ماری نہ ڈالے اس بے چارے کو۔ چلو۔“ پھر دونوں مین روڈ پر آئیں، اسی دوران زارا کے موبائل پر فہد کی کال آ گئی۔

”اس کو کہتے ہیں سچی محبت۔ دیکھ لو، اسے پتا لگ گیا کہ ہونے والی بیگم فرار ہو رہی ہیں۔“ حنا سے چھیڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔

”کیا ہے، سکون سے پڑھا نہیں جاتا تم سے، ہر وقت ٹوہ میں رہتے ہو۔“ زارا کاٹ کھانے کو دوڑی۔ حنا نے گھورا۔

”آج تمہاری اور کوئی کلاس نہیں زارا! تم لوگ میرا انتظار کرو، لیب میں تمہوڑا کام ہے۔ آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔ تم لوگ کہیں بھی بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔“

”ہم تمہارے انتظار کرنے کے پابند نہیں۔ ہم جارہے ہیں کب سے۔“

”زارا! ہرگز نہیں، میں..... میں ایسی آ جاتا ہوں۔“ فہد بے قرار ہو گیا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ دھیان دو بڑھانی پر۔ حنا کو ضروری کام ہے گھر پر، ہم جارہے ہیں اور جب تک تم اپنا حرج کر کے آؤ گے، ہم جا چکے ہوں گے، بائے۔“ اور زارا نے اس کی بات مزید سے بغیر فون بند کر دیا۔

”یار زارا! تم کتنی کیسی ہو۔“ حنا، فہد کا پکاوٹ تھی۔

”پتا نہیں، کبھی گنا نہیں۔ دیکھا پھر آ گیا فون، چین نہیں ہے اس انسان کو۔“

فہد کی دوبارہ کال پر زارا فون ریسیو کرنے لگی، اسی وقت دو کم عمر لڑکے بائیک پر آئے اور اس کا موبائل چین کر بھاگنے لگے تو بائیک نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ بھاگے تو سانسے سے آتے ارمغان نے ایک زور کا مکا لڑکے کے منہ پر مارا، خون بہنے لگا۔



”ابے تیری تو، تیری کیا لگتی ہے یہ۔“ بدتمیز لڑکا منہ پر ہاتھ رکھے بولا۔  
”بہن۔“

☆☆☆

”دیکھیے امی جان! ہم سب جانتے ہیں کہ زیر کا ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ دینا کوئی معمولی دکھ نہیں مگر جب آپ ایسے کرنی ہیں تو دوسرے لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔“  
”یہ بات، ہم بھی ان کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے، مزید یہی کہ اس ناخلف کے پیچھے ہم اپنے فرماں بردار بچوں کا دل کیوں دکھائیں۔ مگر یہ بھتیس ہی نہیں۔“ سلیم صاحب نے جیسے باپوی سے شگفتہ گود لکھا۔  
”ابا جان! آپ ہی ایسا کچھ کریں کہ امی جان پھر زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔“  
”اگر یہ سعادت ہمیں ہی حاصل ہو رہی تو ہم عقد ثانی کے لیے تیار ہیں۔ بھی باندھ دیجیے ہمارے سر پر سہرا اور کسی مناسب خاتون کو ہماری دلہن بنالایے۔ کوئی اعتراض نہیں ہمیں۔“  
سلیم صاحب کو اپنی شرارت کے مطلوبہ نتائج حاصل ہو گئے۔ شگفتہ خاتون بری طرح بھڑک اٹھیں۔ ”کمزور نہیں ہوئی کہ کوئی قدم نہ اٹھا سکوں، اس مناسب خاتون کی ناگئیں رکھوں کی چولے میں اور سر رکھوں گی کوئی میں اور اس کا کچرا اور بیجا بھون کر کھلاؤں گی آپ کو۔ بجائے یہ کہتے کہ چلو گھر میں کوئی رونق میلا لگاتے ہیں۔ بچوں میں سے کسی کی منگنی یا ویاہ کا کھڑاک کرتے ہیں، اپنا عقد ثانی کرنے چل پڑے بڑے میاں۔“

ایک عرصے بعد شگفتہ اپنے مخصوص انداز میں لوٹی تھیں، سلیم صاحب بھی مدت کے بعد اتانے تھے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”میری پیاری امی جان! ابا جان کی اس شرارت کا مقصد بھی یہ تھا کہ آپ کوئی کھڑاک کریں۔“ مزید ماں سے لپٹ گئی، بیٹے اور بہو میں بھی خوش تھے مگر گلشن جہاں سلگ اٹھیں۔

”دیکھ رہے ہیں آپ۔ بڑے میاں کے چوخیال اور بڑھیا کی باتیں۔ کس طرح ایک دوسرے پر فدا ہیں ایک آپ ہیں کہ ہر وقت ہمیں گھورا کرتے ہیں۔“ گلشن جہاں حسب عادت اس خوش گووار ماحول سے جل گئی تھیں۔

”جلنا آپ کی فطرت ہے۔ جلا کریں آپ۔ یوں بھی ہماری اماں جان اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”ہونہ، آپ کی اماں جان آپ کی بہنیں ہی اچھی ہیں، باقی سب تو گویا کچرا ہے۔“

”اب آپ نے اپنی تعریف خود کر دی ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔“

”آپ کچھ بھی کر لیجیے، غیر صاحب! ہم آپ کی آبا جان کا راج یہاں چلنے نہیں دیں گے۔ یہ ہمارا گھر ہے، یہاں ہمارا علم چلے گا۔ ہمارے فیصلوں پر عمل ہوگا۔“

”آپ حد ادب کراس کر رہی ہیں خاتون۔ آبا جان ہماری بڑی اور بڑے درجے اور مرتبے پر ہیں اور آپ سب سے چھوٹے درجے پر ہیں اور آبا جان کے آنے سے اماں جان کی طبیعت کتنی بحال ہوئی ہے۔ سچے خوش ہیں اور۔۔۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ جالاک سوچ کی مالک گلشن کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا بھلا ان کے پاس چالوں کا کال پڑ گیا تھا کہ وہ مسلم کھانہ کی مخالفت کر کے خود کو برا بناتیں۔

☆☆☆



عقد ثانی کا سلیم صاحب کا مذاق گھر کے بچوں کے عقد اول کا موجب بن گیا۔ بچے کیا سوچ رہے تھے، کسی کا دل کسی کے لیے دھڑک رہا تھا۔ بے خبر بڑوں نے شفق اور روحیل کا رشتہ کر دیا۔ تجیل اور ثناء کا رشتہ کر کے جلدی شادی کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا تو..... متعلقہ لوگوں کو ترپے ہی تھے، وہاں والدین بھی دھک سے رہ گئے۔ گلشن کو اپنی بڑی بیٹی شفیق جتنی پیاری اور عزیز تھی، اتنا ہی روحیل ان کے ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں سب سے اوپر تھا۔

”ہمیں یہ رشتہ قبول نہیں۔“ انہوں نے کمرے میں آتے ہی احتجاج کیا تو بیٹی کی چاہت اور بیگم کے حد سے بے نیاز غفیر صاحب نے انتہائی اطمینان سے چشمہ لگایا۔

”بیہ آپ کے ایجاب و قبول کا موقع نہیں۔ آپ کی صاحبزادی کا ہے۔“

”جی اسی لیے ہم آپ کو بتا رہے ہیں، حق کو ردیل قطعی پسند نہیں۔“

”گلشن! ہم جانتے ہیں کہ آپ کی اور نفیسہ بھابھی کی نہیں بنتی اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس میں بھابھی بھی برابر کی شریک ہیں مگر۔“

”آپ یہ سب تو جانتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ہم نے اپنی شفق کے لیے کسی کو پسند کر رکھا ہے۔“ گلشن جہاں نے ایک اور چال چلی۔

”گلشن خاتون! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے، ہمیں آپ کے بھیا کے وہ ٹوٹے پھوٹے صاحبزادے قطعی پسند نہیں۔“ غفیر صاحب چشمہ اتار کر پیش میں آ گئے۔

”ہونہ! شوکت میاں تو کیا آپ کو ہمارے تمام میکے والے ناپسند ہیں۔“

”اسی قابل ہیں، میکا ہے کہ کبوتر خانہ۔ ایک وقت کا کھانا میسر نہیں۔ محنت ملازمت کرنی نہیں اور نوابی ٹھاٹھ چھوڑنے نہیں۔“

”اگر آپ کو ہمارے میکے والوں کی برائیوں سے فرصت مل جائے تو ہم کو بتائیں، ہمیں اسی گھر کا لڑکا پسند ہے شفق کے لیے۔“

”کون؟“ لئے ہوئی غفیر صاحب ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”غزین۔“ گلشن جہاں نے بہت سوچ کر تیر پھینکا۔

”غزین۔“ غزین غفیر صاحب کو تو کیا سب کو پسند تھا مگر گلشن جہاں اس کا نام لیں گی، یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

”ہاں غزین..... اس میں اتنا حیران ہونے والی بات کیا ہے۔ غزین اگر آپ کی نظر میں شہزادہ ہے تو ہماری شفق میں کیا کمی ہے۔ اس گھر کی سب لڑکیوں سے زیادہ حسین، یلغہ شعار ہیں۔ فرماں بردار ہیں اور کسی کو کیا چاہے ہمیں تو بس اس گھر میں ایک غزین ہی اپنی شفق کے قابل نظر آتا ہے کیوں آپ کو پسند نہیں غزین میاں یا ہماری شفق ان کے قابل نہیں۔“

”فضول مت بولیں۔ ہم صرف یہ سوچ رہے ہیں کہ غزین.....“ غفیر صاحب الجھ کر رہ گئے تھے۔

”سن لیجئے غفیر صاحب! اگر آپا جان نے غزین اور شفق کا رشتہ نہ کیا تو ہم بھی ایسا وبال کھڑا کریں گے کہ سب کو ہتھ اچل جائے گا کہ ہم بھی کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ہم آپا جان سے غزین کے بارے میں بات کریں گے۔ اگر وہ تیار ہو گئیں تو ٹھیک ورنہ جو فیصلہ بڑوں نے کرو یا سو کر دیا۔ ہمیں روحیل میاں میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔“

”آپ کی آپا جان کی ایسی کمی تھی۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ ہماری بیٹیوں کے رشتے ہماری مرضی کے خلاف



کیسے ہوتے ہیں۔“ گلشن جہاں نے موٹے شیشوں کی عینک سے شوہر کو گھورا۔  
 پھر بات گلشن کے کمرے سے نکل کر میزہ تک پہنچ گئی۔  
 ”نہیں۔ قطعی نہیں۔ گلشن خاتون اور غیر میاں شفیق اور عزیزین کا رشتہ ممکن نہیں۔“

☆☆☆

”فرجاد! ٹی ایس کافی ہاؤس کی مالک ہے، وہ جو چاہے کرے۔ تمہیں اسے روکنے کا، اس کے فریڈز کے سامنے اس کی بے عزتی کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔“ روبیکا، رابی کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، وہ بری طرح ٹی کو گھور رہا تھا۔

ندیم اپنی گواہی دے کر چاچا کا تھا۔ فرجاد نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بیٹی کے ساتھ ساتھ ماں کو بھی دو چار پتھر لگا دے اور کہے کہ یہ ایک مسلمان لڑکی کے اطوار ہیں۔ نہ مذہب کی خبر، نہ قومیت کی پہچان۔ مگر کیا کر تا وہ ہر طرح سے بے بس تھا۔ خاموشی ہی اس کی پناہ گاہ تھی۔

”میڈم! آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں مگر چونکہ میں آن ڈیوٹی ہوں، اپنے سامنے، میں اپنے مالک کا نقصان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“ فرجاد نے کن انھیوں سے ٹی کو دیکھا، غصے سے اس کی سانس اور ناگ دونوں پھولی ہوئی تھیں۔

”ڈیڈ! اس اسٹوپڈ شخص کو نکال باہر کریں، ورنہ میں اس کو مار دوں گی۔ آئی ڈونٹ وائٹ ٹوسی.....“  
 ”ٹی! شٹ اپ! پورا ماؤتھ، میں اگر خاموش ہوں تو اس لیے نہیں کہ میں فرجاد کو غلط اور تمہیں درست سمجھ رہا ہوں۔ فرجاد میاں! تم نے آج جو کیا اس سے میرے دل میں تمہاری عزت بڑھ گئی ہے اور ٹی! تم اور تمہارا وہ گدھا فریڈ اگر مجھے نظر آتے تو میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔“ رابی ٹی پر دھاڑا تو روبیکا چلا اٹھی۔

”رابی! ہوش میں آؤ، میں تمہیں ایک معمولی ملازم کی وجہ سے اپنی بیٹی اور اس کے دوستوں کے خلاف بولنے کا حق نہیں دے سکتی۔ مسٹر فرجاد! تم جتنی جلد ہوا پتا کہیں اور ٹھکانا کر لو۔“  
 اس وقت روبیکا کو جتنا غصہ آ رہا تھا، وہ اس نے اس جیلے میں تو رابی نے شدید غصے میں سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئی ٹی اور روبیکا کو دھکا دے کر آفس سے نکال دیا اور خود جھک گیا۔  
 ”سر!“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

### کچن اور آپ

اس ماہ صبا شریف کو ”کچن اور آپ“ میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی جانب سے صبا شریف کو تین ماہ کے لیے ”ماہنامہ کرن“ مفت دیا جا رہا ہے



فروغ

کیرتھو

# مرحمت و احسان



\*MME-2



☆☆☆

وہ صادقہ کی دوست تھیں۔ صادقہ دوسرے شہر  
جیسا تھیں روز روز نہیں آسکتی تھیں۔ اس لیے سفینہ  
کے گھر کی دلیز پکڑ لی۔ سفینہ طلاق یافتہ تھیں۔ جب  
فرید علی کا رشتہ ان کے لیے آیا۔ وہ ایک چودہ سالہ  
جوان ہوئی بیٹی کے باپ تھے۔ وہ اچھے شوہر تھے۔ مگر  
اس سے بھی زیادہ اچھے باپ تھے۔ وہ سادہ انسان  
تھے۔ چاہتے تھے کہ وہ ان کی بیٹی کی ماں بن کے  
رہیں مگر مینا فرید کیا جانتی تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔  
سجیدہ سی سفینہ اسے ایک آنکھ نہیں بھائی تھیں۔ وہ کم  
روسی تھیں۔ گندی رنگت، بوٹا سادہ، قدرے فربہ  
مائل جسم، پہننے، اوڑھنے میں سادگی کا عنصر۔ بھلا اتنی  
عام صورت عورت مینا فرید جیسی گلابیاں چھلکانی  
رنگت اور تارے سے قد والی، طرح داری لڑکی کی ماں  
کہلانے کے قابل کب۔

پہلے پھل سفینہ نے مینا کے دل میں جگہ بنانے  
کی سر توڑ کوشش کی مگر ہر بار دھکاردی جاتیں۔ وہ کم  
رو تھیں مگر ذہین تھیں۔ فرید صاحب نے ایک دوبار  
اس کا برابر دیکھ کے مینا کو سمجھانا جا بجا مگر سفینہ نے  
منع کر دیا۔ وہ معاملے کو اپنے انداز میں حل کرنا  
چاہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں۔ مینا ہر وہ کام کرے گی  
جس سے وہ اسے منع کریں گی۔ اپنی ماں کے خلاف  
کوئی بھی بات سننا اس کے لیے محال تھا۔ وہ پیار سے  
نہیں سمجھتی تھی۔ سفینہ نے پیار سے سمجھانا چھوڑ دیا۔ وہ  
آہستہ، آہستہ سمجھ گئی تھیں۔ اسے کیسے سنبھالنا ہے۔

ان کی سلیقہ شعاری کا گواہ فرید صاحب کا پورا  
خاندان تھا۔ کئی تو منہ پہ کہہ دیتے جن میں فرید کی  
بہن صادقہ بھی تھیں۔ جنہوں نے اپنی طلاق یافتہ  
سہیلی سفینہ کی شادی فرید سے کروائی تھی۔

”جیسی فرید تمہاری توقست محل گئی۔ کیسی سلیقہ  
مند بیوی ملی ہے کہ تمہارے گھر کو، بیٹی کو اتنے اچھے  
انداز میں سنبھال لیا۔“ جہاں فرید صاحب اور سفینہ  
بیگم مسکرا دیتے۔ وہاں پاس بیٹھی مینا ہنکارا بھر کے اٹھ  
جانی۔

”تم نہایت ہی بد سلیقہ اور پھوہڑ ہو ہر وقت  
رسالے ہاتھ میں لیے بستر توڑتی رہتی ہو تمہاری ماں  
بھی ایسی ہی تھی۔ سنا ہے بیٹیوں پہ ماؤں کا اثر ہوتا  
ہے۔“

حسب معمول وہ کمرے میں آتے ہی شروع  
ہو چکی تھیں۔ بیڈ پہ نیم دراز کہانی کے انتہائی اہم موڑ  
پہ پہنچی۔ منائل عرف مینا بھناٹھی۔ رسالہ پتخ کر سیدھی  
ہو چکی۔

”میری ماں تو بے چاری تب ہی مر گئی تھی جب  
میں چودہ سال کی تھی۔ میری تربیت تو آپ نے کی  
ہے اور واقعی میں بہت بد سلیقہ اور پھوہڑ ہوں۔ مگر  
آپ سے کم۔ جائیں اب مجھے تنگ مت کریں۔“  
اداس لہجے میں بات کرتے آخر میں تو بین  
آئینہ لہجے میں جواب دے کے اس نے رسالہ اٹھا لیا  
تو سفینہ بیگم اور تب اٹھیں۔ اس کے بیڈ پہ بکھرے  
ہوئے رسالے پتخ پتخ کر میز پہ رکھتے ہوئے دانت  
پیس کر بولیں۔

”یقین جانو مینا! بی بی اگر تجھ جیسی بد زبان  
میری بیٹی ہوتی تو انگلیں توڑ کے سیدھا کر دیتی اس  
کو۔ تمہارے لیے تو جتنا کر لوں تم پرانی اولاد ہی رہو  
گی۔ میری بیٹی ہوتی تو احساس کرنی بخاری حالت  
میں مجھے کچن میں نہ کھڑے ہونے دیتی۔ کم سے کم  
کھانا ہی بنا لیتی۔ مگر نہ جی۔ تو تم ہوسا رہی کی بیٹی، بد  
سلیقہ اور بد زبان۔“ اسے کن انکلیوں سے دیکھتے وہ  
اب بیڈ کی چادر ٹھیک کر رہی تھیں۔ وہ آگ بگولا ہوتی  
پاؤں میں جھپٹ اڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ بالکل مت سمجھنا آپ کہ مجھے آپ پر ترس  
آ گیا ہے۔ ابا تنگھے ہوئے آنے والے ہیں، اس  
لیے کوئی تماشا نہیں چاہتی میں۔“ وہ انگلی اٹھا کے  
جتاتے ہوئے پیر پختی کچن کی طرف چل دی۔

”بھال ہے یہ عورت کبھی سیدی بات کرے  
مجھے ذلیل کرنا تو جیسے مشغلہ ہے ان کا۔“ اس کی بلند  
بزدل اہٹ عروج پہ تھی سفینہ خاتون بیڈ پہ بیٹھ کے  
مسکرانے لگیں۔



”اوندہہ سلیقہ مند۔“ منہ بگاڑ کے نقل اتارتے ہوئے وہ کمرے میں چلی آتی۔

”پھوپھو کو تو میری ماں میں ہی برائیاں نظر آتی ہیں۔ وہ چھوٹی تھیں، لاڈلی تھیں، اکلوتی تھیں، کیا ہوا جو انہیں کچھ بنانا نہیں آتا تھا۔ شکل تو خوب صورت تھی۔“

☆☆☆

آگ اگلے سورج کی گرم ترین شعاعیں آج کسی ہنٹر کی طرح زمین پر اور زمین والوں پہ برس رہی تھیں۔ وہ صبح ہی لاہور ایئر پورٹ پہنچا تھا۔ سورج آسمان کے وسط میں پہنچ چکا تھا جب وہ مطلوبہ محلے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے ماموں کے گھر آیا تھا۔ ایک مدت کے بعد اپنی ماں سے ملنے۔ اک وہ ماں تھی۔ جس کے پاس سے وہ آیا تھا۔ اک یہ ماں تھی۔ جس سے ملنے کی لگن اسے آسٹریلیا سے بچ لائی تھی۔ گو زریں بیگم نے اسے کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی ہمیشہ اپنی اولاد کا سایہ پار دیا

اسے کبھی سویتلا نہیں سمجھا۔ مگر اس سے کبھی یہ بھی نہیں چسپایا کہ وہ اس کی سگی ماں نہیں ہیں۔ اور بہن بھائیوں کو تو تھا ہی وہ، جان سے پیارا۔ اور وہ بھی تو ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ بھی تو دیکھنے آیا تھا کہ اگر صرف بالنے والی ماں تھی کا چھالا پنا کے رکھ سکتی ہے تو پیدا کرنے والی ماں کیسی محبت کرتی ہوگی۔

”چچا از اہد صاحب کا گھر کہاں ہے؟“ سڑک کے ساتھ ہی تنگ سی گلی کے چوڑے پہ بیٹھے بڑے میاں سے پوچھا۔ تو انہوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے راستہ بتایا۔ دو گلیاں پہلا ٹکڑا ایک کشادہ گلی میں داخل ہوا۔ پسینے سے شرابور بیک ایک کندھے سے دوسرے کندھے پہ منتقل کرتا وہ مطلوبہ گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دروازے پر دستک دی اور گھر کا جائزہ لینے لگا۔ پلستر اتری دیواروں میں سبز رنگ کا زنگ آلود دروازہ لگا تھا۔ جو کینوں کی خستہ حالی کا اعلان کر رہا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا دھوپ

سیدھی پڑ رہی تھی۔ اس نے جھنجھلا کے دوبارہ دستک دی۔ اب کے چرکی آواز سے دروازہ کھل گیا تھا۔ ”ہاں جی! کس سے ملنا ہے۔“ اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتی، کا کے کو چاکلیٹ کی رٹ لگانے پہ ایک زبردست چائنا سید کرئی، مہرو نے بے زاری سے اس سے دریافت کیا۔

”زاہد صاحب کا گھر یہی ہے؟ میں ان کا بھانجا ہوں آسٹریلیا سے آیا ہوں۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“

سر پہ پڑتی دھوپ کا اثر تھا یا آدھے دن کی خواری کا کہ وہ ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ گیا۔ وہ جلد از جلد اندر چھاؤں میں پہنچنے کے لیے بے قرار تھا۔

”ہاہ پچھی کا بیٹا! تب ہی میں بھی کہوں اتنا بابو ٹائپ بندہ ہماری گلی میں کیوں آجھٹکا۔“ اشارہ سالہ مہرو نے ٹھوڑی پہ انگلی رکھے حیرت کا اظہار کیا تو دوسرے ہی پل اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔ جب صمد دروازہ دھکیلتا اندر جا گھسا۔

”چل تو! اندر چل تیری ابھی باجی سے پھینٹی لگواتی ہوں کہ تم نے بڑا تنگ کر رکھا ہے۔“ صمد کا غصہ ڈھانی سالہ بھانجے کا بازو مروڑ کے نکالتے ہوئے مہرو اندر کو ہولی۔ ”تھن میں ہی چار پانی ڈالے بیٹھی فرحت اسے اپنے پاس بٹھا چکی تھیں۔

”مامی! امی کہاں ہیں میں اتنی دور سے ان سے ملنے آیا ہوں۔ کیا وہ کچن میں ہیں؟ باہر کیوں نہیں آرہیں؟“ سوال میں موجودے تابی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ فرحت کے ہونٹوں پر طعنے مسکراہٹ چھیلی۔

”تمہارے ابا نے تمہیں نہیں بتایا؟ اس کی تو ہم نے جب ہی شادی کر دی تھی۔ جب تمہارے باپ نے اسے طلاق دی تھی۔“ حیرت کے اظہار میں طنز کی آمیزش تھی وہ ساکت رہ گیا اسے یہ طنز ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اس نے یہ کیسے سوچ لیا تھا۔ کہ اس کی



☆☆☆

اس کے بابا عبدالکریم نے اس کی ماں سے شادی محض اپنی ماں کو خوش کرنے کے لیے کی تھی۔ درحقیقت وہ اپنی کلاس فیلو سے محبت کرتے تھے۔ اور بیوی کے روپ میں بھی اس کو بی دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر یہ نصیب کے کھیل ہی ہیں۔ جن سے انسان کبھی نہیں جیت سکتا۔ وہ کبھی بھی سفینہ کو دل سے قبول نہیں کر پائے۔ ایک بیٹے کے بعد بھی وہ ان کے دل کی رانی نہیں بن سکیں۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد انہوں نے سفینہ سے زریں میں اپنی دلچسپی بیان کر دی۔ جس دن وہ زریں کو بیاہ کر لائے۔

اس دن سفینہ نے کھر چھوڑ دیا۔ انہیں گوارا ہی نہیں تھا کہ وہ زریں کی سوت بن کر رہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھیں۔ جو رشتوں کو مکمل ایمان داری سے نبھاتے ہیں۔ نہ خیانت کرتے ہیں نہ برداشت کرتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی وہیں چھوڑ گئیں۔ وہ جانتی تھیں۔ ان کے عزیز از جان بیٹے کو عبدالکریم کے سوا کوئی محبت اور تحفظ نہیں دے سکتا۔ وہ ممد کریم کو سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر نہیں پال سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے فریدی کی اولاد کو سینے سے لگا کے پالنے کا عزم کیا تھا۔ کیا خبر کبھی کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔

☆☆☆

آج کی دن کے بعد موسم خوش گوار تھا۔ حسب معمول لائٹ ندر تھی۔ وہ لوگ شام کی چائے کے بعد صحن میں چار پائیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی آنے والا ہوا کا جھونکا جسم و جاں میں سکون بھر رہا تھا۔

”ابا! ابھی خوشی کا فون آیا ہے۔ وہ کل اپنی منگنی کی شاپنگ کرنے جا رہی ہے۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ اس کی چوائس بھی تو ایسی سی ہے۔“ سخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے اس نے کہا تو چار پائی یہ آلتی پائی مار کر بیٹھے ہوئے فرید صاحب حیران سے رہ گئے۔ ان کی اولاد یہ کس لہجے میں بات کرنا شروع ہو گئی تھی۔ انہوں نے تو اپنی بیٹی کو کبھی یہ

ماں ضرور اب تک نہیں ہوگی۔ انہیں بھی تو زندگی پہ اتنا ہی حق تھا جتنا عبدالکریم کو تھا۔

”لیس جی ٹھنڈا ٹھنڈا شربت، بھئی میری مہر و کے ہاتھ میں بڑی لذت ہے پانی میں بھی چینی کھول دے تو وہ بھی ذائقے دار ہو جاتا ہے کیوں اماں!“ مہربانوں سے بڑی شہر بانوں نے بہن کی تعریف کے پل باندھے اور آنکھ کا اشارہ کر کے اماں کو بھی ہم نوا کرنا چاہا۔ وہ اشاروں کی یہ زبان خوب سمجھ رہا تھا اور اس کا دل یہاں سے نکل بھاگنے کو چاہ رہا تھا۔ جانے کیوں ایک دم دل بوجھل ہو گیا۔ بہت ضبط سے اس نے اپنے لہجے کو نارمل بنایا اور مامی سے کہنے لگا۔

”نہیں ممانی کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مجھے امی کا ایڈریس دیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں ان سے ملنے کے لیے ہی اتنی دور سے یہاں آیا ہوں۔“ اس نے پہلو بدلتے ہوئے بے تاب سے کہا۔

”ارے بیٹا اتنی بھی جلدی کیا ہے ابھی تو آئے ہو۔ اپنے ماموں سے نہیں ملو گے کیا؟“ لہجے میں شہد سوتے ہوئے انہوں نے ناگوار سی اس کی بے تاب کو دیکھا۔

”میں پھر آؤں گا ممانی! ماموں سے بھی ملوں گا، کھانا بھی کھاؤں گا۔ ابھی مجھے بس امی سے ملنا ہے۔ پلیز مجھے ان کا ایڈریس دے دیں۔“ اب کی بار اس کے لہجے میں اکٹا ہٹ تھی۔ تھوڑی رد و قدح کے بعد ممانی نے اس وعدے پہ ایڈریس دے دیا کہ وہ ملے آتا جاتا رہے گا۔

ممانی سے اجازت لے کر وہ ان کے بے انتہا اصرار پر بھی وہاں نہیں رکا۔ وہ بھاگنے کے انداز میں گلیاں عبور کر رہا تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اب منزل انجان تھی۔ نم آنکھیں پوچھتے ایڈریس کی برچی ہاتھ میں لیے وہ یوں چل رہا تھا کہ جیسے ایڈریس کس دوٹی ہی تو دور ہے۔ اسے یہ تک یاد نہیں رہا تھا کہ وہ ایڈریس جیب میں ہی رکھ لے۔ اس کی حالت عجیب دیوانوں جیسے ہو رہی تھی۔



نہیں سکھایا تھا کہ کسی کی تضحیک کی جائے۔

”بری بات ہے منایا! اس طرح کسی کی پیٹھ کے پیچھے کسی کی برائی نہیں کرتے سخت گناہ ہوتا ہے۔“ شفقت سے پر لہجے میں بھرپور تنبیہ تھی وہ جھلا اٹھی۔

”اک تو ابھی نا، ہر ایک سے ہمدردی چڑھی رہتی ہے انہیں۔“ دل ہی دل میں خوب تلملانی وہ ان کے پاس چارپائی پر چڑھ کے بیٹھ گئی۔

”اچھا نا نہیں بہتی میں کچھ۔ مگر اجازت تو دے دیں۔ میرے پیارے ابا پھر صبح جاؤں گی مغرب سے پہلے گھر آ جاؤں گی وعدہ۔“ انہیں مکھن لگاتے ہوئے لہجے میں شیرینی کھولے وہ اپنے مقصد کی بات پر آئی۔ اسی وقت سبزی کی نوکری تھا سے سفینہ خاتون بچن سے نکلیں۔

”نہیں کسی کے گھر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کئی بار سمجھایا ہے۔ کہ شریف لڑکیاں گھر میں رہتی ہیں۔ سارا سارا دن ستر بے مہار بار نہیں پھرتیں۔“ وہ دوسری چارپائی پر بیٹھ کر مٹر نکالنے لگیں اور نہایت سخت لہجے میں اسے کہیں بھی جانے سے روک دیا۔ مینا اس دخل اندازی پہ خوب کبیدہ خاطر ہوئی۔ اور تنک کر بولی۔

”میں نے آپ سے بات کی ہے؟ آپ کیوں ہمیشہ میرے اور بابا کے درمیان آ جاتی ہیں؟ میں نے اجازت آپ سے نہیں بابا سے مانگی ہے۔ آپ کو کیوں شوق ہے۔ ہمیشہ میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے کا؟“ ایک پل میں ہی سفینہ خاتون کے چہرے کا رنگ دھواں دھواں ہوا۔ مگر اگلے ہی لمبے وہ خود کو سنجال چکی تھیں۔ لہجے کی سختی کو برقرار رکھتے ہوئے بولیں تو ان کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

”تم بھول رہی ہو کہ میں اس گھر میں تمہاری ماں کی حیثیت سے آئی ہوں۔ تمہیں اچھائی برائی پر ٹوکنا میرا فرض ہے۔ اور میں اپنا فرض ضرور نبھاؤں گی تمہیں اچھا لگے چاہے برا۔“ ان کے رساں سے سمجھانے پر غصے اور نفرت سے اس کا چہرہ مسخ ہوا۔

”اور ایک بات آپ بھی بھول رہی ہیں کہ آپ یہاں پاپا کی بیوی کی حیثیت سے رہ رہی ہیں۔ میری ایک ہی ماں تھی۔ جو اس دنیا سے جا چکی ہے۔ میری ماں بننے کے ڈرامے بند کیجیے۔ میرا جو جی چاہے گا میں وہی کروں گی۔ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں۔“ خاموشی سے سنتے فرید صاحب اس درجہ بدتمیزی پہ انکشت بدندان رہ گئے۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے مینا اپنے بڑوں سے کوئی اس طرح بات کرتا ہے؟ میں نے تمہیں بدتمیزی کی تربیت تو کبھی نہیں دی تھی۔ سفینہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ کہیں جانے کی، جاؤ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھو۔“ غصہ کنٹرول کرتے ہوئے بھی وہ جی اٹھے۔ سفینہ نے آنکھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا۔

”رہنے دیں فرید صاحب! یہ نہیں بول رہی۔ اس میں اس کی ماں کا لہجہ بول رہا ہے۔ آخر یہ سارہ کی بیٹی ہے۔ اسے بڑوں کی بات ماننے میں کیا دلچسپی ہوگی۔ بڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا۔ بس فیشن کرنا اور سہیلیوں سے ملنا باتیں کرنا اس کے یہی تو مشغلے ہیں۔“ حسب عادت انہوں نے اس کی ماں کا طعنہ دیا تو وہ تڑپ اٹھی۔

”گھر میں رہ کر فیشن کرنا یا پھر اپنی سہیلیوں سے باتیں کرنا یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ جو آپ ہمیشہ مجھے طعنہ دیتی رہتی ہیں۔ گناہ تو یہ ہے کہ کسی کے گھر پر قبضہ کر لیا جائے۔ کسی کی اولاد کو یوں ستایا جائے جیسے آپ مجھے ستا رہی ہیں۔“ اس نے غصے سے کانپتے ہوئے سخت لہجے میں کہا گویا جنگ شروع ہو چکی تھی۔

”میں نے تمہیں کیا ستایا ہمیشہ پھولوں کی طرح رکھا۔ اور جی بات سننا سیکھو لڑکی! عورت کا پھو بڑپن اور دانستہ اپنی کراہتی کو وقت نہ دینا بھی غلط ہے اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے سارا خاندان جانتا ہے کہ اگر سارہ مر نہ جائے تو اپنی گریہ سنی خود اپنے ہاتھوں سے براہد کر چکی ہوتیں۔“ آلو کا تلی سفینہ اس کی ماں کی



بات ایسے کر رہی تھیں جیسے کسی اور کا ذکر کر رہی ہوں۔

فرید صاحب نے تڑپ کر سفینہ بیگم کی طرف دیکھا۔ کچھ بھی تھا وہ سائرہ سے محبت کرتے تھے۔ اور اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے۔ گو مینا بھی اپنی ماں کے پھوپھڑن سے واقف تھی۔ مگر اپنی ماں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سن سکی۔ جب بھی سفینہ بیگم اس کی ماں کے بارے میں اسے طعنہ دیتی تھیں۔ تو وہ اپنی بڑی سے بڑی خواہش چھوڑ دیتی تھی۔ نادانستگی میں وہ خود کو اچھا ثابت کر کے اپنی ماں کی غلطیاں مٹانا چاہتی تھی۔ مگر یہ کب ممکن تھا انسان ایک دوسرے کی خوبیاں تو بھول سکتا ہے۔ مگر خامیاں کبھی نہیں بھولتا۔ اس نے بے بس نظروں سے دونوں کو گھورا اور کمرے میں جا کے دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔

اتنا تو وہ جانتی تھیں۔ کہ وہ حساس ہے، نرم دل اور بڑوں کا احترام کرنے والی ہے مگر بات وہیں آ جاتی ہے کہ بس وہ انہیں اپنے گھر میں اپنی ماں کی جگہ نہیں دے پا رہی تھی اور شاید اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی، وہ ایسا ہی کرتی۔ وہ تو پھر حد سے زیادہ جذباتی اور کھلنڈ رہی تھی۔

سزئی بن چکی تھی وہ اپشتی سی نظر فرید صاحب پر ڈال کر بچن کی طرف چل دیں۔

سارہ بے حد خوب صورت تھی جب فرید صاحب کی شریک حیات بنی تو وہ بہت خوش تھے۔ اس کا بچنا سنسورنا، زبردستی انہیں اپنی سہیلیوں کے گھر لے جانا، گھر کا خیال نہ کرنا، کھانا روز باہر سے منگوانا شروع، شروع میں انہیں کچھ بھی برا نہیں لگتا تھا۔ ان کی والدہ جب تک زندہ رہیں ان کی بد نصیبی یہ افسوس کرتی رہیں۔ جس پر سارہ سے بے بھاد کی سختی بھی تھیں۔ فرید صاحب بے بسی سے دونوں کے درمیان پس کے رہ جاتے۔ وہ فطرتاً صبح جو انسان تھے۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ وہ بھی سارہ سے تنگ آ چکے تھے۔ وہ سارہ کو گھر سنبھالنے کے لیے

لائے تھے۔ گھر میں سجانے کے لیے نہیں۔ جب روز جائے پائے کھا کے آؤں جاتے اور شام کا کھانا لے گئے وہاں آتے تو دھول مٹی سے گھرا ہوا، صبح کی جائے کے گندے برتنوں سے سنک بھرا ہوا۔ ایک ہفتے بعد وہ مارے باندھے جھاڑ دیا کرتی۔ وہ بھی صادقہ کے ہزار بار تو کہنے پہ، وہ آتے جاتے بھائی کے گھر کا حال دیکھتیں تو سر پیٹ لیتی۔ مینا کے بعد تو حالات اور خراب ہو گئے۔ انہیں اپنا سنگار تو یاد رہتا مگر بچی کے فیڈ رکھنا بھول جاتا تھا۔ وہ چھ بھائیوں کی اگلوٹی بہن تھیں۔ لاڈلی بھی بے حد تھیں۔ طبیعت میں انتہا کا لالہابی پن تھیں۔ فرید صاحب کے سمجھانے پہ وہ بدزبانی پہ اتر آتی تھیں۔ بات مٹی بار طلاق کی نوبت تک چنچی۔ ڈری سہی مینا لڑتی کا پتی کمرے کے ایک کونے میں مال پاپ کو کسی شیر، شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے دیکھتی رہتی مگر پھر سب مل کے صبح کروا دیتے تھے۔ سارا بارہ سال بعد پھر امید سے تھیں مگر بچے کی پیدائش کے دوران ہی چل بسی، ڈاکٹر بچے کو بھی نہیں بچا پائے۔ یوں زندگی کا ایک باب بند ہوا مینا اسکول سے آ کے تمام دن تنہا رہتی تھی صادقہ کا خود بھرپور اخاندان تھا۔ ان ہی کے اصرار پہ انہوں نے سفینہ سے نکاح کر لیا۔

☆☆☆

گیسی میں بیٹھ کر اس نے وہ ایڈریس دیا جو مامی نے اس کے بے حد اصرار پہ اسے دیا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ چنچی اپنے اپنے گھر کو لوٹ رہے تھے۔ اس کا دل ایک دم ڈوب کے ابھرانہ جانے وہ لوٹ رہا تھا مینا بن بلائے مہمان کی طرح لوٹ جانے کے لیے آیا تھا۔ کھڑکی سے بھاگتی عمارتیں اس کی دھندلی آنکھوں میں عجیب ہو لے بنا کر اس پہ ہنس رہی تھیں۔ بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھ کر اس نے نظریں اپنے ہاتھوں کی لکیروں پہ لگا لیں۔

”لو باؤ جی آگئی منزل۔ سو گئے ہو کیا! الو آگئی ہے۔ تمہاری منزل۔“ اسے ایک درمیانے سے درجے کے علاقے میں ایک گھر کے سامنے گیسی



نہیں چلا وہ کب دروازہ پورا کھولتا صحن میں داخل ہو گیا اور ہوش میں تو وہ بھی نہیں تھا۔ کوئی اسے بے بھاد کی سزا رہا ہے۔ اسے خبر نہیں تھی۔ وہ تو بس میکا کی انداز سے دروازہ وا کرتا اندر کھس آیا تھا۔

”مینا! کون ہے بیٹا تھی بار کہا ہے، شام کے بعد دروازہ پوچھ کر کھولا کرو یہاں پتا نہیں حالات کتنے خراب ہیں۔ آئے دن دلیتیوں کی خبر آتی رہتی ہے۔ مگر مجال ہے تم میری کوئی بات سنو“ اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے جیسے ہی وہ صحن میں آئیں صمد کو دیکھ کر ساکت ہو گئیں۔

”صدا! میرے بیٹے تم یہاں کیسے؟ کب آئے؟ بتاتے تو سہی مجھے میں تمہیں لینے آ جاتی۔“ فرط مسرت سے اسے لپٹا کر بے تحاشا چومتے ہوئے وہ کہہ رہی تھیں جبکہ صمد پر شادی مرگ کی سی کیفیت چھائی تھی۔

”آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟“ وہ جو سمجھ رہا تھا کہ پہچان کے اذیت ناگ مراحل اس کے منظر ہیں۔ اس قدر اہلانا استقبال۔ یہ حیران رہ گیا۔ ”زیریں مجھے ہر سال تمہاری تصاویر بھیجتی رہتی ہے۔ میں کیسے نہ پہچانتی۔“ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ جیسے اسے آنکھوں کے رستے دل میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس ایک چہرے کو دیکھنے کے لیے وہ تمام عمر تڑپی تھیں۔ صمد کو بے اختیار، نذریں ماما یہ پڑا آیا۔

”اب سارے سوال یہیں کرو گے یا اندر بھی چلو گے۔ چلو میں تمہیں فرید صاحب سے ملواؤں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے اندر جانے لگیں پھر رک کے صحن میں ساکت کھڑی مینا کو مخاطب کیا۔

”مینا صمد کے لیے کوئلہ ڈرنک لے آؤ پلیز۔“ اتنا کہتے وہ صمد کو لے کے اندر چلی گئیں۔ جبکہ ساکت کھڑی مینا میں گویا جان ڈال گئیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس آرڈر پر ہزار باتیں سنا کے کمرہ بند ہو جاتی مگر دل کو تو ایک ہی دھن لگی تھی۔ اس ساحر کو جان لینے کی دھن۔ جس نے ایسا سحر پھونکا تھا کہ اکٹرا

روکتے ہوئے ٹیکسی والے نے اس کو آواز دی تو وہ چونک اٹھا۔ بیک ٹھہرتے ہوئے ٹیکسی والے کو کراہی دے کر گھر کی طرف چل دیا۔ گھر کے ساتھ ہی ایک درخت لگا ہوا تھا جو پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے ہی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ سارے دن کی کوفت کے بعد وہ اب خود کو پکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ یوں جیسے منزل نہیں ملی اس کے درد کا درماں مل گیا ہو۔ بے حد سرشار انداز میں اس نے دروازے کی تیل پر انگلی رکھ دی تو پھر اٹھانا بھول گیا۔

آف وائٹ پنٹ سے سجی ہوئی دیواروں میں پیوست میران دروازہ کھل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی بے چینی پھر حد سے سوا ہوئی۔ صحن میں بستر لگائی مینا شیشا کر دروازے کی طرف لپکی فرید صاحب اپنے کمرے میں بیٹھ کر دیکھ رہے تھے جبکہ کچن میں کھانا بناتی سفینہ نے پھر کچ کر دروازے کی طرف جانی مینا کو تاسف سے دیکھا۔ ان کا معمول تھا شام کا کھانا کھاتے ہی وہ صحن میں کھلی فضا میں چار پائیوں پر ایئر کولر لگا کے بیٹھ جاتے تھے۔ پھر تھوڑی بات چیت کے بعد سو جاتے تھے۔ مینا بی ایس سی کر رہی تھی۔ روز اس کو پڑھنا ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کمرے میں جا کر پڑھتی رہتی جب نیند آتی تو آکر سو جاتی۔

”کیا مسئلہ ہے تیل جلا دو گے کیا تمہارے باپ نے تو نہیں لگائی۔“ دروازہ کھولتے ہی وہ دھڑا دھڑ شروع ہو گئی۔ لیکن سامنے کسی بچے کے بجائے ایک لڑکے کو یا کر حیران ہو گئی۔ اجالا اندھیرے میں مدغم ہو رہا تھا صحن کا پیلا بلب جل رہا تھا جب کہ کھلی میں اندھیرا تھا۔ اندھیرے اجالے کے عکس پر گھڑا وہ شخص جو بھی تھا کمال تھا۔ سرخ و سفید رنگت، کسرتی جسامت، چھ فٹ سے کھٹا ہوا قد، ٹھکے ٹھکے سے چہرے پہ نچی فریج کٹ داڑھی، مڑی ہوئی خم دار مونچھیں، عجبانی ہونٹ، سیاہ اداس آنکھوں میں نچی چمک گویا کئی ستارے کوٹ کے ان سیاہوں میں بھر دیے گئے ہوں۔ وہ مبہوت سی اسے دیکھ لگی پتا ہی



کھل جاتی تو مینا جانے کیا ہنگامہ کرتی۔ اسی وجہ سے اسے آتے دیکھ کے وہ مہم کی پہچان چھپا گئے اور سفینہ کو بھی ہاں میں ہاں ملائے کا اشارہ کر دیا۔  
مہم کو یوں لگا گھر کی بنیادیں ٹل گئی ہیں۔ دھڑام سے کمرے کی چھت اس پر آ گری ہے۔ وہ تو پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔ اب اسے لگا کہ سارے دن کا سفر اتنی خواری بدن توڑی تھکن سب بے سود ثابت ہوئی۔ شدت جذبات سے بوجھل ہوئی آنکھیں زور سے پھلکیں اور سامنے رکھی کولڈ ڈرنک زہر مار کرنے لگا۔ اسے احساس ہی نہ ہوا وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔

فرید صاحب بہت خوش اخلاقی سے اس سے گھر اور گھر والوں کے متعلق سوالات کرتے رہے۔ وہ غیر حاضر دماغی سے جواب دیتا رہا۔ سفینہ بیگم نے جلدی سے کھانا لگا دیا وہ کھانا کھاتا رہا۔ اتنی دیر میں سفینہ بیگم نے اس کا کمرہ سیٹ کر دیا۔ وہ تھکن کا بہانہ کر کے بہت جلد کمرے میں آ گیا درمیانے سائز کے کمرے میں آف وائنٹ جگہ سے اکھرا پینٹ تھا۔ میروں پر دے، میروں ہی کا پینٹ، جہازی سائز پینڈ جس پر میروں اور آف وائنٹ پرنٹڈ چادر بچھی تھی۔ اس کا سامان پرانی طرز کی سیف الماری کے پاس رکھا تھا۔ وہ دروازہ بند کرتے ہی پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ماما بالکل صحیح کیا آپ نے مجھے اپنا مینا نہیں کہا ورنہ آپ کے لیے کتنے مسائل کھڑے ہو جاتے۔ میں آپ کی سب مجبوریوں سمجھتا ہوں ماما، وہ دل ہی دل میں سفینہ سے مخاطب تھا۔ وہ اٹھ کے بیڈ تک آیا لباس بدلے بنا بستر پہ اونڈھالٹ گیا روتے روتے وہ کب سویا اسے خبر نہیں ہوئی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ چڑیا کی تیز چھچھاہٹ سے کھلی تھی۔ چند سی آنکھوں سے اس نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی اور مسکرا دیا۔ ساری کلفت جیسے دھل جی گئی تھی۔ اسے اپنا کمرہ یاد آیا۔ اس کا کمرہ ہر قسم کے سامان کیش سے سجا

اور بد دماغ مینا چاروں شانے چٹ ہو گئی تھی۔ سفینہ بیگم اس کا ہاتھ پکڑے چھوٹے سے برآمدے سے گزر کے درمیانے سائز کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اور کمرے میں چلتی وی آف کر دیا۔ کمرہ سادگی سے سجا تھا سامنے ہی بیڈ پہ بیٹھے فرید صاحب اسے دیکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت انسان تھے۔ گمرے گھر کے سادہ شلواری قمیص میں بھی ان کی وجاہت نمایاں تھی۔ چھ فٹ کے قریب قد سرخ و سفید رنگت، کنپٹیوں پر سفید بال انہیں مزید گریس مل بنا رہے تھے۔

”تو یہ ہے فرید صاحب ایسا بھی کیا خبروں کا نشہ کہ کون آیا کون گیا آپ کو خبر ہی نہیں ہوتی کمال ہے۔“ مصنوعی ناراضی سے کہتے نروس سے مہم کو بازو سے پکڑ کے آگے کیا۔

”دیکھیں کون آیا ہے۔“ خوشی سے تمنتا ہے چہرے پہ چمکتی آنکھیں مہم کا دل رک کر دھڑکا۔ ابھی سفینہ بیگم فرید صاحب کو بتائیں گی کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ ابھی فرید صاحب ان دونوں ماں بیٹے کو گھر سے باہر کھڑا کر دیں گے۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں وہ اپنی ماں سے ملنے آیا تھا۔ ان کا گھر ان کی خوشیاں برباد کرنے نہیں۔ ساتھ یہ احساس بھی تھا کہ ایک مدت کے بعد وہ اسے اپنا بیٹا کہہ کے بلا میں گی۔ وہ اس وقت خوشی اور خوف کی فی جلی کیفیت میں گھرا کھڑا تھا۔ کھڑے ہو کر عینک صاف کرتے ہوئے فرید صاحب نے اسے غور سے دیکھا۔

”یہ زریں کا بیٹا ہے نا۔ وہی تمہاری دوست جو آسٹریلیا میں رہتی ہے۔“ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے خوش اخلاقی سے سفینہ بیگم سے دریافت کیا اسی وقت ٹرے میں کولڈ ڈرنک سجائے مینا اندر داخل ہوئی۔ سفینہ بیگم نے ایک لفظ کہے بنا مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ فرید صاحب کا اشارہ سمجھ چکی تھیں۔

فرید صاحب جانتے تھے کہ اگر ابھی حقیقت



کوئی بڑی زاد ہے۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، اتنا لباقد، مجھے تم تازہ جیسی کہتی ہو میں اس کے کندھوں تک آتی ہوں۔ بس مجھو میرے خوابوں کا شہزادہ ہے وہ۔ میں نے پہلی نظر میں ہی پور پور اس کی محبت میں ڈوب گئی ہوں یار۔“ ایک ہاتھ میں موہاں تھا دوسرے ہاتھ سے تار پہ پھیلے کپڑے اتارنی لڑکی اس کی تعریف میں مٹی کی طرح اللسان تھی۔ سادہ سے سیاہ شلوار قمیض میں مٹی کی طرح دونا گلے میں ڈالے کنڈنی رنگت والی لڑکی کی اس کی طرف بٹھ تھی۔ وہ مسکرا کے وہیں کھڑا ہو گیا۔

”مگر ہائے رے میری قسمت میرے خوابوں کا شہزادہ ملا بھی تو کس روپ میں وہ اس محترمہ سفینہ عظیم کا بیٹا ہے۔ جس سے میں نے تمام زندگی نفرت کی۔ تم تو جانتی ہونا کتنا ستایا ہے اس عورت نے مجھے۔ کاش وہ اس کا بیٹا نہ ہوتا چاہے پھر گلے سے گزرتے فقیر“ وہ کپڑے ایک بازو میں سینے کھوی تو سامنے ٹکرا اتھرا صحرائے کریم کھڑا تھا۔ صبح پیشانی پہ بڑے تل بتا رہے تھے کہ وہ سب سن چکا ہے۔ ایک لمحے کو مینا کا چہرہ تاریک پڑا۔

صبر کچھ بھی کہتا ہے لے لے ڈگ بھرتا اندر کچن کی طرف چل پڑا۔ جہاں سفینہ خاتون دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ آج کل ان کے دوسری تو کام تھے۔ صحرائے کریم کے خمرے اٹھانا اور دنیا جہان کی نعمتوں سے اس کے لیے دسترخوان بچانا۔

صبح کہتے ہیں۔ محبت میں انسان سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ وہ بھی ایسی ہی ہو گئی تھی۔ اس دن صبح کے سامنے ہوئے والی شرمندگی کے زیر اثر وہ اس سے کترا رہی تھی۔ وہ زیادہ وقت کم سم رہتی یا پڑھتی رہتی۔ سفینہ عظیم بھی دیکھ رہی تھیں کہ وہ اب ان سے ابھی نہیں زیادہ تر اپنے کیمے میں رہتی ہے۔ جب تک صحرائے کریم تھا وہ کوئی فی جاہتی بھی نہیں مینا اسے اس خاموش روپے کے پیچھے وہ فرید صاحب کی نصیحتوں کا ہاتھ سمجھ رہی تھیں جبکہ فرید صاحب یہ سوچ کر خوش تھے کہ مہمان کی خاطر ہی سہی مینا اب سفینہ

تھا۔ دو منزلہ خوب صورت کوئی کاہر کرہ خوب آراستہ پیراستہ تھا۔ زریں ماما کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ وہاں شور نام کو نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا لوگ چلاتے بھی سرگوشی میں ہیں۔ عجیب شہر سرد تھا کہ پرندے بھی سہم کے بولتے۔ وہ جب تک چاہتا سوتا تھا۔ اس کے برعکس پانچ کمروں پر مشتمل یہ چھوٹا سا مگر عجیب سی اپیل لے ہوئے تھا۔ اس کا کمرہ اوپر تھا۔ کھڑکی کی منڈیر یہ بیٹھی چڑیا اسے جگا کر مگر سے اڑ گئی۔ جیسے بھی گرنے تو آئی ہو۔

باریک پردے سے چمن کر آتی روشنی ماحول کو گرم کر چکی تھی۔ کسل مندی سے کچھ دیر لیٹے رہنے کے بعد وہ سر جھٹک کر تمام اچھی بری سوچوں سے دامن بچاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سپر زہیروں میں اڑتے ہوئے وہ بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا کپڑے نکالتا واش روم میں مہس کیا۔ نہا کے آسانی رنگ کا ہلکا چمکا سا سوٹ مہن کے بال بناتا وہ میز میوں کی طرف چلا آیا۔

پہلا استقبال تپتی دھوپ نے کیا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے مگر دھوپ کی وجہ سے گلیاں سنسان تھیں۔ چڑیا منڈیر پہ رکھے بڑے سے کنوڑے سے پانی پی رہی تھی۔ باہر سے آنے والی پھیری والے کی گراہی آواز پہ متوحش ہو کر پانی میں جا گری۔ وہ جو پہلے زینے پہ قدم رکھ چکا تھا۔ منڈیر پہ بیٹھی بیٹی بیٹی چڑیا کو دیکھ کے مسکرا دیا۔

”مجھے جگایا تھا نا اب پتا چلا؟“ دل ہی دل میں چڑیا کو مخاطب کرتا وہ میز صیباں اتر گیا۔ آخری میز می پہ قدم رکھتے ہی وہ ٹٹک گیا۔ محن میں چاروں دیواروں کے ساتھ گلاب اور موہیے کے گلے رکھے تھے۔ باہر کے دروازے کے ساتھ نجانے کون سے پھولوں سے اٹا درخت تھا جو آدھا باہر کو جھکا ہر آنے جانے والے پر پھول نچھاور کرتا رہتا۔ سارے محن میں موہیے کی خوشبو پھیلی تھی۔

”ارے یار روشنی تمہیں کیا بتاؤں کتنا خوب صورت انسان ہے وہ۔ یوں لگتا ہے آسمان سے اتر



دیکھ پائی تھی۔

”یہ کیا بد تیزی ہے۔ شکل سے تو پرہی لکھی گئی ہو۔ یہ نہیں پتا کسی کے کمرے میں بنا دستک دیے نہیں آتے؟“ صد ایک پل میں سنبھلتا اور سنبھلتے ہی اسے ہری طرح ڈانٹنے لگا۔

مینا اسے سامنے پا کر گھبرا گئی اور گھبراہٹ میں بازو پیڈالے کپڑے سامنے کر دیے۔

”آپ کے کپڑے۔“ چٹکی آواز میں بس اتنا ہی بول پائی تھی کہ صدر کی بھنویں تن گئیں۔ وہ بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ کو میرے کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے کام کرنے کے لیے میری امی ہیں۔ آپ کو اک قائل نفرت عورت کے بیٹے کی خدمت کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ صدر کریم ہمیشہ اپنی ماں کے پیار کے لیے ترسا ہے۔ انہیں کوئی گرم نگاہ سے بھی دیکھے تو مجھے چاہئے یا سوچئے کا حق دار نہیں۔“ اس کے لہجے میں چٹانوں کی سختی تھی۔ مینا ایسے الفاظ سن کر بھونچکا رہ گئی۔

”کیا مطلب؟ میں بھی نہیں میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر رہی میں تو.....“ اس کی بات سچ میں

ہی رہ گئی اب وہ بولا تو اس کا لہجہ استہزاء سے تھا۔

”اور یہ حیرے کہیں اور استعمال کرو جا کر۔ کیوں کہ میں جہاں سے آیا ہوں۔ وہاں تم جیسوں کی کمی نہیں۔ مجھے پاکیزہ اور عزت کرنے اور کروانے

والی لڑکیاں پسند ہیں۔ کسی شوخیاں کی طرح سچی ہوئی نہیں۔“ مینا کا چہرہ احساس تو بہن سے سرخ ہوا۔

دفعاً اس کے اندر کی غر اور سرکش مینا نمودار آئی، اس نے کپڑے کمرے کے وسط میں پھینکے اور چار

قدموں کا قاصد ملے کر کے اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

”چہ خوب..... آپ کو اپنے بارے میں بہت خوش فہمیاں ہیں مسٹر صدر کریم۔ آپ جیسی گھٹیا سوچ

کے مالک لوگ کسی کی جی جاہت کے قائل ہوتے بھی نہیں۔ فار یور کانٹریڈ انٹار مشن میں آپ کی ہی

سے کم الجھتی تھی۔ صدر بھی مینا کا کتنا خوب محسوس کر رہا تھا۔ اسے یہ خاموش سی چٹکی نظروں والی لڑکی اچھی لگی، خاص کر اس کا پھولوں سے عشق کرنا اور ڈوبے رہنا اسے کھینچتا تھا، مگر وہ اس کے اپنی ماں کے بارے میں خیالات جان کے دھکی تھا۔ اگر ان دنوں وہ کتنا رہی تھی تو نظر انداز وہ بھی کر رہا تھا۔

اس روز بھی فرید صاحب کے چاتے ہی بادل گھر آئے سفینہ کے گھنٹوں میں آج انتہا کا درد تھا۔

ناشتا تک فرید صاحب باہر سے لائے تھے۔ بستر پہ لیٹی سفینہ بیگم کو جن میں ہوئی بوندا باندی دیکھ کر ایک

دم یاد آیا۔

”مینا اومینا! بھئی رات کو میں نے صدر کے کپڑے دھو کر ڈالے تھے۔ وہ اتارنا نہیں رہے۔ تم

لے آؤ دیکھو تو کن سن بارش شروع ہوئی ہے۔ تیز ہو گئی تو بھگ جائیں گے۔ اور پھر سے دھونے پڑیں گے۔“ ان کے لہجے میں الجھاہٹ تھی۔

مینا جیزب ہوئی ہوئی چھت سے چلی آئی اسے اطمینان تھا۔ صدر کو آج اپنے ماموں کے گھر جانا تھا۔

اس نے رات ہی صدر کو سفینہ سے کہتے سنا تھا۔

اس کے کپڑے سینٹے سینٹے بادل ٹوٹ کر برسنے لگے۔ وہ بھاگ کر بھی اوپر والی چھت کا وسیع

صحن عبور کرتی تو بھی سیزھیوں تک پہنچتے پہنچتے بھگ جاتی۔ اتنے میں بجلی زور سے چمکی۔ وہ بے اختیار بیچ

کر چھت پہ بنے اکلوتے کمرے میں جا کھسی اور جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ جہاں آج کل صدر رہا

تھا۔ صدر جو بارش کی وجہ سے کہیں بھی جانے کا ارادہ کینسل کیے اپنے بیڈ پہ بیٹھا لیپ ٹاپ پہ معروف

تھا۔ اسے دیکھ کے ٹھنک گیا۔ تیز بو چھاؤ اس کو آدھا بھگو چکی تھی۔ وہ ابھی نہا کر نکلی تھی۔ سفید کاشن کے

سوٹ میں کھلے لمبے بالوں میں موچے کی ٹیوں کا ہار اٹکائے وہ پور پور مہک رہی تھی۔ کمرے میں اچانک

در آنے والی موچے اور شیمو کی ملی جلی خوشبو صدر کے حواسوں پہ سوار ہو رہی تھی۔ جبکہ دروازے سے فیک

لگا کر آنکھیں موند لے کھڑی مینا اب تک صدر کو نہیں



اسے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا۔ وہ امی کے ساتھ جا کے ماموں کی ٹیکسی سے بھی مل آیا تھا۔ مگر وہاں دوبارہ نہ جانے کا عہد کر کے اٹھا تھا۔ گو وہاں ان لوگوں کا رتیسا استقبال کیا گیا تھا۔ خاص کر مہر لسا کے سلیف کے قہقہے بڑھے گئے۔ جس کا مقصد پوری طرح سمجھ کے صدمہ چڑا تھا۔ سفینہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ وہی گھر تھا جہاں عبدالکریم سے طلاق کے بعد ان کی زندگی تنگ کر دی گئی تھی۔ بات بات یہ ان کے لیے باکی اور بے راہ روی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔ آئے گئے کے سامنے اس کے خود طلاق لینے کے جرم کو بڑھا چڑھا کر بتایا جاتا۔

بھابھی کے خیال میں عورت اچھی ہو تو مرد چاہے ہزار شادیاں کرے مگر عورت اس کا در نہیں چھوڑی۔ ان کی دونوں بھینچیوں کو ان سے دور رکھتیں کہ کہیں ان کی بد چلتی کا سایہ ان بچیوں کا نصیب نہ وارے دار کر دے۔ ان دنوں سفینہ بے حد دل گرفتہ رہتی تھیں۔ پھر خدا کو ان پر رحم آیا فرید سے شادی کے بعد حالات کافی بہتر ہو گئے تھے۔

مگر جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے انسان کی شخصیت کو ٹوٹا پھوٹا دکھاتے ہیں۔ ویسے ہی رشتے بھی ٹوٹ کر اپنی جاذبیت کھودیتے ہیں۔ وہ بہت کم بھابھی کے گھر جاتی تھیں۔

وہ ایک ہفتے سے نوٹ کر رہی تھیں صدمہ سارا دن ان سے فرمائشیں کرتا لگاؤ کا اظہار کرتا۔ مگر جیسے فرید صاحب آتے وہ کچھ کھینچا سارو بہ اختیار کر لیتا۔ وہ پوچھتی رہ جاتیں مگر وہ ٹال جاتا۔ فرید صاحب کے ساتھ اس کا رویہ نازل تھا اور اچھا تو وہ بیٹا کے روئے پہ بھی گئی تھیں۔ آج کل وہ اسے جو بھی کہتیں وہ اچھے بنا مان لیتا۔ ہر وقت کھوٹی کھوٹی سی رہتی۔ صدمہ سے تو جیسے باقاعدہ چھپ رہی تھی وہ۔ اس ساری صورت حال سے وہ پریشان ہو کر رہ جاتیں اور محسوس تو فرید صاحب بھی بہت کچھ کر رہے تھے مگر خاموش تھے۔

والدہ کے کہنے پہ اور آئی تھی۔ ورنہ مجھے آپ کی مغرور صورت دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔“ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بے خوفی سے اس سے مخاطب تھی۔ ایک بل کے لیے صدمہ کو اپنے ناروا رویے کا احساس ہوا۔ وہ جیسے ان بڑی بڑی لائٹ براؤن آنکھوں میں ڈوب کے ابھرا۔

”میں بارش سے بچنے کے لیے اپنے ہی گھر کے ایک کمرے میں آئی تھی۔ مجھے اگر ایک فیصد بھی یہ پتا ہوتا کہ تم یہاں ہو تو مجھے یہاں نہ آتی۔ آئندہ مجھ سے مخاطب ہو تو یہ یاد رکھ کے ہونا کہ تمہارے مقابل میں تفرید کھڑی ہے۔ وہ میں تفرید جو اگر صدمہ آئے تو اپنی بڑی سے بڑی خواہش چھوڑ دیتی ہے۔ تم کیا چیز ہو؟“ وہ اس کا کارل پڑے آنکھوں میں غصہ لیے جھپٹی ہوئی دروازے تک بھاگی۔ صدمہ کا دل چاہا وہ اسے روک لے اور اپنے رویے کی معافی مانگے۔

”ایک بات اور تم نے بہت غلط انسان کے سامنے بہت غلط بات کہہ دی ہے۔ اب کے بعد اگر میں نے دانستہ اک نظر بھی تم پہ ڈالی تو میں تفرید نام نہیں میرا۔“ وہ جس تیزی سے چلی تھی اسی تیزی سے اٹے پیروں واپس ہو کر وہ اس کو حیران کر گئی اب کی بار جاتے ہوئے وہ جان بوجھ کر کچھڑ سے ہنر اس کے دھلے ہوئے کپڑوں پہ رکھ کے ٹوڑی دھاڑ سے دروازہ بند کر کے وہ برستی بارش میں نیچے بھاگی۔ لڑکیوں کی صورت بہتے آنسو بارش کے پانی میں مل رہے تھے۔ اپنے کمرے میں جا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”میرے کردار پہ انگلی اٹھا کے تم نے بہت برا کیا ہے، صدمہ کریم بہت برا۔“ زار و تظار روئے ہوئے وہ سرگوشی میں بس ایک ہی لفظ کی گردان کیے جا رہی تھی۔

فرش سے کپڑے اٹھا کر صوفے کی پشت پہ ڈالتے ہوئے صدمہ کریم مسکرا دیا۔ اس نے بہت سی با اعتماد اور نڈر لڑکیاں دیکھی تھیں مگر اس کندی رنگت والی لڑکی کی بات سب سے جدا تھی۔



پری می پر فیکٹ جوڑ ہے۔ میں اس سے شادی کرتا چاہتا تھا قدرت کو بھی شاید یہ ساتھ منظور تھا۔ مگر میری بہن صادقہ کا اصرار تھا کہ میری شادی سفینہ سے ہو۔ سفینہ اس کی کالج کی دوست بھی تب عام سی صورت والی سفینہ میری آنکھوں میں کہاں چینی تھی۔“ پچھتاوا جیسے ان کے لہجہ کو لڑا رہا تھا۔

صہد کریم کا حساس دل جیسے تڑپ کر رہ گیا۔ ”پلیز خود کو سنبھالیں اکل۔“ اس نے ان کے گلشن پر ہاتھ رکھا۔

”میری آزمائش مقصود تھی کہ قدرت نے مجھے سارہ کا ساتھ بخشا۔ اور سفینہ کی شادی ہمارے مشترکہ کلاس فیلو عبدالکریم سے ہو گئی۔ سفینہ ایک مرتخان مرغی لڑکی تھی۔ ہر حال میں خوش رہنے والی۔ عبدالکریم اس کا خالہ زاد تھا۔ اس سے ایک سال سینئر تھا۔ ہمارے گروپ کا سب سے خوب صورت لڑکا۔ گو ہم سب کے ڈیپارٹمنٹ الگ تھے مگر ہمارا گروپ یونیورسٹی کا سب سے مشہور گروپ تھا۔ جہاں سارہ جیسی خوب صورت مگر بدسلوک لڑکی میری زندگی میں بے ترتیبی لائی وہیں حسن پرست عبدالکریم بھی عام صورت مگر عمدہ ترین دل و اخلاق والی سفینہ کو نہ بسا سکا۔“ ان کے لہجہ میں دکھ تھا۔

”نہیں اکل! پاپائے دونوں بیویوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہا تھا مگر ماننے انہیں چھوڑ دیا۔ کاش وہ ایسا نہ کرتیں تو آج ہم اکٹھے ہوتے۔“ ان کی غلط فہمی دور کرتا وہ جذبات میں وہ گلٹ بیان کر گیا جس میں وہ بچپن سے جھلا تھا۔ فرید صاحب مسکرا دیے۔

”کیا تم ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا پسند کرو گے جس کے دل میں کوئی اور بسا ہو؟“ ہولے ہولے سر جھٹکنے سے پوچھنے لگے تو صہد لا جواب ہو گیا۔

”شاید نہیں۔“ مختصر سا اعتراف مگر کوئی کی صورت صہد کے ہونٹوں سے نکلا۔

”سفینہ جذبول اور ایثار سے گندمی بہت خاص دل والی لڑکی تھی۔ اس کی شادی عبدالکریم سے ہوئی تو تمام جذبے بغیر کسی خیانت کے اس کے نام کر دیے

کئی دنوں کے بعد یاد دل ٹوٹ کے برسے۔ جل تھل سی ہو گئی۔ جہاں سخن میں لگے مویجے اور گلاب کے پودے دھل دھلا کے ٹکڑے تھے۔ ماحول ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہاں اک نقصان یہ ہوا تھا کہ ان کے علاقے کا ٹرانسفارمر جل گیا تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ جب ان کی محسن کے احساس سے آنکھ کھل گئی۔ آج بارش کی وجہ سے وہ لوگ برآمدے میں چار پائیاں ڈالے لیٹے تھے۔ ساتھ والی چار پائی پر سفینہ بیٹم بے خبر سو رہی تھیں۔ جبکہ دینا اندر کمرے میں پڑھ رہی تھی۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے اس لیے انہیں گرم موسم زیادہ سناٹا تھا۔ اس وقت وہ باہر نہیں جاسکتے تھے اس لیے انہوں نے اوپر جانے کے لیے زینے پہ قدم رکھ دیا۔ سامنے ہی چار پائی بچھائے صہد بیٹا اندھیرے میں غیر مرئی نعلے گونگھور رہا تھا۔ وہ شاید ابھی ابھی آکے بیٹھا تھا۔

”کیسے ہو بر خوردار؟ کن سوچوں میں کم ہو یا! یہ عمر سوچنے کی نہیں بھر پور انداز میں زندگی گزارنے کی ہے۔“ چار پائی پہ اس کے برابر بیٹھے ہوئے انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”ارے نہیں اکل! کچھ بھی نہیں سوچ رہا اے بی بس لائٹ نہیں تھی تو نیند نہیں آ رہی تھی۔“ ہلکے پھلکے انداز میں انہیں مطمئن کرنا چاہا تو وہ مسکرا دیے۔

”تمہیں پتا ہے صہد زندگی بڑی عجیب چیز ہے کبھی کبھی تو اتنے انوکھے انداز میں امتحان دیتی ہے کہ انسان سمجھ ہی نہیں پاتا کہ اس میں کامیاب ہو بھی تو کیسے۔ کیوں کہ ہمیں آزما یا جا رہا ہوتا ہے سب راستے صہد راز رکھ کر۔“ ان کے انداز پہ وہ الجھ سا گیا کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ پھر گویا ہوئے اب کی بار لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

”میری کزن سارہ بلا کی طرح دار اور خوب صورت عورت تھی۔ مجھے لگتا تھا میرے جیسے خوب صورت انسان کے لیے اس جیسی فلک سے اتنی



پھر خود کیسے خیانت برداشت کرتی؟“ سفینہ کے ذکر یہ ان کے لہجہ میں احترام ہی احترام آتا رہا۔ ایک دم انہیں زور کی کھانسی آئی۔ صدمہ ہاگ کے اپنے کمرے میں رکھے کولر سے پانی لے آیا۔ ان کی پشت سہلاتے ہوئے پانی پلایا۔ ٹھوڑی دیر تک وہ نازل ہو گئے۔

”تم یہ گھر دیکھ رہے ہو؟ تم نے اپنے باپ کا گھر بھی دیکھا ہو گا۔ سفینہ نے محل میں دوسرے درجے کی عورت بن کے رہنا پسند نہیں کیا اس جھونپڑی کی وہ بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ وہ اسی میں خوش ہے۔ عبدالکریم پورے دل سے زریں کو چاہتا تھا کیا سفینہ صرف اس وجہ سے آدھے دل کا احسان رکھتی کہ وہ کم صورت تھی؟“ چاند کی روشنی میں ان کے چہرے پہ سکون ہی سکون تھا۔ ایک غیر شخص اس کی ماں کو حق بجانب ٹھہرا رہا تھا اک وہ تھا کہ تمام عمر بغض پالے بیٹھا رہا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں ماما کا بھی خوشیوں پر اتنا ہی حق تھا جتنا بابا کا۔“ وہ بولا تو اس کے لہجہ میں شرمندگی کی رشتی تھی۔

”وہ تمہیں پوری رضامندی سے عبدالکریم کے پاس چھوڑ کر آئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ تمہارا باپ تمہیں وہ بہتر مستقبل دے سکتا ہے۔ جو دنیا کا کوئی دوسرا انسان نہیں دے سکتا۔ وہ تمہارا حق تھا تم سے کیسے چھینتیں؟ وہ جب وہاں سے نکلیں تو یہ طے کر کے نکلی تھیں کہ تم زریں کے بیٹے ہو۔ اور آفرین ہے زریں۔ یہ بھی کہ اس نے محبوب کی محبوب ہستی یعنی تمہیں جی پیٹنے سے لگا کے پالا۔“ وہ خاموش ہوئے۔ چاند اپنی منزل کی طرف تھوخر تھا۔ ہلکی ہلکی ہواراحت و سکون کا سبب تھی۔ وہ پھر گویا ہوئے۔

”اولاد واقعی انسان کی آزمائش ہوتی ہے۔ میری بیٹی سمجھتی ہے۔ سفینہ نے اس سے مجھے چھین لیا ہے۔ جب کہ وہ جانتی ہے کہ سفینہ نے مجھے، میرے گھر کو، اور اسے ہمیشہ سنوارا ہے۔ پھر بھی وہ اس سے تمام زندگی نفرت کرتی رہی۔ جانتے ہو کیوں؟“ ٹانگیں اوپر کر کے اُلٹی پائی مار کے بیٹھتے ہوئے وہ

گویا ہوئے تو جہاں صدمہ نے اپنا رخ ان کی جانب کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا وہیں انہیں بلانے اوپر آتی بیٹا بھی دم سادھے کھڑی ہوئی۔

”وہ خود ساختہ غلطی کا شکار ہے، اسی غلط فہمی کا جس کے آج تک تم شکار رہے۔ پتا نہیں کیوں۔ مگر انسان جو سوچنا چاہتا ہے اور جو سمجھنا چاہتا ہے وہ سوچ، سمجھ کے دل و دماغ کو یوں تالا لگا دیتا ہے کہ پھر بڑے سے بڑا جے سود لگتا ہے۔“ وہ جیسے تھک سے گئے تھے۔ صدمہ کریم نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ بیڑھیوں پہ کھڑی بیٹا شرمندہ ہوئی۔

”سفینہ نے بہت کوشش کی کہ وہ بیٹا کے دل میں جگہ بنا سکے مگر مینا ہمیشہ اس کی ہر بات کا الٹ کرتی ان دنوں سفینہ بہت پریشان رہا کرتی تھیں۔ کیوں کہ جیسے تم زریں کے بیٹے تھے۔ ایسے ہی مینا سفینہ کی بیٹی، جسے وہ سو تیلے رشتے کی ضد میں خود کو برباد کرتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔“ سفینہ کی شخصیت کا یہ کون سا پہلو تھا جس سے وہ انجان تھی۔ وہ مینا آہٹ کیے آخری میز می پر بیٹھ گئی۔ گھوڑ انداز مینا اپنے دامن میں سنائے سمیٹے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی کسی جھنجھکی آواز ماحول میں ارتعاش پیدا کرتی پھر خاموشی چھا جاتی۔

”سفینہ چاہتی تو مجھے مینا کے خلاف کر دیتی یا خود اس کی پروا کرنا چھوڑ دیتی مگر اس نے یہ دونوں کام نہیں کیے ایک الگ طرز کی حکمت عملی اپنائی اسے اس کے انداز میں سمجھانے لگی۔ اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جو سفینہ کی محبت سے کئی بات نہیں سمجھتی تھی، وہ غصے سے کئی بات سمجھ جاتی تھی۔ سفینہ ہمیشہ مجھے سمجھاتی تھی کہ میں نہ بولوں وہ خود بری بن جاتی تھی۔ مگر میری بیٹی کی نظروں میں مجھے برا نہیں بننے دیتی تھی۔“ وہ ایک لمبا خاموش ہوئے تو صدمہ نے ان کا دکھ اپنے دل میں محسوس کیا۔ بیڑھیوں پہ بیٹھی مینا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ دبے قدموں سے نیچے چلی آئی۔

☆☆☆

دن بہت بے کیف گزر رہے تھے سب ایک



جاگنے سے پہلے ہی وہ آدمی سے زیادہ کپڑے بننا چکی تھی۔ سفینہ بیگم باہر آئیں تو حیرت زدہ رہ گئیں۔  
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں کیا میں کپڑے نہیں دھو سکتی۔“ کپڑوں کو پانی سے نکال کر نچوڑتے ہوئے وہ نرم لہجے میں ہلکا سا مسکرا کر بولی تو سفینہ بھی مسکرا دیں۔

”نہیں دھو سکتی ہو کیوں نہیں دھو سکتی مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے آج خودیے خیال کیا۔“ وہ صحن میں ہی پچھی چار پانی پیٹھ پیٹتی تھیں۔

”ماما! یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان جو کام تمام عمر نہ کرے وہ عمر کے کسی حصے میں بھی نہ کرے۔ انسان محبت میں وہ سب نہیں کر پاتا جو ضد میں کر جاتا ہے۔ میں آپ کی بات ضد میں مانا کرتی تھی۔ اس لیے مارے باندھے مانتی تھی۔ آج میں جو کر رہی ہوں محبت میں کر رہی ہوں۔“ شرواپ شرواپ تیزی سے کپڑے کھنگالتے ہوئے وہ صحن سے انداز میں بولی تو باہر جاتے صفحہ کریم کے قدم ایک پل کو ٹھہرے اور سفینہ بیگم یوں مسکرا دیں جیسے ان کی تمام عمر کی محنت، آج باہر ہوئی ہو۔

”تمہیں اندازہ ہی نہیں مینا فرید کے میں اس محبت کے لیے تمام عمر کتنا ترسی ہوں۔ میری اپنی اولاد میرے پاس نہیں تھی۔ تم میری ترسی ممتا کی تسکین تھیں۔ مگر میں تمہارے لیے بالکل اجنبی۔“ سفینہ کی سرمئی آنکھوں میں گئے دنوں کی تلخیاں پھر سے نمایاں ہوئیں۔

”ماما! میں بھی چاہتی تھی کہ میں آپ سے ناز اٹھاؤں۔ مگر ہمارے درمیان موجود رشتہ ہی ایسا تھا کہ مجھے فاصلے سمیٹنے ہی نہیں دیتا تھا۔ بابا کا آپ کو اہمیت دینا، بھول کر بھی میری ماں کا ذکر نہ کرنا، میرے ہر معاملے میں آپ کی رائے لینا ان دنوں مجھے سب برا لگتا تھا۔“ مانتے ہی آیا پسینہ صاف کرتے وہ شرمندگی سے بتانے لگی۔ گوشتن کے اس حصے میں ابھی دھوپ نہیں آئی تھی۔ مگر پھر بھی پیش بڑھ رہی تھی۔

دوسرے سے جیسے نظریں چرا رہے تھے۔ صفحہ کارویہ رفتہ رفتہ سفینہ بیگم اور فرید صاحب سے سکرم تبدیل ہو گیا تھا۔ فرید صاحب کے ہی کہنے پہ وہ انہیں پایا کہنے لگا تھا۔ صفحہ بھی اس گھر میں اب سچ معنوں میں ایڈجسٹ کر پایا تھا۔ ہر شام وہ تینوں صحن میں محفلیں جماتے تھے۔ روز فرید صاحب واپسی پہ کچھ نا کچھ لے آتے تھے۔ جو چائے کے ساتھ باتوں کے دوران سب کھاتے۔

مینا کے پیپرز ہو رہے تھے ان دنوں اس نے سب سے بات چیت کرنا بند کی ہوئی تھی۔ ویسے بھی ریونی کی شادی کے بعد اب اس کی کوئی دوست نہیں تھی۔ مینا اپنا حصہ لے کے اندر چلی جاتی۔ اس دوران بھی وہ نظریں جھکا رکھتی۔ اسے لگتا وہ مڑی ہوئی مغرور ٹپکیں ابھی اٹھیں گی اور سیاہ آنکھیں سوال کریں گی کہ میری ماں سے نفرت کرتی ہو تو مجھے کیوں چاہتی ہو۔

اس کے اس گریز سے صفحہ بھی انجان نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سفینہ بیگم اور مینا کے درمیان پچھلے دنوں تک چھائی ہوئی سرد مہری چھٹ رہی تھی۔ اسے شروع دن سے یہ مغروری با اعتمادی کی پسند آئی تھی۔ مگر جب اس نے صفحہ کی ماں کے بارے میں برے الفاظ بولے تو وہ بدگمان ہو گیا۔ مگر اس رات کے اس رویے پہ مینا کا رد عمل دیکھ کے ششدر رہ گیا۔ اس رات پایا سے ہونے والی بات چیت سے اس کے سارے گلے ٹھکے کسی ریت کی دیوار کی طرح ڈھس گئے۔ وہ بھی تو اپنی ہی ماں سے بدگمان تھا اگر مینا فرید اپنی سوتیلی ماں سے بدگمان تھی تو کیا فرق تھا دونوں میں۔

ہم اپنی ہی متضاد سوچوں کے زیر اثر آ کر اپنے گرد بدگمانیوں کے ایسے پہاڑ اٹھا لیتے ہیں کہ انہیں نہ خود سر کرتے ہیں نہ کسی کو اندر جھانکنے کی اجازت دیتے ہیں۔

اس دن بھی سورج سوائیزے پہ تھا۔ منانے مشین لگائی ہوئی تھی۔ پچھی کا دن تھا۔ سب کے



”کیا چاہیے آپ کو؟“ اس کے سوال میں بے زاری ہی بے زاری تھی۔ صدمہ مسکرا دیا۔  
”مجھے ٹھنڈا پانی چاہیے تھا۔“ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بمشکل ہلکی روکی، مبادا وہ قہقہہ لگا بیٹھتا اور رخ موڑے کھڑی بیٹا متوجہ ہو جاتی۔

”گزشتہ ایک گھنٹے میں آپ تین بار پانی پیئے آئے ہیں اتنی تکلیف کیوں کرتے ہیں پانی کی بوتل ہی ساتھ لے جائیں اور براہ کرم مجھے سکون سے کام کرنے دیں۔“ اس کے لہجے میں کئی کئی صدمہ شرمندہ سا باہر نکل آیا جب کہ بچن کی طرف آتے فرید صاحب پہ گھڑوں پانی پڑا۔ وہ دیکھ رہے تھے مینا کا رویہ سفینہ سے تو بہتر ہو گیا ہے۔ مگر صدمہ سے بہت اکڑا اکڑا کر اور سر درو پہ تھا اس کا اول تو وہ صدمہ کو مخاطب ہی نہیں کرتی تھی۔ اگر کمر بھی لیتی تو انداز سرد مہری لیے ہوتا۔ وہ بچن میں آگئے۔

”مینا بیٹا! یہ کیا حرکت کی تم نے مہمان سے کوئی ایسا رویہ رکھا ہے وہ کچھ دن میں چلا جائے گا کیا سوچے گا کہ میں نے کسی تربیت کی ہے اپنی بیٹی کی؟“ اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے تنبیہی لہجے میں سمجھایا۔ وہ جو کام ختم کر کے بچن سے نکلنے ہی والی تھی شرمندہ ہو گئی۔

”سوری بابا کمری کی وجہ سے میں سخت جواب دے گئی۔ مجھے اندازہ ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ سر جھکا کے بولی تو فرید صاحب کا دل پھسل گیا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا! کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے میں نماز پڑھاؤں پھر کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ شفقت سے کہتے باہر نکل گئے تو وہ بھی جلدی سے نہانے کھس گئی۔ وہ نہا کر نکلی تو کمر میں سناٹا تھا۔ صدمہ بھی شاید مسجد چلا گیا تھا۔ اس نے سفینہ بیگم کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بیٹھ کر نماز ادا کر رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی اور نماز پڑھنے لگی۔ نماز سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ فرید صاحب اور صدمہ آگئے کمر میں چل

”تمہارا چٹک آمیز رویہ اتنا درد نہیں دیتا تھا۔ جتنا درد تمہاری وہ حرکتیں دیتی تھیں جو تم میری نرمی سے فائدہ اٹھا کے کرتی تھیں۔“ انہیں یاد ہے ایک بار تم نے میرا نیا سوٹ چلا دیا تھا۔ اور اس حرکت میں تم اپنا ہاتھ بھی جلا بیٹھی تھیں۔ ساری رات تمہاری سسکیاں مجھے تکلیف دیتی رہی تھیں۔“

”جی یاد ہے کیسے بھول سکتی ہوں میں۔ تب تو بس ایک ہی وجہ سواری تھی کہ بس آپ کو نقصان پہنچا لوں چاہے چھوٹا سا ہی سکمی، میں نادان تھی۔ ہمیشہ آپ کو ستاتی رہی مجھے معاف کر دیں۔“ وہ کپڑے دھو چکی تھی۔ اب ان کے پیروں کے پاس بیٹھی معافی مانگ رہی تھی سفینہ بیگم کا دل بھرا آیا۔

”پیشیاں بھی ماؤں سے معافی نہیں مانگتیں میری گڑیا تمہیں احساس ہو گیا۔ میرے لیے یہ کافی ہے۔“ اس کی صبح پیشانی چومتے ہوئے انہوں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔ آج صبح صبح معنوں میں خوب صورت تھی ختم آنکھوں سے انہوں نے اس خوب صورتی کے تمام زندگی پہ محیط ہونے کی دعا مانگی اور بچن میں چل دیں۔

☆☆☆

سانوں لگ گئی بے اختیاری  
ہو یا ر سانوں لگ گئی بے اختیاری  
جب سے بدگمانوں کی دھند چھٹی تھی مینا نے گھر کا آدمی سے زیادہ کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ویسے بھی پیپرز کے بعد وہ آج محل بالکل فارغ تھی۔ صدمہ نے بھی عجیب سی عادت اپنائی۔ جب وہ بچن میں ہوتی بہانے بہانے سے بچن کے چکر لگاتا رہتا۔ جس سے مینا چڑی جاتی۔ اس وقت بھی وہ بچن میں شام کے لیے بریانی دم دے رہی تھی۔ لیمن کھر کے سادہ لان کے سوٹ میں ہم رنگ دوپٹے کا چہرے کے گرد ہالہ کیے، وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ جب صدمہ بچن میں چلا آیا۔ سلا دہائی مینا ٹھک گئی وہ فرنچ کھولے کھڑا تھا۔



پہلی سی ہو گئی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا آف وائٹ کاشن کے سوٹ میں صمد بہت وجہہ لگ رہا تھا۔ اس نے نظر بھر کے دیکھا اور باہر آ گئی۔

”محبت میں دیدار کی طلب ہی تو محبوب کا حاصل ہوتی ہے۔ مگر مینا جیسی کلنڈری لڑکی محبت کی جنگ میں کامیابی سے اپنی نسوانی انا کو جتور ہی تھی۔“ اس نے جلدی سے چھوٹے سے برآمدے میں دسترخوان پر کھانا چن دیا۔ سب چیزیں رکھ کے وہ بیٹھ گئی جب سفینہ کی نظر صمد کی پلیٹ پہ پڑی۔

”کیا ہو گیا ہے صمد آج کل میں دیکھ رہی ہوں تم کھانا ٹھیک سے نہیں کھا رہے۔ کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ سفینہ بیگم نے پریشان لہجے میں پوچھا تو فرید صاحب بھی متوجہ ہوئے۔ ان کا ذہن فوراً مینا کی کچھ دیر پہلے والی بدگیری کی طرف گیا۔

”ارے نہیں ماما میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ایسے ہی بھوک نہیں لگ رہی، کھا تو رہا ہوں۔ آپ پریشان کیوں ہو جاتی ہیں۔“ صمد نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو کباب اس کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے فرید صاحب بولے۔

”صمد بیٹا اگر گھر والوں کے لیے اداس ہو رہے ہو تو ان سے اسکا غیب پہ بات کر لو اور اگر کوئی اور پریشانی ہے تو مجھ سے کہو اپنی ماں سے کہو یوں اداس مت ہو۔“ فرید صاحب کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”ارے نہیں بابا، میں نہ اداس ہوں نہ پریشان اور گھر والے آپ جانتے تو ہیں کچھ دنوں میں پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں۔“ انہیں یاد آیا وہ پہلے ذکر کر چکا تھا۔

”بات اصل میں یہ ہے بابا کہ میں کسی کو پسند کرتا ہوں۔“ تھوڑا جھجکتے ہوئے وہ مدعا پر آیا تو فرید صاحب تہقید لگا کر ہنسنے اور سفینہ بیگم مسکرا دیں جبکہ مینا نے بامشکل نوالہ نگلا۔

”تو یہ تو کوئی پریشانی کی بات نہیں بیٹا یہ تو خوشی کی بات ہے۔“ خوش ہوتے ہوئے سفینہ بولیں تو

وہ بے اختیار فرید صاحب کا گھٹنا پکڑ گیا۔

”پریشانی کی بات ہے ماما۔ بابا وہ لڑکی بہت ٹیک، پانچ وقت کی نمازی بہت اعلا خاندان کی لڑکی ہے پتا نہیں وہ مجھے قبول کرے گی بھی یا نہیں۔“ صمد نے چور نظروں سے سرخ سادہ لان کے شلوار قمیص میں ہم رنگ دوپٹے میں لپٹے مینا کے بے تاثر چہرے کو دیکھا اسی وقت مینا نے بھی اس کی چوری پکڑی اور ناگواری سے پلیٹ پہ جھک گئی۔

”دیکھو بیٹا جی! اگر دین دار گھرانے کی بات ہے تو ہم بھی ایک دین دار گھرانے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک بات اعلا خاندان کی ہے تو بیٹا زریں کے آنے کا انتظار کر لیں امیر خاندان تو یقیناً اپنے ہم پلہ خاندان کو ہی ترجیح دیں گے۔“ فرید صاحب نے تفصیل سے جواب دیا تو سفینہ بیگم نے بھی ہلکا لگا لگایا۔

”تو اور کیا ہمارے ہیرے جیسے بیٹے کو کون انکار کر سکتا ہے۔“ صمد شرمندہ سا ہو گیا۔

”بات امارت کی نہیں ہے بابا! اس لڑکی کا معیار بہت اونچا ہے اور میں ایک کناہ کار سا بندہ ہوں۔ پتا نہیں وہ مجھے قبول کرے گی بھی کہ نہیں۔ میں اس کا دل بہت بری طرح دکھا چکا ہوں۔ پتا نہیں وہ مجھے معاف کرے گی بھی کہ نہیں۔“ وہ کھانا چھوڑ چکا تھا اس کے لہجے کی افسردگی مینا کو پہلو بدلنے پہ مجبور کر گئی۔

”جہاں محبت ہو وہاں غربت، امارت، ضد، انا، خامیاں، خوبیاں کچھ بھی تو نہیں دیکھا جاتا یہ تو وہ جذبہ ہی نہیں جس پہ ذرا سے اختیار کا کوئی دعو کر سکے۔ یہ تو ایک بے اختیار سا جذبہ ہے جو انسان کی انگلی تھامے کسی ننھے بچے کی طرح جہاں چاہے موڑ لے۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے جذب سے بولے تو مینا چپ نہ رہ سکی۔

”بابا جہاں بات عزت نفس کی آ جاتی ہو، اس محبت کے رنگ ماند پڑ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں تاکہ تلوار کا زخم مٹ جاتا ہے مگر بات کا نہیں۔ ہو سکتا ہے



رہ جاتی۔ پھر خود کو لٹا ڈیتی۔ ”تم نے کون سا اسے معاف کیا ہے جو وہ تم سے بات کروانے کا کہے۔“ دو آنسو گر کے اس کے آچل میں رہا جاتے۔ بابا ٹھیک کہتے تھے۔ ”محبت کرنے والے بھی ایک دوسرے سے ناراض نہیں ہوتے کیونکہ محبت میں، انا نہیں ہوتی۔“ اس کی ناراضی بھی اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ مگر وہ ضد بھی جو آج تک قائم تھی اور اسے وہ برا نہیں پارہی تھی۔

دن سو گوارے گزر رہے تھے۔ وہ سارا دن خود کو کاموں میں مصروف رکھتی رات کو صبح کی یاد سے دل کو بہلاتی، کبھی بے اختیار نرس دیتی، کبھی پھوٹ پھوٹ کے رو دیتی۔

اس رات بھی بادل ٹوٹ کے برسے تھے۔ دوپہر پہلی رات کا سماں چھایا تھا۔ اس نے پائپ لگا کے سارا ٹھنک دھو دیا۔ وہ وائپر لگا رہی تھی۔ جب دروازہ بجا سامنے اچھی صورتیں تھیں۔ ادھیڑ عمر مرد اور عورت میاں بیوی تھے شاید۔ مگر چاند سورج کی جوڑی لگ رہے تھے۔ ان کے ساتھ بارہ اور چودہ سال کے دو شرابی بچے آنکھوں میں شوق کا جہان آباد کیے اسے دیکھ رہے تھے۔

”بیٹا یہ فرید صاحب کا ہی گھر ہے؟“ دبی مسکراہٹ ہوٹوں پہ بجائے عورت نے دریافت کیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی۔

”جی مگر وہ ابھی آفس گئے ہیں۔“ اس نے ان کے یوں دیکھنے پہ جھجکتے ہوئے بتایا تو وہ مسکرا دیں۔

”چلو تمہاری امی تو گھر پر ہوں گی تاہم ان سے مل لیتے ہیں۔“

اس نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ سفینہ کو اطلاع دے کر وہ نہانے گھس گئی۔ واپس آئی تو بابا بھی آچکے تھے۔ وہ حیران ہوئی بابا تو کبھی اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر پوچھ نہیں آتے تھے۔ اس نے جلدی سے چائے بنائی مچن میں لوازمات کے شاہ پر دھرے تھے شاید بابا رکھ گئے تھے۔ اس نے جلدی سے کباب فرانی کیے اور ٹرے میں باقی لوازمات سجا کے

صمد صاحب کے منہ سے کوئی ایسی ہی بات نکل گئی ہو جس کا مدا ممکن نہ ہو۔“

مینا کھانا کھا چکی تھی۔ برتن سمیٹتے ہوئے وہ عام سے لہجے میں بڑی بات صمد کو سناتے ہوئے فرید صاحب سے کہہ گئی۔ فرید صاحب شرمندہ ہو گئے۔

”تم اس کی بات کا برا مت ماننا وہ نادان ہے بنا سوچے سمجھے بول جاتی ہے۔ دل کی بری نہیں ہے وہ۔“

”میں نے برا نہیں مانا بابا! میں جانتا ہوں وہ دل کی بری نہیں ہے۔ اور اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا ورنہ بعض اوقات ہم سے ہی بہت غلطیاں ہو جاتی ہیں جن کا مدا ممکن نہیں ہوتا۔“ وہ بات کو سینٹا اوپر آگیا۔ یہ الگ بات کہ پھر وہ ساری رات سو نہیں سکا۔

☆☆☆

دن یہ دن گزرنے لگے۔ عبدالکریم کی فیملی پاکستان آ چکی تھی۔ مگر وہ کئی دن سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر شہر کے پوش ایریا میں فرنٹڈ گھر پسند آئی گیا۔ بہت جلد زریں وغیرہ پاکستان شفٹ ہو گئے۔ صمد بھی ان کے ساتھ شفٹ ہو گیا۔ مینا سارے گھر میں بولاٹی بولاٹی پھرتی۔ وہ جو جھوٹی انا کا علم بلند کیے اجنبیت کا لبادہ اوڑھے چور نظروں سے کاسہ دید بھرتی پھرتی رہتی تھی۔ اب جیسے خالی خالی نظروں سے گھر کے درو پوار گھورا کرتی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے چلے جانے سے پورا گھر ویران لگنے لگے۔ میں تو اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی پھر یہ بے چینی کیوں۔“ وہ خود سوال کرتے الجھ جاتی۔

سفینہ بیگم اور فرید صاحب اس کی بے چینی کو امتحان کے بعد کی فراغت کی بے زاری سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے ایم ایس سی میں ایڈمیشن کا مشورہ دیا۔ جسے اس نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ اب مزید پڑھنا نہیں چاہتی۔ صمد نے دو تین بار سفینہ بیگم کو کال کی فرید صاحب سے بھی بات کی وہ دل مسوس کر



بلا کی سختی تھی۔

”تم جانتی ہوتا میں تمہیں پسند کرتا ہوں تمہارے سوا کسی کو سوچتا بھی نہیں چاہتا پھر بھی تم نے ابا کو بچ نہیں بتایا؟“ وہ جیسے کر لایا۔

”ہاں پھر بھی میں نے نہیں بتایا۔ تم سے تعلق جوڑنے کے لیے میں کوئی بھی پیش رفت نہیں کرنا چاہتی۔ کیوں کہ میں متاثر فرید ہوں۔ اپنی عزت نفس مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔“ اس کا لہجہ برف سا سرد تھا۔ باہر بادل زور سے گر جا۔

”متاثر فرید! میں صمد کریم خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ قسم اٹھاتا ہوں کہ تمام عمر تمہاری عزت نفس کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کروں گا۔“ اس کے باؤں کے پاس سخن کے پتھوں بیٹھا صمد کریم کوئی فقیر لگ رہا تھا۔ جبکہ پکن کے دروازے پر کھڑی سفینہ بیگم آنکھوں میں نمی لیے ساکت کھڑی تھیں۔ دلہیز یہ قدم رکھتے فرید صاحب، صمد کے آخری الفاظ سن چکے تھے۔

”اور مجھے بھی ایسا ہی داماد چاہئے تھا۔ جو میری بیٹی کو عزت اور احترام دے سکے۔ میں شکر گزار ہوں اپنے رب کا جس نے ہمارے دلوں سے بدگمانی کی میل اپنی رحمت سے دھو ڈالی۔“ فرید صاحب نے اندر آ کر زمین پر بیٹھے صمد کریم کو گلے لگالیا۔ سفینہ بیگم بھی مسکراتی ہوئی ان سب کے پاس آ گئیں، دفعتاً تیز بارش نے سارے ماحول کو بل جھل کر دیا تھا وہ سب اندھ بھاگے۔ چنانے ناراض نظر اس یہ ڈالی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ کئی دن کے بعد شکر ادا ہی گئی۔ محبت اس کے لیے شب سیاہ کا چاندھی اور چاند سے نظریں کون چراتا ہے۔ گردہ اتنی جلدی صمد کو محاف بھی نہیں کرنے والی تھی۔ سزا سے ملتی ہی تھی۔

☆☆

ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔

”معاف کرنا مگر مجھے اپنی بیٹی کے لیے ایسا گھر چاہیے۔ جہاں اس کی دل سے قدر ہو۔ میں اپنی بیٹی کے لیے ایسا شریک سفر چاہتا ہوں۔ جو میری بیٹی کو پسند کرتا ہو بلا شرکت غیرے۔“ دھیمے لہجے میں فرید صاحب نے انکار کیا تو سب کو چائے سرو کر دینی بات کی نزاکت سمجھ کر فوراً کمرے سے نکل گئی۔ زریں نے جاتی ہوئی مینا کو دیکھا انہیں یہ لڑکی اچھی لگی تھی اور سب سے بڑھ کر صمد کی پسند تھی۔

”صمد نے مجھے خود بتایا تھا۔ کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہے۔ آپ کا آتما ر آنکھوں پر کمر اس سلسلے میں میری طرف سے انکار ہے۔“ زریں سنائے میں آ گئیں۔ ”دیکھیں فرید صاحب آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر صمد کسی کو پسند کرتا تو ہمیں آپ کی طرف کیوں بھیجتا۔“

عبدالکریم ان کے انکار پر ششدر تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کے وہ لوگ لوٹ آئے۔ صمد لان میں ہی پیشان کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی گیٹ سے اندر آتے ہی وہ بے صبری سے روش کی جانب بڑھا۔

”انہوں نے انکار کر دیا صمد!“ اور صمد کو لگا کھڑے قد سے گر جائے گا۔ کچھ دیر میں وہ گاڑی بھاگتا پینا کی طرف جا رہا تھا۔ زریں نے روکنا چاہا مگر عبدالکریم نے اشارے سے منع کر دیا یہ معاملہ وہ خود اچھے انداز میں سلجھا سکتا تھا۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ وہاں پہنچا۔ دروازہ مینا نے کھولا اسے راستہ دے کے اندر جانے لگی تو اس نے راستہ روکا۔

”تم نے انکار کیوں کیا مینا؟“ لہجے میں شکوہ ہی شکوہ تھا ایک بل کو مینا کی سانس رکی مگر اگلے ہی بل وہ سنبھل چکی تھی۔

”میں نے انکار نہیں کیا ابانے کیا ہے۔“ اس کی بات سن کے صمد کی جان میں جان آئی مگر اگلے ہی جیلے نے اسے ساکت کر دیا۔ ”ابانہ بھی انکار کرتے تب بھی میں انکار کر دیتی۔“ ٹھہرے ہوئے لہجے میں



مکتبہ فیل

نادیہ احمد

# عشق و قہار





دوران جانے سے پہلے انمول کی اگلی مصروفیات کے متعلق سوال کرنا جس کا لگ بھگ حال اور سرسری سا جواب پچھلے چند ماہ سے دہرایا جاتا۔ اسے سن کر قاسم نے کچھ کسی رد عمل کا اظہار کیا تھا نہ ہی اپنی طرف سے اس میں کوئی مشورہ دے کر اپنی دلچسپی شامل کی تھی۔ اپنے سوال کے بعد اسے اس بات کی رتی برابر پروا نہیں تھی کہ انمول کا جواب کیا ہوگا اور اب کچھ عرصے سے انمول کو بھی قاسم کی گفتگو سے بس اتنی ہی دلچسپی رہ گئی تھی کہ وہ ”کہہ“ دیتا تھا اور انمول ”من“ لیتی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے انمول، قاسم کے یہی سوال پوچھنے پہ لمبی چوڑی تنبیہ باندھے نان اسٹاپ اسے پورے دن کی ممکنہ مصروفیات کے متعلق بتایا کرتی۔ گریڈ کرید کر اس سے اس کی فرمائش پوچھتی اور پھر اسی کے مطابق ڈنر کا مینو پلان کرتی۔ ڈنر کے دوران دس بار ”کھانا کیسا ہمارا ہے؟“ کا سوال دہرایا جاتا جس کا جواب ہمیشہ لائقہ سے ”ٹھیک ہے“ کہہ کر دیا جاتا۔ پھر جب وہ رات کو ہاتھ میں ٹی وی کا ریٹھوٹ تھا تو نگاہیں اسکرین پہ جمائے اپنے معمول کے انداز میں یہ پوچھتا کہ اس نے آج ”کیا“ کیا تو انمول اس کے کندھے پہ سر ٹکائے اگلی ہی پوروں پہ کتنی ”سوچ سوچ“ کر دن بھر کی ہر چھوٹی بڑی بات اس کے گوش گزار کرتی۔ کس وقت کون سا کام کیا۔ قاسم کے اس چند حرفی سوال کا اس کے پاس ہر روز لمبا چوڑا مفصل جواب ہوتا تھا۔ اس بات سے لاپرواہ کہ وہ اس پل اسے نہیں بلکہ ٹی وی پہ پیشے کی نیوز سن کر کو سننے میں محو ہے وہ بس بولتی چلی جاتی یوں جیسے ان لمحوں میں اپنی دن بھر کی تنہائی کا ادا کرتی۔ وہ سوچیں جو سارا دن اسے بے چین رکھتیں رات کو اس ایک گھنٹے میں قاسم سے کہہ کر وہ پرسکون نیند سو جاتی۔ ایک عرصے تک وہ یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ اس وقت قاسم ”کے“ من رہا ہے۔ اس کی بے مقصد گفتگو کیا پھر حالات حاضرہ پہ تیسرہ کرتے تجزیہ نگاروں کے بیچ اور جھوٹ کو۔ وہ بس بولتی رہتی تھی۔ مگر یہ سب تو اب

وہ دبیر کی ایک خشک مگر اداس صبح تھی۔ سورج کا تھال ابھی افق کے اس پار کھڑا اپنی پہلی چھب دکھلا رہا تھا جب اس نے بے دلی سے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ سر ہوا کا تیز جھونکا اس کے گلابی گالوں کو سرخ کر گیا تھا۔ خشکی کا احساس ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر رہا تھا پھر اس بل وہ جیسے اس شدت کو اپنے اندر اتارنا چاہتی تھی اسی لیے تو بے آرام ہونے کے باوجود اس کا پاس سے بظا اٹھا رہی تھی۔ چند منٹ یونہی سکون و بے سکونی کے ساتھ گزرے۔ سامنے دیوار پہ لگے کلاک میں اب آٹھ بج رہے تھے۔ ایک گھر اس سانس لیتے اس نے شیشہ برابر کیا اور پردے گرا دیے۔

☆☆☆

”کیا پلان ہے تمہارا آج؟“ قاسم نے اخبار کی سرخیوں پہ نگاہ دوڑاتے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔

انمول کا چائے دانی سے اپنے گم میں چائے اٹھیلتا ہاتھ ایک پل کو تھا۔ اس نے قاسم کی طرف دیکھا جس کی مکمل توجہ اس وقت ہاتھ میں پکڑے اخبار کی شد سرخیوں پر تھی۔ یہ وہ معمول کا سوال تھا جو ہر صبح ناشتے کی میز پہ دہرایا جاتا اور جس کے جواب میں اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

حسب سابق وہ آج بھی اتنا ہی لاپرواہ دکھائی دے رہا تھا جتنا آج سے پہلے ہوا کرتا تھا۔

”کچھ الگ نہیں۔ وہی روٹین کے کام۔“ انمول نے چائے میں چینی ملائے تنبیہ کی سے کہا اور سلاکس پہ یکھن لگا کر قاسم کے آگے رکھا۔ اخبار ایک طرف رکھتے وہ اب ناشتے میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ پوری روٹین سے ناشتا کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے وجود سے غافل اور لائق۔ انمول نے ایک حسرت بھری نگاہ قاسم پہ ڈالی اور پھر سامنے پڑا اپنی سر دھونی چائے کا کپ یوں سے لگا لیا۔

قاسم کے لیے سب کچھ جیسے ایک میکائی روٹین کا حصہ تھا۔ ”بیش کرنا“، ”شیر کرنا“، ”شادر لینا“، ناشتے کی میز پہ بیٹھ کر ”اخبار“ پڑھنا اور اس



ایک نیا دروازا ہوا۔ اسے قاسم کا رویہ، اس کی خاموشی، اس کا لگا بندا مزاج، اپنے کام اور ذمہ داریوں میں حد درجہ مصروف رہ کر خود انمول کی ذات کو نظر انداز کرنا چاہیے لگا۔

جس دن اس پر یہ راز منکشف ہوا کہ قاسم کو اس کی پروا نہیں اس نے قاسم کی پسند و ناپسند کی پروا کرنا چھوڑ دی لیکن انفس اسے انمول کے اس احتجاج سے بھی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ اس کے بدلے مزاج پر چونکے گا تو وہ غلطی اور اپنی غلطی کا احساس انسان کو سموت مارتا ہے۔ وہ بھی ہر روز مر رہی تھی پھر بھی جیسے جاری تھی۔ بے جی شرط بھی جینے کے لیے اور قاسم کی طرف سے بے جی کا لبادہ اس نے بھی اوڑھ رکھا تھا لیکن سچ تو یہ ہے بظاہر خود کو تارل رکھنے کی کوشش میں وہ اندر ٹوٹ چکی تھی۔

مرد کا سراپا اس کی تھوڑی سی بھی توجہ عورت کے لیے انرجی ڈریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب تک وہ یہ معمولی سی چمکی پانی رہے جاری رہتی ہے۔ اپنی ہمت اور بساط سے بوجھ کر محنت کرتی ہے۔ شوہر کی بے گامگی کی ہمت توڑنے لگتی ہے۔ اسے ناکارہ کرنے لگتی ہے۔ خود اپنا آپ بھی بوجھ لگنے لگتا ہے اور انمول کے لیے پچھلے چند ماہ سے زندگی ہی بوجھ بن گئی تھی۔

جب سے یونیورسٹی دوبارہ جوائن کی تھی اس کی اپنی مصروفیت حد درجہ بڑھ چکی تھی پھر بھی اس نے بھی قاسم اور گھر کو نظر انداز نہیں کیا۔ قاسم کا رویہ اب بھی اتنی ہی تکلیف دینا لیکن مصروفیت میں وہ ان باتوں پر کم دھیان دیتی۔

کارزن ٹیمیل پہ پڑا قاسم کا والٹ اور گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھاتے اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ روزانہ کی طرح انمول کا شکریہ ادا کرتے قاسم نے مسکرا کر اس کے گالوں کو چھوا اور پھر اسے الوداع کہتے لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ ایک گہری سانس لیتے وہ ڈائننگ ٹیمبل کی طرف چلی اور بے دلی سے میز پہ پڑے ناشتے کے خالی برتن اٹھاے بنین کی

پرانا قصہ تھا جب انمول اور قاسم کی ”نئی نئی شادی“ ہوئی تھی۔ تب خواب خوش نما لگتے تھے اور زندگی خوب صورت تھی۔

تعبیر کی گئی اس وقت محسوس ہوئی جب قاسم کی خود سے لا پرواہی کو محسوس کرتے انمول کے دل میں بدگمانی نے جڑیں گاڑیں۔ وہ نہیں بدلتا تھا ہاں انمول واقعی بہت بدل گئی تھی۔ بولتے بولتے خاموش ہو گئی تھی۔ اچانک اسے اپنی باتیں غیر ضروری اور احمقانہ محسوس ہونے لگیں۔ اس نے خود ہی قاسم کے سامنے خاموشی اختیار کر لی۔

جیسے اس کی طویل گفتگو سے قاسم کبھی عاجز نہیں آیا تھا بالکل اسی طرح اس کی خاموشی نے بھی اسے حیران کیا تھا نہ پریشان۔

”او کے پھر میں چلا ہوں۔“ احمہ میں چائے کا کپ تھا وہ خیالی نظروں سے لوہگ روم کی دیوار کو گھورے جاری تھی۔ قاسم کی آواز پہ چونک کر اس نے اس کی طرف دیکھا وہ اپنا ناشتا مکمل کر چکا تھا۔ چائے کی پیالی سے آخری گونٹ بھرتے اس نے آج بھی انمول کے چہرے پہ لکھی ”خاموش شکایت“ کو نظر انداز کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے حسین چہرے کی شادی پہ کبھی نگاہ نہیں ڈالی تھی اور جس کا احساس انمول کو کچھ عرصہ پہلے ہی ہوا تھا۔

ایک وقت تھا جب سارا دن مصروف رہنے کے باوجود بھی وہ شام ہوتے ہی قاسم کی آمد سے پہلے خوب بیٹاؤ سنگارا اور بہترین لباس میں لمبوس اس کا استقبال کرتی تاکہ کبھی اسے اپنی جھکن کا احساس نہ ہونے دے کیونکہ قاسم ایک فیس اور خوش لباس انسان تھا۔ اسے اپنی چیزوں میں ترتیب پسند تھی۔ قاسم نے بھی نہیں کہا تھا کہ وہ انمول کو اس انداز میں دیکھنا چاہتا ہے پر تو کا بھی نہ تھا۔ وہ سراپا نہیں تھا تو مزہ بھی نہیں بناتا تھا۔ نہ ہی انمول کی حوصلہ افزائی کی تھی لیکن اس کا انمول کے ساتھ ایڈجسٹ کر لینا ہی اس کے لیے کسی دلیل سے کم نہیں تھا۔

پھر یہ سلسلہ ایک دن رک گیا۔ انمول پہ آگہی کا



وقت یہاں؟“ رابعہ نے مسکراہٹ چہرے پر سجائے  
بے تکلفی سے پوچھا۔ وہ بھی اپنے کلاس فیلوز سے  
ابھی ناموں کی حد تک ہی واقف تھی ماسوائے علی کے  
جس کی شہرت اوائل دنوں میں ہی اس کی غیر معمولی  
ذہانت کی بدولت پہنچی تھی۔ جن چند ایک سے اس کی  
دوستی ہوئی تھی ان میں رابعہ سرفہرست تھی۔ علی سے  
بھی اس کا تعارف نام کی حد تک ہی تھا لیکن اس کی  
ذات میں تجسس نام سے بڑھ کر ہونے لگا تھا اور اسی  
لیے چند ایک بار اس نے رابعہ سے علی کے حوالے  
سے ذکر کیا۔ اب یہ رابعہ کی زیر نگاہ بھی جو اس نے  
اس کے فطری تجسس میں پوشیدہ پسندیدگی کی جھلک کو  
تاڑ لیا تھا اور جان بوجھ کر گاہے بگاہے اس کا نام گفتگو  
میں شامل کرنے لگی تھی۔

”رسول ہونے والی“ شام بخن کے سلسلے میں  
مجھے دراصل ثقلین صاحب سے ملنا تھا۔“ اس کے  
چہرے کا تحیر، جل میں بدلتا تھا۔ ثقلین صاحب ان کے  
پروفیسر تھے اور ان کے ڈیپارٹمنٹ کی غیر نصابی  
سرگرمیوں کے انچارج۔  
”اچھا تو آپ ان کے ساتھ آرگنائز رہیں۔“

رابعہ نے بات بڑھانے کی خاطر کرید۔ اس کی اوٹ  
میں وہ اب بھی سر جھکائے خاموش کھڑی اپنی سینڈل  
کو سینٹ کے فرش پر رگڑ رہی تھی۔

”جی نہیں میں شرمکام میں سے ہوں۔“ اس نے  
کہا تو رابعہ نے متاثر کن انداز میں سر ہلایا۔ علی کو لگا  
شاید گفتگو موقوف ہوئی لہذا آگے قدم بڑھائے۔

”کیا ہم بھی سننے آ سکتے ہیں؟“ علی نے جاتے  
جاتے رک ٹران کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اس کی  
طرف دیکھنے سے گریزاں تھی۔ ناخن سے ہاتھ میں  
پکڑی فالٹ کا کور کھرچتے اس کی نگاہیں جھکی ہوئی  
تھیں۔

”ضرور۔ کیوں نہیں۔ یہ شام بخن پورے  
ڈیپارٹمنٹ کے لیے ہے۔ کل صبح نوٹس بورڈ پر نوٹس  
بھی لگ جائے گا۔“ اس باعلی نے بھی اسے گہری  
نگاہوں سے دیکھا تھا اور اب وہ براہ راست جیسے اسی

طرف بڑھ گئی۔  
آج کا دن مختلف تھا۔ آج یونیورسٹی کا آف تھا  
تو اب باقی کا سارا دن اسے اس خالی مکان میں تنہا  
اور بوجھل وجود کے ساتھ گزارنا تھا۔

☆☆☆

”وہ دیکھو کون آ رہا ہے۔“ رابعہ نے اس کی کمر  
میں کہنی مارتے اس کا دھیان سامنے سے آتے علی کی  
طرف دلایا۔ وہ دونوں لائبریری سے نکل رہی تھیں  
جب وہ اپنے مخصوص لباس میں ڈیپارٹمنٹ کی  
بلڈنگ کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ سفید کٹن کا کرتا،  
ٹھکسی ہوئی جینز اور پیروں میں سیاہ پشاور سیٹل۔  
اس اوٹ پٹانگ طبع کے باوجود وہ پرسکش لگ رہا  
تھا۔ مختلف لگ رہا تھا اور اس کا مختلف لگنا ہی اسے علی  
کی جانب متوجہ کرتا تھا۔

”لیکن ابھی تو کلاس ختم ہوگئی پھر یہ  
ڈیپارٹمنٹ کی طرف کیوں جا رہا ہے؟“ ہاتھ میں  
پہنی اپنی ٹیس اور قیمتی کھڑی میں وقت دیکھتے اس نے  
رابعہ کے کان میں سرگوشی کی۔

”ایلیکٹریسیٹی! رابعہ کی آواز پہ وہ چونک کر رہا  
اور حیرانی سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟“ وہ تحیر سے  
بولا۔ حالانکہ وہ ان کا کلاس فیلو تھا لیکن بھی بات  
چیت نہیں ہوئی تھی شاید اسی لیے وہ بھی حیران تھا کہ  
یوں اچانک راستے میں ایسے روکا گیا تھا۔ ویسے تو  
اسے پوری یونیورسٹی جانتی تھی۔ وہ کلاس کا سب سے  
ذہین اسٹوڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ڈیپارٹمنٹ  
کے سب سے اساتذہ کی آنکھ کا تارا تھا اور اس کی  
یہاں بے شمار دوستیاں تھیں۔ اس کے گردلو کے  
لڑکیوں کا جھگھکار ہوتا جس کی بنیادی وجہ اس کے وہ  
جامع نوٹس تھے جو دھڑا دھڑکا ہوا کرتے تھے۔  
ادب میں اس جیسا مزاج پانے کے لیے ان سب کو کم  
سے کم چندہ بیس سال درکار تھے اور یہ بات اکثر  
پروفیسر کلاس میں متعدد بار دہرائے جاتے تھے۔

”یونیورسٹی کا نام تو ختم ہو چکا ہے پھر آپ اس



بات نہیں تھی۔ وہاں ہمارے علاوہ بھی بچا سیوں اسٹوڈنٹ ہوں گے اور شاید اسے تو خبر بھی نہ ہو کہ ہم ہال میں موجود ہیں بھی یا نہیں۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی جبکہ پیچھے وہ اب تک کنفیوز کھڑی لب کاٹ رہی تھی۔

☆☆☆

اتوار کا دن اکثر گھر کے ان کاموں کی نذر ہوا کرتا تھا جو یونیورسٹی کی وجہ سے رکے رہتے تھے اور آج ان ہی کی باری تھی۔

دن بھر گھر کے کام کے بعد سہ پہر کو جائے گا کپ تھا سہ وہ اپنی فائل اور کتابیں لیے باہر آ کر بیٹھ گئی۔ قاسم دو پہر میں کھانا کم ہی کھاتا تھا اور چھٹی کے دن عموماً اس وقت کچھ دیر آرام کیا کرتا تھا۔ اب بھی وہ سبھی سمجھ کر باہر آ گئی لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ اس کے پیچھے اس کے پاس آ گیا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ قاسم کی آواز پہ اس نے سر اٹھایا۔ وہ عام سے اعزاز میں سوال کرتا اس کے پاس رکھی خالی کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا۔

”فوس بنار رہی تھی کچھ ریفرنس اسکے کر رہی ہوں۔“ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر انمول نے ہاتھ میں پکڑا قلم کتاب میں رکھا اور کتاب کو فائل کے اندر رکھ کر بند کرتے ہوئے سامنے بڑی میز پہ رکھ دیا۔ موسم میں خشکی ان دنوں دم توڑنے لگی تھی اور اب ڈھلتے سورج کی نرم گرم کرنوں کے ساتھ یہ پل بدن کو تمازت دیتے تھے۔

”ہم..... گڈ۔“ وہ گہری سوچ میں تھا۔ نگاہیں لان میں بنے سینٹ کے چوڑے پہنگی میں جہاں پرندوں کے لیے دو بیالوں میں دانہ اور پانی رکھا جاتا تھا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی وقت تھا اور وہاں تین چڑیا دانہ چک رہی تھیں۔ ہر روز یونیورسٹی جانے سے پہلے وہ باقاعدگی سے ان میں پانی اور دانہ ڈالتی تھی اور چند روز بعد ہی پرندوں نے وہاں آنا شروع کر دیا تھا اور اب تو اتنے غر ہو چکے تھے کہ انہیں سامنے دیکھ کر بھی گھبراتے نہیں تھے۔ بے اختیار دھیمی سی

سے مخاطب تھا۔ خود یہ نگھی اس کی نظروں کو محسوس کرتے اس نے بھی پگھلیں اٹھائیں اور پھر نگاہوں کے اس تصادم نے جذبول میں طوفان برپا کر دیا۔ ان گہری سیاہ آنکھوں سے چمکتی ڈھانٹ اور چمک میں ایک نیارنگ نمودار ہوا۔ ستائش کا رنگ۔ جو بھوری آنکھوں نے شرماتے ہوئے موصول کیا۔ وہ چاہ کر بھی اس بار نظریں جھکا نہیں سکی تھی اور پھر علی کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بیٹا کچھ کہے وہ آگے بڑھ گیا جبکہ وہ خود راجہ کی اوٹ میں کھڑی اب بھی ان نظروں کے حصار میں تھی۔

”میں نہیں جاؤں گی راجہ۔“ جلتے جلتے وہ اب نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا کہ اچانک وہ ہوش میں آئی اور باس کھڑی راجہ پہ بگڑی۔

”لیکن کیوں؟“ راجہ کو شدید حیرت نے آگھیرا۔ اسے تو لگا تھا یقیناً وہ بے تحاشا خوش ہوگی۔

”پتا نہیں کیوں مجھے اس کی نظروں سے خوف آ رہا ہے۔“ وہ اب تک خود پہ مرکوز اس کی گہری نگاہوں سے اپنے اندر ہوتی جھنجھٹا ہٹ پہ تشویش میں مبتلا تھی۔

”وہ کیوں؟“ راجہ نے حیرانی سے سوال کیا۔  
”روح کے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اس کی نظریں۔“ وہ چلا گیا تھا لیکن اپنا احساس وہیں چھوڑ گیا۔

”حد ہو گئی یار۔ یہ بھی بھلا کوئی توجیہ ہے اسے اپوائنڈ کرنے کی؟“ راجہ جھنجھلا کر بولی۔ اسے لگا اس کی ساری محنت اکارت لگی ہے۔ بجائے خوش ہونے کے یہاں تو پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔

”تم سمجھ نہیں رہی ہو راجہ یا شاید میں تمہیں سمجھا نہیں پا رہی۔“ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چہرے پہ آنی لٹوں کو سلجھاتے اس نے بے بسی سے کہا۔

”تم خود سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو مائی ڈیر۔“ راجہ نے اس کے کندھے کو ہلکے سے تکی دی۔  
”خیر میرے حساب سے تو یہ کوئی اتنی بڑی



مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔

شامی نہ کر پایا۔

”اچھا سنو میں کل صبح ایک میٹنگ کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہوں۔ کم سے کم ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔“ انمول پوری طرح متوجہ تھی۔ جتنی بھی وہ پوچھتی بے سبب آکر اسے اسٹڈی کے دوران ڈسٹر ب نہیں کرتا۔ یقیناً کچھ اتنا اہم تھا جو وہ اس سے مخاطب تھا۔ ”اچانک؟“ انمول کو حیرت کے ساتھ پریشانی نے آگیرا دھکھی اتنے عرصے میں قاسم کے بغیر گھر پہنچا لیکن نہیں رہی تھی۔ قاسم کام کے سلسلے میں اگر بھی گھر پہنچا تو حد سے حدرات تک واپسی ہو جاتی تھی۔

کچھ اس لیے بھی انمول کا انحصار قاسم پہ تھا کیونکہ وہ شادی کے بعد جوائنٹ فیملی کے بجائے الگ رہتے تھے۔ اس سے بڑا بھائی بھی اپنی فیملی کے ساتھ الگ گھر میں مقیم تھا جبکہ چھوٹا بھائی اور ایک بہن والدین کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑے بیٹے کی طرح قاسم کے والد نے اسے بھی شادی کے بعد الگ رہائش کا بندوبست کرنے کی سنجیدگی پہلے ہی کر دی تھی۔ اس کا کام اچھا تھا لیکن ابھی اپنے بیروں پہ اس انداز میں نہیں کھڑا ہوا تھا کہ الگ گھرداری کا مالی بوجھ سہا سکتا پھر بھی اسے اپنا سیٹ اپ بنانا پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ تھا۔

”چند دن بعد ”ایکسپو“ ہے کچھ کمپنیوں سے میٹنگز بھی اس دوران شیڈول کر لی ہیں۔ اتنے دن تو لوگ ہی جائیں گے۔“ وہ خود بھی فکر مند تھا لیکن اتنی تسلی تھی کہ پیچھے انمول اور خود اس کی فیملی اس کا خیال رکھیں گی۔ وہ چاہتا تو انمول کو اس کے میکے میں رکھنے کا مشورہ بھی دے سکتا تھا لیکن وہ یہ بات انمول پہ مسلط کرنے کے بجائے اس کے ایما پہ چھوڑنا چاہتا تھا۔

”تم فکر نہ کرو ٹیٹلی بل آج صبح ہی میں نے سب جمع کر دیا ہے۔ کچھ پیسے تمہاری دراز میں رکھے ہیں اور ایک سائن ہوا چیک میری دراز میں رکھا ہے۔ ایرر جیسی ہو تو نکال لینا۔“ وہ اپنی طرف

ان دونوں کی شادی ”ارنج“ تھی۔ انمول اور قاسم کے والد پرانے دوست تھے اور یہی دوستی ان کے رشتے کی بنیاد بنی۔ انمول ان دنوں ”ایم فل“ کر رہی تھی جبکہ قاسم نے ایم بی اے کے بعد کچھ عرصہ جاب کی اور حال ہی میں اپنا بزنس شروع کیا تھا۔ رشتہ طے ہونے سے پہلے دونوں کے درمیان بس نام کی حد تک جان پہچان تھی تو رشتہ ہونے کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کو پہلی بار سب کی موجودگی میں دیکھا۔ قاسم ایک وجہ پر مرد تھا، کسی بھی لڑکی کی پسند ہو سکتا تھا اس لیے انمول کو بھی اچھا لگا تو دوسری طرف انمول میں بھی کوئی ایسی خامی نہ تھی جس کی بنا پر اس رشتے سے انکار کیا جاتا۔ وہ خوب صورت تھی، اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ قاسم اسے کس بنا پر پسند کرتا لہذا بڑوں کی خواہش کو عملی جامہ پہناتے ان دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔

شادی کے بعد زندگی کا آغاز بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ باشعور اور دنیاوی سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کی زندگی کا ہوا کرتا ہے۔ قاسم کا مزاج دھیمہ تھا۔ وہ بہت باتوئی نہیں تھا اور بلاوجہ باتوں کو اٹھانا یا جھگڑا کرنا اس کی فطرت کا حصہ نہیں تھا۔ البتہ اس نے کام کا شدید بوجھ تھا جو کہ اس نئے نئے پینٹے کاروبار کی وجہ سے اتنا زیادہ تھا کہ شادی کے بعد وہ انمول کو نہیں گھمانے پھرانے بھی نہیں لے کر گیا۔ انمول کی اپنی طبیعت میں شکوے شکایات کا عنصر نہیں تھا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ایک پڑھے لکھے باشعور انسان کا ساتھ تھا جو قاسم کی صورت پورا ہوا تھا۔ وہ طبعا رومانیت پسند تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوشیاں تلاش کرتی۔ بدلتی رتوں اور کھلتے پھولوں کو دیکھ کے نہال ہو جاتی۔ اسے قاسم کے کیش فلو اسٹینٹ کو دیکھ کر ماتھے پر ہنسی سلوٹیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ وہ کوئی ٹین ایجر نہیں تھی نہ ہی ٹین ایجر کی طرح کارہیہ رکھ سکتی تھی لیکن قاسم ٹینس شٹل کے عدد گننے میں اتنا مصروف تھا کہ وہ انمول کی ہنسی کا



ذات بھی اس کی سب سے کم حصہ دار بن پاتی ہے۔  
 ”کاش آپ جان سکتے قاسم میری  
 ”ضرورت“ صرف آپ ہیں۔“ بے اختیار اس کے  
 لبوں سے نکلا۔ اس کی طرف دیکھتے، انگلی سے ناخن  
 کھرچتے اس کی سرکشی اتنی دہشتی تھی کہ قاسم کچھ سن  
 نہیں پایا۔ شاید وہ اب اپنی روانگی کے متعلق سوچ رہا  
 تھا۔

وہ دو الگ سیاروں کے لوگ تھے، دو الگ  
 فطرتوں کے ساتھ پیدا ہو کر پروان چڑھے۔ ایک  
 ہو کر بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے تھے۔ بن ایسا بھی کیا  
 کہ ایک ہی چھت تلے رہتے وہ اس سے اتنا بے گانہ  
 ہو جاتا کہ مجبوراً انمول کو بھی بے پروائی کا لہا وہ اڑھتا  
 پڑتا۔ قاسم کے روپے کے قلق کو ختم کرنے کی خاطر  
 ہی انمول نے بڑھائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ  
 اس روٹین سے ٹھک چکی تھی اور نہیں چاہتی تھی زندگی  
 بے مصرف اور بے کار گزار جائے۔ ایم فل کے بعد بی  
 ایچ ڈی ویسے بھی اس کا دیرینہ خواب تھا اور قاسم کو  
 اس بات پر ہرگز اعتراض نہیں تھا۔ یہ ایک طرح سے  
 اس کے حق میں اچھا ہی تھا کہ انمول کو کوئی ایکٹوٹی مل  
 گئی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا یہ اس کے حق میں کتنا برا  
 ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہاتھ میں  
 پکڑے اس سیاہ مخملی باکس کو عجیب نظروں سے دیکھ  
 رہی تھی۔ اسے یہ باکس آج الماری کی صفائی کے  
 دوران ملا تھا جسے کچھ عرصہ پہلے اس نے بے کار سمجھ کر  
 پھینک دیا تھا۔ آج کئی ماہ بعد اس کو دوبارہ دیکھتے  
 ذہن کے پردے پہ ایک حسیں یاد نے دستک دی  
 تھی۔

”چپی برتھ ڈے انمول۔“ ستارہ کی آواز پہ  
 چونک کر اس نے دیکھا۔ ہاتھ میں ایک خوب صورت  
 ریپر میں لپٹا گفٹ تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی تھی۔  
 ”جینک یو سوچ ستارہ۔“

مسکراتے ہوئے کہہ کر ریپر پہ گلی ٹیپ اتارنا

سے اسے تسلی دیتا ان تمام مالی انتظامات کے متعلق  
 سنجیدگی سے بتا رہا تھا جو اس نے اپنی غیر موجودگی کا  
 سوچ کر انمول کے لیے کیے تھے۔

”قاسم آپ ایک ہفتے کے لیے جا رہے ہیں  
 پھر اتنے سب انتظامات کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے  
 پیسے تو میرے پاس بھی ہیں۔“ انمول کو ان باتوں کی  
 پریشانی بھی ہی نہیں۔ اس کی تشویش قاسم کی غیر  
 موجودگی تھی۔ تحفظ کا وہ احساس تھا جو اس کی رات  
 میں موجودگی کی صورت ہوتا تھا۔ نادانستہ اس کی گھر  
 آمد سے پہلے انمول کی نظریں والہ کلاک کی طرف  
 بار بار اٹکتی تھیں اور جیسے جیسے وقت گزرتا اس کے دل  
 کی دھڑکن بھی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنے لگتی  
 اور اب اتنے دن اس کے بغیر رہنے کی سوچ ہی اس  
 وقت اسے بے چین کر رہی تھی۔

”پھر بھی کوئی نہ کوئی ضرورت پڑ ہی سکتی ہے۔“  
 اس نے سرنگی میں ہلاتے کہا۔

”ضرورت ہو تو امی سے مانگ سکتی ہوں۔“  
 انمول نے تو بس یونہی اس کی تسلی کے لیے کہا تھا لیکن  
 قاسم کو اس کی بات ناگوار گزری۔

”تم میری ذمہ داری ہو انمول اور تمہاری  
 ضرورتوں کو مجھے ہی پورا کرنا ہے۔“ وہ ناراض نہیں تھا  
 البتہ انداز میں ناپسندیدگی تھی لیکن انمول تو اس کے  
 لفظوں میں ابھی اس وقت کی اور ہی سوچ کے حصار  
 میں تھی۔ وہ اس کی ضرورت ”پیسوں“ کو سمجھ رہا تھا  
 جبکہ اس کے نزدیک اس کا ”ساتھ“ سب سے اہم  
 تھا۔

شاید مرد اور عورت کی سوچ کا بنیادی فرق ایک  
 اسی نقطے پہ آکر رک جاتا ہے۔ مرد کے نزدیک دنیا کا  
 ہر کام اس کی اولین ترجیح ہوتا ہے جبکہ عورت کے  
 نزدیک اس کی ”توجہ“ اور ”وقت“ اہمیت کا حامل ہوتا  
 ہے۔ یہ اور بات اسے ”وقت“ کی تقسیم کرتے کوئی  
 بھی مرد اس کا ایک ”جز“ ہی عورت کی جھولی میں  
 ڈال سکتا ہے اس کا ”کل“ ہمیشہ اس کی ذمہ داریوں  
 کی نذر ہی رہتا ہے یہاں تک کہ خود اس کی اپنی



شروع کی لیکن سیاہ مائل کے کور سے نکلی شے کو دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

”میک اپ کٹ؟ تمہیں پتا تو ہے یار مجھے میک اپ وغیرہ کا کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ کرنا بھی نہیں آتا مجھے میک اپ، پھر کیا ضرورت تھی خواہ خواہ اتنے پیسے خرچ کرنے کی۔“ وہ کچھ کچھ بد دل ہوئی تھی۔ جیسے اسے اس خفے کی تو ہرگز امید نہ تھی۔

”کرو گی تو آئے گا نا پائل لڑکی۔“ ستارہ نے اس کے سر پہ ہلکی سی چوٹ رسید کرتے نرمی سے کہا اور خود ہی وہ میک اپ باکس کھول کر اسے دکھانے لگی۔ ستارہ شادی کے بعد پہلی بار پاکستان آئی تھی اور ان دنوں انمول کی تازہ تازہ مطلق کی خبر سے شادی۔ شاید اسی موقع کی مناسبت سے اس نے انمول کو وہ میک اپ باکس دیا تھا لیکن انمول کی دلچسپیاں الگ تھیں۔ وہ ہمیشہ سے کتابی کیز لکھی اور خود کو اسی دنیا میں رکھ کر خوش رہتی تھی۔

”اب کیا تمہارے لیے کتاب لے آتی تھے میں۔“ وہ مسخرانہ ہنسی ہنسی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ انمول نے بھی فی الفور سر ہلا کر اعتراف کیا تھا۔

”کتنی کتابیں انہی کرو گی یار۔ پڑھ پڑھ کر دماغ خراب ہو جاتا ہے محترمہ اور کچھ نہیں تو اپنے اس ہونے والے میاں پہ رحم کھاؤ۔“ بچنا سنو رہا شروع کرو۔ اب کیا اسے صبح شام کتابیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرو گی۔“ اچھی طرح واقف تھی انمول کا پہلا اور آخری شوق ادب اور شاعری ہے اور اپنے اسی شوق کی تسکین کی خاطر اس نے لٹریچر کو چنا۔

”ہاں وہ تو جیسے میرے ہی بچنے کے خطر ہیں۔“ اسے سوچ کر ہی آگئی تھی۔

مطلق کی بعد اس کی کبھی قاسم سے رکی وغیرہ رکی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ یہ مطلق بھی بس ایک رکی کاروائی تھی کیونکہ شادی جلد ہونے والی تھی۔ قاسم نے چاہا نہیں کی تھی تو خود انمول کے ذہن میں بھی ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی کہ ان دونوں کا کچھ تو رابطہ ہونا چاہیے بلکہ اسے لگتا کہ یہ ایک طرح سے اچھا ہی

ہے کہ کچھ ”اسرار“ باقی رہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا آغاز ساتھ رہتے ہوئے ہو۔

”بھی شوہر کے لیے بچے سنو نے کا حکم تو دین میں بھی ہے اور پھر تم پریشان نہیں، آنکھوں کے گرد پڑے سیاہ حلقوں کے ساتھ کسی کتاب کے ایڈیشن سین پے آنسو بہا ہی اپنے شوہر کو نظر آؤ گی تو کیا گزرے گی اس بے چارے کے دل پہ۔“ ستارہ کے ڈرامائی انداز پہ تو وہ ہرگز داد دیے بنا نہیں رہ پائی تھی۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں اور تم فکر مت کرو کچھ نہیں گزرتی اس کے دل پہ۔ میں ہوں نا۔ میں سنبا لوں گی۔“ وہ مزے سے بولی۔

”تو میڈم اس وقت پتا چلے گا جب وہ تم سے بے زار ہو کر کسی جھلمل کرنی حسین اور سنی سنو ری دو شیزہ میں دلچسپی لینے لگے گا۔“ ستارہ کا انداز ڈرانے والا تھا۔

”جو میرے باطن سے بڑھ کر میرے ظاہر کو چاہے ایسے شخص کو تو میں خود اٹھا کر اپنی زندگی سے باہر پھینک دوں گی۔“ بھلا جس انسان میں رشتے نبھانے کی صلاحیت نہ ہو اس کے لیے میں اتنا تردد کیوں کرو۔“ اور ستارہ جانتی ہی کہ یہ وہ بات ہے جو عقل نہیں جذباتیت کی بنا پہ کہی جاتی ہے۔

”یہ سب کتابی باتیں ہیں انمول انہیں کتابوں میں پڑھنا ہی اچھا لگتا ہے۔ رشتے اٹھا کر بیٹھنے کے لیے نہیں بلکہ سنبا لنے کے لیے ہوتے ہیں۔ شوہر کوئی گلاسز اچھل نہیں میری جان جسے کچھ میں ڈال دو گی۔ وہ آپ کا نصف بہتر ہے۔ زندگی کا محور ہے۔ اپنے تعلق کو جاسنوار کر دل سے لگا کر رکھنا۔“

اس کا ہاتھ تھا ستارہ نے بڑے چار سے سمجھایا تھا۔ اس کی سنجیدگی کو دیکھتے خود انمول بھی حیران رہ گئی۔ وہ کچھ دیر خاموش اسے دیکھتی رہی اور پھر یکدم ہی ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کی خاطر فیس کر بولی۔

”یہ تم نے کہاں سے داوی اماں والی باتیں سیکھی ہیں بھئی۔“ ستارہ نے بھی شرارت سے



آج کی رات وہ بے حد حسین لگنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

تیرا حسن ہو میرا ”عشق ہو“  
تو پھر حسن و عشق کی بات ہو  
کبھی میں ملوں کبھی تو ملے  
کبھی ہم ملیں ملاقات ہو  
کبھی تو ہو چپ کبھی میں ہو چپ  
کبھی دونوں ہم چپ چاپ ہوں  
کبھی گفتگو کبھی سنا کرے  
کوئی ذکر ہو کوئی بات ہو  
کبھی وصل ہو تو دن کو ہو  
کبھی بجر ہو تو وہ رات ہو  
کبھی میں تیرا کبھی تو میرا  
کبھی ایک دوسرے کے ہم رہیں  
کبھی ساتھ میں کبھی ساتھ تو  
کبھی ایک دوسرے کے ساتھ ہو!

راجہ کو انکار کے بھی وہ خود کو آج شام یہاں  
آنے سے روک نہیں پائی۔ اگلے دن نوٹس لکھنے کے  
بعد علی نے ایک بار خود بھی ان دونوں کو پرستی انوائٹ  
کیا تھا۔ اس وقت راجہ کے سمجھانے کے باوجود بھی  
اس نے منع کر دیا تھا۔

لیکن شام ہوتے ہی بے اختیار اس کا دل بے  
چین ہوا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی، سننا چاہتی تھی۔  
وہاں بہت سے دوسرے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر یہ  
مشاعرہ سننا کوئی ایسا بڑا مرحلہ بھی نہ تھا۔ اور وہ بہت  
آرام سے ایک خاموش سامع کی صورت واپس  
آ سکتی تھی لیکن وہ اس سے ملے، اسے سراپے بغیر  
پلٹ نہ سکی۔

”ایک بات پوچھوں؟“ یونیورسٹی گراؤنڈ کی  
پکڑی پہ چلتے اس نے سر جھکائے دھیسے سروں میں  
سوال کرتے نگاہ اٹھا کر علی کی سمت دیکھا۔ شخص  
اثبات میں سر ہلاتے علی نے اسے اجازت دی تھی۔  
”کیا آپ نے بھی کسی سے محبت کی  
ہے؟“ لب دبائے اس نے پوچھا جبکہ اس کے سوال

کنڈھے اچکائے۔

”خیر یہ بولتا ہے جانی۔“

اس وقت کی کئی ستارہ کی بونہی سی باتیں اپنے  
آپ انمول کی زندگی کا حصہ بنی گئیں۔ اسے قاسم  
کے لیے جہاں سنورنا اچھا لگتا یہ تعلق تو اس کے لیے دنیا  
کا سب سے اہم بندھن تھا۔ وہ اس کے بغیر زندگی کا  
تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شخص کہ جس سے شخص چند  
ماہ پہلے تک اس کی شناسائی نام سے بڑھ کر نہیں تھی  
نکاح کے دو بولوں کے بعد وہ اس کا کل جہان تھا۔ گو  
کبھی کہا نہیں تھا لیکن یہ سچ تھا انمول کو قاسم سے بے  
پناہ محبت تھی۔ کتابوں میں لکھے چاہتے کے قصے وہ  
اپنے اور اس کے نام سے پڑھنے لگی تھی۔ خیال کا ایک  
جہان تھا جو ان شعروں نے آباد کر دیا تھا جن میں بس  
عشق و عاشقی کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور اس خیال  
میں پرواز کرتا انمول کا وجود قاسم کے سبک الگ ہی  
دنیا کی سیر کرتا۔ لیکن پھر آنکھ کھلتے ہی حقیقت نے  
بڑی زور سے زمین پہ لا کے پڑ دیا تھا۔ قاسم تو اب  
بھی وہی تھا ہاں انمول بدل گئی تھی اور شاید وہ محبت  
بھی۔

ہوا سے باہر کا دروازہ بجا تھا۔ آواز نے اس  
کے دھیان کو منتشر کرتے اسے حال میں لاٹھا۔ آئینے  
میں دکھائی دیتے اپنے گس کو دیکھ کر وہ خود ہی حیران  
رہ گئی تھی۔ کتنے کم وقت میں اس کا چہرہ مرمجھا گیا تھا۔  
آنکھوں کے گرد چلتے گہرے ہو رہے تھے۔ انگلی کی  
پوروں کو آنکھوں تلے پھیرتے اسے احساس ہوا تھا  
کہ یہ تبدیلی کُل ازل وقت ہے۔ اس کے اندر چنپتے  
رد عمل کو وہ قاسم نہیں خود پہ نکالنے لگی ہے۔ وہ خوب  
صورت تھی لیکن اس وقت اپنی عمر سے دس سال بڑی  
لگ رہی تھی اور اس کی وجہ وہ بے توجہی بھی جوان  
دنوں انمول اپنی ذات کو لے کر کرنے لگی تھی۔ کچھ  
سوچتے ہوئے اس نے سیاہ چمچل کے پاؤچ سے میک  
اپ باکس نکالا۔ جانے کیوں آج بہت دنوں بعد اس  
کا دل ایک بار پھر تجھے سنورنے کی ترغیب دے رہا  
تھا۔



ترجمانی کرنے لگے تو یقیناً اس دل میں بڑے لطیف جذبے بستے ہیں۔“ ہاتھ سینے پہ باندھے وہ اسے مسکرائی نظروں سے دیکھے گیا یہاں تک کہ خود اسے نگاہ جھکانی پڑی۔

”آپ شاعر ہیں آپ سے بڑھ کر بھلا نظموں سے اور کون کھیل سکتا ہے۔“ اسنے کھلے بالوں کو اٹھکیوں سے عادتاً سینھے اس کی نگاہ ملی کی طرف اٹھی۔ علی نے بھی قدم سے قدم ملایا۔ وہ آج بھی اسی سفید کرتے اور جینز میں تھا البتہ خود اس کی تیاری ہمیشہ سے بڑھ کر تھی۔ میرون سلک کا کرتا اس کے حسین سراپے کو اور بھی دلکش بنا رہا تھا۔ اس پہ سلیقے سے ہوا میک اپ اور جدید انداز میں کٹے بال اس کی شخصیت کو چار چاند لگاتے تھے۔ کیا ستم آج اس ”امادس“ کی رات میں جب آسمان ایک چاند سے بھی محروم تھا، اداس اور ویران تھا وہ خوش نصیب تھا اس کے سبک چلتے اپنے حسن کی چاندنی بکھیرتا یہ مجسم ”چاند“ رات کی سیاہی کا مداد اکرنا۔

”آج سے پہلے مجھے کبھی اپنی کم مائیگی کا اتنا شدید قلق نہیں ہوا۔“ میں تو سمجھتا تھا میں بڑا زبان دراز ہوں یا پھر وہ لفظ ہی نہیں بنے جن سے آپ جیسی گفتہ شخصیت کی تعریف کی جاسکے۔“ اس کے لفظوں میں صداقت کی رقم تھی۔ تعریف کا انداز بھی اس کی طرح منفرد تھا اور آج سے پہلے کسی نے بھی اس کی تعریف کرنے کی جرأت بھی کہاں کی تھی۔ اس کا حسن اور ماڈرنزم اپنی جگہ لیکن اس کی آن بان اور سنجیدہ تاثرات کے سبب تو لڑکے بلا ضرورت گفتگو سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ وہ لفظوں کا جادوگر تھا اپنے لفظوں سے دل کے تاروں کو چھیڑ رہا تھا۔

”آج اگر یہاں نہ آتی تو کچھ کھودتی۔“ اپنے کیونکس لگے ناخنوں کو دانتوں سے کترتے اس نے موضوع بدلا۔

”اور میں تو کھو چکا ہوں۔“ وہ چونکی۔

”کیا؟“ ابرو اچکائے سوال کیا تھا۔

”اچھا دل۔“ دایاں ہاتھ سینے پہ بائیں طرف

پہ جھرت زدہ وہ خود اس کی طرف دیکھتا جیسے اس سوال کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرا مطلب تھا کہ آپ یہ جو شعر کہتے ہیں تو یقیناً اس میں جذبات بھی شامل ہوں گے۔“ وہ لمحہ بھر کو چپنی اور پھر انگلیاں مروڑتے صفائی دی تھی۔ اس سے پہلے وہ فقط اس کی شخصیت کے حصار میں تھی آج اس کی شاعری نے دل کے تاروں کو چھوا تھا۔

”یعنی سازِ نہ دل پہ چوٹ پڑی ہے جو صدا نکلی ہے۔“ وہ بے اختیار ہنسا۔ البتہ وہ بھی مسکرا ہٹ لبوں پہ لائے اس کا ساتھ دینے میں ناکام رہی۔ ایک خوف سا جاگ اٹھا کہ اس کا جواب ”ہاں“ ہوگا۔

”یہ سچ ہے کہ شاعری جذبات کی عکاس ہوتی ہے پر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ غزل کہنے کے لیے لازماً کسی لڑکی کی زلفوں کا اسیر ہونا پڑے۔ کچھ ہم جیسے حالات کے مارے بھی کبھی بھی عشقیہ شاعری کر لیتے ہیں۔“ وہ شاعر تھا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے ہنر سے واقف اور اب بھی اس نے انتہائی مختصر لفظوں میں اس کے دل کا جو بھلکا کر دیا۔ شاید یہ آج کی شب کا سب سے حسین انکشاف تھا کیونکہ اسے سن کے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

”تھینک گاڈ۔“ وہ زرب لب بڑا بڑاکی۔ ”کچھ کہا آپ نے؟“ اس نے چلتے چلتے سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ اپنی بے ساختگی پہ شرمندہ اسے شدید گھبراہٹ نے اکھیرا تھا۔ جو اگر وہ سن لیتا تو کیا کیا بے نقاب ہو جاتا۔

”بہت خوب صورت شاعری کرتے ہیں آپ۔ احساس کے تاروں کو چھو جانے والی۔ دل کی کیفیت کو کس طرح لفظوں میں اتنے حسین انداز سے بیان کر لیتے ہیں؟“ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ یہ سچ تھا کہ علی کے لفظوں کی حسین بازگشت اب تک کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

”کہتے ہیں حسن ہمیشہ دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ ایک شاعر کا کلام کر کسی کے جذبات کی



کتابیں پکڑیں اور واپسی کا قصد کیا جب پارکنگ کی طرف جاتے ایک انجینی آواز نے اس کے قدموں کو روک دیا۔

”ہیلو!“ ایک غیر شناسا آواز کو اپنی قربت میں سر کر انمول چوکی اور پلٹ کر دیکھا۔ ایک مڈل ایج لیکن بے حد پنڈم اور باوقار شخصیت کے حامل انسان کو اپنی طرف متوجہ پارکروہ اچھی خاصی حیران ہوئی۔

”میں پروفیسر رضوی ہوں۔“ اسے حیرت زدہ دیکھ کر آگے بڑھتے نہایت خوش اسلوبی سے انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔ ان کی عمر چالیس سے پینتالیس کے درمیان تھی۔ بڑے گرےس فل انداز میں کنپٹیوں سے جھانکتے چند سفید بالوں نے ان کی شخصیت کو اور بھی سویر بنا دیا تھا۔ شخصیت کی طرح لب و لہجہ بھی بے حد توجہ طلب تھا اس پہ چار کول بلیک کٹر کے نوپس بے حد چستی سوٹ میں ملبوس ان کا رکھ رکھاؤ قابل دید تھا۔

”پروفیسر رضوی؟“ انمول نے سوچتے ہوئے آنکھیں کھلیں۔ وہ اس نام سے واقف تھی اور اب ذہن پہ زور ڈالتے یہی سوچ رہی تھی کہ اچانک اسے یاد آ گیا تھا۔ ”آپ ہمارے ڈیپارٹمنٹل ہیڈ ہیں نا سر؟“ اس بار وہ خود بھی مسکراتی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں ادب و احترام کا عنصر غالب تھا۔ پروفیسر رضوی کا نام ڈیپارٹمنٹ کی بلڈنگ میں لگی اساتذہ کی فہرست میں نیا اضافہ کسی لیکن سب سے نمایاں تھا۔ ان سے شناسائی نہ ہونا کچھ اتنا حیران کن بھی نہیں تھا لیکن ہاں ان کا انمول کو بالخصوص روک کر اپنا تعارف کروانا واقعی ایک اعزاز کی بات تھی۔

”اتفاق سے۔“ انہوں نے کندھے اچکائے۔ ان کے لاہور سے انداز پہ اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔ انہوں نے حال ہی میں یونیورسٹی جوائن کی تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ابھی ان سے ناواقف تھے۔ وہ بہت غور سے اس کے ہاتھ میں پکڑی ان کتابوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو ابھی

رکھتے اس نے بے ساختہ کہا۔ وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے دامن میں ابھی خود بھی مسکرا دی۔

”کلاس میں آپ اچھے خاصے سنجیدہ انسان نظر آتے ہیں۔“ انداز نائے والا تھا۔

”یقین جانیں میں اس وقت بے حد سنجیدہ ہوں۔“ وہ مزید کچھ کہہ نہیں پائی۔ کہنے کو کچھ بچا بھی کہاں تھا کہ اب خاموش گفتگو میں بدل گئی تھی۔ چلتے چلتے وہ دونوں پارکنگ میں کھڑی اس کی گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔ ایک خوب صورت شام کا اختتام اس سے بھی زیادہ محرک تھی اور اگلی صبح تو ہر صبح سے روشن و چمک دار ہونے کی امید تھی کیونکہ دلوں میں محبت کے دیے جل اٹھے تھے۔

☆☆☆

قاسم آج صبح کی فلائٹ سے کراچی چلا گیا تھا اور وہاں پہنچ کر اس نے انمول کو بتا بھی دیا تھا۔ وہ اسے چند گھنٹوں میں ہی اسے بری طرح مِس کرنے لگی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے سارا شہر ہی سنسان ہو گیا ہے، یہ الگ بات دل اپنا داس ہو رہا تھا۔ بڑی تسلی سے اور وقت لگا کر اس نے یونیورسٹی لائبریری سے کتابیں ایٹو کروائی تھیں۔ کل کا کچا کھانا اب تک جوں کا توں فریج میں پڑا تھا کیونکہ اچانک ہی قاسم نے ڈنر باہر کرنے کا پلان بنالیا تھا۔ بہت دن بعد وہ اس کے لیے اپنی روٹین سے ہٹ کر تیار ہوئی تھی۔ قاسم نے یہ محسوس کیا تھا نہیں وہ نہیں جانتی تھی کیونکہ وہ بھی اپنی احساسات کا اظہار نہیں کرتا تھا پھر بھی انمول وحشی طور پہ پرسکون تھی۔ وہ قاسم کو بہت اچھے انداز میں رخصت کرنا چاہتی تھی۔

قاسم نے جانے سے پہلے اسے کہا بھی تھا کہ بوریت ہو تو یونیورسٹی کے بعد اپنی امی کی طرف چکر لگا آئے لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ قاسم کے بغیر بھی اس کا گھر چلتے پھرتے اس کا احساس دلانا تھا اور اس کی غیر موجودگی کے سبب فرصت کچھ زیادہ ہی ہونے والی تھی۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی چند مطلوبہ



ہے۔“ وہ بے اختیار بولی۔

”وہ کیسے؟“ دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے وہ پورے انتہاک سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”دیکھیں ناسرا! دردِ عم“ نہ ہو تو ”راحت“ کا پتا نہیں چلتا۔ ”جدائی“ کے بنا ”وصل“ کی اہمیت ہی نہیں اور محبت! محبت تو کائنات کا حسن ہے بھلا اس کے بغیر بھی زندگی کوئی زندگی ہے۔ روی کہتا ہے محبت ہی اصل زندگی ہے جہاں محبت ہوگی درد بھی ساتھ ہوگا۔“ وہ جیسے اس ایک فقرے میں خلاصہ بیان کر گئی۔

”نو کمٹس۔ اس موضوع پہ ہم پھر کسی دن طویل بحث کریں گے۔ ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ بڑے وجہہ انداز میں مسکراتے وہ یقیناً اس سے امپر لیس ہوئے تھے اور پھر کلائی پہ بندھی کھڑی میں وقت دیکھتے بے ساختہ بولے۔ ”انمول کو یاد آیا کہ اسے بھی گھر واپس پہنچنا ہے سو اس نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔

”اور ہاں اپنے تھیس میں کسی بھی طرح کی کوئی مدد چاہیے تو آپ کسی وقت بھی میرے آفس آ سکتی ہیں۔“ چلتے چلتے مڑ کر انہوں نے برخلوص انداز میں کہا اور پھر تیز قدموں سے اپنی کاری طرف چلے گئے۔

انمول چند لمحے کھڑی ان کے متعلق سوچتی رہی پھر خود بھی پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

گھر پہنچنے تک وہ اس مختصر ملاقات کو بیکسر فراموش کر چکی تھی کیونکہ ذہن اس وقت قاسم میں الجھا ہوا تھا۔ چند ماہ پہلے جب انمول نے اسے اس کے حال پہ چوڑ کر اپنی زندگی جینے کا ارادہ کیا تھا اس وقت سے اب تک یہی لگتا تھا شاید وہ واقعی اپنی زندگی گزار رہی ہے لیکن وہ غلط تھی۔ اس سے وقتی دوری کے احساس نے ہی اسے بوکھلا دیا تھا۔ اس کی موجودگی ایک محفوظ حصار تھا اور اب جیسے وہ یک دم

کچھ دیر پہلے انمول نے لائبریری سے لی تھیں۔

”شاعری میں بہت دلچسپی ہے آپ کو؟“ انہوں نے بے تکلفی سے سوال کیا۔ یقیناً اسے روکنے اور اس سے سلسلہ کلام شروع کرنے کی وجہ اس کے ہاتھ میں پکڑی کتابیں تھیں۔

”فرہاد میرے پسندیدہ شاعر ہیں اور ان کا کلام میری کمزوری۔“ اس نے ایک نگاہ کتاب کے ٹائٹل کو دیکھا اور پھر پر جوش انداز جواب دیا۔ وہ جو اب تک ان کی گفتگو کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھی بالآخر سراپا مگنی لیکن وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ پروفیسر رضوی نے اسے پارکنگ میں دیکھ کر نہیں روکا بلکہ وہ لائبریری سے اس کے پیچھے آئے تھے۔

”جس اشتیاق سے آپ لائبریری سے اس کی کتابیں اکٹھی کر رہی تھیں اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا مجھے۔“ انمول کے ہاتھ سے ایک کتاب لے کر اس کے ٹائٹل پہ نگاہیں جمائے وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گئے۔ گہری سوچ کے حصار میں زیر لب بڑبڑاتے وہ کتاب کے سرورق پہ اپنی انگلی پھیر رہے تھے۔

”لگتا ہے سب ایک ساتھ بڑھنے کا ارادہ ہے۔“ انہوں نے نگاہ اٹھا کر انمول کی طرف دیکھا۔ ”ایسی بات نہیں سرا! یہ کتابیں تو میں کئی بار پڑھ چکی ہوں لیکن ابھی تو میں یہ اپنے تھیس میں ریفرنس کے لیے لے کر جا رہی ہوں۔“ انمول نے وضاحت پیش کی۔

”آپ نے اپنا مقالہ لکھنے کے لیے اس ”کلامِ انسان“ کا انتخاب کیا ہے جس کے پاس کہنے کو کوئی ڈھنک کی بات ہی نہیں۔ بس درد۔ جدائی۔ غم۔ محبت کے رونے دنیا کو ستا رہا ہے۔“ انہوں نے قدرے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔ اپنے ہر ایک لفظ پہ زور دیتے وہ انمول کے ذہن کو ٹوٹل رہے تھے۔ اس کی ذہنی چٹائی کو ج کتنا چاہتے تھے یا پھر اس کی زبانی وہ دلیل سننا چاہتے تھے جس کی بنا پر اس نے اپنے موضوع کا چناؤ کیا تھا۔

”تو کیا یہ سب فطرت کے عین مطابق نہیں



ڈاؤن بھی نہیں کیا ہوگا کہ انمول کو اس کی غیر موجودگی نے مضطرب کر دیا تھا۔ اس وقت تو اسے ایسا لگ رہا جیسے وہ بارہ سوئیں بارہ ہزار گلو میٹر کے فاصلے پہ ہے۔ ”نہیں مسئلہ تو کوئی نہیں۔“ اسے آنسوؤں پہ قابو پاتے اس نے لہجے کی نمی کو حد درجہ کم کرنا چاہا پھر بھی قاسم چونکا۔

”تمہاری آواز کو کیا ہوا انمول۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ اس کے لہجے میں واضح تشویش تھی جس نے خطا ہونے کے ساتھ انمول کو بے حد حیران کیا۔ اس سے پہلے تو بھی قاسم نے اس کی آواز پہ اتنا غور نہیں کیا تھا۔ ”تو کیا وہ واقعی اس کے لیے اس وقت فکر مند ہو رہا تھا یا پھر شاید اس وقت فرصت زیادہ تھی لیکن وہ تو بتا رہا تھا کہ وہ کسی کام میں مصروف تھا اور آج اس کا ارادہ دیر تک جانے کا ہے کیونکہ صبح اسے اپنی ایک پریزنٹیشن دینی ہے جسے اس وقت مکمل کرنا انتہائی اہم ہے۔“ اس نے خود ہی اپنی سوچ پہ نفی کا نشان لگاتے قاسم کی بات کو دل ہی دل میں دہرایا جو وہ اسے کچھ دیر پہلے بتا چکا تھا۔

”آج شاید سردی زیادہ ہے اسی لیے ہلکا سا فلو ہو گیا۔“ اپنی سرخ ہوئی ناک کو رگڑتے اس نے بھانہ بتایا۔ پتا نہیں قاسم کو یقین آیا تھا یا نہیں لیکن اس نے مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے اسے دوا لینے اور گیٹ کا لاک اچھی طرح چیک کرنے کی تاکید کرتے کال بند کر دی۔

کال منقطع ہوتے ہی انمول کا مہر جواب دے گیا۔ وہ بے تحاشا چھوٹ چھوٹ کر روئی۔ اتنا کہ اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا اور پھر وہ بے دم می ہو کر نکلے پہ سر ٹکائے بستر پہ لیٹ گئی اس طرح کہ آنکھیں خالی بستر پہ لگی تھیں۔

وہ تمام رات جاگتی رہی۔ اذان کی آواز سنائی دی تو اٹھ کر وضو کر کے نماز پڑھی اور ایک بار پھر واپس بیڈ پہ آئی تھی۔

اس طبیعت کے ساتھ وہ ہرگز آج یونیورسٹی نہیں جاسکتی تھی۔ ”اچھا ہوا کل کتابیں لے آئی تھی

کھلے آسان تلے آکر کھڑی ہوئی تھی۔ وہی دیوار دور تھے لیکن تنہائی کا جو احساس آج کی رات اس کے حصے میں آیا تھا ایسا تو اس نے بھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے بدگمانی کی ہلکی سی لکیر نے اس کو یہ عندیہ دیا تھا کہ شاید ان کا رشتہ بے حد کمزور ہے لیکن جب اس کے بغیر شام کے وہ لمحات تنہا گزارنا مجبوری رہی تو جان پہ بن آئی تھی۔

رات کو ڈرنے کے بعد کچھ دیر بیوی دیکھنا قاسم کی روز اول کی روٹین تھی اور انمول اس روٹین کی عادی تھی۔ حالانکہ وہ بہت بدل گئی تھی لیکن اس دوران بھی یہ مخصوص وقت اس کا قاسم کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اب بھی اس کا سر قاسم کے کندھے پہ ہی ٹکا رہتا تھا بس فرق یہ تھا کہ وہ پہلے کی طرح بے سبب گفتگو نہیں کرتی تھی اور اب خاموشی سے اس کی طرح نیو جیٹل دیکھتی رہتی تھی۔

آج بھی ڈرنے کے نام پہ چند لقمے بمشکل حلق سے اتار کر اس نے حب معمول اپنے لیے کافی بنائی تھی۔ بس آج دو نہیں کافی کا ایک ہی کپ تھا جسے لے کر وہ لاؤنج میں چلی آئی اور آتے ساتھ ہی وی آن کر لیا۔ تجویز نگاروں کی وہی روزمرہ کی ہنگامہ آرائیاں تھیں جس میں بھی اسے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن آج وہ بڑے انہماک سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ صوف کی بیک پہ سر ٹکائے اس وقت اسے یہ شور اپنے اندر کے سناتے سے بہتر لگ رہا تھا۔ دس بجے قاسم نے کال کر کے اس سے اس کی خیریت دریافت کی تھی اور وہ بڑی دقت کے ساتھ اپنے آنسوؤں کو کنٹرول کر پائی۔

”کھانا کھالیا آپ نے؟“ وہ جانتی تھی قاسم ساڑھے آٹھ بجے کھانا کھانے کا عادی ہے۔ کبھی اس سے لیٹ ہو جائے تو وہ رات کا کھانا نہیں کھاتا کیونکہ اس صورت اسے رات بھر بے چینی رہتی ہے۔

”ہاں کافی دیر ہو گئی۔ سوچا تم سے پوچھ لوں کوئی مسئلہ تو نہیں۔“ وہ اسے کیا بتائی یہاں مسئلہ نہیں مسائل ہیں۔ شاید ابھی قاسم کے جہاز نے کراچی چ



میں آچکی تھیں۔

وہ ڈرامہ، نثر، تاریخ، تنقید یا پھر شاعری میں سے کسی بھی موضوع کا انتخاب کر سکتی تھی لیکن کیونکہ اسے فرہادی کی شاعری بے حد انس پار کرتی تھی لہذا اس نے اپنے مقالے کا موضوع بھی اسی شاعری کو چنا۔ پھر بھی یہ اس کے احقائدین کی انتہا تھی جو اس نے اب تک فرہاد کے متعلق کوئی بھی معلومات انھیں نہیں کی تھی۔ اس کے اب تک بنے تمام نوٹس اس کے کلام پر مبنی تھے لیکن اس کی ذات سے خالی تھے۔

تھک کر سیل فون بستر پر پھینکتے وہ اب تک سیدھا کر کے لیٹ گئی۔ پروفیسر رضوی کی پر خلوص آفرور بے تکلف گفتگو کے بعد بھی اس کا اپنے مقالے کے لیے ان سے لینے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ اسے ان کی مدد درکار تھی ہی نہیں لیکن اب وہ اپنا فیصلہ بدل چکی تھی۔

اسے کل ہر صورت پروفیسر رضوی سے ملنا تھا۔

☆☆☆

علی کا تعلق لوہڑ کلاس کے ایک ایسے گھر سے تھا جہاں پیٹ کی آگ آپ کا ہر شوق جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ بہت کم عمری سے ہی اس نے مسائل کو اپنے برائے بوسیدہ مکان کی چھت پر بارش کے پانی کی طرح پھینکتے دیکھا۔ وہ تین سال کا تھا جب ایک دن فیکٹری میں کام کرتے اس کا باپ کرنٹ لگنے کے باعث دائمی معذوری کا شکار ہو گیا۔ اس کے پیروں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ اٹھ کر چل پھر سکتا ایسے میں گھر کا چولہا جلانے کی ذمہ داری اس کی ماں پر آن پڑی تھی۔

بچپن کے سر پہ شوہر کی معذوری سے آسمان ٹوٹا تھا لیکن اس کے پاس اس ظلم پر آنسو بہانے کا وقت نہیں تھا۔ قیوم پہ فقط خنم اور علی کی ذمہ داری نہیں تھی بلکہ اس کے بوڑھے ماں باپ اور اس کی دو غیر شادی شدہ بہنیں بھی اسی محدود کمائی پہ گزر بسر کرتے تھے جو اس کی فیکٹری میں مزدوری سے ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا بوڑھا باپ گلی کے کٹڑ پہ

اس نے سوچا کہ آج کم سے کم گھر بیٹھ کر وہ تسلی سے اپنا کام کرنے کی لیکن یہ الگ مسئلہ تھا کہ اس طبیعت اور ایسی ذہنی حالت کے ساتھ وہ کچھ کر بھی سکتی تھی یا نہیں۔ ذہن بے حد تھکا ہوا تھا لیکن نیند اب بھی نہیں آرہی تھی۔ اچانک اس کا ذہن کل پیونروٹی سے واپسی پر پروفیسر رضوی سے ہوئی مختصر ملاقات کی طرف جانکلا۔

”آپ نے اپنا مقالہ لکھنے کے لیے اس ”گمنام انسان“ کا انتخاب کیا ہے جس کے پاس کہنے کو کوئی ڈھنگ کی بات بھی نہیں۔“ اس کے ذہن میں پروفیسر رضوی کا جملہ گردش کر رہا تھا۔

”گمنام انسان؟“ اس نے زیر لب دہرایا اور پھر جلدی سے انٹرنیٹ براؤزر کھول کر وہ ”فرہاد“ کو سرچ کرنے لگی۔ اس پہ آج پہلی بار یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ اس کی کتابوں کے سوا انٹرنیٹ پر اس کے متعلق ایک بھی جملہ نہیں تھا۔ اس کی کوئی تصویر بھی نہ ہی اس کا تعارف موجود تھا۔ آج کل تو ہر چھوٹے بڑے، نئے پرانے قلم کار و شاعر کا پورا بھرہ زب انٹرنیٹ پہ موجود ہوتا ہے۔ یا تو وہ خود سوشل میڈیا پہ مل جاتے ہیں ورنہ ان کے نام سے انہیں شامل کر کے ان کے پیج بنے ہوتے ہیں جہاں سے ان تک بآسانی رسائی ممکن ہوتی ہے لیکن ایک گھنٹہ ڈھونڈنے پر بھی انمول کو ”فرہاد“ کے متعلق ماسوائے اس کی کتابوں کے لکس کے کچھ نہیں ملا تھا جو خود اس کے پاس بھی موجود تھیں اور وہاں بھی تعارف تھا نہ ان میں شامل ”پیش لفظ“ میں فرہادی ذات کا تذکرہ تھا۔ جو کچھ بھی تھا فقط اس کے کام کے حوالے سے تھا۔

اسے خود یہ بھی حیرت ہوئی کہ آج سے پہلے یہ سوال خود اس کے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ حال ہی میں اس نے اردو ادب کی تاریخ پڑھی تھی۔ ”فرہاد“ کا نام نیا تھا لیکن اس کی شاعری میں جو تنجید کی اور گداز پن تھا وہ یہ بات بے باک دہل کہتا تھا کہ وہ عصر حاضر کے چند نیچور ترین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ گزرے چند سالوں میں اس کی کئی کتابیں مارکیٹ



ایک چھوٹی سی دکان پہ بیٹھا کرتا تھا جہاں سے اسے ہر ہفتے تین سو روپے ملتے اور اس قلیل آمدنی میں ان کی دوسری ضروریات پوری ہونا تو دور کی بات پیٹ بھی بھرنا مشکل ہوتا تھا۔

ان حالات میں شبنم کے لیے گھر سے نکل کر شوہر کی جگہ فیکٹری میں ملازمت مجبوری تھی۔ یہ بھی شکر کہ اسے یہ ملازمت مل گئی تھی۔ تین سال کا بچہ تمام دن ماں کے بغیر دادی اور پھوپھیوں کے آسرے پہ رہتا۔ دادی بیٹے کے ساتھ پڑنے کی بھی دیکھ بھال کرتی لیکن وہ خود اتنی ضعیف تھی۔ قیوم کی دونوں بہنیں عمر کے اس حصے پہ دستک دے رہی تھیں جہاں خواب اور امیدیں دم توڑ دیتے ہیں۔ اپنے بالوں میں اترتی چاندی نے ان کے اندر احساس کمتری اور چڑچڑے پن کو اس شدت سے ابھارا تھا کہ وہ سارا دن جلی کٹی رہتیں۔ جب سے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جانے کیوں انہیں پورا یقین ہو گیا تھا اب ان کی شادی بھی نہیں ہو پائے گی۔

بہر حال فرصت تو ان کو بھی نہیں ہوتی تھی کہ گھر کے تمام کام اور اس کے ساتھ موسم بٹیاں اور لفافے بنانا بھی ان کی ذمہ داری تھی جنہیں ان کا باپ اسی دکان دار کو بیچ دیا کرتا تھا جہاں وہ خود ملازمت کرتا تھا اور اس آمدنی کا ایک دھیلا بھی وہ ماں یا بھائی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھیں کیونکہ ان پیسوں کو وہ دونوں اپنے متوقع چیز کے لیے اکٹھا کر رہی تھیں۔ اب تک کل ملا کر ساڑھے چار ہزار روپے جمع ہو چکے تھے جنہیں ایک لوہے کے صندوق میں رنگ آلود تالا لگا کر رکھا گیا تھا۔ امید تھی اتنے پیسوں میں چند ایسی چیزیں تو آتی جائیں گی جن کی بدولت انہیں گھر سے خالی ہاتھ آنے کا طعنہ نہیں ملے گا۔ بس اب انتظار تھا تو فقط ایسے رشتوں کا جو ان حالات کے مارے گھروں کا رخ مشکل ہی سے کرتے ہیں۔

چھ سال کی عمر میں علی کو محلے کے ہی ایک چھوٹے سے اسکول میں سو روپے ماہوار پہ داخل کرا دیا گیا۔ اس کے یونیفارم اور کتابوں کے پیسے دو ماہ

فیکٹری میں اور ٹائم کے بعد شبنم نے اسٹپے کیے تھے۔ قیوم خود میٹرک پاس تھا جبکہ شبنم نے آٹھویں تک پڑھا تھا ایسے میں وہ علی کو بھی پڑھانا چاہتے تھے۔ پہلے دن دادا کی انگلی پکڑے اسکول جاتے اس سے اوپر دونوں کی امیدیں اس پہ جاگتی تھیں۔ یہ الگ بات ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا علی کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہ پائے گا بھی یا نہیں کیونکہ محدود وسائل اور مسائل کے اعتبار سے دے دے وہ سات لوگ اس نجی سطح کے پرائیویٹ اسکول کو زیادہ دیر تک افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

علی کے دل میں پڑھائی کا شوق قیوم کی باتوں سے پیدا ہوا تھا جو اسے چھوٹی چھوٹی بچوں کی کہانیاں سناتا تھا۔ شاید کبھی بچپن میں یہ سب کہانیاں اس نے اپنے باپ سے ہی سنی تھیں لیکن اس کے سنائے قصبے جن میں ڈھکی چھپی مصیبتیں اور آگے بڑھنے کی لگن ہوتی تھی علی کو ہمیشہ ہی متاثر کرتے تھے۔

وہ نو سال کا تھا جب ایک دن بڑی پھوپھی کی اچانک موت کی خبر نے اس کا ننھا ساد مل دلا دیا تھا۔ اپنی فرسٹریشن میں اس نے سکھایا کھا کر خود کشی کر لی تھی جس کے بعد سے دادی نے چار پائی پکڑی تو پھر اس چار پائی کو چار کندھوں پہ ہی اٹھایا گیا۔ یہ ایک انتہائی غم زدہ سال تھا جو اس خاندان کے بچے بچے لوگوں بشمول ایک چھوٹے بچے کے ان سب نے انتہائی تکلیف میں گزارا۔ شبنم کو اب چھوٹی ننڈ کی پریشانی ستاتی تھی لہذا اس نے بوی مشکل سے اپنے ساتھ فیکٹری میں کام کرنے والی ایک دوسری عورت سے اس مسئلے کا ذکر کیا۔ اتفاق سے اس کا بڑا بھائی ان دنوں ریٹوڑا تھا اور اپنے بن ماں کے چھ بچوں کی وجہ سے شدید پریشانی میں مبتلا۔ شبنم کو یہ رشتہ غنیمت لگا اس نے فوراً قیوم اور سر سے بات کی۔ ان حالات میں خود ان کو بھی یہی معقول لگا کہ بس یہ شادی ہو جائے لہذا آغا فانا نکاح اور رخصتی کر دی تھی۔ اس طرح گھر سے ایک اور ذمہ داری کا خاتمہ ہوا۔ علی کے اسکول کا سلسلہ چلتا رہا تھا یہاں تک کہ اس



والی ماسی بھی اسے سلپنگ سوٹ میں دیکھ کر حیران ہوئی۔ بہر حال شام تک حالت کچھ بہتر ہوئی لیکن ذہن اب بھی تھکا تھکا سا تھا۔ قاسم کی کمی اسی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسے کال کرنا چاہتی تھی لیکن قاسم کو بلا ضرورت کال کرنا پسند نہیں تھا اور خود اس نے اب دوبارہ فون رات میں ہی کرنا تھا ہاں اگر خدا نا خواستہ کوئی ایمر جنسی ہوئی تو وہ الگ مسئلہ تھا لیکن اسے کام کے دوران وہ انمول کی محض ہیلو ہائے کے لیے گی کئی کالز کو پسند نہیں کرتا تھا اور انمول اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتی تھی کہ کام کے دوران اسے ڈسٹر ب نہ کرے۔

اگلے دن یونیورسٹی سے واپسی سے پہلے یہ کنفرم کر کے کہ پروفیسر رضوی اپنے آفس میں ہیں اور مصروف نہیں وہ ان کے پاس آگئی تھی۔  
”آپ نے کہا تھا مجھے اپنے کام کے سلسلے میں کسی مدد کی ضرورت ہو تو آپ کے پاس آسکتی ہوں۔“

”بالکل کہا تھا اور میں اپنی اس بات پہ قائم بھی ہوں۔“ اسے دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی لیکن پھر بھی انہوں نے نہایت خوش دلی سے جواب دیا تھا۔  
”میں آپ کو ڈسٹر ب نہیں کرنا چاہتی تھی سر لیکن.....“ میز کا گونا اپنے ناخن سے کھرچے اس نے معذرت کرنا چاہی۔ پروفیسر رضوی یقیناً اس کی کیفیت سے باخبر تھے اسی لیے حوصلہ افزائی کے پیش نظر مسکرا کر کہا۔

”یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی کہ ہماری یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے والے کسی طالب علم کے ریسرچ ورک میں میرا بھی کچھ کاثر بیوٹ ہو۔“  
ان کے روپے نے انمول کو واقعی تسلی دی۔

انٹر کام پہ اپنے اور اس کے لیے کافی منگوانے کے بعد وہ اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔ انمول نے ان کے سامنے اپنا سوال دہرایا۔ وہ فرہاد کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔ اپنی کل کی تحقیق سے وہ انہیں آگاہ کر چکی تھی اور اب اسے کسی ایسے شخص کی

چھوٹے سے پرائمری اسکول سے نکل کر وہ اب ایک سرکاری مڈل اسکول میں پہنچ گیا تھا۔  
کہتے ہیں کنول کا پھول گچڑ میں ہی کھلتا ہے۔ اس چھوٹے سے کنبے کے مسائل زدہ جوہڑ میں علی جیسی نفیس سوچ کا مالک پیدا ہونا حیران کن بات تھی۔ وہ گیمیاں جہاں بچے سارا دن کھیلنے میں وقت ضائع کرتے تعلیم کے نام پر گالیاں سیکھتے ہیں وہاں علی کے ہاتھ میں کتابوں کا ہونا کوئی معجزہ ہی تھا یا پھر شبنم کی دن رات کھلتی جان کا شمر۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس نے تیرہ سال کی عمر سے دن کا بقیہ حصہ اس دکان پہ بیٹھنا شروع کر دیا تھا جہاں پہلے اس کا دادا بیٹھا کرتا تھا اور اس کی موت کے بعد دکان کا مالک کسی اور کی تلاش میں تھا۔ علی میٹرک میں تھا اور ہفتے کے ہفتے اس کا حساب بھی دیکھ لیتا تھا جس کی وجہ سے وہ اس سے خوش تھا اور دکان میں فارغ وقت میں اسے پڑھنے سے منع نہیں کرتا تھا۔

اس نے پہلی نظم اس وقت لکھی جب وہ انٹر میں تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا واسطہ کالج میں بہترین لوگوں سے پڑا جنہوں نے اس کے ٹیلنٹ کو سراہا تھا۔ کالج کے ساتھ وہ مختلف ٹیوشنز کرنے لگا تھا اور اب شبنم کا فیکٹری جانا بند ہو چکا تھا کیونکہ اس سے بہتر میسے بہر حال علی محوم پھر کرکما لیا کرتا تھا۔ گر بجویشن کے بعد اس نے ایک پارٹ ٹائم ملازمت کر لی تھی جسے وہ یونیورسٹی کے ساتھ بڑے اچھے طریقے سے سنہال رہا تھا۔ مسائل زندگی میں اب بھی بے شمار تھے لیکن وہ ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔  
وہ کوشش کر رہا تھا کہ مالیاتی دینے والی ذات اللہ کی تھی۔

☆☆☆

”تو کیا آپ واقعی فرہاد کے متعلق کچھ نہیں جانتے سر؟“ انمول نے مایوسی سے سوال کیا۔ کل کا دن بے زاری میں گزرا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کام نہیں کر پائی تھی۔ دوپہر میں صفائی



سنجیدگی سے اس کے تاثرات کو اسکین کر رہے تھے  
 ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے اسے شہرت کی آرزو ہی نہ  
 ہو۔ وہ اپنی کمائی کے ساتھ خوش ہو۔ مطمئن ہو۔“  
 سگریٹ کی راگھ کو راگھ دانی میں جھٹکتے انہوں نے  
 تبصرہ کیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا کہ آج کے دور میں  
 کوئی اپنے کام کا کریڈٹ ہی نہ لینا چاہے۔ کوئی  
 ایک تو ہوگا تا سر جو اس سے واقف ہوگا۔ اس کے  
 لفظوں کے پیچھے مجھے درد سے واقف ہوگا۔ وہ جس کا  
 غم منارہا ہے۔ کوئی تو اس روگ سے واقف ہوگا۔“  
 اس سچی کو بلجھانے میں وہ خوبے حد الجھ رہی تھی۔

”انمول میرا خیال ہے تم ایک انتہائی قابل اور  
 ذہین لڑکی ہو اور تم میں یقیناً اتنی صلاحیت ہے کہ  
 شاعری پہ اپنا تنقیدی مقالہ بنا کسی کے پس منظر کو  
 جانے لکھ دو۔ تو پھر کیوں اس تحقیق میں اپنا وقت برباد  
 کر رہی ہو۔“

اس سے پہلے وہ خود بھی یہی سوچ رہی تھی کہ  
 یقیناً وہ ایسا کر سکتی ہے اور وہ کر بھی جاتی۔ یہ شاعری  
 اس کے دل و ذہن پہ کچھ اس طرح مسلط تھی کہ وہ  
 باسانی اپنا کام کر سکتی تھی۔ فرہاد نے اپنے کلام میں  
 زندگی کے جس حسین رنگ کو متعارف کر دیا تھا وہ  
 ”محبت“ سے ”درد“ کا بندھن تھا۔ گو یہ سب نیا نہیں  
 تھا لیکن ہاں اس کے کہنے کا انداز نرالا تھا اور اس کے  
 لفظوں کا خنجر انمول کو روح میں اترتا محسوس ہوتا تھا۔  
 اس سے پہلے جب تک وہ اس کے کلام کی دیوانی تھی  
 اس بات سے کوئی سروکار نہ رہی تھی کہ یہ شخص کون  
 ہے لیکن کل سے یہ جیسے اس کی ضد بن چکی تھی کہ اسے  
 فرہاد کے متعلق جانا تھا۔

”مجھے لگتا ہے اس کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس  
 کی شخصیت کو کھوجنا نہایت اہم ہے۔ میں جس  
 شاعری سے متاثر ہوں وہ محض الفاظ تو نہیں ہیں۔ وہ  
 ایک انسان کے جذبات ہیں اور ان کی روح تک  
 پہنچنے کے لیے اس انسان کے بارے میں جانتا ہے  
 حد ضروری ہے۔ آخر وہ کون ہے؟ کیا ہے اور کس

تلاش تھی جو فرہاد کو جانتا ہوتا کہ اس سے اس کی  
 شخصیت کے متعلق معلومات اکٹھی کر سکتی اور اگر ممکن  
 ہوتا تو خود اس سے مل پاتی۔ وہ اس کی شخصیت کے  
 چھپے پہلوؤں کو جان کر ہی اس کی شاعری پہ اپنا نظریہ  
 بیان کرنا چاہتی تھی۔ یہ کتاب میں لکھی کسی نظم کی  
 تشریح یا خلاصہ نہیں تھا یا پھر کسی مضمون کا تنقیدی  
 جائزہ جو وہ پروفیسر رضوی سے سمجھنا چاہتی تھی۔ ایک  
 ”آؤٹ آف داؤے“ مہیلب تھی اور یہی وجہ تھی کہ  
 اسے اب ان کے پاس بٹھے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔  
 اس کے سوال پہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد  
 انہوں نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ آؤں بوائے  
 میز پہ کافی کے کپ رکھ کر جا چکا تھا اور وہ بغور کافی کے  
 اس کپ کو دیکھ رہے تھے جس میں سے اس وقت  
 بھاپ اٹھ رہی تھی

”تو کیا آپ کسی ایسے شخص کو بھی نہیں جانتے  
 جس کے ذریعے فرہاد تک پہنچا جاسکے؟“ انہوں نے  
 اسے مدد کی آفر کی تھی اور اس وقت انمول کی اس سے  
 بڑھ کر مدد اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اسے اس گمنام شاعر  
 کے متعلق بتا دیتے لیکن ان کے پاس اس کے لیے  
 مثبت جواب نہیں تھا۔ پروفیسر رضوی کی باتوں نے  
 اسے اداس کر دیا۔ ان کے سنجیدہ اور بے تاثر چہرے کو  
 دیکھتے انمول نے مایوسی سے ایک اور سوال کیا۔  
 ”آپ فرہاد سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“  
 دونوں کہنیاں میز پہ لٹکائے وہ اب اس کی طرف دیکھ  
 رہے تھے۔

”میر اور غالب نے بھی اپنی بات کہنے کے  
 لیے اشعار کا سہارا لیا لیکن گمنامی کا راستہ اختیار نہیں  
 کیا۔ آج ایک عالم ان کا قدردان ہے۔ اس کے  
 علاوہ بھی بے شمار ایسے شاعر ہیں جن کا نام شہرت کی  
 بلند یوں کو چھوٹا ہے اور ان میں سے ہر کوئی اس شہرت  
 کا محتلاشی تھا اور ہے۔ پھر ایسی کیا وجہ ہے کہ ایک اتنا  
 باکمال شاعر دنیا کی نظروں سے اوجھل رہے وہ بھی  
 آج کے دور میں۔“ وہ روانی میں کہہ رہی تھی اور  
 پروفیسر رضوی اس کے چہرے پہ نظریں جمائے



پرست تھی جو شاید سب ہی زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر ہوتے ہیں لیکن جس حقیقت میں وہ زندہ تھی اور جس طرح اس کے آئینہ کلزم کا خاتمہ ہو رہا تھا وہ اسے ہر دن اذیت دیتا تھا۔ قاسم کا غیر جذباتی رویہ اسے تکلیف دیتا تھا۔ وہ ایک بے حد رومانٹک روح تھی جو ایک انتہائی غیر رومانٹک اور دوسرے معنوں میں سپاٹ انسان کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔

قاسم ایک اچھا انسان تھا لیکن افسوس وہ انمول کو محبت نہیں دے سکتا تھا۔ وہ محبت جس کی امید انمول، قاسم سے رکھتی تھی یا شاید وہ اس سے محبت ہی نہیں کرتا۔ یہ سوچ کر اس کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ ایسا کیا تھا جو اس نے ان گزرے تین سالوں میں قاسم کے لیے نہیں کیا تھا۔ ایک اچھی بیوی کی طرح اس نے اپنا فرض پورا کیا تھا۔ وہ اس کے لیے سراپا محبت بنی رہی تھی اور اس نے اپنے ہر اک انداز سے یہ قاسم پہ واضح کیا تھا۔ خیال تو قاسم بھی اس کا رکھتا تھا، اس کی ضرورتوں کی فکر کرتا تھا لیکن انمول کو یہ رویہ سخت نہیں لگتا تھا۔ اس سوچ نے اس کے اندر جو فرسٹریشن بھر تھا اس کا نتیجہ آج اس کے اور قاسم کے رشتے میں پیدا ہونے والا وہ خلا تھا جو دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

رونے سے دل ہلکا ہوا اور اب اپنی حماقت پہ افسوس ہو رہا تھا کہ اس طرح پروفیسر صاحب کے کمرے سے اٹھ کر چلی آئی ہے۔ یقیناً انہیں برا لگا ہوگا لیکن اب یہ سب سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے انیشن میں جابی مگھا کر گاڑی اشارت کی اور پارکنگ سے نکال کر گھر کی راہ لی۔

”ہیلو انمول آپی۔ وعدہ کر کے بھی آپ ہمارے گھر نہیں آئیں۔“ فاران کی بلند آواز پہ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ گاڑی ریپ یہ کھڑی کر کے وہ اس وقت مین گیٹ کا تالا کھول رہی تھی کہ فاران اور اس کی امی کو اپنی طرف متوجہ پا کر خود کو تاریل کرتی وہ ان کے پاس چلی آئی۔ سب معمول وہ دونوں کالج سے گھر واپس آ رہے تھے۔

طرح کھدیتا ہے ایسی گہری باتیں۔“ اس نے انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کی۔ جانے کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے پروفیسر رضوی یا تو اسے سنجیدہ نہیں لے رہے یا پھر اسے ٹال رہے ہیں۔

”ہر انسان کی ذات کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں اور جذبات سب میں یکساں پروان چڑھتے ہیں اسے میں اگر آپ کو ایک شاعر کی کہی چند بے کلی نظمیں دل کے قریب لگنے لگیں تو یہ محض ایک اتفاق ہے۔“ کندھے اچکا تے وہ استہزائے لہجے میں بولے اور اپنی میز پر کچے کافے کے کپ سے گھونٹ بھرا۔

”سب کے پاس جذبات نہیں ہوتے۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ اس کے بنا بہت مطمئن اور پرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی نظر میں جذبات کی کوئی اہمیت نہیں۔ نہ اپنے اور نہ ہی کسی دوسرے کے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

پروفیسر رضوی اس کی آنکھوں میں پنہاں درد کی جھلک دیکھ کر حیران ہوئے اور ان کی حیرانی وہ خود بھی دیکھ چکی تھی اس لیے یک دم ٹکا ہیں جھکا لیں۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندہ لگا تھا جو خود پہ قابو پانے کی کوشش میں آنکھوں سے نہیں جھٹکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتے، بنا کچھ کے انمول اپنی چیزیں اٹھا کر ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

یونیورسٹی پارکنگ تک پہنچتے پہنچتے اس کے لیے اپنے روکے ہوئے آنسوؤں پہ بند باندھنا مشکل ہو گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اسٹرنگ پہ سر نکالنے اس نے زار و قطار رونے شروع کر دیا تھا آخر کب تک انسان اپنا بھرم قائم رکھ سکتا ہے بھی تاں کبھی تو اس کے صبر کا پیمانہ پھٹک ہی جاتا ہے سو اس کا بھی جھٹک گیا تھا۔ وہ سب سے بے جا تک دہل کہتی تھی کہ اسے فریاد کی شاعری پسند ہے اور وہ اس کا پسندیدہ شاعر ہے لیکن آج تک اس نے کبھی کسی کو یہ نہیں بتایا تھا وہ خود اس طرز کی زندگی جینا چاہتی ہے جس کا ذکر فرہاد لفظوں میں کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ شدید آئیڈیل



ہی دیکھی تھی اور یہیں سے وہ اس کلام کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی۔

”میں آتا جا ہتی تھی فاران لیکن ٹرسٹ می ان دنوں تھیس کو لے کر اتنا اسٹریس ہے۔ پھر قاسم بھی دو دن سے شہر میں نہیں ہیں۔“ فاران کی شکایت پر وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

”قاسم آج کل گھر نہیں اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ مجھے بتاؤ کوئی پریشانی تو نہیں بلکہ تم ایسا کرو میرے ساتھ گھر چلو وہیں بیٹھ کر سکون سے بات کریں گے۔“ اس سے پہلے کہ فاران کوئی جواب دیتا وہ اپنی فکر مند لہجے میں بولیں۔ ”انمول کے لیے ان کا فکری فطری تھا۔ اسی لیے ہلکی سی خطی کے بعد پورے استحقاق سے اسے ساتھ چلنے کو کہا۔

”ابھی نہیں سی باجی لیکن میں کل ضرور آپ کی طرف چکر لگاؤں گی۔“ انمول اس وقت ایسی دہشتی حالت میں نہیں تھی کہ ان کے ساتھ جاسکتی۔

”چلو جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے لازمی بتا دینا۔“ انمول کے گال کو محبت سے چھوئے وہ جلد ہی مان لگیں ساتھ ہی ساتھ تاکید بھی کی۔

”ارے ہاں! تم نے اپنا تھیس لکھنا شروع کر دیا مجھے ٹاپک تو بتایا ہی نہیں۔“ اپنی چادر درست کرتے انہوں نے مزید پوچھا۔

”میرا کٹام شاعر۔ فرہاد۔“ انمول نے دھیمی آواز میں کہا۔ کچھ دیر پہلے پروفیسر رضوی سے ہوئی گفتگو ایک بار پھر سوچوں کے پردے سے نکرائی شاید اسی لیے وہ ان کے چہرے پر نمودار ہوئی خجیدگی پر غور نہیں کر پائی تھی۔

”میں چلتی ہوں۔“ اسے لگا تھا اگر وہ کوئی تیرہ کرپس کی تو وہ غلط تھی۔ کلائی پر بندھی اپنی گھڑی پہ ایک نظر ڈالتے وہ اب انمول کو نہیں دیکھ رہی تھیں بلکہ سڑک کے کنارے پہ لگے ایک مجھے پہ لگا ہیں بجائے تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ انمول انہیں کوئی اوداعی کلمات کہتی وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑیں۔

السلام علیکم سی باجی۔ جیلو فاران!“ مسکراتے ہوئے وہ دونوں اب اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ دہشتی طور پہ شدید ڈسٹرب ہونے کے باوجود اپنی ساری قوت برداشت جمع کرتے وہ انہیں دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔

”علیکم السلام انمول یونیورسٹی سے آ رہی ہو؟“ انہوں نے ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے برخلوص انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ جواب میں انمول بھی سر ہلاتے مسکرائی تھی۔

اس ایریا میں یہ وہ واحد فیملی تھی جن سے انمول کا تھوڑا بہت میل ملاپ تھا۔ چند سال پہلے شادی کے بعد جب وہ قاسم کے ساتھ یہاں آ کر رہنے لگی تو فطری جھک کے زیر اثر اس پڑوس میں کسی سے بھی دوستی نہ کر سکی۔ لیکن پھر جب اس نے یونیورسٹی جوائن کی تو اس کا سامنا اتفاقاً ان لوگوں سے ہوا اور یہیں سے انمول کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا تھا۔

”آپ نے پراس کیا تھا آپنی، آپ آئیں گی اور دیکھ لیں آج تک وہ پراس پورا نہیں ہوا۔“ فاران نے بڑی اپنائیت سے شکوہ کیا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سال کے قریب تھی اور حال ہی میں اس کا داخلہ فرسٹ ایئر میں ہوا تھا۔ بہت ہی سلگھا ہوا اور گیزر وار پچ تھا جس کی وجہ سے قاسم اور انمول اسے بہت ہی پسند کرتے تھے۔

سی باجی سنگل مدر تھیں اور ایک قریبی گرلز کالج میں لیکچرر کے طور پر کام کرتی تھیں۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ البتہ شخصیت میں دکھ رکھاؤ اور انداز سے خاندانی پن جھلکتا تھا۔ کم قیمت اور سادہ سے لباس میں بھی وہ ہمیشہ بڑی باوقار نظر آتی تھیں۔ انمول نے انہیں بھی بناؤ سنگار کرتے نہیں دیکھا تھا پھر بھی ان کا چہرہ بے حد پرکشش تھا، البتہ کئی ایام کی چند کبیریں جبر یوں کی صورت پیشانی پر نمودار ہو رہی تھیں۔ عمر کے فرق کے باوجود انمول کی ان سے اچھی دوستی ہوئی تھی جس کی بنیادی وجہ ان کی ادبی شخصیت تھی۔ ”فرہاد“ کی کتاب پہلی بار انمول نے ان کے گھر میں



کا کام انتہائی جامع تھا۔ اسے کسی اصلاح کی ضرورت نہیں تھی یہ کسی بھی صاحب ذوق کو ایک بار پڑھنے سے پتا چل سکتا تھا۔

”وہ کیوں؟ اتنا شان دار کام ہے تمہارا۔ پبلشر کو اور کیا چاہیے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”پسے اور شہرت۔ جو فی الحال میرے پاس نہیں۔“ علی نے کاپی کے چند صفحے پلٹتے بے بسی سے ان پر لکھے سیاہ حروف کو دیکھا اور بند کر کے واپس اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

”اور مستقبل قریب میں آتی نظر بھی نہیں آ رہی۔“ وہ دونوں ہاتھ سینے پہ لیٹے کرسی پہ پرسکون سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسنے حالیہ مسائل اور سرگرمیوں کے مسائل کے ساتھ یہ خواہش ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی تھی۔

”ایسا مت کہو۔ لفظوں میں اتنی روشن خیالی اور حقیقت میں اتنی مایوسی۔“ اسے تکلیف ہوئی تھی۔ وہ ایک بے حد حساس لڑکی تھی اور احساس کا یہ تعلق جلد ہی محبت کی صورت اس کے وجود پہ اترنے لگا تھا۔

”جب ارد گرد نا کامی نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں تو مایوسی یونہی روح تک اتر جاتی ہے۔“ میز کا کونا کھرتے وہ دھیمی آواز میں بولا۔ وہ اسے کیا بتاتا اس شہر میں قلم والوں کا کس طرح استحصال ہوتا ہے۔ اچھے شعروں پہ سب سر دھتے ہیں لیکن جب معاوضے کا ذکر آتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں۔ کس کس طرح دل شکنی کی جاتی ہے۔ حوصلے اور ہمت توڑے جاتے ہیں۔

علی کی باتوں سے اس کے چہرے پہ بھی مایوسی پھیلنے لگی تھی۔

”لیکن اگر تمہارا ساتھ میرا آئے تو یہ اندھیرے اجالوں میں بدل سکتے ہیں۔“ علی نے اچانک میز پہ دھرا اس کا ہاتھ تھامتے سوال کیا۔ اسے اپنے سامنے یہ مایوس چہرہ اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ ہی تو اس کے حسن کو دودھ آسہ کرتی تھی اور اب اس سے حسن کی یہ تھنک برداشت نہ

قاران نے ماں کو جاتے دیکھا تو انمول کو دیو کرنا وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

چند سینڈ انمول دین کھڑی ان کے اس عجیب و غریب رویہ کے متعلق سوچتی رہی اور پھر سر جھٹکتے گیٹ کھول کر گاڑی اندر کھڑی کرنے لگی۔ اس کا ذہن پہلے ہی بہت الجھا ہوا تھا آج کے دن وہ مزید کسی نئی آنکھن کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے اور یہ عشق کی آگ ہی تھی جس نے جذبات میں چراغاں کر رکھا تھا۔ اس رات جو قصہ غم شروع ہوا تھا تو ہرگز رتے دن اس میں فقط اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ دنیاوی اعتبار سے مختلف سہمی لیکن حقیقت میں وہ دونوں ایک جیسے تھے اور ان کی یہی خاصیت انہیں دن بدن قریب لارہی تھی۔ اس کا تعلق شہر کے ایک ممتاز ترین گھرانے سے تھا تو دوسری طرف علی کی زندگی شہر کی تنگ گلیوں میں گمائی میں بسر ہوئی تھی۔ پھر بھی دونوں میں قدر مشترک ”حساسیت“ تھی۔ وہ دل تھا جو لطیف جذبول سے اسیر دھڑکتا تھا۔ علی لفظوں سے کھیلنے کا ہنر جانتا تھا تو وہ ان کی گہرائی سے واقف تھی۔ نئی ایام اپنی جگہ اور محبت اپنی جگہ۔ اس کے اور اپنے اسٹیشن کے فرق کو دھیان میں رکھ کر بھی وہ اس کی چاہت سے دست بردار نہیں ہو سکا تھا۔

”اسے کتابی شکل میں کب لاؤ گے؟“ اس کے ہاتھ میں علی کی نوٹ بک تھی جس میں اس کا تازہ کلام لکھا تھا۔ وہ تو پہلے ہی متاثر تھی اب تو مداح بن چکی تھی۔

”فی الحال تو ایسی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔“ علی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ وہ دونوں آج کلاس کے بعد کیفی ٹیرا چلے گئے تھے۔ کل اس نے یہ نوٹ بک لی تھی اور آج بڑھ کر اسے واپس کرتے ہیں۔ اپنا اظہار خیال کرنے کے ساتھ ساتھ وہ چاہتی تھی کہ جلد اسے کتابی صورت میں بھی دیکھے کیونکہ علی



ہوئی تھی۔

”یہ میری خوش نصیبی ہوگی فرہاد“ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ علی کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا تھا۔ یک بیک جلوؤں سی ٹٹائی آنکھیں چراغاں کا منظر پیش کرنے لگی تھیں۔ وہ اسے ایک بار پھر مسکرانے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”اور ایک بات یاد رکھنا۔ میں فقط اجالوں کی نہیں اندھیروں کی بھی ساتھی بن کر تمہاری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ یہ وعدہ ہے میرا اس تعلق کو مرتے دم تک نبھاؤں گی“۔ وہ نہ بھی کہتی تو علی کو پورا یقین تھا کہ وہ اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ اسے اتنی شدت سے چاہنے لگا تھا تو کیسے ممکن تھا اس سفر میں تمہارہ جاتا۔ یہ محبت ہی تو ہے جو محبت کا آسرا بنتی ہے۔ اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے اتنی محبت تھی جس کے بعد کسی تیسرے سہارے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

☆☆☆

قاسم کو کراچی گئے آج با نچواں دن تھا اور پچھلے دو دن سے قاسم نے اسے کال نہیں کی تھی۔ انمول کے مینج یا پھر کال کرنے پر دونوں کے درمیان بات چیت نہایت سرسری سی ہوتی تھی جس کی وجہ سے وہ آج شدید ڈپریشن میں تھی۔

اس دن فاران سے وعدہ کرنے کے باوجود وہ اگلے دن ان کے گھر نہیں جا پائی تھی کیونکہ اسے اپنی امی کی طرف جانا پڑ گیا تھا۔

”قاسم کراچی گیا ہے اور تم نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔“ صبح ان سے کال پر بات کرتے ان کی ڈنر کی دعوت پر انمول نے قاسم کی غیر موجودگی کے متعلق بتایا تھا۔ وہ جانتی تھی اگر انہیں پتا چلا تو وہ اصرار کر کے اسے اپنی طرف بلا لیں گی اس لیے اب تک یہ بات ان سے چھٹی تھی۔ قاسم کے گھر والے البتہ واقف تھے اور ایک دو بار اس کی حیریت پر چھپکے تھے۔

”کام کے سلسلے میں اکثر جاتے رہتے ہیں امی۔ اب تو دو تین دن تک واپسی ہے۔“ وہ خود

ڈسٹرب تھی پھر بھی انہیں تسلی دی تھی۔

”تم یہاں آ جاؤ انمول۔ وہاں اکیلی کیسے رہو گی۔“ اسی لیے وہ انہیں بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ ایک دم پریشان ہو گئی تھیں۔

”یہ میرا گھر ہے امی اور پھر میں کوئی چھوٹی بچی نہیں ہوں جو اپنے ہی گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔“ حالانکہ ایک ایک گلی بھاری تھا۔ کچھ قاسم سے دوری تو کچھ تنہائی کا احساس جو پہلے فقط اپنے اندر تھا اب باہر بھی اسی شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔

”تو بھلا تمہیں ساتھ ہی لے جاتا۔ شادی کے بعد ایک بار بھی تم دونوں کہیں گھومنے پھرنے نہیں گئے۔ چلو اسی بہانے تمہاری بھی آؤ ٹنگ ہو جاتی۔“ ماں کی بات پر انمول نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ خود کو جتنا بھی نارل اور خوش ظاہر کرتی لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بتاتے بھی سب کو معلوم ہوتی ہیں۔

”تاہم ہے بھلا میرے پاس آؤ ٹنگ کا۔ یونیورسٹی کی وجہ سے ایک منٹ کی فرصت نہیں ملتی۔ قاسم نے تو کہا تھا یہاں اکیلی رہنے سے بہتر ہے کراچی میرے ساتھ چلو۔ میں نے ہی کہا آپ اپنا کام کریں گے یا پھر مجھے تمہا میں پھرا میں گئے۔ ویسے بھی ان دنوں مجھے اپنے ٹیمپس کو لے کر بڑی ٹینشن ہے۔“ ماں کو تسلی دینا بھی ضروری تھی حالانکہ جھوٹ بولنا بہت مشکل تھا۔

”جی تو یہ ہے ہر عورت زندگی میں اپنا اور اپنی شادی شدہ زندگی کا بھرم رکھنے کی خاطر ایسے مصلحت آمیز جھوٹ بھی زندگی ضرور بولتی ہے۔“

دل میں ایک ٹیس سی اچھی تھی کہ کاش قاسم نے ایک بار دل رکھ کر بتا دیا ہوتا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔ ہولے سے ہنس کر بات بتاتے اس نے ماں کے سامنے اپنا بھرم رکھا تھا۔

”تو چلی جاتی پڑھائی کہاں بھاگی جا رہی تھی۔ وہ بے چارہ بھی شریف آدمی ہے جو تمہاری سی مان لیتا ہے۔ میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا شادی کے



اعتراض نہیں کیا کیونکہ انمول کے اکیلے ہونے کی ٹینشن تو بہر حال اسے بھی تھی۔ یہ جان کر کہ وہ آج رات وہیں رہنے والی ہے قاسم نے فوراً ہی کال بند کر دی تھی۔

اگلا پورا دن وہ قاسم کی کال کے انتظار میں رہی لیکن قاسم نے کال نہیں کی۔ شام تک مارے پریشانی کے انمول کا برا حال ہو گیا تھا۔ مجبوراً اس نے خود کال کی تو قاسم نے اسے اپنی مصروفیت کا بتایا۔ حسب معمول اس کی خیریت دریافت کی گئی البتہ کال منقطع کرنے سے پہلے اس نے انمول سے گھر واپسی کا پوچھا تھا۔ اس کا ارادہ نہیں تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس نے قاسم کے پوچھنے سے جزبہ آج رات یہیں ٹھہرنے کا ارادہ بتایا۔ قاسم متعجب نہیں تھا۔

انمول کے لیے قاسم بھی سرایا محبت نہیں تھا۔ وہ لگی بندھی گفتگو کا عادی تھا اور ان دونوں کی فون پہ ہوئی آج تک کی طویل ترین گفتگو بھی دس منٹ سے زیادہ نہیں تھی پھر بھی آج قاسم کا مخاطب سا رویہ انمول کو ابھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ اکیلے رہ کر پریشان ہونا آسان ہوتا ہے سب کے درمیان گرنا مشکل نہیں اذیت کھاتا ہے۔ وہ بھی آج اسی اذیت میں مبتلا تھی۔ اپنے گھر والوں کے سامنے ہنسا مسکرا کر مجبوراً ہی حالانکہ دل میں اسے شدید کوفت کا سامنا تھا۔

اگلے دن صبح ماں کے لاکھ روکنے پر بھی وہ گھر واپس آ گئی تھی۔ دہری اذیت کے ساتھ ان سب کا سامنا کرنا آسان نہیں تھا۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر اس نے ناچاچے ہوئے بھی قاسم کو میسج کیا تھا۔ دل چاہتا یا نہ چاہتا اسے مطلع کرنا ضروری تھا۔

”ریچڈ ہو (گھر پہنچ گئی)۔“

سینڈ کاٹن دبا کر اس نے بے دلی سے فون بیڈ پہ اچھالا اور خود اپنی چیزیں سیٹھنے لگی۔ بھوک تو دیے

بعد مزید پڑھنے کی تک ہی کیا ہے۔ مگر دیکھو، شوہر کو دیکھو۔ اپنی جلی شروع کرو۔ کب تک یونہی کتابوں میں سر دیے آنکھیں پھوڑو گی۔“

انمول چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی۔ ماؤں کی باتیں ڈانٹ ڈپٹ سے شروع ہو کر نصیحت پہ ختم ہوتی ہیں۔ یہ ان کی محبت ہوتی ہے اور اسے جتانے کا ان کا اپنا انداز۔ ایک ماں اٹھتے بیٹھے بیٹی کی خوشیوں کی دعا کرتی ہے اور ان کے نزدیک یہ خوشیاں وہی ہوتی ہیں جو انہیں آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں۔ بیٹی کا سرال سے الگ رہنا، اس کے پاس بنیادی ضروریات سے بڑھ کر دنیاوی سہولیات کا ہونا ان کے نزدیک معیار ٹھہرتا ہے۔ قاسم کی سنجیدگی اور خاموشی کو اس کا سلجھا ہوا انداز سمجھ کر وہ بھی تسلی میں تھیں۔ انمول نے بھی ان سے اپنے مسائل نہیں کہے تھے۔ کبھی تو یقیناً وہ اسے جھڑک دیتیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ نہیں تھا۔ کسی بھی ماں کے نزدیک ایسی باتیں مسئلہ ہوتی ہی نہیں ہیں۔ مسئلے وہاں ہوتے ہیں جہاں بنیادی ضرورتوں کی قلت ہوتی ہے۔ بھوک ہوتی ہے۔ بیماری ہوتی ہے۔ اور اتفاق سے محبت بھوک ہے نہ بیماری۔ پھر بھلا انہیں بیٹی کی طرف سے کیا فکر ہوتی۔

گفتگو کے اختتام پر انہوں نے انمول کو گھر آنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ ابھی ناخن سے فارغ ہوئی تھی اور اسے آج یونیورسٹی بھی نہیں جانا تھا اس لیے سستی میں بیٹھی تھی لیکن اب اٹھنا مجبوری تھی۔ قاسم کو میسج پہ بتایا کہ وہ اپنی امی کی طرف جا رہی ہے۔ جواب اسی وقت آ گیا تھا۔ وہ جانتی تھی اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگلا میسج اس نے ہی باقی کو معذرت کا کیا تھا۔

سارا دن جیکے میں گزار کر وہ شام کو واپس آنا چاہتی تھی لیکن اسے رکنا پڑا۔ امی کو اس کے اکیلے ہونے پہ پریشانی تھی تو ابو کی خواہش تھی وہ ایک دو دن وہاں ان کے ساتھ گزار لے۔ مجبوراً اسے ان کی بات رخصتی پڑی تھی۔ قاسم کو بتایا تو اس نے بھی



”آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس کا جواب اس بات پہ مہر تھا کہ وہ قاسم سے نفا ہے۔

”فرق پڑتا ہے اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔“ وہ ناراض تھی اور آج پہلی بار اپنی ناراضی جتا بھی رہی تھی ایسا نہیں ہو سکتا تھا اسے فرق نہ پڑتا۔

”فرصت کہاں ہے آپ کے پاس۔“ یقیناً آج ایک غلیظ دن تھا۔ تین سال میں پہلی بار وہ شکایت کر رہی تھی۔

”فرصت نکالی جاسکتی ہے۔“ جواب اسی انداز میں آیا تھا۔ فی الغور اور بے ساختہ۔

”سر میں درد ہے میرے آپ سے پھر.....“ اس وقت طوفان تھا جو دل میں دبا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اپنی ساری فرسٹریشن اس طرح قاسم کے سامنے نکالے اسی لیے کال بند کرنا چاہی۔ قاسم نے اس کا ارادہ بھانچے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”فون بند نہیں کرنا امول۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ یو ساؤنڈ سو ویرڈ (تم بہت عجیب لگ رہی ہو)۔“ یہ تو طے تھا وہ ناراض ہے لیکن یہ معہل کرنا ابھی باقی تھا کہ کس وجہ سے کیونکہ پہلی بار وہ براہ راست قاسم سے شکایت کر رہی تھی اور قاسم کا ذہن اس پزل کے کٹڑے اکٹھے کرنے میں مصروف تھا۔

”کیا سننا چاہتے ہیں آپ؟ یہی کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ قاسم میں انسان ہوں کوئی مشین نہیں اور ہر انسان کے صبر کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ آپ کے اندر احساس نامی شے کا خدا ن ہے لیکن مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ میں استعمال کی چیز نہیں آپ کی بیوی ہوں جسے آپ کے حد درجہ نظر انداز کرنے سے درد ہوتا ہے۔ وہ بس یہی نہیں چاہتی تھی لیکن جس دہنی دباؤ سے گزر رہی تھی یہ آتش فشاں باہر نکلتا ہی تھا۔ پزل مکمل ہو گیا تھا۔ قاسم کو اندازہ ہو گیا تھا وہ کس بات سے اپ سیٹ ہے۔

”مجھے لگتا ہے اپنی فیملی کے ساتھ بڑی ہوگی۔ میں بس تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ اسے اس عجیب و غریب توجیہ پہ ہنسی

بھی نہیں محسوس ہو رہی تھی اور اگر ہوتی بھی تو اس وقت اس کا کھانا پکانے اور کھانے کا ارادہ نہیں تھا۔ دو منٹ بعد اس کا فون پرفیکٹ اسٹریجی کی مخصوص رنگ ٹون کے ساتھ بجنے لگا تھا۔

”ہیلو۔“ کالر آئی ڈی پہ نگاہ ڈالے بغیر بھی وہ جانتی تھی کال کس کی ہے۔

”کب آئیں؟“ معمول کے انداز میں خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے اگلا سوال کیا تھا۔

”آپ کی زندگی میں آئے تین سال ہو چکے۔“ زبان سے بے ساختہ نکلا تھا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ لہجے کی جھین کو نظر انداز کرتے اس نے محفوظ ہوتے جواب دیا تھا۔

”یاد دہانی کرو رہی ہوں۔“ فون کان سے لگائے وہ فریج وٹو کے پاس آگئی تھی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے لیکن سورج بادلوں کی تہ تلے چھپا تھا جس کے باعث باہر روشنی برائے نام تھی۔

”آج کل۔ اس ہفتے ہماری ویڈیو ایڈو سری نہیں ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا تھا۔ ذہن امول کی گفتگو میں الجھا تھا۔

”ایڈو سرری ڈے کے علاوہ بھی یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔“ وہ اس سے کبھی اس لہجے یا ذہنی انداز میں بات نہیں کرتی تھی جس طرح آج کر رہی تھی اور قاسم ہرگز اتنا جتنی نہیں تھا جو اس انداز کو محسوس نہ کرتا۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ اس نے بات بدلنا مناسب سمجھا تھا۔

”ہاں۔“ بے ساختہ اور دو ٹوک انداز میں بتایا گیا تھا۔

”موسم کیسا ہے وہاں؟“ اس نے مزید پوچھا۔

”سرد۔“ جواب اسی بے زاری سے آیا تھا۔

چند لمبے خاموش گزرے لیکن خاموشی بے کار تھی۔

”موڈ کیوں خراب ہے؟“ قاسم نے بالآخر سوال کیا تھا۔



نہیں جانتا تھا۔

”ضرورتیں، چیزیں، اس چیز کی کمی۔ اس کی زیادتی۔ زندگی آپ کی نظر میں بس چیزوں کے آسرے بسر ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت ہے اس کی نہیں۔ زندگی آپ کی نظر میں ضروریات کے تابع بسر ہوتی ہے۔ کل میری ضرورت نہیں رہی تو مجھے نکال باہر کریں گے آپ؟“ قاسم نے بات شروع کی تھی انمول نے مکمل نہیں ہونے دی۔ وہ الٹا مزید مشغول ہو گئی تھی۔ قاسم کا جواب سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

دوسری طرف قاسم حیران پریشان اپنے سیل فون کو دیکھ رہا جس میں ڈسکونشن فون اب تک بج رہی تھی۔

☆☆☆

فون بیڈ پہ واپس پھینک کر ٹیکے میں منڈے دے زارو قطار روئی رہی۔ اس دوران اس کا فون مسلسل بج رہا تھا لیکن وہ قاسم سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد فون کی بیل بجنا بند ہو گئی تھی۔ آنسو بھی اپنے آپ ختم کئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا رنٹل شدید تھا۔ پتا نہیں کتنے دنوں کی بے سکوئی تھی کہ رونے سے طبیعت ہلکی ہوئی تھی اور وہ وہیں لٹی لٹی سو گئی تھی۔ تین بجے کے قریب اس کی آنکھ ایک بار پھر فون کی بیل سے کھلی تھی لیکن یہ کال قاسم کی نہیں بلکہ کسی باجی کی تھی۔ ایک تو روتے ہوئے سوئی تھی اس پہ نیند کا اثر۔ اس کی آواز کا بوجھل پن محسوس کرتے وہ متحکروں کی تھیں۔ انمول نے طبیعت خرابی کا بہانہ بناتے ان کے سوالات سے بچنا چاہتا تھا لیکن اس کا الٹا نتیجہ نکلا تھا۔ وہ شام میں سوپ کا پیالہ لیے اس کی خیریت پوچھنے چلی آئی تھیں۔

”تمہاری طبیعت کا پتا چلا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔“

”طبیعت ٹھیک ہے میری بس۔“ اس سے بولا بھی مشکل سے جا رہا تھا۔ پہلا اگر وہ افسردہ بھی تو اب ڈپٹی دباؤ تھا۔ فون پہ قاسم کی بے شمار مسد کالز تھیں جو

کم غصہ زیادہ آیا تھا۔

”شادی کے بعد وہ نہیں آپ میری فیملی ہیں۔ آپ سے زیادہ اہم نہیں رہے وہ سب۔ پھر دن میں دو بار دس سے پندرہ منٹ روٹین کی باتوں سے کوئی ڈسٹرب نہیں ہوتا۔ یا شاید آپ کو لگا دو دن کے لیے ہی کسی جان چھوٹی۔“ پہلی بار تھا وہ اس کے بغیر اتنے دن میکے میں رہی تھی ورنہ اس کے ساتھ جانی اور ساتھ ہی واپسی ہو جانی۔ کچھ اس کا اپنا شیڈول ایسا تھا کہ اسے ماں کے پاس جا کر رہنے کی فرصت کم ہی ملتی تھی تو یہ بھی سچ تھا وہ قاسم کو گھر چھوڑ کر وہاں رہنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ انمول کا وہاں رہنا عجیب نہیں تھا۔ عجیب قاسم کا رویہ تھا جو حفظ اپنی ہی سوچ کے تابع تھا اور جسے آج تک انمول سمجھنے سے قاصر تھی۔

”ایسی بات نہیں یا ر۔ تمہاری فکر ہے اور.....“

”اپنی فکر اپنے پاس سنبھال کر رہیں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”ایڈ ٹاؤ یو آر مس لی بیوگ۔“ یہ مرد تھا اور پھر شوہر، اس سے زیادہ اس کے لہجے کی کچی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”اسی لیے کہا تھا مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔“

آپ مردوں کا مسئلہ ہی یہ ہے۔ عورت ہونٹ سی کر پھرے، آپ کی ہر بات سے سر جھکانے، آپ کے غلط رویوں پہ خاموش رہے بلکہ مسکرا کر بھی دکھائے۔ اپنے جذبات مار کر آپ کے ساتھ زندگی گزار دے تو وہ اچھی ہے۔ جہاں شکایت کی، اس پہ بدتمیز ہو کر سرکش کا ٹیکل لگا دیا جاتا ہے۔ “تین سال کی مٹھن تھی جو ان تین منٹوں میں باہر نکل رہی تھی۔ وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہی تھی۔

”میری پوری کوشش رہی ہے کہ تمہیں کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھا ہے میں نے۔ مانگنے سے پہلے.....“ پتا نہیں وہ کب سے رو رہی تھی اور کچھ بار قاسم کے سامنے، اس کی وجہ سے رو رہی تھی۔ اتنی انمول کا رونا تکلیف دے رہا تھا۔ وہ اتنے بھنا چاہتا تھا لیکن کس طرح وہ



تھی۔ پتا نہیں قاسم نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں۔ گھڑی کی طرف دیکھتے اس نے سوچا تھا۔

”تم نے اپنا مقالہ لکھنا شروع کر دیا انمول؟“ اسے کھانا دیکھ کر وہ خود بھی مطمئن ہو گئی تھیں۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

”ابھی تو نوٹس اکٹھے کر رہی تھی سی باجی لیکن پھر اچانک مجھے لگا شخصی تعارف اور بیک گراؤنڈ جانے بغیر بھی بھلا کوئی تنقیدی مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔“ وہ خود اردو کی لیکچرار تھیں اور سالوں سے تدریس کے شعبہ میں، اسی لیے وہ ان سے اکثر اپنی پڑھائی کے متعلق باتیں ڈسکس کر لیا کرتی تھی۔

”کیا آپ فرہاد کو جانتی ہیں؟“ اس نے ایک دم ہی سوال کیا تھا۔

”میں؟“ وہ چونکیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتیں انمول نے خود ہی اپنی بات گورد کر دیا تھا۔

”مجھے اندازہ ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس سلسلے میں اپنے ڈیپارٹمنٹل ہیڈ کے پاس بھی گئی تھی میں۔ انہیں لگتا ہے مجھے اس تردد کی ضرورت نہیں لیکن میرا ذہن بند ہو گیا ہے۔ ساری ریسرچ ریک گئی ہے۔ کاش کوئی مجھے فرہاد کے متعلق بتا سکتا۔ بھی بھی تو لگتا ہے وہ حقیقت میں ہے ہی نہیں۔ جیسی تخیلاتی باتیں کرتا ہے بالکل اسی طرح کا کوئی کردار ہے۔“ انمول یہ ایک بار پھر مایوسی غالب آنے لگی تھی۔ وہ سامنے لب کاٹتے سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں۔ انمول اب انہیں اپنے نوٹس کے متعلق تفصیل سے بتا رہی تھی۔

☆☆☆

”فیڈ بیلک“ وہ روڈ سائڈ پہ کھڑی بے بسی سے اپنی گاڑی کے فلیٹ ٹائر کی طرف دیکھ رہی تھی جب پاس رکتی گاڑی کی پچھلی سیٹ سے نکلے پروفیسر رضوی کی آواز پہ پلٹ کر دیکھا۔ ابھی توڑی دیر پہلے ہی وہ یونیورسٹی سے نکلی تھی کہ گاڑی کا پچھلا ٹائر پھڑ ہو گیا۔ اسے مجبوراً گاڑی سڑک کے کنارے پہ پارک کرنی پڑی تھی۔

اس وقت سے اب تک وہ انمول کو کرچکا تھا لیکن ان میں سے کسی ایک بھی اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ بہت سے میسجز تھے جنہیں اس نے کھول کر بھی نہیں دیکھے تھے۔ شادی کے اتنے سالوں میں پہلی بار اس نے قاسم سے جھگڑا کیا تھا وہ بھی اس کی غیر موجودگی میں اور یہ بات اس کے لیے معمولی تھی نہ ہی قاسم کے لیے، انمول کا یہ رد عمل نظر انداز کر دینے والا تھا۔ وہ اگر پریشان تھی تو قاسم بھی کم ڈسٹرپ نہیں تھا۔

”خود سے لا پرواہی اچھی عادت نہیں۔ چہرہ دیکھو ذرا اپنا، ایسا لگ رہا ہے جیسے مہینوں سے بیمار ہو۔ بالکل فریش نہیں لگ رہی ہو۔ قاسم آ کر دیکھے گا تو اسے شاک لگے گا۔“ وہ ہنس کر کہتی چکن کی طرف چلی گئیں۔

”وہ مجھے کہاں اتنے دھیان سے دیکھتے ہیں۔“ بے دلی سے صوفہ پہ بیٹھے اس نے پاؤں بھی اوپر ہی رکھ لیے تھے۔

”چلو اب یہ سوپ یو لو۔“ انہوں نے اس کی خود کلامی نہیں سنی تھی۔ کچھ دیر بعد چکن سے نکلے ان کے ہاتھ میں سوپ کا باؤل اور چمچ تھا جو انہوں نے سینئر ٹیبل پر انمول کے سامنے رکھتے محبت سے کہا۔

”آپ نے تکلف کیا سی باجی میں واقعی بیمار نہیں ہوں۔“ اپنی اتنی مصروفیت کے باوجود وہ اس کے لیے انجیل کھانا بنا کر لائی تھیں صرف یہ سن کر کہ وہ بیمار ہے۔ اسے شدید شرمندگی نے آکھیرا تھا۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ پھر بھی اپنی خدمت کرواتے رہنا چاہیے۔ تھوڑا سا خیرے اٹھوانا اچھا لگتا ہے۔“ اس کے پاس بیٹھے انہوں نے ہنس کر کہا اور سوپ کا باؤل اٹھا کر انمول کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

صبح ناشتے میں اس نے سلاکس اور چائے کا کپ پیا تھا۔ اب شام کے سات بجے سوپ کی خوشبو کو محسوس کرتے اس کی بھوک جھک اُچی تھی۔ سوپ واقعی مزے دار تھا۔ وہ جانتی تھی ان کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے اور اس وقت تو بھوک بھی زوروں کی



وہ خود اب ڈرائیونگ سیٹ پہ آکر بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی اشارت کرتے ہوئے انہوں نے انمول سے اس کے گھر کا ایڈریس پوچھا۔ انمول کے ایڈریس بتاتے ہی گاڑی دھبی رفتار سے سڑک پہ دوڑنے لگی تھی۔

”سوری اس دن میں بغیر اجازت اٹھ کر آ گئی۔“ وہ جھٹا انداز میں خاموشی سے ڈرائیو کر رہے تھے جب کچھ سوچتے ہوئے انمول نے دھبی آواز میں کہا۔

”میں نے برا نہیں منایا۔“ وہ ان سے اسی اعلا ظرنی کی امید رکھتی تھی۔

”لیکن مجھے واقعی برا لگا بلکہ افسوس ہوا۔ آئی نو اٹس بیڈ میز۔“ گاڑی اب جانے پہچانے راستوں پہ دوڑ رہی تھی۔

”فراہد سے کیوں ملنا چاہتی ہو انمول؟“ وڈ اسکرین کے پار سڑک پہ نگاہیں جمائے انہوں نے سوال کیا۔

”بتایا تو تھا آپ کو کہ اسے مقالہ میں۔“ لب کاٹنے اس نے انہیں دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

”یہ سب میں جانتا ہوں اور اس کا جواب بھی اسی دن دے چکا ہوں لیکن اب میں اصل وجہ جانتا چاہتا ہوں۔ تمہیں کیا چیز پریشان کر رہی ہے؟“ انہوں نے انمول کی بات کو کاٹ دیا تھا۔ انمول نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پہ جمائے وہ بہت دھیان سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ نظر سڑک پہ مرکوز۔ یقیناً انہوں نے انمول کا اپنی طرف دیکھنا محسوس کیا تھا اسی لیے گردن گھما کر بس چند سیکنڈ کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر واپس سڑک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”وہ..... وہ محبت کی بات کرتا ہے سر۔ احساس کی بات کرتا ہے۔ جذبات کی بات کرتا ہے۔ میں اس سے پوچھتا جا رہی ہوں اس نے کیا سوچ کر یہ باتیں لکھی ہیں۔“ دونوں ہاتھ گود میں رکھے اٹھایاں مروڑتے وہ ایک بار پھر وڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی

”نو تھینک یوسر۔ میں پہنچ کر لوں گی۔“ پروفیسر رضوی بھی شاید اس کے بعد ہی نکلے تھے اور اب اسے سڑک کے کنارے کھڑا دیکھ کر گاڑی روک کے مدد کی آفر کی تھی جسے اس نے مسکرا کر شکر یہ کے ساتھ بے ساختہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

”جانتا ہوں کا کروچ مارنے کے سوا ہماری خواتین دنیا کا ہر معرکہ سرانجام دے سکتی ہیں لیکن آپ کو اس طرح سڑک کے کنارے ٹائز بدلنے دیکھ کر نظر انداز کرتے آگے بڑھ جانا انتہائی نامناسب رو بہ ہے۔“ ان کی جس مزاح بھی شان دار تھی۔ بلکہ پھلکے مزاح کے پیرائے میں بات کرتے انہوں نے مسکرا کر کہتے بدستور اپنی آفر قائم رکھی تھی۔

”آپ کی مطلوبات ادھوری ہیں سر۔ ہم اب کا کروچ بھی خود ہی مار لیتی ہیں۔“ پروفیسر رضوی کے جواب پہ ہنس کر جواب دیتے وہ اب اپنی نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صبح کی بارش کے بعد سردی آج عروج پہ تھی۔ اس نے شلوار ٹیص کے ساتھ سیاہ سویٹر پہ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا لیکن اس وقت کھلے آسمان کے نیچے کھڑے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اسے اپنی شال بھی لانی چاہیے تھی۔

”میرا ڈرائیو کر لے گا یہ سب۔ آؤ میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ انمول کے ہاتھ سے جبک پکڑتے انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور پیچھے کھڑے اپنے ڈرائیو کی طرف دیکھا۔ ان کا اشارہ ملتے ہی وہ انمول کی گاڑی کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”لیکن سر۔“ انمول کو یہ مناسب نہیں لگا تھا۔ ”تم سے کچھ باتیں سمجھی کرنی ہیں۔ بیٹھو، ڈرائیو گاڑی گھر لے آئے گا۔“ جبک ڈرائیو کو پکڑاتے انہوں نے اسے ٹائز بدلنے کے بعد پیچھے لگانے کی تاکید کی اور انمول کے لیے آگے بڑھ کر پیئر سیٹ کا دروازہ کھولا۔ چند سیکنڈ وہ اس جیسے و غریب صورتحال پہ غور کرتی رہی۔ پروفیسر رضوی کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے پہ دروازہ بند کرتے



تھی۔ بارش کے بعد منظر محل گیا تھا۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ پھر بھی سورج کی روشنی مائل تھی۔

”شاعری سوچ سمجھ کر کوئی کرتا ہے۔ ایک خیال ہے جس کی آمد دل پہ ہوتی ہے، ذہن اسے لفظوں کے حال میں بن کر شعر کی صورت اگل دیتا ہے۔ تم ادب کی سب سے بڑی و ذری محل کر رہی ہو۔ اتنا سادہ سا فلسفہ نہیں جانتیں۔“ گاڑی سٹپل پہ رکی تھی جب انہوں نے انمول کی طرف دیکھا لیکن وہ اب ایک بگ سرک کو دیکھ رہی تھی۔

یہ بات وہ اس سے پہلے بھی نوٹ کر چکے تھے کہ وہ بہت دیر تک کسی ایک ہی چیز کو نگہتی رہتی تھی۔ آج بھی یہی ہوا تھا اور اس ایک منظر کے ساتھ جانے کتنے منظر فلم کی طرح ذہن کے پردے پہ نمودار ہوتے تھے۔ ماضی بھوت بن کر حال میں آکھڑا ہوا تھا۔ بے قراری سی بے قراری تھی۔ بے چینی سی بے چینی تھی۔ ہر سانس بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ ان ٹھہری ہوئی آنکھوں کا عکس اب تک نگاہوں کے سامنے تھا۔ ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کڑچیاں، جو باسانی گئی جا سکتی تھیں۔ زندگی سے باہر تھیں مار رہی تھی پہلی بار لگا تھا شاید انہیں دھوکا ہوا ہے دوسری بار نہیں۔ وہ ان کے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور جتنا وقت مجھ کو گفتگو رہی وہ لاشعوری طور پہ اس کے اس انداز کو گاہے لگا ہے نوٹ کرتے رہے تھے۔ وہ بات کرتے کرتے ایک ہی منظر پہ ٹھہر جاتی تھی۔ اور پھر اچانک منظر بدل گیا تھا۔ اب انمول کی جگہ وہ وہاں بیٹھی تھی۔ چہرہ بدلا تھا نگاہیں نہیں۔ ان آنکھوں میں بھی وہی درد تھا جو انمول کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہی ادا سی تھی۔ وہی ٹھہری ہوئی زندگی تھی۔ ٹوٹے ہوئے خواب تھے اور ریزہ ریزہ حسرتیں۔ اٹل آئینہ مسکراتے ہوئے لبوں پہ رکی ہوئی شکایتیں۔

”کیوں آتے ہیں اسے یہ باطل خیالات؟ وہ محبت جس کا اس دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔ ایسے جذبے جن سے اس دنیا کا دور تک کوئی واسطہ نہیں پھر کیوں وہ مجھے اور مجھ جیسی کتنی ہی لڑکیوں کو گمراہ

کرنے کے لیے ایسی لفاظی کا سہارا لے رہا ہے۔ اس جھوٹ کا پرچار بند کیوں نہیں کر دیتا وہ جس میں الجھ کر ہم خواب دیکھنا شروع کر دیں۔ حقیقت سے فرار پانے کو دل چاہے۔“ اس کی آواز پہ وہ یک دم چوٹکتے ماضی سے حال میں لوٹے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دیکھتے وہ ان سے مخاطب تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کا سوال فرہاد سے نہیں ان سے ہے۔

”روٹی کہتا ہے محبت کسی راگن نہیں جاتی کیونکہ محبت ہی اصل زندگی ہے۔“ اسی کے لفظوں سے اسے مات دیتے وہ بے ساختہ بولے تھے۔ انمول نے بے اختیار شغالب کاٹا۔ ”تم نے کہا تھا وہ تمہارا فیورٹ ہے۔ اس کا کلام تمہیں ازبر ہے اور اسی لیے تم اس پہ اپنا مقالہ لکھنا چاہتی ہو۔“ نظریں موڑتے وہ اب سٹپل کو دیکھ رہے تھے۔ پانچ۔ چار۔ تین۔ دو۔ ایک۔ پہلے پتی پتی چلی اور پھر وہ گرین ہو گیا۔ سب گاڑیاں تیزی سے ایک بار پھر سڑک پہ دوڑنے لگی تھیں۔

”نہی تو ابھن ہے۔ وہ دل کی باتیں کہتا ہے جو سیدھی دل پہ اثر کرتی ہیں لیکن جیسے ہی کتاب بند کرو اس کا ہر لفظ غلط ثابت ہونے لگتا ہے۔ تعلق پہ ضرورت حاوی ہو جاتی ہے۔ محبت بے معنی و بے کار جذبے کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ احساس کا رشتہ تنہا کھڑا اپنی بے بسی کا ماتم کر رہا ہوتا ہے۔“ وہ جیسے دو دھاری کھوار پہ چل رہی تھی۔ دل جو چاہتا تھا حقیقت میں میسر نہ تھا۔ جانتی تھی دل نادان ہوتا ہے پھر بھی خواب بننا کسے برا لگتا ہے۔ پھر اس کی عمر میں تو سب ہی خواب بننے ہیں۔

”یہی اس دنیا کی چٹائی ہے انمول۔ تحلیل علی زندگی سے بہت دور کی چیز ہے۔“ پروفیسر رضوی کی پرسوج آواز سنائی دی گئی۔

”تو کیوں کرتا ہے وہ ایسی جھوٹی باتیں۔ کس نے اجازت دی ہے اسے ہم جھوٹوں کے جذبات سے کھیلنے کی؟ انسان جیسے تھے زندگی کے ساتھ مجھوتا کر لیتا ہے۔ خود کو دنیا کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے



لیکن ایسی باتیں پڑھ کر امیدیں جنم لیتے گیتی ہیں۔ کچھ دیر کو ہی سہی بے وقوفوں کی یہ جنت بھلی گیتی ہے لیکن جیسے ہی دنیا کی اصلیت سامنے آتی ہے ان سب جھوٹی باتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ ”کل کے قاسم سے جھگڑے کا اثر تھا تو کچھ اس کا ڈپریشن کہ وہ ان کے سامنے اتنا کل کے بول رہی تھی۔

”جانتی ہو تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ انمول نے ان کی طرف دیکھا۔

”تم بہت حساس ہو جبکہ اس معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے بے حسی درکار ہے۔ میرا چھپن ایک دوستانہ مشورہ ہے۔ امید رکھنا چھوڑ دو کیونکہ امیدیں پوری نہ ہوں تو تکلیف دیتی ہیں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بولے لیکن انمول کی نگاہیں ان کی آنکھوں سے چمکتے درد پئی تھیں۔

”آپ کو کیا لگتا ہے میں نے بے حسی کا حربہ نہیں آزمایا ہوگا۔ پھر بھی دل اگر خد بانہمے تو کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے مصیبت سے پوچھا تھا۔

”کسی کے لیے دل میں محبت کا جذبہ ہونا اہم ہے، اسے محبت پہ مجبور کرنا اہم نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے بس میں نہیں۔ پھر کیا پتا دوسرے کا محبت جتانے کا انداز ہم سے جدا ہو۔ ویسے تو بردا کرنا بھی محبت میں شمار ہوتا ہے۔ کسی کا خیال رکھنا بھی جذبات سے جڑا ہے۔ مسکراتا بھی محبت ہے اور خاموشی بھی۔“ گاڑی اب اس کی گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ ہیڈ ریسٹ پر سر نکالے وہ خالی الذہن سے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

پروفیسر رضوی نے گاڑی انمول کے گھر کے باہر روکی۔ وہ گاڑی سے نیچے اتر کر ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی کہ اپنے مین گیٹ کھلنے کی آواز پہ حیرت سے گیٹ کی طرف دیکھا۔ سامنے قاسم کھڑا تھا۔

”قاسم آپ؟“ دروازہ کھول کر وہ باہر آ گیا تھا اور بے تاثر چہرے کے ساتھ ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ کل صبح کے بعد اس کی قاسم سے دوبارہ بات نہیں

ہوئی تھی۔ اس نے کل سارا دن اس کی ایک بھی کال ریسیو نہیں کی تھی نہ ہی اس کے پیچھے میجر کو کھول کر بڑھا تھا۔ وہ آج واپس آنے والا تھا یہ اسے معلوم تھا لیکن اس کے پیچھے سے پہلے وہ گھر پہنچ چکا ہوگا اسے اندازہ نہیں تھا۔

”یہ میرے ڈیپارٹمنٹل میڈ ہیں۔ میری گاڑی کا ٹائر پچھڑا ہو گیا تھا راستے میں تو سر مجھے ڈراپ کرنے آ گئے۔“ انمول کو اپنے ساتھ کھڑے پروفیسر رضوی کا خیال آیا تھا اور پھر اس نے فوراً ہی ان کا تعارف کرواتے اپنا مسئلہ بتایا تھا۔

”السلام علیکم قاسم! آپ سے مل کر ایک بار پھر خوشی ہوئی۔“ پروفیسر رضوی نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھانے میں پھل کرتے اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا۔

”اور مجھے خوشی سے بڑھ کے حیرت۔“ قاسم اب بھی ہونز بنچیدہ تھا۔

”آپ لوگ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔“ اسے یہ جان کر حیرانی ہوئی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ وہ عجیب ٹینشن میں جھلا تھی۔ ایک تو کل کا جھگڑا، اس کے بعد آج قاسم کا اسے پروفیسر رضوی کے ساتھ دیکھنا وہ بھی اس کی غیر موجودگی میں۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا ہوگا اس کے متعلق حالانکہ وہ اسے برسوں سے جانتا تھا اور یقیناً اس پہ بھروسہ بھی کرتا ہوگا۔ اس نے بھی انمول کے پوچھوٹے جانے کو ایٹو نہیں بنایا تھا لیکن اب۔ قاسم کی سنجیدگی سے وہ کبھی کوئی نتیجہ اخذ کر ہی نہیں پاتی تھی۔

”اتفاق سے برسوں ہی کراچی میں ملاقات ہوئی تھی۔“ قاسم کے جواب نے اس کی حیرت میں اضافہ ہی کیا تھا۔ پتا نہیں وہ ان سے کس ریفرنس سے ملا تھا کیونکہ اس کے مطابق قاسم کا حلقہ کار وہاں تھا جبکہ پروفیسر رضوی کا تعلق ادب سے تھا۔

”آپ پلیز اندر آئیں ناسر میں کافی بناتی ہوں۔“ اپنی فکٹش پہ دو حرف پیچھے اس نے انہیں کافی



”مجھے آئیڈیا نہیں تھا آپ جلدی آجائیں گے پتا ہوتا تو میں آج یونیورسٹی نہ جاتی۔“ خود پہ قابو پاتے اس نے مسکرائے کی تاکام کوشش کی۔ اس سے دور بیٹھے فون پہ جھگڑا کرنا آسان تھا لیکن اب کچھ گھنٹوں بعد اس کا سامنا کرنا بے انتہا مشکل۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ قاسم کو کیسے فیس کرے۔

”کل رات تک تمہیں کال کرتا رہا۔ منیجر بھی کیسے جو تم نے بڑھے نہیں۔“ قاسم دھیمے قدموں چلتا اس کے پاس آگیا۔ لہجہ سخت تھا نہ آواز بلند لیکن انداز سہاگ تھا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنی بات کا آغاز کیا تھا۔

”میں جلدی سے کچھ پکا لیتی ہوں آپ نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔“ کل سارا دن اس نے کچھ نہیں پکا یا تھا۔ سبکی باجی کے کلائے سوپ کے علاوہ اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور فریج میں کوئی بچا ہوا کھانا ہوتا مشکل ہی تھا کیونکہ وہ دو تین دن سے گھر نہیں تھی۔ قاسم کے جانے کے بعد کسی ایک دن بھی اس نے اسٹوڈنٹس اپنے لیے کھانا نہیں پکا یا تھا۔ وہ جانتی تھی قاسم لچر ریگولر نہیں کرتا لیکن اس وقت بات بدلنے اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہتے اس نے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی تھی لیکن قاسم نے اس کا بازو تھام لیا تھا۔ انمول نے چونک کر قاسم کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں پتا ہے کل پہلی بار تم نے مجھ سے جھگڑا کیا ہے۔ صرف جھگڑا نہیں کیا۔ تم نے میری بات سننے بغیر کال ڈراپ کی اور میرے پچاس ماریفون کرنے پر ایک بار بھی آئیڈیا نہیں کیا۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ حد سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ جھگڑا ہونا الگ البتہ ہے لیکن کال کا ٹائما باخلاقی میں شمار ہوتا ہے۔

”آئی ایم سوری۔“ انمول نے نظریں جھکا لیں۔ اندازہ تھا اس کا رویہ انتہائی غیر مناسب تھا خاص طور پہ جب وہ دوسرے شہر میں تھا۔

”تمہیں یہ شکایت تھی میں نے تمہیں فون نہیں کیا تو تم کر لیتیں۔ کیا میں نے بھی تمہیں فون کرنے

کے لیے انوائٹ کیا تھا۔ اس سے پہلے اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن قاسم کی موجودگی میں وہ یہ اخلاقیات نبھاسکتی تھی۔

”ابھی نہیں۔ پھر کسی دن فرصت سے آؤں گا تم دونوں سے لمبی گپ شپ کرنے ابھی تو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تمہاری گاڑی ڈرائیور لے کر آتا ہی ہوگا میں نے اسے تمہارا ایڈریس ٹیکسٹ کر دیا ہے۔“ قاسم کی طرف دیکھتے انہوں نے مسکرا کر کافی کے لیے معذرت کی اور ٹنگٹوکا گلا حصار انمول کو کہا گیا تھا۔

”تھنک یو سو مچ سر۔“ وہ بے اختیار بولی تھی۔ ”میشن ناٹ۔“ ان دونوں سے الوداعی کلمات کہتے قاسم سے ایک بار پھر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اگلے کچھ لمحوں میں ان کی گاڑی گلی سے نکل گئی تھی جبکہ وہ دونوں اب تک ریمب پھکڑے تھے۔ سر جھکائے انمول اپنے جوتوں کو دیکھ رہی تھی اس احساس کے ساتھ کہ قاسم اس وقت اسے دیکھ رہا ہے۔ لب کاٹتے اس نے چہرہ اٹھایا اور گردن کھٹا کر قاسم کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا یا کچھ کھوج رہا تھا۔ شاید وہ تبدیلی جو کل اس نے انمول کے لہجے میں محسوس کی تھی۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں اور گھر کے اندر چلی گئی۔ قاسم بھی اس کے پیچھے گھر میں داخل ہوتے مین گیٹ لاک کر رہا تھا۔

☆☆☆

بیڈروم میں آکر اس نے اپنا پینڈ بیک اور فائل مخصوص جگہ پہ رکھی۔ کمرہ بیڑکی وجہ سے خاصا گرم تھا۔ اسی وقت قاسم کمرے میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر بیڑکی نے آن کیسے تھے۔ وہ گرے پولو شرٹ اور سیاہ ٹریک پینٹ پہنے تھا۔ کمرے کی حالت اور اس کا حلیہ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا اسے آئے کافی دیر ہو چکی ہے۔ انمول نے ایک نظر قاسم کو دیکھا۔ وہ سنجیدہ نگاہوں سے اسی کی طرف متوجہ تھا۔



سے منع کیا ہے؟“ اس کی تیز آواز پہ انمول نے  
نظر اٹھا کر دیکھا۔

”مجھے لگتا تم اپنی امی کے ساتھ ہو مجھے تمہیں  
پرائیویسی دینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے میری سوچ غلط  
ہو۔ تمہیں حق ہے کہ تم مجھے میری غلطی کے متعلق بتاؤ  
لیکن اس انداز سے؟“ اس نے اگلی بات نرمی سے کی  
تھی۔

”میرا پہلی بار شکوہ کرنا آپ کو جھگڑا لگا قاسم۔  
میں کبھی کچھ بھی کہوں گی آپ کو برا لگے گا۔ کوئی اپنی  
غلطی نہیں مانتا۔ شکایت زندگی کی کسی بھی بات پر کی  
جائے اور اس کا انداز کتنا ہی دھیمائی کیوں نہ ہو ہماری  
انا کو نہیں پہنچاتی ہے۔ ہمیں لگتا ہے ہم اپنی جگہ حق پہ  
ہیں۔ جیسے آپ اس وقت خود کو حق پہ سمجھ رہے ہیں۔“  
اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑاتے وہ پیچھے ہوتی تھی۔  
قاسم کو اگر لگا تھا دل کا غبار کل جھٹ چکا ہے تو  
یہ اس کی بھول تھی کیونکہ یہ فقط شروعات تھی۔

”وائے یو ہو پین سوچو نیچڑ۔“ وہ سر ہلاتے بے  
یقینی سے بولا تھا۔ ”تمہیں اندازہ ہے تم کتنی بدل گئی  
ہو۔ جب ہماری شادی ہوئی تم مجھ سے اپنی ہر چھوٹی  
بڑی بات شیئر کرتی تھیں۔ میرے گھر آنے پہ دو  
منٹ خاموش نہیں تھکتی تھیں تم۔ ایک لپ اسٹک کا  
شیڈ سیلیکٹ کرتے ہوئے بھی مجھ سے پوچھا کرتی  
تھیں۔ دس دس بار یہ سوال کرتیں کہ مجھے کھانا پسند آیا  
یا نہیں۔ خود کو میری پسند کے سانچے میں ڈھال رکھا  
تھا تم نے۔ میرے کپے بغیر تم وہ بن گئی تھیں جیسا میں  
اپنی ہنسفر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن پچھلے چند ماہ سے میں  
حیران ہوں کہ تمہیں ہوا کیا ہے۔ اس کا چہرہ دونوں  
ہاتھوں سے تھا ہے وہ شاک تھا اور اپنے ساتھ اسے  
جی حیران کر رہا تھا۔

”تو پھر اس سے پہلے یہ سوال کیوں نہیں کیا؟  
آپ تو ذرا بھی تو نہیں بدلے قاسم۔ بالکل اسی طرح  
جیسے آپ نے مجھے بھی اپنی پسند بدلی نہیں جتنی اپنی  
نا پسند بدلی کو بھی دل میں چھپا لیا۔“  
تین سال اسے یہی لگتا رہا وہ اسے نظر انداز کر

رہا ہے۔ اسے فرق نہیں پڑتا۔ اس کی کوئی بھی قابلیت  
قاسم کا دل جیتنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ پچھلے تین  
سال میں اس کی خود اعتمادی صفر کی سطح عبور کر گئی تھی  
اور آج جب اس کے اندر یہ امید ہی دم توڑ چکی تھی کہ  
قاسم اس کی پروا کرے گا اس پہ یہ انکشاف ہونا اسے  
شاک نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس وقت قاسم کے اس  
انکشاف نے اسے کوئی خوش گوار احساس نہیں دیا تھا  
بلکہ اس کے برعکس وہ شدید متضلل ہوئی تھی۔

مرد اپنے وقت اور سہولت کے مطابق عورت کا  
استعمال کرتا ہے۔ اس کے پاس عورت کی طرح اس  
کے لیے ہمہ وقت جذبات کا ٹھکانا مارتا سمندر نہیں  
ہوتا بلکہ وہ سوچ کچھ کم ضرورت کے تحت چلتا ہے۔ تم  
سے زندگی کا کچھ اور خوشیاں وابستہ ہیں، تمہارے بن  
ادھورا ہوں، تم ہو تو زندگی ہے جیسی باتیں عورت سے  
کہتے اتنا آڑے آتی ہے بالخصوص جب وہ عورت آپ  
کی بیوی ہو جبکہ اس کے برعکس ایک عورت بڑی  
آسانی سے نکاح کے بول سن کر ”قبول ہے“ کہنے  
کے بعد اپنا سب کچھ نہ صرف اس ایک شخص کی جھولی  
میں ڈال دیتی ہے بلکہ اس اعتراف سے بھی نہیں  
چوکتی کہ وہ اس کی کل کائنات ہے۔ وہ اسے اس کی  
خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرتی ہے اور دنیا کے  
سامنے بڑے فخر سے یہ اعتراف کرتی ہے کہ وہ اس کا  
ہے۔

”تم مجھے بتاؤ گی انمول کہ مجھے کہاں بدلنا  
چاہیے تھا؟“

”شادی کے بعد یہ سب آپ نے بتایا تھا کہ  
مجھے آپ کے ساتھ کس طرح رہنا ہے؟“ قاسم کوئی  
جواب نہیں دے سکا تھا۔ ”آپ کو لگتا ہے میں ہمیشہ  
سے ایسی ہی تھی؟ نہیں، میں نے وہ سب اس لیے کیا  
کیونکہ مجھے آپ کی پروا تھی۔ شادی سے پہلے ہر لڑکی  
اپنے دل کی کرتی ہے، اپنے دل کی سنتی ہے۔ شادی  
کے بعد وہ صرف وہ کرتی ہے جو اس کے شوہر کو پسند  
ہوتا ہے۔ خود کو اس حد تک بدل لیتی ہے کہ خود آئینے  
میں اپنا عکس پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اپنا گھر



چھوڑنا، اپنے ماں باپ بھائی بہن چھوڑنا یہاں تک کہ اپنی پہچان اپنا نام تک بدل لیتا۔ کیا کچھ نہیں کرنی ایک عورت مرد کی خاطر؟“

قاسم کے چہرے کا تاثر بدلا تھا۔ جانتا تھا وہ غلط نہیں کہہ رہی ہے پھر بھی اس کی باتیں چھہ رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے ایک نئی جگہ اسی یونیشن میں سن کھڑی تھی۔ نگاہیں اب بھی پچن کی کھڑکی سے باہر مرک یہ مٹی تھیں۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ آج اس کی واپسی وقت سے پہلے ہو گئی تھی اسی لیے اس نے کوئٹہ جلدی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اوپری منزل پہ بنے اس دو کمروں کے چھوٹے سے پورشن کا پچن بالکونی سے ملتا تھا اور پچن سنک کی دیوار پہ وہ واحد کھڑکی مٹی تھی جس کا رخ سنک کی طرف تھا۔ وہ اکثر سنک پہ کھڑے کھڑے باہر نگاہ مارتی تھی۔ اب بھی وہ سنک میں ابلی ہوئی نوڈلز کا پانی چھانے آئی تھی۔ پین سے چھلنی میں منتقل کرتے اس نے تل کے ٹھنڈے پانی میں کچھ دیروڈلز کو بھجویا۔ کھولتے پانی کی بھاپ اب تک اوپر اٹھ رہی تھی جب اچانک تل بند کر کے وہاں سے پلٹتے اس کی نظریں اس دھندلے شیشے پہ جم گئی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا لیکن دماغ کہہ رہا تھا جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ سچ ہے۔ اس نے بے اختیار دوپٹے کے کونے سے کھڑکی کے شیشے پہ جمی بھاپ کو صاف کیا۔

وہ وہی تھا!

آج اتنے سال بھی اس نے اسے ایک نگاہ میں پہچان لیا تھا۔ وہ اس کے سوا اور کون ہو سکتا تھا بھلا اور یہ اس سے بہتر کون جان سکتا تھا؟ یہ شخص دنیا کے لیے پہلی کتاب تھیں اس کے لیے پہلی کتاب تھا۔ ایسی کتاب جس کا ہر حرف اس کے دل پہ نقش تھا۔ زندگی بھی اسی کے نام سے شروع ہو کر اس کے نام پہ ختم ہو کر گئی تھی۔

بھلا کسی اتنے اسے کبھی بھلایا جاسکتا ہے؟ پہچاننے میں دھوکا کھایا جاسکتا ہے؟ برسوں لگے تھے

”ہماری خوشیاں، ہمارے دکھ آپ سے منسوب ہو جاتے ہیں۔ آپ نہیں تو ہم بنتے ہیں آپ کی خاموشی پہ ہم جاتے ہیں۔ پھر کیوں ایک مرد اس عورت کی خاطر خود کو معمولی سا بھی نہیں تبدیل کرتا جو اس شخص کی خاطر اپنا آپ تین سو ساٹھ ڈگری بدل دیتی ہے۔“ تھک کر کرنے کے سے انداز میں وہ بیڈ کے کونے پہ بیٹھ گئی تھی۔

سفر طویل ہو یا صحت کم، دونوں ہی صورتوں میں انسان تھک جاتا ہے۔ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ بھی تھک چکی تھی۔ ٹوٹ چکی تھی۔ بس اب بکھرتا باقی تھا اور اس سے پہلے کہ بکھر جاتی خود کو سمیٹ لیتا چاہتی تھی۔

”تمہیں لگتا ہے مجھے تمہاری پروا نہیں۔“ اس سے چند انچ کی دوری پہ پیٹھ موڑے بیٹھے قاسم کا دھیان اس ہی کی طرف تھا۔

”مجھے لگتا نہیں قاسم۔ یہ حقیقت ہے۔ آپ کو اگر میری پروا ہوتی تو آج میرے اندر اتنی تنہائیاں اور ادھورا پن نہ ہوتا۔ پیسوں کے سوا دیا ہی کیا ہے آپ نے مجھے؟ آپ کو پتا ہے آپ کتنے ”سیلف سینٹرڈ“ (اپنی ذات سے مطلب رکھنے والے) اور ”ایکویٹنرک“ (متکبر) ہیں؟“ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ قاسم سامنے لگی فریج دھڑکے کھلے پردے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے چونک کر انمول کی طرف دیکھا جو اپنی بات کے اختتام پہ لب بھینچے برستی آنکھوں سے اس کی طرف متوجہ تھی۔ آنسو لڑی کی صورت اس کے گالوں پہ بہہ رہے تھے۔ پھٹکی کی پشت سے رگڑتے اس نے اپنی آنکھوں اور گال کو صاف کیا لیکن آنکھوں کی برسات نے ایک بار پھر



کوئی سر دکا نہیں تھا اس نے علی کو چاہا تھا۔ اس کے سوشل اسٹیشس سے واقف ہو کر بھی، وہ اس بات سے نہیں گھبرائی تھی کہ آنے والی زندگی میں وہ اسے کوئی آسائش دے سکے گا نہیں۔ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ علی اس کے لیے دنیا کی ہر شکل کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور جب اسے یقین تھا تو پھر علی اس کا یہ مان کس طرح توڑ سکتا تھا۔

یونیورسٹی کے بعد علی بہتر دنوں کی تلاش میں تھا تو وہ اس دن کے انتظار میں جب اسے زندگی کے ہر میدان میں کامیاب دیکھے گی۔ خود اس کے لاکھ چاہنے پر بھی علی نے اس کی کتابیں پیش کر دانے کی درخواست کو رد کر دیا تھا۔ وہ اس کے وسائل سے اپنے لیے فائدہ نہیں چاہتا تھا اور اس کو احساس ہوا تھا کہ علی کے لیے اس کی عزت نفس کتنی اہم ہے۔ ان کا رشتہ عادت کی طرح اور بھی مضبوط ہو رہا تھا لیکن حالات اب بھی ایسے نہ تھے کہ وہ شادی کر پاتے مگر حیدر سعید بیٹی کے لیے آیا ایک انتہائی شان دار رشتہ ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔

بات جب اس تک پہنچی تو اس نے فی الفور انکار کرتے علی کا نام بتا دیا تھا کہ شادی کرے گی تو بس اس ایک شخص سے ورنہ کنواری مر جائے گی۔

اس کا بیک گراؤڈ جان کر حیدر سعید کا سچ پا ہوتا فطری تھا۔ کہاں ان کا طے کردہ ملوں فیکٹریوں والا رشتہ اور کہاں ایک دو کوڑی کا شاعر جس کا کل اثاثہ ایک خستہ حال جمونہ ڈی غما مکان اور چند محبت بھری غزلیں ہیں جن کی اوقات باہر کی دنیا میں دو پیسے کی بھی نہیں ہے۔

”میں نے اس کی اوقات سے نہیں اس سے محبت کی ہے ڈیڈ“ وہ انہی کی بیٹی تھی ان جیسا ہمت اور حوصلہ بھی رکھتی تھی۔ جو ٹھکان کی تھی اس پہ عمل کرنا جانتی تھی اور دل کی بات کہنے سے تو بالکل نہیں ڈرتی تھی۔

”بکواس بند کر دو۔ باپ کے سامنے ایسی بات کہتے جنہیں نہ آتی۔“ صالحہ کو بیٹی کے انداز نے ہلا کر

اسے ماضی بھلانے پر، اور کیا ستم اس کی ایک جھلک نے ہر زخم کو اوجھڑ ڈالا تھا۔ ہر ایک خسارہ یاد آنے لگا تھا۔ وہ بمشکل پانچ منٹ کھڑا ہوا تھا وہاں لیکن ان پانچ منٹوں میں اس نے پچاس صدیاں جی لی تھیں۔ وہ چلا گیا تھا لیکن ساری اب بھی وہاں کھڑی اس کی گاڑی کے ٹائروں سے اڑتی دھول میں ماضی کی داستان نمودار ہوتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ اوقات دیکھی ہے اس انسان کی جس کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کر رہی ہو تم۔“

حیدر سعید نہ صرف ایک جانے مانے بزنس مین تھے بلکہ جدی پشتی رئیس بھی تھے جن کا آدمی سے زیادہ خاندان سیاست میں تھا تو باقی آدمی فیکٹری و ملوں کے مالکان کی صورت ملکی معیشت میں ڈائریکٹ اثر و رسوخ رکھتے تھے لیکن وہ اگر ایک عام آدمی بھی ہوتے تو ان کا رد عمل ہرگز مختلف نہ ہوتا۔ کیونکہ ایک مڈل کلاس درمیانے درجے کا شخص بھی اپنی اولاد کی شادی خود سے بہتر خاندان میں کرنے کی خواہش رکھتا ہے، یہاں تو اس کی حیثیت حیدر سعید کے کسی ملازم سے بھی بدتر تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک بڑھا لکھا اور شریف انسان تھا اس میں دوسری کوئی خوبی نہیں تھی اور انیسویں ہمارا معاشرہ ایسی خوبیوں کے دام نہیں لگاتا۔ اس بازار میں انسانوں کی شناخت ان کا معاشی اسٹیشن ہے۔

حیدر سعید کا کٹن انڈسٹری کے روح رواں تھے اور حیدر سعید ٹیکسٹائلز کی صورت ایک سپورٹ پہ چھائے ہوئے تھے۔ وہ جن کے گھر پہ ملازم بھی حسب نسب اور خاندان دیکھ کر رکھا جاتا تھا ایسے قدامت پسند انسان کے گھر اس جیسی اولاد کا ہونا شاید کوئی معجزہ ہی تھا جس کے مزاج میں اپنے اکلوتے ہونے اور دولت کی بے تحاشا فراوانی نے بھی کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ دولت پہ دل کو فوقیت دینے والی لڑکی تھی۔ علی کے بیک گراؤڈ سے اسے



جنہوں نے اسے پیدائش سے لے کر آج تک کبھی کاٹا جیسے جیسی معمولی تکلیف کا سامنا بھی نہیں کرنے دیا تھا۔

”اپنا اسٹینس دیکھو اور اس کی حیثیت۔ دو وقت کی روٹی بھی مل گئی تو غنیمت جانتا۔ تمہیں جن آسانسوں کی عادت ہے کیا ان کے بغیر وہ پاؤ گی؟“ اس بار مجھے انداز میں تصویر کا وہ رخ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی جس سے ان کے خیال میں شاید اب تک وہ واقف تھی۔

”تمہارے ڈیڈ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ چھوڑو یہ بچکانہ باتیں اور بھول جاؤ اسے۔“ صالحہ نے بھی اس بار پیار سے پچکارتے اس کا کندھا تھپکا۔

”مرتے دم تک نہیں۔ میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اور ہرگز اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ وہ اپنی بات پر یقین لگائی۔

ان دونوں کے لیے یہ ”اسٹینس“ کا مسئلہ تھا تو اس کے لیے ”دل“ کا معاملہ اور دل کے معاملے زور زبردستی کی بنا پر تو بہر حال نہیں سلجھائے جاتے۔

”تو پھر مر جاؤ کیونکہ میں اپنی اگلی اولاد کو جیتے جی اس جہنم میں نہیں جھونک سکتا جس کا انتخاب اس نے جنت سمجھ کر کیا ہے۔“

حیدر سعید کے لیے بیٹی کی محبت سب سے بڑھ کر تھی لیکن وہ جانتے تھے یہ نری گیدڑ بھبکیاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے جیہوں کی خاطر لوگوں کو اپنا ایمان پیچھے دیکھا تھا۔ اولاد کا سودا کرتے دیکھا تھا۔ محبت جیسی بے کار اور بے نام شے کی خاطر بھی بھلا کوئی جان دے سکتا ہے۔ ان یہ ساریہ کی اس دھمکی نے تو بہر حال کوئی اثر نہیں ڈالا تھا لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی کیونکہ یہ دھمکی تو ہرگز نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے ڈیڈ۔ میں بھی آپ کی بی بی ہوں۔ علی کے بغیر زندگی بے معنی ہے اور اب اگر یہ آپ کی ضد ہے تو میں آپ کو مر کر ہی دکھاؤں گی۔“ اسے باپ کی بے بسی پر شاگ لگا تھا۔

رکھ دیا تھا۔ جانتی تھیں وہ کتنی ضدی ہے اپنی بات منوائے بغیر پیچھے نہیں ہٹتی لیکن یہ بات بھلا کوئی ماننے والی تھی۔ خدا نا خواستہ ایسا کچھ ہو جاتا تو سوسائٹی میں وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے کہ ان کا ہونے والا داماد ایک عام اور معمولی شاعر ہے۔

”نقطہ چاروں کا کھیل ہوتا ہے یہ عشق محبت۔ پھر جب زندگی کی حقیقت سے سامنا ہوتا ہے تو آئے وال کا بھاؤ پتا لگتے ہی ساری عاشقی ہوا ہو جاتی ہے۔“ حیدر سعید نے میر کو شہدے سے پرے ہٹایا اور سفر سے کہتے صوفہ پر بیٹھ گئے۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھے لیکن اپنی بیٹی پر نہیں بلکہ اس لڑکے پر جس نے محبت کے سبز باغ دکھا کر ان کی اگلی اور جذباتی اولاد کو باغی کیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنے باپ

ہونے کے اختیار کو اپنی ”ویڈیو پاور“ سوچ کر خود کو کسلی دی تھی کہ وہ ایسا کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ غلط فہمیوں کا علاج ممکن ہے خوش فہمیوں کا نہیں۔

حیدر سعید اس بات سے غافل تھے کہ اولاد کے سامنے طاقت در سے طاقت ور ترین انسان بھی سب سے زیادہ کمزور اور بے بس ہوتا ہے۔ جس سے جیت بھی ہار سے بدتر ہوتی ہے وہ آپ کی اپنی اولاد ہی ہوتی ہے۔ یہاں بڑے بڑے طرم خان پسائی اختیار کر جاتے ہیں۔ وہ اس بے طاقت کا داد آزمانے کی کوشش بھی کرتے تو نتیجہ پھر بھی ان کے حق میں تو ہرگز نہیں آنے والا تھا۔

”غلط فہمی ہے آپ کی۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور اگر زندگی کو آپ نے صرف ضروریات کے ساتھ گزارا ہے تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ علی اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ مجھے دو وقت کی روٹی بھی نہ دے سکے۔“ وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے ہوتی تو یہ سب آغاز میں ہی ہو چکا ہوتا۔ دو ڈھائی سال کے ساتھ میں یہ تو طے تھا کہ مٹا تو جا سکتا ہے لیکن پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا۔ یہ محبت کا جن ایسے ہی سرچڑھ کر بولتا ہے جیسے اس وقت وہ ان دونوں کے سامنے بول رہی تھی۔ اس بات سے بے نیاز کہ یہ وہی دو لوگ ہیں



بہت سا خون بہہ جانے کے باعث وہ کارپٹ پہ اوندھے منہ بچھوٹ پڑی تھی۔ خیالے رنگ کے بیش قیمت قالین کو اپنے ہی خون سے لت پت دیکھ کر حیدر سعید کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ اسے فوری طبی امداد اور شہر کے سب سے جتنے اسپتال میں وی آئی پی ڈاکٹروں کا علاج زندگی کی طرف واپس لے آیا تھا۔ وہ ہوش میں تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر واپس آئی تھی لیکن ان گزرے دنوں میں یہ تو بس وہی جانتے تھے اس کے اقدام خودکشی کو کن کڑی شرطوں پہ دنیا کی نظروں سے چھپا پائے تھے۔ اخبارات کی سرگئی سننے سے روک پائے تھے۔ خود اپنے ہی خاندان میں اگر اس بات کی ہوا بھی نکل جاتی تو بی بی عائشہ کی عزت کا شیرازہ بکھر جاتا اور یہ شیرازہ تو اب بھی بکھرنے ہی والا تھا۔

”یہ بچی ہے۔ نادان ہے۔ آپ کیوں مایوس ہو رہے ہیں۔“ صالحہ اکلوتی اولاد کے کھونے کے خوف سے تازہ تازہ باہر آئی تھیں لیکن شوہر کی بے بسی کو بھی اچھی طرح محسوس کر سکتی تھیں۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ اپنی ہر امید کھو چکے ہیں۔ کم سے کم اس حوالے سے کہ سامیہ اپنی ضد پوری کر دے بغیر مانے گی نہیں اور وہ اب ایک دوسرے بچے پہ سوچ رہے تھے۔ انہیں کس طرح اس ساری صورت حال میں اپنی ساکھ اور اپنا بھرم سلامت رکھنا تھا۔ اس معاشرے کی ہنسی سے خود کو بچانا تھا۔ ایک سمجھوتا تھا جو انہیں کرنا تھا اور مسئلہ حل ہو سکتا تھا لیکن وہ سمجھوتا انہیں اپنی شرائط پہ کرنا تھا۔ کب، کیسے اور کہاں۔ یہ حیدر سعید طے کرنے والے تھے۔

”میں مایوس نہیں ہوں صالحہ بس وقتی تکلیف میں ہوں۔ جب اولاد اپنے ہاتھوں اپنا نصیب بگاڑنے کے ورے ہو تو ماں باپ کیا کر سکتے ہیں۔ بہر حال اس لڑکے کو بلاؤ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی سامیہ نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ اسے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی دیوار میں دروازہ پڑ چکی

حیدر سعید کا خیال تھا یہ بس اس کی ضد ہے لیکن زندگی میں پہلی بار اس نے ضد نہیں فیصلہ لیا تھا۔ علی کے بغیر زندہ رہنا موت سے بدتر تھا اور یہ تصور ہی اسے جان لیوا لگ رہا تھا۔ ایک طرف ”انا“ تھی تو دوسری طرف ”محبت“۔ اور اس بار اسے ہر آزمائش پہ پورا اترنا تھا۔ ”محبت“ کو جیتنا تھا۔ آنسوؤں سے تر گالوں کو بے دردی سے کلائی کی پست سے صاف کرتے اس نے ایک نگاہ حیدر سعید کے سنجیدہ اور بے تاثر چہرے کو دیکھا اور اگلے ہی پل لاؤنج سے نکل گئی تھی۔

”حیدر پلیز روکیں اسے یہ احمق لڑکی جذبات میں آکر کچھ نہ کر لے۔“ اسے روتے ہوئے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر انہوں نے اپنے شوہر کو جھنجھوڑا۔ وہ ماں تھیں۔ اکلوتی اولاد کے لیے دل میں اٹھتے خدشات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ حیدر سعید نے بیوی کے پریشان چہرے کو دیکھا اور پھر اپنے کندھے پہ نکان کا ہاتھ نرمی سے ہلاتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔

حیدر سعید جیسے بہادر انسان کے اندر بھی اب ہار کا خوف سر اٹھانے لگا تھا۔

☆☆☆

”تم نے ثابت کر دیا سامیہ کہ تمہارے لیے باپ سے بڑھ کر اس شخص کی محبت ہے جس کا ساتھ تمہاری زندگی میں فقط چند منٹوں سے ہے۔ تم نے مجھے اور میری تربیت کو غلط ثابت کر دیا۔ ہماری سالوں کی محبت یہ ایک ایسے انسان کو ترجیح دی ہے جس نے آج تک تمہیں کچھ نہیں دیا۔“

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سامیہ نے کمرے کا دروازہ لاک کر کے بیڈ سے اپنی کلائی کاٹ لی تھی۔ حیدر سعید کے لیے ان کا انشٹینس اکلوتی اولاد کی زندگی سے عزیز ہو سکتا تھا لیکن اس کے لیے زندگی ”علی“ سے بڑھ کر نہیں تھی۔ صالحہ اس کے پیچھے مچی تھیں۔ وہ ماں تھیں اور انہیں سامیہ کی دمکلی سے خوف آیا تھا مگر جب تک دروازے کا لاک کھولا گیا دیر ہو چکی تھی۔



”کیا تھا اس لڑکے میں سوائے اچھی صورت کے جس پہ ان کی اکلوتی بیٹی مرمتی تھی۔“ اسے دیکھ کر پہلی سوچ ان کے ذہن میں یہی آئی تھی اور ساتھ ہی انہوں نے اپنے نزدیک لوگوں میں سامعہ کے ہم عمر اور ہم پلہ ہر اس لڑکے بشمول اس رشتے کے متعلق سوچا تھا جو ہر لحاظ سے علی سے بہتر تھے۔

وہ خود ایک سخی سوچ رکھنے والی اپنی کلاس کی نمائندہ انہی کے گھڑے اصولوں کی تابع تھیں۔ انسان کو اس کے ظاہر کی بنا پہ جانچنا ان کے مزاج کا حصہ تھا وہ سامعہ کی علی میں انوالومنٹ کو بھی اسی پیرائے میں دیکھ رہی تھیں۔

ساتھ بیٹھے حیدر سعید ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں میلی صوفہ کی سائیڈ پہ مارتے اس کی طرف متوجہ تھے۔ یقیناً وہ اس وقت بے حد دہنی دباؤ کا شکار تھے۔

”آپ اگر میری محبت کو آزمانا چاہتے ہیں تو میں ہر امتحان دینے کے لیے تیار ہوں سر۔“ ملازم اس کے سامنے رکھی میز پہ چند لوازمات سرو کر کے جا چکا تھا۔ اس نے فضا پانی کا گلاس اٹھا کر لیوں سے لگاتے اپنے خشک حلق کو تر کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش کی۔

یہاں آنے سے پہلے وہ حیران تھا تو یہاں آ کر پریشان۔ وہ نہیں جانتا تھا سامعہ نے کس طرح اپنے والدین کو اس رشتے کے لیے تیار کیا ہوگا اگر جان جاتا تو سامعہ کی عقل پہ ماتم کرتا جس نے نہ صرف اپنی جان کی پروا نہیں کی بلکہ اپنے ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکالنے کی تیاری بھی پوری طرح کر دی تھی۔ ”ہونہر۔ تم اور تمہاری محبت۔ افسانوی نام رکھ لینے سے کوئی بچ میں پہاڑ کاٹ کر نہیں نکال لیتا۔“ خنجر سے کہتے انہوں نے بے حد حقارت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

علی کو ان کا انداز یہ باور کروانے کے لیے کافی تھا کہ اس ملاقات میں ان کی دلچسپی یا اس رشتے میں ان کی رضامندی صفر پہ اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے

ہے۔ صالحہ حیرت زدہ سی آنکھیں مچاڑے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کا تو یہی خیال تھا کہ آہستہ آہستہ سمجھا بجا کر سامعہ کے ذہن سے اس محبت کا بھوت اتارنے کی کوشش کریں گی۔ حیدر سعید کے دو ٹوک انداز نے اسے بغاوت کی ترغیب دی تھی لیکن وہ اسے ایک یاں بن کر ہینڈل کر سکتی تھیں۔ تھوڑا سا پیار اور جذباتی بلیک میلنگ سے ان کے خیال میں یہ مسئلہ بڑے سکون سے حل ہو سکتا تھا۔ حیدر سعید کا بنا کوشش بھیاں ڈال دینا انہیں حیران نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

”حیدر!“ صالحہ نے پکارا لیکن وہ کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ ایک نگاہ سامعہ کے پرسکون چہرے پہ ڈال کر وہ شوہر کے پیچھے اس کے کمرے سے چلی گئی تھیں۔ پیچھے سامعہ نے اپنے لیوں پہ آری ہلی کی مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش نہیں نکھال کاٹا۔ وہ واقعی یہ جنگ جیت چکی تھی۔ ایسا اس کا خیال تھا۔

☆☆☆

”میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ تم میری بیٹی کو کہاں رکھو گے اور کس حال میں رکھو گے کیونکہ میں تمہاری اوقات سے باخبر ہوں اور اس اہم لڑکی کی ضد سے مجبور جسے تمہارے جیسے دو ٹوکے کے انسان میں ہیرو نظر آتا ہے۔“ صالحہ کے سمجھانے کے باوجود، حیدر سعید نے سامعہ کی شادی علی سے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس سلسلے میں آج اسے اپنے اس عالیشان گھر میں بلوایا گیا تھا۔ جس کی اونچی چھت تلے گھڑے ہو کر اسے یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ حیدر سعید جیسی قد آور شخصیت کے مقابلے میں وہ ایک بونا ہے اور یقیناً انہوں نے اسے یہ احساس دلانے کے لیے ہی یہاں بلایا تھا۔ سامعہ سامنے نہیں آئی تھی اور اس وقت ہال میں بس حیدر سعید اور صالحہ موجود تھے۔ وہ دونوں اس کے سامنے رکھے ایک دو سیڑ صوفہ پہ بے حد سنجیدہ بیٹھے تھے جبکہ صالحہ تو قدرے نالاں دکھائی دے رہی تھیں۔



سلمیہ کی زور زبردستی کا نتیجہ ہے۔ صالحہ کا ناراض چہرہ اور حیدر سعید کے تیور اسے سب کچھ سمجھا رہے تھے پھر بھی وہ ان سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ اسے ذلیل کرنے کے لیے اسے گھربلا میں گے۔  
”سلمیہ جیسی اسٹیج لڑکی کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

حیدر سعید نے اس ”کچھ بھی“ کو انگلیوں کی پوروں پہ گنتا چاہا تھا اور کچھ بھی کام اس وقت یاس جیٹی صالحہ بھی دلی ہی دلی میں کر رہی تھیں۔ جتنی شروع ہوتے ہی ختم ہوگئی تھی کیونکہ ان کے نزدیک علی جیسا معمولی انسان ان کی نازوں پٹی بینی کے لیے ان میں سے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا سوائے مرنے جانے کے اور اس کے مرنے سے کم سے کم سلمیہ کی تو کوئی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں، البتہ خود ان کی تکلیف ضرور کم ہو جاتی۔ وہ بھلا اس کی ضروریات کو خاک پورا کر پاتا۔ خود علی نے بھی یہی سوچا تھا وہ شاید سلمیہ کو یہ تمام آسائشیں اور سہولیات کبھی نہ دے پائے جن کے ساتھ وہ اپنے باپ کے گھر میں رہنے کی عادی ہے لیکن پھر بھی وہ اس کی خاطر زندگی میں محنت اور کوشش کے بل پراتنا تو ضرور ہی کرے گا کہ جن سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ وہ اسے ہر ممکن ایک اچھی زندگی دینے کی کوشش کرے گا اور اس کے لیے وہ حیدر سعید سے کچھ مہلت مانگنا چاہتا تھا۔ چند دن، چند مہینے یا پھر چند سال۔ وہ ابھی خود بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔

”کہنا بہت آسان ہے بغور دراز اور کرنا اتنا ہی مشکل۔ در نہ تم سلمیہ کو درغلانے کے بجائے پہلے اس کے قابل بن کر دکھاتے۔ سوچا ہوگا امیر باپ کی اکلوتی اولاد ہے ایڈوشنل بلیک میلنگ سے مجھ سے اپنی ہر بات منوالے گی۔ جہیز میں گاڑی بنگلا روپیہ پیسہ سب مل جائے گا اور تمہاری قسمت بدل جائے گی۔“

وہ غریب تھا۔ یہ اس کا مقدر تھا، غریب نہیں پھر بھی وہ ایک باپ کی اپنی اولاد سے وابستہ توقعات

ٹوٹنے پہ اس کے اندر کی تنگی کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ اسی لیے اب تک ان کے تذلیل بھرے جملوں کو نظر انداز کرتے اپنے مخصوص دھمے اور پنے تلے انداز میں بولا تھا لیکن اب یہ اس کی برداشت کی حد تھی۔

”آپ میری تو بین کر رہے ہیں حیدر صاحب۔ میرا انتخاب صرف سلمیہ ہے اور اس کی محبت میں کچھ بھی کرنے کی سکت رکھتا ہوں میں۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے آپ کی اس سوچ پہ حالانکہ آپ میرے متعلق کچھ بھی تو نہیں جانتے بہر حال اس عزت افزائی کا شکریہ۔ میں چلتا ہوں۔“ وہ بے ادب ہوا تھا نہ ہی آواز بلند تھی لیکن اس نے احتجاج کیا تھا۔

علی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ دونوں محض اسے ذلیل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ کوئی بد مزگی نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھی۔ سلمیہ کی محبت اپنی جگہ لیکن اگر اس کے والدین کی خوشی شامل ہی نہیں تو پھر اس بات کو آگے بڑھانے سے کیا فائدہ۔ اسے سلمیہ کے لیے سوچ کر دکھ ہوا تھا۔ افسوس یہاں ہر دولت مند اور با اختیار انسان کا رویہ اور سوچ ایک سا ہے۔

”رکو!“ حیدر سعید اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

”اس گھر سے کوئی سائل کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔“ ان کی آواز پہ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

”آپ جو ذات میری جمولی میں ڈال چکے ہیں اس کے بعد آپ سے کسی خیر کی امید نہیں رہی۔“ وہ مسخرانہ لہجے میں گہٹا مسکرایا۔ وہ دونوں اب آنے سے مٹنے لگے تھے۔

”اولاد کی ضد نے عاجز نہ کیا ہوتا تو آج تم جیسے انسان کی ہمت نہ ہوتی مجھے آنکھیں دکھانے کی۔ بہر حال میں سلمیہ کا رشتہ تم سے کرنے کے لیے راضی ہوں۔ لیکن میری کچھ شرطیں ہیں۔“ اس بار حیدر سعید کا رویہ مختلف تھا۔

”آپ کا رو باری آدی ہیں شرطوں پہ یہی رشتہ



گھاگ اور زیرک نگاہ والا بزنس مین اچھی طرح جانتا ہے کب کس کے آگے کون سی ہڈی ڈالنی ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر اور جذباتیت کو برے رکھتے ہوئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ سامیہ کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا ناممکن تھا لیکن جو حالات وہ ان کے لیے پیدا کر چکی تھی ایسے میں ان جیسے سمجھ دار انسان کے لیے یہ ڈیل اتنی بری تو نہیں تھی۔ پھر ان کا اتنا وسیع کاروبار ہے جس کی وارث ان کی بیٹی ہے تو کیا ہرج ہے اس کی شادی کے بعد ان کا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے اور گھر کا مال گھر ہی میں رہ جائے۔

”کیا میں سامیہ سے مل سکتا ہوں؟“ علی نے ایک توقف کے بعد سوال کیا۔

حیدر سعید مطمئن سے انداز میں واپس صالہ کے پاس جا کر بیٹھ گئے تھے۔ سگار سلگاتے محض سر کے اشارے سے اپنی مرضی اس تک پہنچاتی تھی۔ ملازم ان کا پیغام سامیہ کو دینے گیا تھا۔ چند منٹوں کے بعد سامیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک پل اسے لاؤنچ میں دیکھ کر کھٹکی اور پھر اس نے حیدر سعید اور صالہ کے مطمئن چہروں کو دیکھا۔ وہ دونوں ہی اسے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر مسکرانا چاہتی تھی لیکن علی کی خود پہ مرکوز نگاہوں نے اسے پریشان کیا تھا۔ یہ وہ نظریں تھیں جن میں اس کے لیے داری اور عشق جھلکتا تھا۔ یہ وہ نظریں بھی نہیں تھیں جن میں سامیہ کے لیے عزت اور محبت دکھائی نظر آتی تھی۔

آج ان نگاہوں میں شکوہ تھا۔ شکایت تھی۔ ناراضی تھی۔ بدگمانی تھی۔

”تمہارے والد نے بڑی شاندار قیمت لگائی ہے میری۔ پوچھا بس اتنا تھا کیا اس بولی میں تمہاری رضا بھی شامل ہے؟ اگر تمہارا جواب ہاں ہے تو مجھے یہ سودا منظور ہے سامیہ۔ کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اور بے حد حساب کی ہے لیکن اس کے بدلے مجھے گوارا نہیں کوئی میری انا اور عزت خریدنا چاہے۔“ وہ شاک ہوئی تھی تو دوسری طرف چوٹے

جوڑیں۔ میں دل کا سودا گر ہوں اپنا آپ گروی رکھ کر بھی انہیں پورا کر دوں گا۔“ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالے اس نے کندھے اچکائے۔

”شادی کے بعد سامیہ اسی گھر میں رہے گی۔ میں اسے تمہارے ساتھ کسی گندے سے محلے میں رہنے پر گز نہیں جانے دوں گا۔“ علی خاموش کھڑا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ”یہ شاعری وغیرہ سب چھوڑنی ہوگی۔ میرا امداد یہ گھٹیا بازاری شعر و شاعری کرے گا تو سوسائٹی میں میری کیا پوزیشن ہوگی۔ تمہیں میری فیکٹری جو ان کرئی ہوگی“ انہوں نے مزید کہا۔

”اور ہاں اس گھر میں بس تم رہ سکتے ہو اپنے ماں باپ کو یہاں لانے کے متعلق سوچنا بھی مت بلکہ ان سے اپنا رشتہ ختم کرنا ہوگا تمہیں۔“ وہ پہلے ہی صالہ کو اس کے متعلق بتا چکے تھے۔ بیٹی کی خاطر اس کی پسند کو گھر داماد بنا کر رکھنا بہر حال اتنا برا آپشن نہیں تھا۔ اس طرح وہ زمانے کی باتوں سے بھی کسی حد تک بچ جاتے اور اس بدنامی سے بھی جو سامیہ کی کسی سرکشی کی صورت ان کے گلے کا طوق بن سکتی تھی۔ صالہ کو بھی ان کی بات مناسب لگی تھی۔ گھر داماد پالنا ان کی کلاس میں پالتو جانور پالنے کے بعد دوسرا شوق تھا۔

”آپ یقیناً ایک کامیاب بزنس مین ہیں اور خرید و فروخت کے تمام رموز سے واقف۔ اب اتنی دلچسپ پیش کش پہ کوئی انکار بھی کیسے کرے۔“ اس کے پر جوش لہجے پہ قاتحانہ انداز میں حیدر سعید نے صوفہ پہ بیٹھی صالہ کی طرف دیکھا تھا جیسے جتا رہے ہوں دیکھا نیچے انسانوں کی کتنی رکھ ہے۔ یہ جو غریبی کا کھوٹا چہرہ ہے سچائے اپنی مفلسی کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں درحقیقت اس کے پیچھے مقصد اونچے طبقے والوں کے دلوں میں رحم اور ہمدردی کے جذبات جگا کر ان سے مراعات حاصل کرنا ہوتا ہے۔ عزت نفس اور اخلاقیات سے ان کا واسطہ نہیں اسی وقت ہوتا ہے جب تک ان کی بولی نہ بولی جائے۔ جتنی اونچی اتنی اونچی بولی۔ حیدر سعید جیسا



حیدر سعید بھی تھے۔

سامیہ نے حیرانی سے ان کی سمت دیکھا۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ اس کے باپ نے علی سے کیا کہا ہے۔ اسے تو بس یہی اندازہ تھا کہ وہ علی سے ملنا چاہتے ہیں تاکہ سامیہ اور اس کی شادی کی بات ہو سکے۔

”علی میں.....“ اس نے بولنا چاہا لیکن علی نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

”میرے پاس ایسی عالی شان محل نما کوٹھی نہیں پر ایک چھوٹا سا مکان ہے جہاں میں تمہیں عزت کے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔ لاکھوں کروڑوں کا بینک ٹیلنس نہیں پر یہ وعدہ کرتا ہوں تمہاری ضرورتوں کا پورا خیال رکھوں گا۔“ اس نے گہرا سانس لیا اور پھر دوبارہ بولنا شروع کیا۔

”میرے والدین نے تمام عمر اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر میری پرورش کی ہے کیسے آپ کی دولت کی چکا چوند دیکھ کر انہیں بڑھاپے میں تنہا چھوڑ دوں حیدر صاحب؟“ علی نے اس بار سوال کرتے رخ موڑ کر حیدر سعید کی طرف دیکھا تھا۔

”معافی چاہتا ہوں مجھے یہ گھائے کا سودا منظور نہیں۔“ علی رضوی“ از ناٹ فار سیل حیدر صاحب۔“ بڑے دو ٹوک انداز میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ ہر شخص بکاؤ نہیں ہوتا۔ اس نے محبت کو جھٹکے دیا تھا نہ ہی محبت کے نام پر خود کو بکنے۔ اور اب سامیہ کے جواب کا منتظر تھا۔

سامیہ کی کنفیوژن ختم ہو گئی تھی۔ علی کی تلخ گفتگو اسے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ کس بنا پر حیدر سعید نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالے ہیں۔ وہ اگر جھگڑتی تھی کہ یہ ان کی محبت ہے تو وہ غلط تھی۔ وہ یہ سب صرف اپنی انا میں کر رہے تھے۔

”ڈیڈ نے تم سے جو کچھ کہا وہ ان کی سوچ تھی اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا نہ ہی انہوں نے مجھ سے پوچھ کر نہیں یہ سب کہا پر میں اتنا جانتی ہوں تم سے محبت کی ہے اور محبت میں سودے بازی نہیں

ہوتی۔ میں دل کے راستوں پہ تمہارے ساتھ چلنے کی خواہاں ہوں اب یہ تم پہ منحصر ہے انہیں پھولوں سے بھر دیا کانٹوں سے۔ میں تم سے تمہاری عزت نفس کے بدلے اپنا سکھ نہیں مانگوں گی علی۔“ اس تجویز کے بعد اس سے بڑھ کر اور چاہیے بھی کیا تھا۔ ایک دم دل پہ دھراؤ چھ لگا ہوا گیا تھا۔ محبت جیت گئی تھی۔

”پاکل ہو گئی ہو تم سامیہ۔ میں تمہاری اچھی اور بہتر زندگی کی خاطر یہ سب کر رہا ہوں ورنہ یہ دو کوڑی کا انسان کہاں اس قابل تھا کہ اسے کوئی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھما دے۔“ حیدر سعید کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔

”آپ کو کس نے حق دیا ڈیڈ آپ علی کے لیے ایسی زبان استعمال کریں۔ آپ کے پاس پیسہ ہے تو اس کا مطلب سامنے کھڑا شخص اتنا گیا نرا رہے جسے آپ جو چاہیں گے کہہ دیں گے۔“ وہ اب براہ راست ان سے مخاطب تھی۔

اگر وہ اسے پہلے سے اپنی اس حرکت کے متعلق بتا دیتے تو وہ مگر کبھی علی کو یہاں ان سے ملنے نہ بلاتی۔ وہ جانتی تھی اس کے لیے اس کی عزت نفس کتنی اہم ہے۔ وہ سودے باز نہیں۔ ان ڈھانکی تین سالوں میں بھی کوئی ایک موقع بھی تو ایسا نہیں آیا تھا جب اسے علی پہ لاپچی ہونے کا گمان ہوا ہو۔ اس کی جیب میں بہت کم پیسے ہوتے تھے تو دوسری طرف سامیہ کا پرس نوٹوں سے بھرا ہوتا تھا پھر بھی کبھی ایک بار بھی اس نے علی کی موجودگی میں کیسے ٹیریا کا ٹیل نہیں دیا تھا۔ وہ اس کے معیار کی آؤٹنگ انورڈ نہیں کر سکتا تھا اسی لیے ایسی کسی جگہ پہ نہیں جاتا تھا جہاں اس کے بجائے سامیہ کو میسے خرچتا پڑیں۔ حالانکہ وہ اسے میووب نہیں سمجھتی تھی لیکن علی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ اور سامیہ کو اس کی یہی ادا اچھی لگتی تھی۔ کتنی ہی بار سامیہ نے اسے کسی موقع کی مناسبت سے تنہا دینے کی کوشش کی لیکن علی نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ وہ خود اسے اکثر چھوٹی چھوٹی چیزیں تحفے کے طور پہ دیا کرتا تھا لیکن اسے سامیہ سے کچھ بھی لیتا



پسند نہیں تھا۔ سامیہ کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ اسے اس کی کتاب چھپوانے میں اپنی مدد کے لیے قائل نہیں کر پائی تھی۔ یہ اس کی دیرینہ خواہش تھی لیکن اپنے بل بوتے پر۔۔۔ اس کے لیے انتظار کر سکتا اور کر رہا تھا لیکن اپنا سر جھکا جتنا منظور نہیں تھا۔

”اس کی وکالت تو ایسے کر رہی ہو جیسے وہ تمہیں ملکہ بنا کر لے جا رہا ہے۔ دن میں تارے نظر آجائیں گے جب اس جھونپڑی میں رہنا پڑے گا۔“ صالحہ بھی شوہر کی طرف داری کرتے تیز لہجے میں بولیں۔

”دل والوں کی اپنی سلطنت ہوتی ہے جہاں اینٹ پتھروں سے بنے گھر نہیں چاہتے شیش محل ہوتے ہیں۔ وہ جہاں بھی رکھے گا میرے لیے وہی محل ہوگا۔“ وہ ہر حال میں راضی برضا تھی۔ وہ جس غربت سے اسے خوف زدہ کر رہے تھے سامیہ اس کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھی۔

”تو پھر میں بھی دیکھوں گا کتنے دن اس شیشے کے گھر میں رہ پاؤ گی۔ تم جی عمر کے عشق پہ باپ سے بغاوت پہ آمادہ ہو پھر میرے پاس عقل اور تجربہ ہے۔ جب زندگی میں ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے لیے سسکا بڑے گا تو پھر منہ اٹھا کر میرے در پہ مت آنا۔“ ان کے دھتکارے ہوئے لہجے نے تکلیف تو پہنچائی تھی لیکن جانتی تھی اس کا انتخاب درست ہے اور آنے والے نکل میں یہی لوگ اس پہ فخر کریں گے۔

”نہیں آؤں گی۔ اولاد ماں باپ کی دعاؤں کی محتاج ہوتی ہے۔“ حیدر سعید غصے سے منھیاں کھینچنے لگی۔ بڑی کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی ساری بازی ایک ہی لمحے میں پلٹ جاتی تھی اور پیچھے فقط تاسف بچا تھا۔

☆☆☆

وہ حیدر سعید کے گھر سے خالی ہاتھ نکلتی تھی۔ اس کی ضد اور اپنی انا میں انہوں نے اسی وقت ان دونوں کا نکاح کروادیا تھا اس شرط پہ کہ وہ اب اس

سے مرتے دم تک کوئی تعلق رکھیں گے نہ ہی اس کی کسی مشکل میں اس کا ساتھ دیں گے۔ سامیہ نے ان کی مرضی پہ تسلیم ختم کیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اس معمولی سے مکان میں لے آیا تھا کیونکہ یہ اس کی مجبوری تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں اس مکان میں چند تبدیلیوں نے اس کی بد حالی کو کم تو کیا تھا پھر بھی یہ جگہ ہرگز اس لڑکی کے شایان شان نہیں تھی جو اپنے باپ کا شان دار اور پر وقش محل جیسا گھر چھوڑ کر صرف اس کی محبت میں اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ وہ اس سے شادی کی خواہش رکھتا تھا لیکن اس طرح نہیں۔ اس شہرادیوں جیسی لڑکی کے شایان شان تو نہیں تھا یہ گھر جہاں اسے لانا پڑا تھا۔ حیدر سعید کی اس کے لیے رخصت بجائی۔ وہ بھی طور ان کی اگلی اور آرائشوں میں پلٹی جی کے لیے مناسب نہیں تھا لیکن سامیہ نے اس کی عزت کو اپنی محبت کے پیراہن میں ڈھانپ کر اس مشکل مرحلے کو آسان کر دیا تھا۔

اس کے ماں اور باپ دونوں کے لیے یہ خبر حیران کن تھی پھر بھی انہوں نے بیٹے کی خوشی کی خاطر اسے سر آنکھوں پہ بٹھایا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ماں اور باپ سے باتیں کرتے خوش تھی۔ اپنے فیصلے سے مطمئن تھی۔ علی کی خاطر بہت بڑا قدم اٹھایا تھا اس نے۔ لیکن آٹھ بائے دس فٹ کے اس انتہائی مختصر اور آرائشوں سے مزین کمرے میں سامیہ کو لے جاتے ہوئے علی کے ذہن میں حیدر سعید کا ایک ایک لفظ گونج رہا تھا۔

اس وقت جو کچھ انہوں نے علی کو کہا تھا وہ اس سے نالاں تھا لیکن اس کی وجہ سے جو سب سامیہ نے سنا وہ ایک ایک حرف اس کے اندر تازا نے بجا رہا تھا۔ اس وقت بھی ٹیکے سے کمر نکالنے لگا اپنے سامنے اکھڑے ہوئے پلستر کی بے رنگ دیوار پہ مرکوز ہو گئی سوچ میں کم تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ سامیہ نے پاس بیٹھتے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ یکدم چونکا تھا۔

”کچھ سوچ رہا ہوں۔“ اس نے ایک گہری



قابل تھا جیسے سامیہ نے اسے بچایا تھا۔  
 ”میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ تمہیں اس سے زیادہ دولت اور آسائش دوں گا جو کل تک تمہیں تمہارے باپ کی بدولت حاصل تھا۔“ اس نے سامیہ کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے غمزدہ کاٹھار کیا۔  
 ”میری دولت تمہارا پیار ہے علی۔ میرے لیے تمہارا یہ گھر کل سے بڑھ کر ہے کیونکہ یہاں تمہاری محبت تمہارا ساتھ میسر ہے۔“ اس نے ایک بار پھر اس کو اپنی محبت کا یقین دلایا۔ سننے میں چھپ گئی تھی۔  
 ”جانتا ہوں یہ سب تم میری محبت میں کہہ رہی ہو۔ تم نے اپنے حصے کی وفا نبھالی ہے اب میری باری ہے۔ آج سے میری زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہے کہ اس دنیا کی ہر خوشی کسی بھی قیمت پر تمہارے قدموں میں لا کر رکھوں گا اور میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اپنے مقصد کو پورا نہیں کر لیتا۔“

اس خوشبو جیسی لڑکی نے آج کی رات اپنی محبت سے اس کے وجود کو کبھی معطر کر دیا تھا۔

☆☆☆

نہ تو کل چاندنی رات تھی نہ ہی آج صبح بہاراں۔ یہ اس کا نرم دلائم بستر نہیں تھا جہاں اسے کی جتنی سے بدن کو راحت ملتی تھی۔ جس زدہ چھوٹے سے کمرے میں اس کمرہ دارے پٹنگ پہ سونا یقیناً اتنا کھل نہ ہوتا اگر محبوب کی قربت میسر نہ ہوتی۔ اس نے بھی علی کی خاطر خود کو ہر مشکل اور تکلیف کے لیے تیار کر لیا تھا۔ وہ اس کے وسائل سے واقف تھی اور اسے اس کے مسائل میں اضافہ نہیں کرتا تھا۔ جو زندگی سامیہ کے لیے تلخ اور سی تھی، علی اور اس کے گھر والے ان حالات میں برسوں سے رہ رہے تھے۔ وہ بھی اس کی طرح انسان تھے اور اللہ نے ان کی تخلیق بھی یقیناً اسی محبت سے کی تھی، پھر کس طرح وہ انہیں ان کی کم مائیگی کا احساس دلا سکتی تھی۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا وہ علی کا سپہا رہنے کی۔ اس کی ملاقات بنے کی۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ علی کی سب سے

سائس لی۔ سامیہ کے ہاتھ کی پشت پہ انگلیاں پھیرتے وہ اب بھی اتنا ہی ڈسٹرب تھا۔  
 ”ڈیڈ کی باتوں سے بہت ہرٹ ہوتا تم؟ ان کی طرف سے میں معذرت کرتی ہوں تم پلیز وہ سب بھول جاؤ۔“

”بھول ہی تو نہیں سکتا۔ تمہارے ڈیڈ نے میری غربت کو طمانچہ بنا کر میرے چہرے پہ مارا ہے۔ ان کا ہر طنز ہر ہنس بھیکے تیرے سامیہ کے سینے میں اترتا ہے سامیہ اور میں یہ سب بھی نہیں بھولوں گا۔“ اس کے کھلے بالوں میں انگلیاں چلاتے وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”لیکن علی یہ بھی تو سوچو کہ اس سب میں، میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں۔ انہوں نے مجھے بھی تو طعنے اور بددعاؤں کے سائے میں رخصت کیا ہے۔ پھر آج تو ہماری محبت کی جیت کا دن ہے۔ ہم دوسے ایک ہوئے ہیں۔ کیوں تم ان کی سخت باتوں کو یاد کر کے دل جلاتے ہو؟“ ان کی شادی جیسے بھی حالات میں ہوئی تھی لیکن آج ان کی زندگی کی نئی شروعات تھی۔ سب کچھ دیا نہیں تھا لیکن یہی بہت تھا کہ وہ دونوں ساتھ تھے۔ آج کی رات تو محبت کو موضوع ہونا چاہیے تھا پھر وہ کیوں ان کیوں کو یاد کرنا چاہتا تھا۔ سامیہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”اسی بات کا زیادہ ملال ہے۔ میری تجتیر یہ تو میں بھی خاموش رہ جاتا۔ جو کچھ انہوں نے کہا وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو بنا سوچے سمجھے کسی سے بھی منہ اٹھا کر نہیں بیاہ دیتا لیکن جو کچھ انہوں نے تم سے کہا ہے سامیہ وہ میں فراموش نہیں کر سکتا اور تم بھی یہ کوشش مت کرنا کہ میں وہ سب بھول جاؤں۔“

وہ جانتی تھی یہ سب باتیں وہ اس کی محبت میں کہہ رہا ہے اور یہی وہ یقین تھا جس نے سامیہ کو اس باپ کی مریضی کے خلاف جانے پر مجبور کیا تھا۔ جو اس کی بے عزتی کو اپنی ذلت سے بڑھ کر محسوس کرتا، اس پر رنجیدہ تھا۔ وہ شخص یوں دل میں بجائے جانے کے



بڑی کمزوری بن گئی ہے جس کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

آنکھ کھلنے پہ اپنے پہلو میں علی کو نہ پا کر حیران کی سامیہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ اسے باہر برآمدے میں ہی مل گیا تھا۔ اس کی تیاری سے لگتا تھا جیسے وہ اس سے بہت پہلے سے جاگا ہوا تھا۔ برآمدے میں اس وقت کوئی نہیں تھا البتہ باورچی خانے سے آ رہی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا جنہم وہیں تھی۔ لیکن سامیہ کو جس بات نے حیرت میں مبتلا کیا وہ برآمدے کے وسط میں بڑی کپڑے کی سفید بوری تھی جس میں اکثر آٹا یا پھر اناج بھرا ہوتا ہے لیکن اس وقت اس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

”یہ کیا ہے علی اور اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہیں؟“ بالوں کو کلب میں لپیٹتے وہ جس سے سوال کرتی اس تک پہنچی تھی۔ معمول کی طرح سفید کرتے اور جینز میں وہ تیار ٹھہرا تھا۔

”یہ؟ متاعِ حیات۔“ سامیہ نے ایک نظر علی کے سنجیدہ چہرے پہ ڈالی اور پھر خود ہی اس بوری کو کھول کر اس میں رکھا سامان دیکھنے لگی۔

”یہ تو کتا ہیں ہیں اور یہ آپ کی ڈائریاں۔ ان میں آپ کی ساری شاعری لکھی ہے۔ یہ سب لے کر کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ حیرت زدہ سی ایک ایک کر کے اس میں رہی چیزیں باہر نکال کر وہاں پڑے تخت پہ رکھ رہی تھی۔

”کبھی یہ میرا ڈھنچا بچھوتا تھا لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو رومی کا ڈھیر لگتا ہے۔ ایک صاحب ذوق سے سودا ہوا ہے۔ ان کی اچھی قیمت دینے کو تیار ہے۔“ علی بے حد سنجیدگی سے کہتے خود بھی اسی تخت پہ بیٹھ گیا اور کتابوں کو واپس اسی بوری میں منتقل کرنے لگا۔

”آپ اپنی کتابیں بیچ رہے ہیں؟“ اسے شاگ لگا تھا۔

”لیکن کیوں علی؟“ وہ ہنسنوں کے علی علی کے پیروں میں بیٹھے حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ علی

نے کتابیں تخت پہ رکھتے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ ”یار کچھ پیسوں کی ضرورت ہے اور اس وقت فوری پس بھی حل سوچا ہے۔ خیر تم کیوں پریشان ہوئی ہو۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولا تھا۔

”یہ میں آپ کو بالکل نہیں دوں گی۔ اس میں تو آپ کا برسوں کا کلام لکھا ہے اور آپ ہی نے کہا تھا آپ کی سب سے بڑی خواہش اسے کتابی صورت میں لانا ہے۔“ سامیہ نے اس کی دونوں ڈائریاں اٹھاتے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔ ان میں لکھے لفظوں کو اس نے پتا نہیں کتنی ہی بار پڑھ رکھا تھا اور اب تو جیسے یہ سب اسے زبانی یاد تھا۔ وہ اس کلام سے علی کی دانشمندی سے آشنا تھی۔ پھر کس طرح وہ اپنی اتنی محنت کو چند سو روپوں میں بیچ سکتا ہے۔

”وہ سب زبانی جاہلیت کے قصے تھے میری جان۔ اب حالات بدل چکے ہیں اور میری سوچ بھی۔ یہ سب لکھنا پڑھنا احمقانہ لگتا ہے کیونکہ نہ تو ان چند حرفوں سے بازار سے بھی ملتا ہے نہ گھر کا چراغ جلتا ہے تو پھر کیا فائدہ ان میں وقت ضائع کرنے کا۔“ اس نے دائیں ہاتھ سے سامیہ کا گال تھپتھپایا۔ بے یقینی سے وہ اب بھی بنا پٹلیں چمکائے اس کو دیکھ رہی تھی۔

”خیر تم رکھنا چاہو تو رکھ لو لیے بھی اس سے کتابوں کی ذیل ہوئی تھی۔ یہ تو بس یونیورسٹی کے لیس ساتھ کہ اب میرے لیے بے کار ہیں۔“ علی نے سر جھٹکتے کہا اور ایک بار پھر کتابیں بوری میں ڈالنے لگا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ سامیہ سر جھکائے سینٹ کے فرش پہ بیٹھی تھی اور علی کی دونوں ڈائریاں اس کی گود میں رہی تھیں۔ علی خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔

نئی زندگی کی پہلی صبح اتنی مایوس ہوئی یہ اس نے نہیں سوچا تھا لیکن یہی زندگی ایک امتحان ہے اور امتحان میں کب کون سا سوال آ جائے یہ ہم کیسے جان سکتے ہیں۔ کبھی آؤٹ آف کورس تو کبھی ہماری سمجھ سے اوپر اور یہ پرچا کبھی آؤٹ نہیں ہوتا۔ سب کچھ



مدد کی تھی۔ مشین کے ساتھ وہ گھر میں بھی ایک دو گھنٹے  
ساتھ صاف کرتا اور اب تو وہ بہت سائیز ٹیل بھی گھر  
لے آتا تھا۔

آہستہ آہستہ اس نے خرم کے بجائے  
ڈائریکٹ فیکٹری سے آرڈر لینے شروع کر دیے۔ کام  
زیادہ ملا تو مشینوں کا اضافہ کرنا پڑا ساتھ ہی چند  
کارگر بھی اپنے ساتھ شامل کیے۔ وہ انہیں خرم سے  
زیادہ معاوضہ دیتا بدلے میں وہ اسے بہترین کام  
پوری دلی جی سے کر کے دیتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے علی کا چھوٹا سا اسٹچنگ یونٹ  
فیکٹری والوں کی نظروں میں آنے لگا جہاں تا صرف  
کام صفائی سے ہوتا، آرڈر بھی وقت پر پورا کیا جاتا۔  
صرف ایک سال میں کام بڑھنے کے سبب اس نے  
گھر کے بجائے ایک چھوٹا سا کارخانہ الگ سے  
کرائے پر لے لیا تھا جہاں کارگر بھی زیادہ تھے۔ وہ  
خود بھی وہاں ایک کارگر کی طرح ہی کام کرتا اور کئی  
بار تو ایسا ہوتا وہ رات کو گھر آنے کے بجائے وہیں سو  
جاتا پھر اگلے دن کام پر لگ جاتا۔

☆☆☆

ایک سال بعد اپنی طویل معذوری کو جھیلنے قیوم  
کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے ڈیڑھ ماہ بعد علی شہنم اور  
سامیہ کو لے کر محلے کا اپنا پرانا اور خستہ حال مکان  
ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر ایک نئی سوسائٹی میں آ گیا تھا۔  
مکان کرائے کا تھا اور بہت بڑا بھی نہیں تھا لیکن تعمیر  
نئی تھی۔ بنیادی ضروریات بھی اس گھر اور محلے سے  
بدرجہ اتم بہتر تھیں۔ لیکن یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں وہ  
سامیہ کو لاکر رکھنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ اس پر بہت  
خوش تھی بلکہ اسے تو علی کے ساتھ اس ٹوٹی پھوٹی جگہ  
پر رہنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ اس  
سے بے تحاشا محبت کرتی تھی اور محبت قربانی دینے  
کے وصف سے آگاہ ہوتی ہے۔

ایک سال میں سامیہ کی ملاقات کبھی اپنے  
والدین سے نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس سے ملنا نہیں  
چاہتے تھے تو خود سامیہ نے بھی ان سے ملنے کی

اپنے وقت پر سامنے آتا ہے حل کر لیا تو پاس درند  
فیل اسے بھی اب اس پرچے کو اپنی ہم و فرست  
سے حل کرنا تھا۔

☆☆☆

اور تو کیا تھا بیچنے کے لیے  
اپنی آنکھوں کے خواب بیچے ہیں  
اس نے کتابیں بیچ کر ایک سلائی مشین اور  
سامیہ کی ضرورت کا مختصر سا سامان خریدا تھا۔ وہ  
سب اس کے شایان شان تو نہیں تھا لیکن فی الوقت  
یہی غنیمت تھا۔

یہ ایک مخصوص مشین تھی جس کے ساتھ اسٹینڈ  
لگا ہوا تھا۔ اس میں سلائی کے ساتھ اور لاک اور کاج  
کرنے کی بھی سہولت موجود تھی۔

علی کو یہ پرانی مشین کم قیمت پر اسی اسٹچنگ  
یونٹ سے مل گئی تھی جہاں اس نے سلائی کیے کا ارادہ  
کیا تھا۔ یہ کوئی عام یونٹ نہیں تھا۔ یہاں بننے والا  
مال نہایت مشہور برائڈ کے لیبل سے بیرون ملک  
ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔

ایک بہتر ملازمت کی تلاش میں سرگردہ علی  
پچھلے کچھ عرصے سے کافی تک و دو کر رہا تھا۔ یہ ایک  
اتفاقی تھا کہ کچھ روز پہلے اس کی ملاقات خرم سے  
ہوئی تھی۔ خرم کا ایک درمیانے درجے کے اسٹچنگ  
یونٹ کا مالک تھا اور لگ بھگ سو کے قریب کارگر  
بیک وقت اس کے پاس کام کرتے تھے۔

علی نے خرم سے پہلی ملاقات کے بعد ہرگز  
نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کے ماتحت یہ کام کرے گا  
لیکن کل کی پیمان خیز یوں نے زندگی کو نئے سوسائٹھ  
ڈگری کی سطح پر الٹ دیا تھا۔

☆☆☆

دو ماہ میں اس نے نہ صرف خرم کے پاس کام  
کر کے سلائی سیکھی تھی بلکہ اس کا رد بار کے رموز پر بھی  
بہر پور توجہ دی تھی۔ وہ ایک ذہین اور پڑھا لکھا انسان  
تھا۔ قلیل وقت میں اس پیشے کی بہت سی باریکیاں سمجھ  
گیا تھا۔ خرم نے اس کے مسائل سمجھتے ہوئے اس کی



تاریخی حیثیت رکھتی تھی۔ اس دن اس کی کمپنی کی پہلی شب منٹ ڈپنچ ہوئی تھی اور یہ دن اس کے لیے تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ وہ سامیہ کے پاس اسپتال نہیں جا سکا تھا کیونکہ اس کی موجودگی دیگر باؤس میں اہم تھی۔ ایک ڈراسی غلطی اس کی تین ماہ کی محنت پر پانی پھیر گئی تھی اور وہ کامیابی کی پہلی سڑھی پر کھڑا ہونے سے پہلے ہی زمیں بوس نہیں ہوتا چاہتا تھا۔ اسٹینجک، ایمر انڈری، واشنگ، فولڈنگ اور فاسل پیننگ تک ہر مرحلے میں وہ سر پر موجود تھا۔ یہی نہیں اس نے لوڈنگ کے دوران کارڈن تک خود اٹھائے تھے۔ عام ورکرز کی طرح لوڈر ٹرک میں کارڈن رکھتے اس کے ہاتھ پر کوئی ٹل تھانہ ہی چہرے پر ٹھکن۔ ہاں پریشانی تھی تو سامیہ کے حوالے سے جو اس وقت اسپتال میں اس کی ماں اور ملازمہ کے ساتھ تھی۔ دل میں یہ بھی تاسف تھا کہ وہ اسے پچھلے نو ماہ میں وہ جذباتی سہارا نہیں دے پایا تھا جو ان دنوں اس کی طرف سے وہ توقع کر رہی تھی لیکن سامیہ نے نزدیک ان دنوں کا شمار اس سے نہیں زیادہ تھا۔

☆☆☆

”آئی ایم ایکسپریس سوری سوئٹ ہارٹ۔ آج شیفٹ کی وجہ سے میں ٹائم پر ہاسپٹل نہیں پہنچ سکا۔“ وہ ڈلیوری کے چند گھنٹوں بعد وہاں پہنچا تھا۔ سامیہ کو اس وقت تک ریکوری روم سے پرائیوٹ کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتے اس نے محبت سے معذرت کی تھی۔ اسے سنجیدگی سے دیکھتے سامیہ خاموش رہی۔ زوجگی کے مرحلے سے گزر کر اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ خود علی تمام رات کا جاگا ہوا تھا لیکن پھر بھی ہشاش بشاش اور مسکرا رہا تھا۔

”تم نے دیکھا یہ کتنا کیوٹ ہے۔“ خوشی اس کی آواز سے چھلک رہی تھی۔ پالنے میں سوئے فاران کا ننھا ہاتھ تمام کر اس نے اس کے ہاتھ کی پشت کو چوما تھا۔ وہ نیند میں کسمپاسا جیسے اس نے باپ کے احساس کو محسوس کیا تھا۔ خوشی سے تھمتاتے

کوشش نہیں کی تھی۔ اس دوران اس نے کبھی اپنے گھر یا ماں باپ کا ذکر بھی علی کے سامنے نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس کے اس عمل سے علی کو تکلیف ہوگی لیکن اس کی خاموشی علی کو اور بھی اذیت دیتی تھی۔ وہ اس کی خوشی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر چکی تھی یہ سوچ علی کو دن رات بے چین رکھتی۔

اسے سامیہ کو وہ سب کچھ واپس لوٹانا ہے بمعہ ان رشتوں کے جو وہ اس کی خاطر تیاگ آئی ہے۔ یہ جب ہی ممکن تھا جب وہ معاشرے میں اپنا کوئی قابل عزت مقام بنا لیتا۔ لیکن سامیہ کو اگر آج بھی دولت اور محبت میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوتا تو وہ علی سے محبت کا تقاضا ہی کر لیتی۔

تین سال کی مسلسل کوشش اور انتھک محنت کے بعد علی اپنے کارخانے کو ایک رجسٹرڈ کمپنی میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ بالآخر ان تمام بڑے ناموں کے ساتھ ڈائریکٹ کام کرنے لگا تھا جن تک اس کا بنایا کام پہلے دوسرے ذرائع کے توسط سے پہنچتا تھا۔

انٹرنیشنل برانڈ کی تین بڑی کمپنیوں کے ساتھ اس کے مستقل بنیادوں پر کانٹریکٹ ہوئے جس کے بعد اسے ایک سپورٹ لائسنس مل گیا تھا۔ اس نے کارخانے کو دیگر باؤس میں تبدیل کرتے ہوئے۔ وہ لوگ اب بڑے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔ گھر میں کل وقتی ملازم کا اضافہ ہو گیا تھا۔ بس سے موٹر سائیکل اور پھر گاڑی کا سفر کرتے علی کی مصروفیات میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا تھا۔

”کچھ نہیں“ سے ”کچھ ہونے“ تک کے سفر میں اس کی دن رات انتھک محنت تھی۔ جائزہ اور حلال طریقے سے اپنے زور بازو پر بھروسہ رکھتے جو چیلنج اس نے قبول کیا تھا اسے پورا کرنے میں اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ان دونوں کی ”محبت“، ان کا ”وقت“ اور علی کا عشق خاص اس کی ”شاعری“ کی قربانی شامل تھی۔

”فاران“ کی پیدائش اس کی زندگی میں



طرح نظر انداز ہو رہا تھا۔ پریکٹسی کے دوران اس کے اندر احساس محرومی سر اٹھانے لگا تھا۔ ایسے علی کے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی اور بد قسمتی سے وہ اسے میسر ہی نہیں تھا ایسے میں آج اتنے برسوں بعد اس کا تلخ لہجہ میں علی سے گلہ کرنا اس کے نزدیک حق بجانب تھا۔

”اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر تمہارے پاس وہ سب کچھ ہو جو میری وجہ سے تم نے چھوڑ دیا۔“ اسے پورا احساس تھا وہ شادی کے بعد سامیہ کو وہ توجہ نہیں دے پایا جس کی وہ حق میں لیکن یہ تسلی تھی وہ سامیہ کو اس کے معیار کی ناسی لیکن بہتر زندگی دینے کی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوا ہے۔

آواز کی بلندی اور لہجے کی تلخی کو خاموشی سے اپنے اندر اتارتے اس نے سامیہ کا ہاتھ تھامتے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس کی پہلی باتوں کو نظر انداز کرتے بس آخری بات کا جواب دیا تھا۔

”کیا میں نے تم سے بھی ان سب چیزوں کا تقاضا کیا؟ کبھی اپنے کسی رویے سے محسوس ہونے دیا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟ میں نے اپنی مرضی سے سب کچھ چھوڑا تھا کیونکہ مجھے تم چاہیے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہیں باکر میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھودوں گی۔“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی نہ علی نے ہاتھ چھوڑا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے سامیہ نے ہسٹریائی انداز میں سوال کیا تھا۔

علی نے ایک گہرا سانس لیتے اس کی ہاتھ کی پٹت کو سہلایا۔

”یہ سب وقتی باتیں ہیں سامیہ اور کچھ عرصے میں جب ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے تو تمہاری یہ غلطی بھی ختم ہو جائے گی۔“ ایک غیر محسوس سے انداز میں اس کے ہاتھ اس کی جھولی میں رکھتے وہ اس کے پاس سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”دولت کے ڈھیر پہ بٹھا کر مجھ سے میری زندگی کے خوب صورت دنوں کا تادان لے کر تم بکتے

چہرے کے ساتھ علی نے پلٹ کر سامیہ کی طرف دیکھا جیسے اس سے اپنی بات کی تصدیق چاہتا ہو۔

”میں چاہتی تھی اپنی پہلی اولاد کا چہرہ ہم دونوں ایک ساتھ دیکھیں اور تمہاری مصروفیت نے میرا ایک اور خواب بھی پورا نہیں ہونے دیا۔“ ہیڈریسٹ سے کمر نکائے وہ کمرے کی دیوار پر لگے پوسٹر کو خالی نظروں سے دیکھتے خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

”میں یہ محنت تمہارے خوابوں کی تکمیل کے لیے ہی کر رہا ہوں۔“ علی نے اس کی شکایت کو درست جانتے ہوئے بھی اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی گئی تھی۔

”میرا خواب دولت کبھی نہیں تھا۔ یہ سب تم اپنے لیے کر رہے ہو علی کیونکہ تم بہت بڑے آدمی بننا چاہتے ہو۔ میرے باپ سے زیادہ بڑے اور امیر جس نے تمہیں اپنے گھر میں کھڑا کر کے تمہاری معمولی حیثیت جتاتے ہوئے اپنا گھر داماد بنانے کی آفر کی تھی اور تمہاری امانت وہ آفر گہری ضرب بن کر لگی تھی لیکن تم اس وقت یہ بھول گئے کہ میں اپنے باپ کے سامنے کس طرح تمہارے لیے تمہاری عزت اور محبت کی خاطر ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔ دولت اور محبت میں سے تمہاری محبت کا انتخاب کیا تھا میں نے۔ دولت کی تمنا ہوئی تو اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ نہیں آئی۔“ اس نے پہلی بار احتجاج کیا تھا۔ بلند آواز اور تلخ لہجے کے ساتھ اس پورے عرصے میں پہلی بار اس نے علی کو دیکھا تھا۔

شادی کے بعد سامیہ نے پوری کوشش کی تھی کہ علی کو اس سے معمولی سی بھی شکایت نہ ہونے پائے۔ اس نے کبھی کوئی ڈیمانڈ نہیں کی تھی۔ لڑائی جھگڑا تو دوران دونوں میں بھی اختلاف رائے بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی سامیہ کو علی کی شدت پسندی پریشان کرتی تھی۔ اس کا خود کو بلکانا کرنا تکلیف دیتا تھا۔ کچھ عرصے سے علی کی مصروفیات میں جس تیزی سے اضافہ ہوا تھا اس کے بعد سامیہ کا وجود بری



کر لگا تھا۔

”بس اتنا ہی اعتبار تھا میری محبت ہے؟“ اس کو صدمہ ہوا اس کے سوا وہ بھی کیا سکتا تھا۔ جس انسان کو وہ اپنی روح مانتی تھی اسے جتنا یا جا رہا تھا کہ اگر وہ یہی نہ کہتا تو وہ اسے چھوڑ دیتی۔ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے سامیہ نے سوال کیا تھا۔

”تم کرنی ہو اعتبار میری محبت کا؟“

”مجھے تم چاہیے ہو۔ تمہارا وقت چاہیے ہے۔“

”تو مل جائے گا وقت۔ کہاں بھاگا جا رہا

ہے؟“ وہ پیر پختے بولا تھا۔

”سارا دن نکتوں کی طرح تمہارے پہلو میں

گزار دوں یہ جاہتی ہو تم۔ اس وقت سب سے زیادہ

اہم ہے پیسہ جس کے لیے بھاگ دوڑ کرنی پڑتی

ہے۔ باہر رہ کر دیکھ کھانے پڑتے ہیں۔ جانتی ہو

اس پرائیوٹ اسپتال کا مل کتنا ہے؟ یہاں کے

ڈاکٹر ایک ایک وزٹ کا کیا چارج کرتے ہیں؟ یہ

ادا نیکیاں تمہارے پہلو میں بیٹھ کر شعر کہتے نہیں

ہو سکتی تھیں مالی ڈنیر۔ اس لیے کیا ہے خود کو اتنا بلکان

اور آج اگر یہ سب نہ کرتا تو تم کسی سرکاری اسپتال

کے گندے سین زدہ کاریڈرو میں لگے عارضی بستر پہ

میری اولاد پیدا کرتیں جہاں کسی کو نہ کھدے میں

کتے اور بلیاں بھی اپنے بچے پیدا کر رہے ہوتے

ہیں۔“ اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے

ان پیڑہوں کو نکال کر سامیہ کے آگے پھینکا تھا۔

کاغذ کے وہ چند ٹکڑے اس جیبے اسپتال کے

اغراجات کی رسیدیں تھیں جو کل سے لے کر اب تک

اس پہ اور اس کے نومولود بچے پہ خرچ کیے گئے تھے اور

جن کی ادائیگی وہ اس کے پاس آنے سے پہلے کر کے

آ رہا تھا۔ وہ اگر ماں باپ سے لڑ کر ملے کا ہاتھ نہ تھامت

تو جانتی تھی یہ چند ہزار روپے اس کی کلاس کے کسی بھی

فحص کے سامنے بے حیثیت ہیں۔ چند سال پہلے

اس کا ماہانہ جب خرچ اس سے کئی گنا زیادہ ہوا کرتا

تھا لیکن اس وقت سامنے کھڑے فحص کی بہت دنوں

کی محنت کا ثمر تھے۔ اس کی کئی راتوں کی نیند کا تاوان

ہو میری ہر خلش ختم ہو جائے گی۔“ وہ اگر بات ختم کرنا چاہتا تھا تو سامیہ کے لیے آغاز تھا۔ ایک کے بعد ایک شکوہ کرتے وہ اس کی مفاہمت کی ہر ایک کوشش اس کے منہ پہ مارتے یہ بھول گئی تھی وہ اگر آج دن رات کی تفریق بھلائے سکون کو خود پہ حرام کر رہا ہے تو یہ اس کی خاطر ہے۔ حیدر سعید کا اس کے متعلق تجزیہ بالکل درست تھا۔ وہ بے تحاشا جذباتی تھی۔

”تم یہ سب باتیں اس لیے کہہ رہی ہو کیونکہ تم نے زندگی میں کوئی ایک دن بھی میری طرح نہیں گزارا ہے۔ تم تک کوئی مشکل نہ پہنچے اس کے لیے دن رات محنت کرتا ہوں میں۔ نیند، چھوک، بیماری کو انہور کر کے رات دن ایک کرتے ہوئے صرف اس لیے مشقت کر رہا ہوں کہ تم۔ سامیہ تم خوش رہ پاؤ۔“ اس نے تو اپنی بھڑاس نکالی ہی تھی اس بار علی بھی خود پہ قابو نہیں رکھ پایا تھا۔

وہ اب فقط مجبور نہیں اس کی بیوی تھی۔ محبوبہ کی شکایت ادا لگتی ہے لیکن بیوی کا گلہ سنگ باری۔ سامیہ نے جو کہا اپنے ذہنی دباؤ کے زیر اثر کہا تھا وہ چاہتا تو یہاں اپنی تھوڑی سی برداشت سے بات کو ختم کر سکتا تھا۔ مرد کی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔ باہر بڑے بڑے پہاڑ توڑ سکتا ہے، دنیا کی ذلت اور گالیاں سمجھ سکتا ہے۔ بھوک اور مشکلوں سے جنگ کر لیتا ہے لیکن عورت کے سامنے ہار جاتا ہے۔ مبر بھی۔ برداشت بھی اور عمل بھی۔

”میں نے اور میرے خاندان نے غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزار دی تھی میں آگے بھی اسی طرح جی سکتا تھا لیکن تمہیں ان حالات میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اگر یہ اقدام نہ اٹھاتا تو یا تو اس پسماندہ محلے میں رہتے رہتے تم گھٹ گھٹ کے مرجاتیں یا پھر ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر واپس اپنی دنیا میں چلی جاتیں۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک آپشن سوچوں بھی تو میرا دم کھینچنے لگتا ہے۔“ اس نے جذبات میں فقط ایک بات کی تھی لیکن سامیہ کو اس کا خدشہ گالی بن



تھے یہ پیسے جو اس کے سکھ پہ خرچ کیے گئے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سامیہ اس کے سامنے احسان سے سر جھکاتی۔ جب وہ اسے بتاتا وہ اس کی مشکور ہوتی۔ وہ اگر اس سے اپنی پریشانی بانٹتا تو اس کی ہمت بندھ جاتی لیکن آج اتنے سالوں بعد اس نے پہلی بار اسے بتایا نہیں تھا بلکہ جتایا تھا اور علی کا جتنا اسے ہزار گلے کر گیا تھا۔

اس ایک دن میں اسے احساس ہوا تھا آسمان سے زمین پر آگرتا کیسا ہوتا ہے۔ اسے اگر یہ محرم تھا کہ علی سے شکایت کر کے وہ اس سے اس کی غلطی کا اعتراف کروالے گی تو یہ اس کی محض سوچ تھی۔ وہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔ وقت و حالات نے جو تم ان کے ساتھ کیا تھا اس میں سب سے بڑا خسارہ سامیہ کا ہوا تھا جس کا احساس آج علی کے کاٹ دار لفظوں نے اسے کر دیا تھا۔ آج کا دن سامیہ کیسے فراموش کر سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ دبیر کی ایک خنک مگر اداس صبح تھی۔ خزاں رسیدہ درختوں کے زرد پتوں سے جھانکتے سورج کی دھیمی سی تمازت سست بدنوں کو حرارت دینے میں ناکام ہوئے جاتی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فریج وینڈو کو سلائیڈ کرتے کھڑکی کا کچھ حصہ کھول دیا۔ آن واحد میں کمرے کے نرم گرم ماحول کو سردی نے منتشر کیا تھا اور سرد ہوا کا تیز جھونکا اس کے گلہابی گالوں کو سرخ کر گیا تھا۔ خنکی کا احساس اس کی ریزھ کی ہڈی میں سرایت کر رہا تھا پر اس پل وہ جیسے اس شدت کو اپنے اندر اتارنا چاہتی تھی اسی لیے تو بے آرام ہونے کے باوجود اس احساس سے خطا اٹھا رہی تھی۔ چند منٹ یونہی سکون دے سکونی کے ساتھ گزرے۔ سامنے دیوار پر لگے کلاک میں اب آٹھ بج رہے تھے۔ ایک گھر اسانس لینے اس نے شیشہ برابر کیا اور پردے گرادیے۔

”سامیہ!“ کمرے پر بکھرے اپنے ریشمی سیاہ بالوں کو جوڑے میں جیکتی وہ دست روی سے چلتی

کمرے سے باہر نکل رہی تھی جب علی کی آواز پہ قدم ٹھہر گئے۔ شاید اس کی آنکھ کھڑکی سے آری سورج کی روشنی سے کھلی تھی۔ وہ خود بخود خیر خالی طویل عرصے سے اس کا سونے جانے کا کوئی شیڈول نہیں تھا۔ بعض اوقات پوری پوری رات جاگ کر گزرتی خاص طور پہ ان دنوں جب شپ منٹ کی تیاری آخری مراحل میں ہوتی۔ اس دوران وہ گھر بھی آدھی رات کے بعد آتا۔ اس وقت تک سامیہ اور فاران دونوں سو چکے ہوتے جبکہ اکثر وہ ان کے جاگنے سے بھی پہلے گھر سے نکل جاتا۔ یوں کئی دن سامیہ کا اس سے سامنا نہیں ہوتا تھا۔ شبنم کے انتقال کے بعد تو یہ تنہائی اور بھی پریشان کرنے لگی تھی۔ فاران نے اس کی مصروفیت میں اضافہ کیا تھا لیکن جب سے وہ اس نئے گھر میں شفٹ ہوئی تھی جہاں فاران کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ کا انتظام الگ سے ہو چکا تھا اپنی فرصت کے باعث وہ حد درجہ بے زار رہنے لگی تھی۔

علی ان دنوں اپنی فیکٹری کی تعمیر میں الجھا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اس کا ایک بیڑہ شہر میں تو دوسرا شہر سے باہر ہوتا تھا۔ گارمنٹس انڈسٹری میں تیزی سے بڑھتی اس کی سادھ نے اسے اور بھی مصروف کر دیا تھا۔

پیسہ کمانے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ضرورت پوری کرنے کے لیے کمایا جائے تو ہاتھ کی منی میں سا جاتا ہے۔ ضرورت کو آسمان سادسج کر لیں تو خزانے بھی کم لگنے لگتے ہیں۔

علی بھی ضرورت کی تک دود سے بہت آگے جا چکا تھا۔ پانچ سال پہلے اپنی جمع کی ہوئی سیکینڈ ہینڈ کتاہوں کو بیچ کر ایک سلائی مشین خریدی تھی اس نے۔ پانچ سال بعد اپنے پھیلتے ہوئے کاروبار کے ساتھ اس کا شمار پاکستان کے بڑے پوش میں ہونے لگا تھا۔ وہ ہوزری بزنس میں اس وقت ڈبل ایسٹ اور یو کے کی مارکیٹ کے بڑے حصہ پر قبضہ کر چکا تھا۔ دنیا کی نظر میں اس نے بہت تیزی سے کامیابی کا



یہ سفر طے کیا تھا لیکن اسے اپنی رفتار چھوٹی سی معلوم ہوتی تھی۔

”اتنی جلدی کیوں جاگ گئیں؟“ سامیہ اس کے بلانے پہ واپس بیڑی کی طرف چلی گئی تھی۔ اس نے ایک نظر کاٹ میں لینے فاران کو دیکھا اور تکیہ سیدھا کرتے ایک بار پھر بستر پہ نیم دروازہ ہو گیا۔

ٹریڈ لائنس، فیکٹری پلانٹ، میٹریل، مشینری اور سب سے بڑھ کر بنگ کے قرضہ جات۔ ایسے ہی ان گنت مسائل تھے جن سے وہ آج کل نیر و آزار تھا اور کچھ گھنٹے پہلے ہی اس کی گھر واپسی ہوئی تھی۔ پچھلے تین دن سے وہ اسلام آباد میں کامرس منسٹر سے ملاقات اور چند اہم معاملات کے سلسلے میں رکا ہوا تھا۔ واپس آ کر وہ بس چار، پانچ گھنٹے ہی سویا تھا۔

”انسان وقت پسوے تو آنکھ وقت پہ بی کھل جاتی ہے۔“ وہ بیڑ پہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔ اس دن کے بعد سامیہ نے علی سے شکوہ نہیں کیا تھا۔ وہ پہلے بھی اس سے شکایت کرنے سے گریز کرتی تھی لیکن پھر بھی گا بے بگا ہے اسے ٹوک دیا کرتی تھی۔ وہ خود کو کام میں پکان کر رہا تھا اور سامیہ کو اس کی مشکلات کا پورا احساس تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی علی ان کی زندگی کے اہم اور اچھے دن پسہ کمانے کے جنون کی نذر کر دے۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ وہ بہت زیادہ ترقی کرے، شہرت کی بلندیوں کو چھوئے لیکن اس طرح نہیں۔

ان دونوں کے درمیان اس سے پہلے کبھی بحث ہوئی تھی نہ اس کے بعد۔ علی نے اس سے بعد میں اپنے سخت لفظوں پہ معذرت کی تھی اور سامیہ نے اسے مسکرا کر معاف بھی کر دیا تھا لیکن وہ چاہ کر بھی علی کا لہجہ فراموش نہیں کر پاتی تھی۔ کچھ زخم تمام عمر ہرے رہتے ہیں۔ آپ کی معذرت اور ازالہ انہیں بھرنے میں ناکام رہتا ہے۔

”آئی تو یو آر ویری کلی۔“ نیند سے بخور لہجے میں شرارت سے کہتے اس نے سامیہ کو چھیڑا تھا۔ دھیماسا مسکرایا اور پھر خود کو اسٹریچ کرتے دونوں بازو

اگڑائی کی صورت پھیلانے۔

”ابھی آٹھ بجے ہیں۔ کچھ دیر مزید سو جاؤ میں جانتی ہوں تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔“ وہ چاہ کر بھی مسکرا نہ سکی تھی۔ سنجیدگی سے کہتے وہ آٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جاتی تھی اس کی نیند احموری ہے۔

”یہیں بیٹھو میرے پاس۔ اتنے دن بعد دیکھ رہا ہوں تمہیں جی بھر کے دیکھنے دو۔“ اس نے سامیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس اپنے پاس بٹھا دیا تھا۔ ان دونوں کو ایسا موقع بھی مشکل سے ملتا تھا۔

”دس بجے مینٹگ ہے میری آرکائیوٹ کے ساتھ فیکٹری کے فلور پلان کو لے کر۔“ علی نے اس کے چہرے پہ بھری لٹ کوکان کے پیچھے اڑتے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کا خیال تھا اتنے دن بعد وہ گھر واپس آیا ہے تو شاید آج گھر ہی رکے گا۔ آرام کرے گا۔ لیکن وہ ابھی آ کر ابھی جانے کی بات کر رہا تھا۔

”کچھ بولو گی نہیں؟“

”کیا بولوں؟“

”کچھ بھی۔ اس وقت کوئی بہت اچھی سی بات سننا چاہتا ہوں تمہارے لبوں سے جس کے بعد میری ساری چٹکن ختم ہو جائے اور آج کا دن بہت اچھا گزرے۔“ آج گھنٹے دن بعد وہ اس کے اتنے قریب بیٹھا تھا۔ اس کا ذہن دن گھنٹے لگا۔ کتنے مہینے پہلے اس نے سامیہ سے ایسی دل کی باتیں کی تھیں۔

”شاید مہینے گزر گئے تھے۔“ اس نے سوچا تھا۔ کب کچھلی بار وہ اس طرح پہ فکری سے مسکراتا تھا صرف اس کے لیے۔ سامیہ کو تو یاد ہی نہیں تھا۔ گھڑی کی سوئیاں آٹھ سے اوپر جارہی تھیں۔ بس تھوڑی ہی دیر میں وہ پھر جانے والا تھا نا جانے کب لوٹا۔ سامیہ نے تو اب یہ حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یوں بھی خساروں کا حساب رکھ کے کیا حاصل؟

”میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں علی۔“ یہ لفاظی نہیں حقیقت تھی۔

”میں بھی تم سے بہت بہت محبت کرتا ہوں۔“



امید چھین لی تھی۔ اس دن کے بعد اس کی علی سے ہر امید ختم ہو گئی تھی۔ اب تو بس ایک تعلق تھا جو دریا کے بہاؤ سا چلتا جا رہا تھا۔

سامیہ کے بالوں کی وہ لٹ اب تک علی کی انگلی کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ وہ چپ چاپ بنا پللیں جھپکائے کانوں میں اپنی ہی آواز کی بازگشت سنتا اس کو دیکھ رہا تھا۔ سامیہ نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بالوں کو اس کی دسترس سے آزاد کیا۔ بالوں کو ایک بار پھر جوڑے میں لپیٹتے وہ انھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

بڑی مدت گناہ کے موڑ پر پھری رہی ہوں میں مجھے آیا نہیں تیرے پھرنے کا یقین برسوں ”پروفیسر علی رضوی“ کی گاڑی کے پہیوں سے اڑتی دھول کب کی بیٹھ چکی تھی لیکن وہ اب تک وہاں کھڑی ان لمحوں کی گرفت میں تھی۔ فاران کی آواز پہ چونک کر اس نے تیزی سے اپنی آنکھوں سے بہتا پانی صاف کیا اور جلدی جلدی نوڈلز کو اسٹیر سے نکال کر ڈش میں اڈلایا لیکن اس دوران ایک بار بھی فاران کو مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے کام میں مصروف دیکھ فاران بھی پکں سے باہر نکل گیا تھا۔

”آپ رور رہی تھیں کیا؟“ فاران کے سوال پہ سامیہ کا کھانا سرد کرنا تھ بل بھر کور کا۔

اس نے ایک نگاہ فاران کو دیکھا جو اس کے بجائے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ تھا۔

”نہیں تو..... وہ گرم پانی کی اسٹیم سے آنکھیں جل رہی تھیں تو“ دھیمی آواز میں تردید کرتے وہ اس کے برابر کھڑی کر سی۔ آہ ریمپھ کی اور خود اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔ حالانکہ اس وقت کھانا کھانے کی چاہت نہیں تھی لیکن فاران کے اس سوال کے بعد وہ کھانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ دس منٹ میں گزرے دس سال کو کسی فلم کی کہانی کی طرح ذہن کے پردے پہ جلتے دیکھا تھا اس نے۔ وہ اس کی کہانی تھی اور اپنی زندگی کی کہانی کے ہر ایک سین کو ایک بار

تمہیں پتا ہے تا میری زندگی میں تمہاری کیا اہمیت ہے۔“ اس کے شانے پہ بڑی ایک آوارہ لٹ کو انگلی پہ لپیٹتے اس نے بے ساختہ کہا تھا۔

سامیہ کا چہرہ اب بھی بے تاثر تھا۔ اس کے لفظوں نے دل پہ اثر کرنا کیوں چھوڑ دیا تھا۔ ابھی یہ اعتراف اس کے وجود کو موم کر دینا تھا آج لگتا تھا وہ خود پتھر ہو چکی ہے با پھر اس کے لفظ بانی۔

”پہلے میں بھی یہی جھجھتی تھی“ میں تمہارے لیے سب سے ”اہم“ ہوں۔“ کیا ستم ہے آج ہر احساس اپنا معنی کھو چکا تھا۔ جذبات منہ موڑ چکے تھے۔ وہ واقعی پتھر ہو گئی تھی۔

”یہ سب میں.....“ ایک پل تو وہ سامیہ کی بات سن کر لا جواب سا اس کی شکل دیکھتا رہا اور پھر اس نے اپنی بات کے دفاع میں بولنا چاہا لیکن سامیہ نے اسے ٹوک دیا۔

”جانتی ہوں یہ سب تم میرے لیے کر رہے۔“ وہ جیسے اس کے دل کی ترجمانی کرتی اس کے ادھورے فقرے کو مکمل کر رہی تھی۔ ہونٹوں پہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ لاتے اس نے علی کی طرف دیکھتے آنکھوں ہی آنکھوں میں تصدیق چاہی تھی۔

”تمہیں لگتا ہے مجھے یہ سب آسائش دے کر تم میری ان تمام قربانیوں کا ازالہ کر رہے ہو جو تمہارا ہاتھ تمام کر میں نے دی ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میں ایک دن حالات سے تنگ آ کر تمہیں بیچ راہ میں چھوڑ کر واپس لوٹ جاتی۔“

یہ وہ احساس تھا جو پچھلے ڈیڑھ سال میں سامیہ کو علی سے ڈیڑھ صدیاں دور لے گیا تھا۔ اسپتال میں کھڑے اپنی جھنجھلاہٹ میں کہے اس کے ایک فقرے نے سامیہ کی زندگی سے سکون نکال باہر کیا تھا۔ محبت میں اعتبار نہ رہے تو ایک سر جرنی لفظ رہ جاتا ہے۔ سامیہ کی زندگی اس امر سے نکل کر تپتے صحرائیں جا کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جس محبت کو سنا بنائے اتنی مدت سے اس کی واپسی کی منتظر تھی، علی نے اس دن اپنے تین لفظوں سے سامیہ سے اس کی



نہیں چاہتی تھی اس کے اندر بدگمانی جنم لے۔ زندگی کے کسی موڑ پہ وہ اسے جھوٹا خیال کر کے اس سے دور ہو جائے اس لیے سامیہ نے فاران کو سب سچ سچ بتایا تھا۔ چھ سال کی عمر میں وہ ماں کی بات نہیں سمجھ سکتا تھا بارہ سال کی عمر میں سمجھ گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے سامیہ سے دوبارہ بھی اس موضوع پہ بات نہیں کی تھی۔ آج کئی سال بعد ان کے درمیان یہ موضوع ایک بار پھر زبردست بحث آیا تھا۔

”آپ چاہتی ہیں میں ان کے پاس چلا جاؤں؟“ فاران نے میٹ بال کا کلزامنہ میں ڈالتے سوال کیا۔ یہ اس کی پسندیدہ ڈش تھی جسے وہ ہمیشہ بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ لیکن اسے یاد نہیں تھا سامیہ کے ہاتھ سے کبھی کون سی ڈش اسے ناپسند تھی۔ مزا ان مسالوں میں تھا نہ اس ریسی میں جس سے کھانا پکا جاتا تھا۔ ذائقہ اس لمس کا تھا جو ایک ماں کی محبت کی صورت ان کھانوں میں کھل جاتا تھا اور جسے دنیا کے بڑے سے بڑے شیف چیلنج نہیں کر سکتے تھے۔

”اس سلسلے میں میں تم پہ کوئی دباؤ ڈالوں گی نہ ہی تمہیں ایسوشن بلک میل کروں گی۔ اس وقت تم بہت چھوٹے تھے۔ تمہیں میری ضرورت تھی۔ میں جانتی تھی تمہارے ڈیڈ تمہیں وقت نہیں دے پائیں گے اس لیے تمہیں اسے ساتھ لانے کا فیصلہ لیا تھا لیکن اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ سمجھ دار ہو۔ اچھے اور برے میں فرق سمجھ سکتے ہو۔ تم اگر جانا چاہو تو.....“

انسان میں خود غرضی فقط اپنی ذات کی حد تک قابل قبول ہوتی ہے۔ اسے اپنی اولاد پہ استعمال کرنا قابل فہم نہیں۔ یہ ایک منہ پی رو ہے اور سامیہ نہیں چاہتی تھی ان دونوں کا رشتہ ایک منہ پی رو کے بیجٹ چڑھ جائے۔

اس نے فاران کو کھلی آپشن دی تھی کہ وہ جب کبھی زندگی کے کسی بھی موڑ پہ اپنے باپ کے پاس واپس جانا چاہے وہ اسے روکے گی نہیں۔ بارہ سال کی عمر میں فاران نے اس سے لپٹ کر اپنا فیصلہ بنا

پھر خود پہ پہیلے وہ اسی اذیت سے گزری تھی جس اذیت سے ان لمحوں میں گزر چکی تھی جب اس نے علی سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا۔ درد آج بھی روز اول کی طرح شدید تر تھا۔ دھم آج بھی اتنا ہی ہر تھا۔

”یو آر مسگ ڈیڈ۔ رائٹ؟“ اس نے چوکی کر فاران کو دیکھتے اپنے دل کو ٹولا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلاتھا۔ نہ وہ خود نہ اس کی محبت۔۔۔۔۔ آج ایک بار پھر اس سے اتنی دوری پہ کھڑے رہ کر بھی وہ اس کے سامنے ریت کی دیوار بنی تھی۔

وہ ہمیشہ سے ایک انتہائی مضبوط شخصیت کی مالک تھی جس طرح علی سے شادی کے فیصلے پہ ڈٹ کر اس نے مڑنے کی بات نہیں دیکھا تھا بالکل اسی طرح اس سے جدا ہو کر وہ واپس نہیں چلی تھی۔ اس کے باوجود کہ اس کے بغیر زندگی گزارنا کس قدر دشوار تھا۔ لیکن دشواریاں تو اب اتنی جھیل چکی تھی کہ ہر بات آسان لگنے لگی تھی پھر بھی برسوں بعد اس کی ایک جھلک نے اس کی ساری ریاضت خاک میں ملا دی تھی۔ دل آج بھی اس کے لیے اتنا ہی بے قرار تھا۔ درو کی شدت سالوں بعد بھی اتنی ہی تھی۔ وقت نے کسی مرہم کا کام نہیں کیا تھا۔

سامیہ نے ایک گہرا سانس لیا۔  
”کیا تم مس کرتے ہو اپنے ڈیڈ کو؟ تمہارا دل نہیں چاہتا ان سے ملنے کو۔ اپنے ڈیڈ کے پاس جا کر رہنا چاہتے ہو گے تم؟“ انکار کیا تھا نہ اقرار۔ اس نے فاران سے سوال کیا تھا۔ گو وہ اسی موضوع سے بچنا چاہ رہی تھی پھر بھی وہی بات شروع ہو گئی تھی۔ وہ اب فاران کے دل کا مجید جانا چاہتی تھی۔ وہ بھی تو اس کہانی کا ایک کردار تھا۔ ایسا کردار جس سے اپنے جیسے کی قربانی لیتے اس کی مرضی تک نہیں پوچھی گئی تھی۔ کہانی کا سب سے اہم کردار۔ ان دونوں کے رشتے کا ایک حسین موڑ۔۔۔۔۔

وہ اس وقت صرف چھ سال کا تھا۔ اس عمر کی باتیں تو یاد بھی نہیں رہتی ہیں لیکن وہ کچھ نہیں بھولا تھا۔ خود سامیہ نے بھی اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ وہ



الفاظ کے سنایا تھا۔ آج ایک بار پھر وہ اسی سوال کی زد میں تھا۔ اس نے جواب کے بجائے سامیہ سے سوال کیا تھا۔ سامیہ نے اسے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔

”ڈیڈ نے آپ کو مجھے اپنے ساتھ لانے سے روکا نہیں؟“ وہ ایک بار پھر بات کو گھما کر دوسری طرف لے گیا تھا۔ سامیہ نے نفی میں سر ہلاتے اپنا جواب اس تک پہنچایا تھا۔

اسے یاد تھا سامیہ کی زبان سے اسے چھوڑنے کی بات سن کر علی، اس قدر دھچکا لگا تھا کہ وہ اس سے ایک لفظ بھی کہہ نہیں پایا تھا۔ سامیہ کا فیصلہ اپنی ذات کی حد تک تھا لیکن جب چھ سال کے معصوم فاران نے گھر سے نکلنے ماں کا دہنایا تھا تو وہ منجھڑ ہو گئی تھی۔ اس ایک لمحے میں اس کا دل جس طرح کھلتا تھا اگر علی اسے روک لیتا تو وہ یقیناً فاران کی خاطر پلٹ آتی۔ لیکن وہ خاموش رہا تھا یہاں تک کہ جب سامیہ نے علی کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا اس وقت بھی وہ سر جھکائے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا رہا تھا۔ اس کی خاموشی کو رضامندی جان کر وہ اپنے کچے کنبے کو بھی ساتھ لے آئی تھی۔

بالکل اسی طرح خالی ہاتھ جیسے دس سال پہلے وہ اپنے باپ کے گھر سے نکل کر علی کے ساتھ آئی تھی ایک بار پھر اس کا دامن خالی تھا۔ حیدر سعید نے اسے پابند کیا تھا علی نے نہیں۔ وہ اگر چاہتی تو علی کی تمام دولت، ایک ایک پانی ساتھ لاسکتی تھی۔ اسے یقین تھا وہ اس کا ہاتھ کبھی نہ روکتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس نے صرف خود کو اس کی زندگی سے نکالا تھا۔ وہ اسے اس کے سارے پیسے کے ساتھ اکیلا چھوڑ آئی تھی جس کی خواہش میں اتنے سال اس نے تنہائی کا عذاب جھلا تھا۔

پہلی بار سامیہ کا ہاتھ علی نے تھاما ہوا تھا دوسری بار فاران نے۔ پہلی بار آسرا محبت تھی دوسری بار یہ غلامتائی پر کیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر اسی موڑ پر آ گئی تھی۔ نئے سرے سے ہر ایک جدوجہد کا آغاز ہوا تھا

لیکن وہ اس بار بھی کھلے آسمان تلے نہیں کھڑی تھی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنے لیے ایک اسکول میں ملازمت اور لیڈرز ہوٹل میں رہائش کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور پچھلے ڈگریوں کو محض لگ بھگ بھی جانے تعلیم ضائع نہیں جاتی۔ جس ڈگری کا استعمال لاکھ چاہنے پر بھی اسے علی نے نہیں کرنے دیا تھا دس سال بعد اپنی اسناد کی بنا پر اسے شہر کے ایک بہترین اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس کے پاس تجربہ نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کی شخصیت اور تعلیمی قابلیت نے اسے مسئلہ بننے نہیں دیا تھا۔ اسے کسی بہت ہائی پروفائل زندگی کی طلب نہ تھی۔ دولت نے اس سے اتنا کچھ چھین لیا تھا کہ اب تو اس کے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ خونی رشتے ہوں یا محبوب شوہر۔ اس دولت کی چاہ نہ سب کو ہی اس سے دور کر دیا اور پھر وہ خود ہی اس سب سے دور ہو گئی۔ اسکول کی ملازمت سے اتنی آمدن ہو جاتی تھی کہ وہ ایک باعزت زندگی گزار سکتی تھی۔ اپنی اور اپنے بچے کی ضروریات پوری کر سکتی تھی۔

”دیڈ ڈیڈ ہیں بڑے اسارٹ۔ بہت کمال کی پرسنٹی ہے۔“ وہ باقاعدہ کھلکھلا کر بولا تھا۔ ”تم ملے ان سے؟“ سامیہ کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

”کانج لائبریری میں نیوز پیپر دیکھ رہا تھا دو دن پہلے، پرنس بیج یہ کچھ انڈسٹریلسٹس کے ساتھ ان کی بھی پچھڑی۔ کئی ایک پیو میں گئے ہوتے تھے وہ۔“ سامیہ کا کار کا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔

”تم اگر ان کے پاس واپس چلے جاؤ تو تمہاری زندگی بہت بہتر ہو سکتی ہے۔“ فاران کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”میرا مطلب میرے محدود وسائل میں تو بس اتنا ہی ہو پانے گا۔ وہ تمہیں بائز اسٹڈیز کے لیے باہر بھیج سکتے ہیں۔ بہت بڑا بزنس ہے ان کا اور تم اس کے اکلوتے وارث۔“

سامیہ ٹیکسائل کی ترقی کا تیزی سے ادراک تھا گراف اس کی نظروں سے اوجھل تو نہیں تھا۔ علی کی



ایسے مقام پہ پہنچا چکا تھا جہاں سے اب اسے آگے ہی بڑھنا تھا اور وہ بڑھ رہا تھا۔ لی ایچ ڈی کے بعد علی نے بطور پروفیسر یونیورسٹی جوائن کی تھی۔ لیکن سامیہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ان دنوں وہ شہر کی بہترین یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ تھا اور یہی یونیورسٹی تھی جہاں انمول بڑھ رہی تھی۔

”مئی آپ شاید بھول رہی ہیں میں اس انسان کا بیٹا ہوں جس نے ایک چھوٹے سے محلے کے ٹوٹے پھوٹے مکان سے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کر کے فقط اپنی محنت اور ہمت کے آسرے نیک نسل انڈسٹری میں اپنی شناخت بنائی ہے۔ ان کے پاس میری طرح سہولیات نہیں تھیں۔ میری طرح ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور طاقت ور ماں نہیں تھی۔ پھر اگر وہ اس دنیا میں اپنا مقام خود بنا سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟“ وہ دونوں کے مارے ضدی اور اپنی بات پہ قائم رہنے والے لوگوں کی اولاد تھا۔ خودداری اس کے جینز میں تھی۔ پھر فقط اپنی ضرورت کا سوچ کر پیچھے ہٹ کر دیکھنا خود غرضی کی بدترین مثال ہوتا۔ وہ باپ کی محبت میں نہیں اس کے پیسوں کی خاطر اس کے پاس واپس چلا جاتا تو تمام عمر اپنی ہی نگاہوں میں معتبر نہ رہتا۔

”میں تو بس اتنا جاہتھی تھی کہ اپنی خود غرضی میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ کروں۔“ سامیہ نے اپنا موقف کلیئر کرنا چاہا۔ پہلی بار اسے لگا تھا فاران کی بات کا مفہوم صرف وہ نہیں جو بظاہر سمجھ میں آ رہا ہے۔ وہ اسے علی کی مثال دے کر کیا سمجھانا چاہ رہا تھا؟ کیا بیچ دے رہا؟ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

”اپنی غرض کے لیے آپ کو اس ایچ ڈی اکیلا چھوڑ دوں۔ ایسی خود غرضی مجھ سے نہیں ہوگی۔ اس کا لہجہ دھوکہ تھا جیسے وہ ہر بات سوچ سمجھ کر طے کر چکا ہے، فیصلہ لے چکا ہے۔“

”ویسے اگر ڈیڈ آپ کو منانے آجائیں تو کیا آپ ان کے پاس واپس چلی جائیں گی؟“ سامیہ

کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔ ایک گہری سانس لیتے وہ میز پر پڑے خالی برتن اٹھانے لگی تھی۔ فاران کو ماں کی

زندگی سے نکل کر اس نے کبھی اس ٹوہ میں وقت ضائع نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کے اپنے سر پہ مسائل کا انبار تھا۔ فاران کی اسکوئنگ، اس کی ضروریات اور سب سے بڑھ کر ایک محفوظ علاقے میں گھر جہاں وہ اپنے بچے کے ساتھ پرسکون زندگی گزار سکے۔ اس دوران اس نے مستقل کالج میں لیکچراری پوسٹ کے لیے کوشش جاری رکھی تھی۔ چند سال بعد اسے ایک گز کالج میں اردو پیکچرار کے طور پر جاب مل گئی تھی جس کے بعد وہ ہوسٹل سے اس گرانے کے مکان میں شفٹ ہو گئی تھی۔ اس کا یہ چھوٹا سا پورشن ان دونوں کی ضرورت کے لیے کافی تھا پھر پھر بچے مالک مکان کی فیملی کی بدولت انہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔

یہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے جب فاران کے ساتھ ایک کتابوں کی دکان میں اس کی کتابیں خریدتے سامیہ کی نگاہ ایک کتاب کے سرورق پر لکھے نام پہ چاٹھ رہی تھی۔ وہ ”فرہاد“ کے نام سے تھی تھی اور اسی تجسس میں اس نے وہ کتاب فلیٹ سے اٹھائی تھی۔ گو یہ نام علی کا تھیں لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا اسے استعمال نہ کر جائے۔ سامیہ کو بھی یہی لگا تھا۔ کتاب میں لکھی پہلی لکھ پڑھتے سامیہ کے لیے یہ راز نہیں رہا تھا کہ وہ کتاب علی کی ہی تھی۔ اس دن اس نے وہ کتاب خرید لی تھی لیکن اس کے متعلق فاران سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ علی کے اس شوق کے متعلق نہیں جانتا تھا۔ اس کے بعد پے در پے علی کی تین حزیں کتابیں مارکیٹ میں آئیں اور شہرت کی نئی داستان رقم کی۔

اس وقت سامیہ نے علی کے متعلق جاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ یہ سب فقط اپنے کالی نام سے شائع کروا رہا تھا یعنی یہ بات علی، سامیہ اور پبلشر کے علاوہ کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس نے بزنس سے ہٹ کر ایک بار پھر آگے بڑھنا شروع کیا ہے۔ اسے کاروبار کو وہ بس اب سرسری ہی دیکھتا تھا۔ دس سال پہلے وہ کاروبار کو ایک



خاموشی نے اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

☆☆☆

”انمول بہت معصوم ہے۔“ وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

”متفق“ فی الفور تصدیق کی گئی تھی۔

”میں اس سے بہت ”محبت“ کرتا ہوں۔“

انداز جتنا ہوا سا تھا۔

”میرا خیال آپ کو یہ سب مجھ سے نہیں انمول سے کہنا چاہیے۔“ جواب اسی انداز میں آیا تھا۔

”مجھے فلسفیانہ گفتگو نہیں آتی اس لیے دو نوک بات کرتا ہوں۔ آپ کی مداخلت میرے گھر کا سکون برباد کر رہی ہے۔“ وہ لمحہ بھر خاموش ہوا اور پھر بڑی رکھائی سے بولا تھا۔

”ہم اپنے سب سے بڑے دشمن خود ہیں قاسم۔ بھلا کسی غیر کی کیا اوقات کہ وہ ہماری خوشیوں کو چھین کر لے جائے۔“ اس بار انداز استہزاء تھا۔

”انمول کے بدلتے رویے کا سر آپ سے جڑا ہے۔ جب سے اس کی ملاقات آپ سے ہوئی ہے اس کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ بدل گئی ہے۔“ دل کی شکایت زبان تک آچکی تھی۔

کچھ عرصے سے وہ انمول کو خود سے دور محسوس کر رہا تھا۔ اس کے رویے سے پریشان تھا لیکن اس نے اسے انمول کی مصروفیت اور روشن زندگی سے تھکاؤ گردانا تھا۔ لیکن پچھلے چند روز میں اس نے انمول کی زبان سے جس طرح شکوے شکایات کا انبار سنا تھا اس نے قاسم کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکا دی تھی۔ وہ بھی ایک عام مرد تھا جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے بجائے شکوہ کرنے والی بیوی سے ٹالاں ہو جاتا ہے۔ اسے انمول کا خود کو الزام دینا برا لگا تھا۔ اس نے انمول کے سامنے اپنا دفاع کیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے اندر آئی تبدیلی کو غیر کی دخل اندازی سمجھنے لگا تھا۔

انمول کے ساتھ پروفیسر علی رضوی کو دیکھ کر اس کا چونکنا فطری تھا۔ علی رضوی کوئی عام آدمی نہیں

ہے بلکہ قاسم سے اس کا تعارف اس ملک کی ایک قابل قدر شخصیت کے طور پر تھا۔ کاروباری دنیا میں یہ شخص جس بلندی پر کھڑا تھا اور اس بلندی تک پہنچنے کا سفر اس نے جس مختصر عرصے میں طے کیا تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ پتا نہیں وہ کتنوں کی انسپائریشن تھا، باعثِ رشک تھا۔ جس شخص سے قاسم کو ایک بار ملنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرنا پڑا تھا وہ محض ٹائر پیچھے ہونے پر انمول کو گھر تک ڈراپ کرتا ہے۔ سامعہ ٹیکسٹائلرز کا ڈائریکٹر ہو یا یونیورسٹی کا ڈیپارٹمنٹل ہیڈ۔ انمول کو اتنی توجہ اور احترام دینا دونوں ہی صورتوں میں قاسم کے اندر شبہات پیدا کر رہا تھا۔ بے اختیار اس کے اندر حسد نے سراٹھایا تھا۔

کل انمول سے جھگڑنے کے بعد ان دونوں کے درمیان بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ساری رات وہ ایک منٹ سو نہیں سکا تھا کیونکہ دھیان بار بار ایک ہی طرف جا رہا تھا۔ اور جتنا اس متعلق سوچتا تھا اتنا ہی اپنا شک یقین میں بدلتا محسوس ہوتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ آج خود کو پروفیسر رضوی کے پاس آنے سے روک نہیں پایا تھا۔ اس نے سچ عام میں ان کے دفتر فون کر کے اپنا منٹ مانگی تھی۔ دس منٹ بعد دفتر سے ان کی سیکرٹری نے اسے کال بیک کر کے شام کی چائے پر مدعو کیا۔ وہ جانتا تھا اس پر یہ مہربانی انمول کی بدولت کی گئی ہے۔ تبدیلی کے احساس کے ساتھ بدگمانی کچھ اور بڑھی تھی۔ سامعہ ٹیکسٹائلرز کے ہیڈ آفس میں انہوں نے اپنے عالی شان کیمین میں اس کا استقبال خاصے پر جوش انداز میں کیا تھا۔ لیکن قاسم کے رویے میں بے تحاشا سرد مہری تھی۔ رسمی دعا سلام کے بعد اس نے بلا تمہید گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”آپ نے اس سے پوچھا نہیں وہ کیوں اور کس لیے بدل گئی۔“ وہ کوئی اہم نہیں تھے۔ قاسم کے اکھڑے ہوئے رویے نے انہیں چونکا دیا لیکن انہوں نے قاسم کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیا تھا۔ وہ ان سے کوئی کاروباری واسطہ نہیں رکھتا تھا اور



”میں سمجھا نہیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“  
کوئی ترویید نہ تائید۔ یہ وہ جواب نہیں تھا جس کی قاسم کو توقع تھی۔

”قاسم یہ جو محبت ہوتی ہے نا انسان کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے لیکن ایک ہی وقت میں یہ ہماری سب سے بڑی کمزوری بھی ہوتی ہے۔ انمول واقعی انمول ہے اس کی محبت کو اپنی طاقت ہی رہنے دینا بھی اپنی کمزوری مت بنانا ورنہ باقی کی زندگی میری طرح تنہا پچھتانا پڑے گا۔“ وہ بڑے کرب سے گویا ہوئے تھے۔

”آپ کی باتیں مجھے الجھا رہی ہیں علی صاحب۔“ بے چینی اب حد سے بڑھنے لگی تھی۔  
”تمہاری ابھمن اور بدگمانی دونوں دور ہو جائیں گی۔“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا حالانکہ اپنے اندر اضطراب اور بھی گہرا ہوا تھا۔

”پچھلے کئی سال سے یہ میرا واحد اثاثہ ہے۔ میرے لیے اس سے قیمتی شے اور کوئی نہیں کیونکہ اس کے صفحات اس انسان کے آنسوؤں سے تر ہیں جسے میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ چاہا ہے۔ اس کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا میں کہ اسے ہی پیچھے چھوڑ گیا۔ دس سال بعد جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، میں اسے کھو چکا تھا۔“ اپنی میز کی دراز سے ایک ڈائری نکال کر قاسم کی طرف بڑھاتے انہوں نے دل کٹتی سے کہا تھا۔

قاسم عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ یہاں اپنا سوال لے کر آیا تھا لیکن سامنے والا بھی ساکلی ہی لگتا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر ڈائری تھامتے وہ شدید ابھمن کا شکار تھا۔ اگر حقیقت جان جاتا تو ترس کھاتا اپنے سامنے بیٹھے اس بے تحاشا دولت مند انسان پہ جس کا کاسہ رشٹوں سے خالی تھا۔

”میں نہیں جانتا تم انمول سے کتنی محبت کرتے ہو پھر بھی مجھے حیرانی ہے کہ تم نے اس کی آنکھوں میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں نہیں دیکھیں۔ مایوسی اور رنجش نہیں دیکھی۔ میں نے انمول کے دل

اچانک ملاقات کا وقت مانگ رہا تھا وہ بھی کل کی ملاقات کے محض چند گھنٹوں بعد۔ انہیں قاسم کا سنجیدہ اور بے تاثر سا چہرہ بھی خوب یاد تھا جہاں اس کی بیوی کی مدد کیے جانے پہ احسان مندی مفقود تھی اس نے ایک بار بھی اپنے دروازے پہ کھڑے شخص کا شکر یہ ادا کیا تھا نہ ہی اسے اپنے گہر مدعو کیا تھا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ وہ آداب میزبانی سے واقف نہیں تھا۔ زندگی میں اتنے چہروں پہ لکھی تجارت پر بڑھی تھیں کہ اب ان کے لیے سامنے بیٹھے شخص کی گفتگو کے اصل معنی سمجھنا ہرگز مشکل نہیں تھا۔

”میں اسے کھوتا نہیں چاہتا تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے شاید بہت دیر ہو گئی ہے۔“

مرد کو عورت کی ناراضی اتنی تکلیف نہیں دیتی جتنی یہ سوچ مار دیتی ہے کہ اس کے دل میں اپنا مقام کھو چکا ہے۔ اس سگھاس پہ اب وہ نہیں بلکہ کسی دوسرے کی اجارہ داری ہونے جارہی ہے۔ شادی کے بعد وہ عورت کو ہی نہیں اس کے جذلوں کو بھی اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ ان میں تھوڑی سی رد و بدل بھی ناقابل برداشت تصور کرتا ہے۔ پھر یہاں تو اپنے سامنے بیٹھے ایک اچھے کامیاب شخص کی اپنی حیثیت سے ہونے والی مطابقت ہی اس کے اندر احساس کسری کو بڑھانے کے لیے بہت تھا۔ اپنی خود ساختہ سوچ کو عملی شکل دیتے اس نے فوری ایکشن لینے پر فیصلہ رضوی سے بات کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ بدگمانی اپنی شریک حیات سے نہیں تھی بلکہ غیر کی مداخلت سے تھی۔ گلہ بپکنے والے سے نہیں تھا بلکہ رنجش بھگانے والے سے تھی۔

”مجھے لگتا ہے دیر نہیں ہوئی قاسم۔ آگاہی نے بہت جلد آپ کے دل پہ دستک دی ہے۔ آپ کو میری طرح اس مقام تک پہنچنے میں عشرے نہیں لگے۔“ اس کی غلط فہمی جتنی جلدی دور ہو جانی اتنا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ جو بات سرے سے تھی ہی نہیں اس کی ترویید میں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔



بات کرنے کے لیے بیسیوں بار سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں میری کسی غیر ضروری بات سے اس کا وقت ضائع تو نہیں ہوگا۔ کبھی ہم گفتگوں بے مقصد باتیں کیا کرتے تھے لیکن آج کام کی بات کرنے سے پہلے وقت دیکھنا پڑتا ہے۔ اسے لگتا ہے وہ یہ سب میرے لیے کر رہا ہے۔ میری خوشی کے لیے کر رہا ہے کیونکہ مجھے اس دنیا کی ہر آسائش دینا اس کی اولین ترجیح ہے۔ یہ جانے بغیر میری خواہش اس کی محبت ہے۔ وہ لطیف جذبات ہیں جنہیں اپنے شعروں میں ڈھال کر بھی علی نے میرے دل کے دروازے پہ دستک دی تھی۔ یہ کیسی محبت ہے علی جس نے میرے حے میں تنہائی اور تمہارے مقدر میں محکم لکھ دی ہے؟

کاش وہ وقت لوٹ کر واپس آسکتا جب زندگی کا حسن کاغذ کے نوٹ نہیں ہماری چاہت ہوا کرتے تھے۔

☆☆☆

عجیب لڑکی  
وہ شب کے گھر بے لباس میں تھی  
تمام لکھوں کے سب رویوں کو جانتی ہے  
وہ سوچتی تو بہت سلیقے سے ساری الجھن سلجھ سی جاتی

وہ میرے ماتھے پہ اپنی انگلی سے موت لکھتی  
میں مر ساجاتا  
وہ میرے ماتھے پہ اپنی انگلیوں سے زندگی کو  
کھرچنے لگتی

میں جی سنا جاتا  
وہ بات کرتی تو اس کے اونچے لفظ  
تلیوں کی طرح اڑنے لگتے  
میں تلیوں کو پکڑنے لگتا

وہ اپنے اندر ہزار موسم، ہزار رنگ، ہزار خوشبو  
لیے ہوئے ہے

مگر بظاہر وہ اپنے لہجہ کو اپنے چہرے کو  
اپنی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں کو عام لوگوں کی  
طرح سے رکھتی

میں تمہارے لیے جذبات محسوس کیے ہیں۔ جب بیٹھے بیٹھے وہ ایک ہی منظر کو خالی نظروں سے نکلے جاتی ہے اس وقت اس کی ٹھہری ہوئی آنکھوں میں مجھے سامیہ کی جھلک دھتی ہے قاسم۔ اسے سامیہ مت بنے دو۔ اسے سامیہ کی طرح اپنی زندگی سے دور مت جانے دو۔“ دعا فریاد بن کر یوں سے نکلی تھی۔ دل بوجھل تھا اور زندگی اس سے بڑھ کر بوجھل اور طویل۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے وہ حد درجہ بے چین تھے۔

”سامیہ کون؟“

”یہ ڈائری تمہارا اس سے تعارف کروا دے گی۔“ اپنی آنکھوں کو دو انگلیوں سے مس کر انہوں نے ان میں آئی نمی کو صاف کیا۔ قاسم حیرت سے بھی انہیں اور کبھی ہاتھ میں پکڑی اس ڈائری کو نکلتا جس کے پتوں پہ لکھی داستان پڑھنے کا بحسب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

آخر ایسا کیا لکھا تھا اس ڈائری میں اور ان سب باتوں سے انمول کا کیا تعلق بن رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر علی رضوی سے پوچھتا چاہتا تھا لیکن اس وقت ان پہ جودل گرجی حاوی تھی اس کے بعد خود میں اتنی ہمت نہیں لایا یا کہ مزید کوئی سوال کرے۔

ڈائری اٹھائے چپ چاپ وہ ان کے کمرے سے نکل آیا تھا۔

☆☆☆

ڈیر ڈائری!  
جیسے جیسے زندگی میں خوش حالی داخل ہو رہی ہے ایسا لگتا ہے خوشی رخصت ہوتی جا رہی ہے۔ علی کا کاروبار دن بے دن بڑھتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ اس کی مصروفیت بھی۔ میری سونی کلانیاں سونے کی چوڑیوں سے بھر گئی ہیں لیکن میرا پہلو سونا ہو گیا ہے۔ کبھی جس شخص کی صبح شام میں ہوا کرتی تھی آج اس کے پاس میرے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ علی نے خود کو کام میں اتنا مصروف کر لیا ہے کہ مجھے خود اس سے اپنے لیے وقت مانگتے پچھا ہٹ ہوتی ہے۔ اس سے



وہ شب زدہ سی عجیب لڑکی!!!!

وہ دونوں اس وقت لاؤنج میں تھے جب کھانے کے بعد قاسم ہمیشہ کی طرح صوفہ پہ بیٹھائی دی لگائے اپنی کافی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جب سے واپس آیا تھا انمول اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی پیتی تھی نہ ٹی وی دیکھتی تھی بلکہ اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ اب بھی اس نے قاسم گنگ وہاں رکھا اور اپنی کافی لے کر کمرے کی طرف قدم بڑھا لے لیکن قاسم نے اسے روک کر اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھنا نہیں چاہتی تھی یہ اس کے چہرے پہ لکھا تھا لیکن قاسم کی آنکھوں میں التجا تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی جب قاسم نے بات کا آغاز کیا۔

”مجھے احساس ہے ماضی میں بہت غلطیاں کر چکا ہوں اور تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے اپنے احتجاج سے بہت جلد مجھے میری غلطیوں کا احساس دلادیا۔“ کہتے ہیں صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں جیتے۔ پھر یہ بھول تو نادانستہ تھی۔ انجانے میں ہوئی تھی۔ محبت، خیال، پروا سب کچھ تھا بس جتانے کی ادا نہیں تھی اور جب احساس ہوا تھا تو پہل بھی اسی نے کی تھی کیونکہ انا انہوں سے بڑھ کر نہیں ہوتی ہے۔

”حالانکہ میں ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن کیا کروں انسان ہوں ہمہ وقت ایک سی مضبوط نہیں رہ سکتی۔ میں نے بہت کوشش کی زبان پہ شکوہ نہ آئے پھر بھی۔“

چھپلے دو تین دن سے ان دونوں کے درمیان بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کی بنیادی وجہ انمول کا ناراض رویہ تھا۔ وہ جب چاہے اس کے سب کام کرتی لیکن اس سے کچھ بھی نہ اس کی کسی بات کا جواب دیتی۔

قاسم کے اندر جہاں بدگمانی کی دھند اسی دن چھٹ گئی تھی جب علی رضوی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی دی ہوئی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے ان کی زندگی کے نشیب و فراز کا پتہ چلا تھا۔ ڈائری واپس کرتے اس نے ان سے انتہائی معذرت کی تھی اس

امید کے ساتھ کہ وہ انمول سے کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ پہلے ہی خفا سی قاسم کی غلط فہمی جان جاتی تو مزید بدگمان ہو جاتی۔ پروفیسر رضوی نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ گفتگو ان کے درمیان راز رہے گی۔ ساتھ ہی اسے ایک بار پھر یہ نصیحت کی تھی کہ انمول کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ وہ بہت حساس ہے اور کسی حد تک آئینہ دل پرست بھی۔ ایسے لوگ محبت کے متلاشی ہوتے ہیں نہ ملنے پہ امید کی طرح خود بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔

”تم شکایت نہ کرتیں تو مجھے بھی احساس نہ ہوتا کہ میں تمہارے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔“ اور یہ سچ تھا کہ اس کے بدلے روئے کو دیکھ کر بھی قاسم نے اس سے بھی سوال نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یہ اس کا فرض تھا کہ انمول سے اس کی پریشانی پوچھتا اور اس کا مدد کرتا۔ وہ اگر آج بھی خاموش رہتی تو قاسم کے رویے میں تبدیلی نہ آتی جو انمول کو حیران در حیران کر رہی تھی۔

وہ معذرت کر رہا تھا اور انمول کا سر جھک گیا تھا۔ اس سے لاکھ گلے تھا لیکن ایسا تو بھی نہیں چاہتا تھا۔ رشتے جھکانے سے کمزور ہوتے ہیں اور اس کی یہ بھی خواہش نہیں تھی کہ قاسم کو جھکا ہوا دیکھے۔

”ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمہاری سوچ مجھ سے الگ ہے۔ میں اور بوائے نہیں ہوں، انمول اور نہ کبھی بن سکتا ہو لیکن دل میرے سینے میں دھڑکتا ہے جو ہرگز رتے دن مجھے یہ باور کراتا ہے کہ تمہارا میری زندگی میں بہت خاص مقام ہے۔ تم ایک اچھی بیوی ہی نہیں ایک بہت اچھی انسان بھی ہو جتنے اپنا شریک سفر پا کر میں خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھتا ہوں اسی لیے میں چاہتا ہوں تمہیں دنیا کی ہر خوشی اور وہ تمام سکھ دوں جن کی تم مستحق ہو۔“ وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جب قاسم نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

”لیکن میرے لیے دنیا کی ہر خوشی آپ ہیں قاسم۔ آپ کی توجہ، آپ کا وقت، آپ کا میری طرف دیکھنا دنیا کی ہر آسائش سے بڑھ کر ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہم ایک ٹیکس لائف گزاریں؟ دنیا کے ساتھ



دوسرے پے اعتماد، بھروسہ اور محبت ہمیشہ قائم رہے گا کیونکہ جہاں یہ ہوگا شکوے زیادہ دیر جگہ نہیں بنا پائیں گے۔

انہیں بھی آج ایسی ہی ایک زندگی کی شروعات کرنی تھی جہاں ہر خطی کے بعد منانے کی گنجائش باقی رہ جائے۔

☆☆☆

انسان کو بچی خوشی اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب دل مطمئن ہو۔ وہ بھی آج بے تحاشا خوش تھی۔ مدت بعد مین کی مراد برآئی تھی۔ قاسم سے ہر شکایت دور ہو گئی تھی۔ انمول کے لیے یہ وقت بے حد انمول تھا۔ قاسم کو اس کی پروا تھی یہ احساس ہی روح کو شاداب کرنے کے لیے بہت تھا اس پر یہ انکشاف کہ وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے اس خیال کے ساتھ صبح سے وہ بات بے بات مسکرا رہی تھی۔

آج اس کا موڈ بے حد شان دار تھا ایسے میں قاسم کو آفس بھیج کر اس نے آج اس کی پسند کا کھانا پکانے کا ارادہ کیا۔ میٹھے کی فرمائش وہ خود کر کے گیا تھا۔ جس نے انمول کو حیران ہونے کے ساتھ ساتھ، خوش بھی کیا تھا۔ مہینوں بعد اس نے آج کچن میں پوری لگن اور توجہ سے کام کیا تھا۔ جس طرح شادی کے بعد وہ قاسم کے لیے لپٹل کھانا تیار کرتی تھی۔ قاسم کا پسندیدہ گاجر کا علوہ تیار تھا جب اسے فرانی کرتے اچانک انمول کو سالمیہ کا خیال آیا۔

بچپلے بپتے وہ اس کے گھر اس کی طبیعت چتا کرنے آئی تھی اور اس سے وعدہ کرنے کے باوجود انمول اس سے ملنے نہیں جا سکی تھی۔ اپنی انجمنوں میں چھٹی اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ابھی قاسم کے آنے میں کافی وقت تھا یہی سوچ کر اس نے سالمیہ کا وہ باؤل نکالا جس میں اس دن انمول کے لیے سوپ آیا تھا۔ اس باؤل میں علوہ ڈال کر وہ اس کی طرف چلی آئی۔ اس وقت وہ گھر پہنچی ہی تھی جبکہ قاران دوستوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے باہر گیا ہوا تھا۔ حسب معمول اسے دیکھ کر سالمیہ کے چہرے پہ وہ مسکراہٹ نہیں آئی تھی اور یہ بات انمول نے وہاں آتے ہی محسوس کی

چلنا مجبوری ہے لیکن یہ سفر اکٹھے بھی تو ملے کیا جاسکتا ہے۔ کیوں دریا کے دو کناروں کی صورت چل رہے ہیں جو ساتھ تو ہمہ وقت ہیں لیکن پاس نہیں۔“ غیر ارادی سے انداز میں ہمیشہ کی طرح انمول کا سر اب قاسم کے کندھے پہ ٹکا تھا۔ ایک ہاتھ میں کافی کاکٹ تھا۔ دوسرا بازو اس کی کمر کے گرد مائل کرتے قاسم کا مکمل دھیان اس کی طرف تھا۔ کمرے میں اب بھی ٹی وی میں آن ایئر ایک ٹاک شو کی دھیمی سی آواز گونج رہی تھی لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔

”اب سے جو تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا بس میری ایک شرط ہے۔“ سرگھوڑا سا جھکاتے اس نے انمول کے ماتھے کو چوما تھا۔ ”مجھے میری پہلے والی انمول واپس چاہیے جو میرے گھر آنے پہ سایہ بن کر میرے گرد منڈلایا کرتی تھی۔ مجھے وہ ساری نان اسٹاپ بے ٹکی باتیں سننی ہیں جنہیں تم میرے کندھے پہ سر رکھے دہرایا کرتی۔“ اس نے سراٹھا کر دیکھا۔ قاسم کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”میری باتیں بے ٹکی لگتی تھیں آپ کو؟“ انمول کی ناراضی پہ قاسم بے اختیار ہنسا تھا۔ ”نہیں اچھی لگتی ہیں کیونکہ تم اچھی لگتی ہو مجھے بھی اور میرے اس گھر کو بھی۔ تمہاری خاموشی نے اس چار دیواری کو ہی نہیں مجھے بھی ویران کر رکھا ہے۔ ایک بار تمہاری چپکار سے اپنے اندر زندگی کا احساس محسوس کرنا چاہتا ہوں انمول۔“

کچر میں لپٹے اس کے بالوں سے نکلے ایک پریشان لٹ کو انگلی سے چھپڑتے پہلی بار وہ اس کی دھڑکنیں بڑھا رہا تھا۔ آج کئی سال کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھ رہے تھے۔ جو گزر چکا تھا وہ نظر کا دھوکا تھا۔ جس کا آغاز ہو رہا تھا وہ زندگی تھی۔ اور آج زندگی مسکرا رہی تھی۔ ریشمیں، شکایتیں، غلط فہمیاں، ناراضی سب اپنی جگہ۔ کل بھی ہوں لی کہ یہ زندگی کا حصہ ہیں لیکن ایک



شناخت۔“ بے اختیار سرتھامتے وہ حیرانی سے بولی تھی۔  
اس کے بجائے خود سے سوال کر رہی تھی۔  
”سب تو تمہیں وہ خود ہی بہتر بتا سکتا ہے۔“  
وہ عجیبہ لہجے میں بولی تھی۔

”سہی باجی آپ انہیں کیسے جانتی ہیں؟“ انمول  
نے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھتے سوال کیا تھا۔  
”اس سے ملو گی تو یہ سہی پوچھ لینا کہ“ سامیہ علی  
رضوی“ اسے کیسے اور کتنا جانتی ہے۔“ اور اس  
انکشاف کے بعد انمول کو مزید کسی سوال کی ضرورت  
تھی نہ گنجائش۔ وہ حیرت زدہ سی سامیہ کے بے تاثر  
چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ٹھہری ہوئی آنکھوں  
میں ابھرتی تھی، اس کے ہونٹوں کی کیکھاہٹ بن کہے  
بھی انمول کو جدائی کی داستان سار ہی تھی۔

☆☆☆

”آپ ہی ”فرہاد“ ہیں سر۔“ سچ جاننے کے  
بعد پھلی رات بھی اس نے بڑی مشکل سے گزاری  
تھی۔ سچ یونیورسٹی آکر وہ سب سے پہلے پروفیسر  
رضوی کے پاس آئی تھی اور اندر آتے ہی ان سے  
سوال کیا تھا۔ ”کیوں چھپائی آپ نے مجھ سے اپنی  
سچائی؟“ وہ نہ صرف شاک بھی بلکہ تالاں بھی تھی۔  
علی کا ذہن الٹی گنتی گنتا کی سیال پیچھے چلا گیا  
تھا۔ سامیہ کی وہ تمام برکتیں یاد آتی تھیں اور وہ کب  
یاد نہیں آتی تھیں؟ ہر آتی جالی سانس کی طرح جب  
جب سامیہ یاد آتی اس کی شکوہ کناں آنکھیں بھی یاد  
آتیں۔ ان آنکھوں میں ٹھہری شکایتیں بھی یاد آتیں  
جنہیں وہ بڑھ کر بھی نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔  
اس وقت تو ذہن پہ بس ایک ہی دھن سوار تھی۔  
پیپر۔ اور پیپر۔ بہت سارا پیپر۔

حیدر سعید کی ذلت اس کے لیے چیلنج بن گئی تھی۔  
اس لیے اس نے وہ کرنے کی ٹھانی تھی جو ہر کسی کے بس  
کی بات نہیں تھی کیونکہ محبت میں وقا بھانا بھی تو سب  
کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ سامیہ نے اس کی خاطر جو  
زہر پیا تھا اسے امرت بنانا اس کی ذمہ داری تھی لیکن اس  
ساری تک و دو کا نتیجہ اس کی امید کے برعکس نکلا تھا۔

تھی۔ انمول کے لیے اس کا یہ انداز حیران کن تھا کیونکہ اس  
سے پہلے اس نے اسے ہمیشہ سکرانے دیکھا تھا۔ انمول  
کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی سب  
خیریت تو ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ سوال کرنی سامیہ  
نے اسے مخاطب کیا تھا۔

”تو تمہیں ”فرہاد“ مل ہی گیا۔“ اس نے  
حیرت سے سامیہ کی جانب دیکھا لیکن وہ اسے نہیں  
بلکہ سامنے میز کے گلاس ڈور سے نظر آتے آسمان کو  
دیکھ رہی تھی۔

”جی؟“ انمول یک دم چونکی۔

”بالکل بھی نہیں بدلا وہ۔“ آج بھی ویسا ہی  
ہے۔ ایک نگاہ میں مبہوت کر دینے والا شاید اس  
سے بھی زیادہ پیٹنڈم ہو گیا ہے۔“ انمول کا سوال جیسے  
اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ وہ اب اپنی ہی رو میں کہے جا  
رہی تھی جیسے اس وقت اس کے بجائے اپنے آپ  
سے مخاطب تھی۔

”کس کی بات کر رہی ہیں آپ سہی باجی؟“  
انمول نے بے اختیار سوال کیا تھا۔ مارے بحس اس  
کا برا حال ہو رہا تھا کیونکہ یہ سچ تو بہر حال وہ خود بھی  
جاننا چاہتی تھی۔

”علی رضوی۔ اس دن تم اسی کے ساتھ گھر آئی  
تھیں نا؟“ سامیہ نے نظر گھما کر انمول کو دیکھتے  
سوال کیا تھا۔

”آپ کا مطلب پروفیسر رضوی ہی ”فرہاد“  
ہیں؟“ یہ انکشاف اس کے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھا۔  
سامیہ نے ایک گہرے سانس لیتے سر اثبات میں ہلایا۔  
”لیکن اس دن تو آپ نے کہا تھا آپ نہیں  
جانتیں۔“ اس نے حیرت سے سامیہ کی طرف دیکھا اور  
اس وقت اسے خیال آیا سامیہ نے اس کی بات کا کوئی  
جواب دیا ہی نہیں تھا بلکہ اس نے سامیہ کی خاموشی سے خود  
ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ وہ بھی لاعلم ہے۔

”اوہ مائی گاڈ۔ لیکن اگر یہ بات سچ ہے تو انہوں  
نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں کس قدر پریشان تھی اس  
بات کو لے کر۔ کیوں چھپائی انہوں نے مجھ سے اپنی



محبت تکلیف سہہ لیتی ہے لیکن تذلیل نہیں۔ وہ بھی اپنی محبت کی تذلیل سہہ نہیں پاتی تھی۔

اس دن اپنی جھنجھلاہٹ میں، سامیہ سے غصے میں کہے اس ایک جیلے نے ان دونوں کے رشتے میں جو فیصل کھڑی تھی علی کی معذرت اس میں دراڑ نہیں ڈال پائی تھی۔

وہ ان کی شادی کی دسویں سالگرہ تھی جب علی نے اسے سامیہ ٹیکسٹائلز کی صورت اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھنے میں دی تھی۔ کامیابی کا یہ تاج اس کی مسلسل اور جان توڑ محنت کا ثمر تھا جسے اس نے اپنی زندگی کے ساتھی کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ وہ سرخرو ہوا تھا۔ خود سے کیا وعدہ، اس سے کیا وعدہ پورا ہوا تھا لیکن..... سامیہ نے اپنی رخصت کا عندیہ دے کر اس کی خوشیوں پہ خاک ڈال دی تھی۔ وہ جانا چاہتی تھی اور علی اس وقت صدمے سے اتنا نڈھال تھا کہ اسے روک بھی نہیں پایا تھا۔

”میں نے تمہیں تمہارے برے وقتوں میں نہیں چھوڑا علی کیونکہ محبت اور وفا دونوں کا مان عزیز تھا لیکن آج جب تم زندگی کے اس مقام پہ ہو کہ دنیا کو تمہیں دیکھنے کے لیے سر اٹھانا پڑے میں تم سے دور جانا چاہتی ہوں تاکہ تمہیں احساس ہو صرف پیسوں کے سہارے زندگی گزارنا کیسا ہوتا ہے۔“

دماغ پکوڑوں کی طرح برستے سامیہ کے لفظ اس کے اعصاب کو جھلنی کر رہے تھے۔ سر جھکائے وہ کتنی ہی دیر اس عالی شان مگر خالی مکان میں بیٹھا رہا تھا۔ جن درو دیوار کو اس نے سامیہ کے لیے سجایا تھا وہاں اب فقط اداسی کا راج ہوئے والا تھا۔ وہ ان کے بیٹھ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ کہاں؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ ڈھونڈنا چاہتا تو ڈھونڈ سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا سامیہ اس طرح واپس نہیں آئے گی۔ وہ خفا ہو کر گئی تھی اور اسے منانا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے خود کو منانا پڑنا تھا اور وہ مننے کے لیے تیار تھا۔ اسے بس ایک ہی چیز واپس لاسکتی تھی۔ محبت۔

وہ وقت اس کی زندگی کا ٹرنک پوائنٹ تھا۔

کے وہاں پہ کھڑے ہو کر اپنی تلوار پھینک دینے والا اشوکا بس ایک ہی ہوتا ہے۔ اس جیت کی اہمیت سامیہ کے ساتھ اس کی موجودگی سے تھی۔ جب وہ نہیں تھی تو یہ کامیابی، ناکامی سے بدتر تھی۔ زندگی موت سے بدتر تھی۔

زندگی بدلی تو اس کی ترجیحات بھی بدل گئی تھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب اس نے ایک بار دوبارہ اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ اس کا بزنس اب اس کے سہارے کا محتاج نہیں رہا تھا۔ وہ جی ریس کے گھوڑے کی طرح سر پٹ دوڑ رہا تھا۔ نہ بھی دوڑتا تو اب علی کی اس میں دوپٹی صفر تھی۔ کوئی اس سے اس کا سب کچھ چھین کر اسے سامیہ کا ساتھ واپس دلا دیتا تو وہ تمام عمر اس کی بے دام غلامی کرتا۔ دل کو بھی مال کی چاہ تھی نہ دولت کی ہوس۔۔۔ وہ ایک جنون تھا جس کا اختتام ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ آغاز ہوا تھا اس سزا کا جو سامیہ اسے دے کر گئی تھی۔ کبھی جس پیسے کے پیچھے بھاگتے اس نے خود پہ سکون حرام کر لیا تھا آج خواہش نہ ہونے کے باوجود وہ پیسہ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سامیہ ٹیکسٹائل کا نام بلند یوں کو چھو رہا تھا۔ دنیا کے سامنے اپنا آب منوار ہا تھا۔

ڈاکٹر بیٹ مکمل کرنے کے بعد اس نے یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔ اس دوران بزنس کو بھی نہ چاہتے ہوئے وہ کچھ وقت دیتا رہا کہ پچھلے دنوں مصروفیات اتنی بڑھالی تھیں اب ذرا سی فرصت بھی ناگوار لگتی تھی۔ پھر تنہائی اور فراغت میں سامیہ اور فاران کی یادیں بے چین رہتی تھیں۔ یہ الگ بات وہ تو جیسے ہر لمحہ آس پاس ہی رہتے تھے۔ کسی کو دل بھول سکے تو وہ یاد آئے، جو عادت کی طرح زندگی میں شامل ہوا سے بھلا یا بھی کس طرح جاسکتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے اسے سامیہ کی الماری سے چند نوٹ بکس اور یہ ڈائری ملی تھی۔ وہ ان نوٹ بکس کو پچھانتا تھا کیونکہ وہ علی کی تھیں۔ ان میں اس کا کلام لکھا تھا اور جنہیں برسوں سامیہ نے دل سے لگائے رکھا تھا۔ یہ ڈائری اس کے تنہائی کے لمحوں کی ساتھی تھی۔ اپنی ساری



شکایتیں، کرب اور تنہائی کو اس نے اس ڈائری میں لکھ رکھا تھا۔ پتا نہیں وہ سب چیزیں وہاں بھول سے چھوڑ آئی تھی یا اس نے یہ حرکت سوچ سمجھ کر کی تھی۔ وہ وہاں سے خالی ہاتھ لکلی تھی اور اس کا سارا سامان جوں کا توں آج بھی اس کی الماریوں میں موجود تھا جسے علی یا کسی ملازم نے بھی نہیں چھوا تھا۔

اس ڈائری کو پہلی بار بڑھ کر اسے احساس ہوا تھا کمرے میں کھڑے ہوتا کیسا لگتا ہے۔ آج تک نہانے کی بار اس نے وہ ڈائری پڑھی تھی۔ یہ الفاظ نہیں اس کے احساسات تھے اور ہر بار بڑھنے کے بعد علی کا احساس جرم شدید ہو جاتا تھا۔ وہ محبت کا مجرم تھا اسی لیے قید تنہائی کا مزہ لو اوٹھتا تھا۔ پھر بھی ایک آخری اپیل کے طور پر اس نے یہ گوش کی تھی۔ اپنی کتابوں کی اشاعت اور شاعری سے ایک بار پھر نانا جوڑ کر سامیہ کو واپس لانے کی کوشش۔ وہ نہیں جانتا تھا شنوائی ہو پائے گی یا نہیں لیکن اس نے سامیہ کے دل پہ دستک دی تھی۔

”مجم سے یہ سب کس نے کہا۔“ چند لمبے سکوت میں گزرے پھر اس نے نفی میں سر ہلاتے تردید کی تھی لیکن انمول کو یقین نہیں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھائی دیتی یقین کی چٹکی نے انہیں چٹکا تھا۔ خود کو سامنے لائے بغیر اس نے اپنے گھس کے ساتھ دوبارہ شاعری کرنا شروع کر دی تھی۔ اسے شہرت کی چاہ نہیں تھی۔ وہ وقت بہت پیچھے رو گیا تھا جب دل اس کا تمنائی تھا۔ یہ محبت نامے تھے جو بس ایک دل سے دوسرے دل تک پہنچائے جا رہے تھے اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ پڑھے جا رہے ہیں یا نہیں۔

”سامیہ؟“ بے اختیار لکھوں سے کہتے آنکھوں میں امید لیے انمول کی طرف دیکھا تھا۔ اس بار اثبات میں سر ہلاتے اس نے سامنے بیٹھے شخص کو زندگی والی دی تھی۔ تو نامے پڑھے جا رہے تھے۔ سالوں بعد علی سہی جواب آیا تھا اور یہ جواب اس بات کی توثیق تھا کہ کہیں شنوائی ہوئی ہے۔ زندگی بالآخر مہربان ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دروازے پہ لگی کال بیل کی آواز سن کر فاران نے نیچے آ کر اپنی انٹرس کا دروازہ کھولا اور سن رہ گیا۔ سامنے کھڑے شخص کی شخصیت کی مبہم سی شبیہ یاداشت کے پردوں پہ نقش تھی لیکن ان کی صورت تو ازبر تھی۔ آج سے پہلے اس نے بس اسے تصویروں میں ہی دیکھا تھا اور وہ دھوکے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنی تصویروں سے بہت بڑھ کے شاندار شخصیت کے حامل ہے۔ وہ خود بھی قد کاٹھ میں اسی کی مماثلت رکھتا تھا۔ شاید آج سے دس چودہ سال بعد شخصیت میں بھی اس کی جھلک آجانی لیکن کیا وہ اس کی عمر میں اس جتنا باوقار دکھائی دے سکتا تھا۔ وہاں کھڑے فاران نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور اس سے بھی پہلے اس نے اس کی وہاں آمد کے متعلق سوچا تھا۔

”کس سے ملتا ہے آپ کو؟“ اپنی حیرت پہ قابو پاتے اجنبیوں کی طرح اس سے سوال کیا تھا۔ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس نے کانپتے ہاتھوں سے فاران کے چہرے کو چھوا۔ وہ دو قدم پیچھے ہوا تھا حالانکہ دل تو بے اختیار سینے سے لپٹ جانے کا کیا تھا۔ ماں ہو یا باپ فخری محبت کا احساس اولاد کے اندر پروان چڑھتا ہے۔ وہ بھی اس شخص سے اتنی ہی محبت کرتا تھا جتنی اپنی یاں سے۔ بس فرق اتنا تھا ماں کے لیے محبت سامنے تھی اور چٹائی چالی تھی۔ باپ کے لیے دل میں چھپائی ٹی تھی۔

”کون ہے فاران؟“ اسی وقت آخری سیر می پہ کھڑی سامیہ نے پکارا۔ وہ دروازے پہ فاران کا معمول سے دیر تک کھڑے ہونا محسوس کرتی اس کے پیچھے آئی تھی اور اب نیچے ہی دیکھ رہی تھی جب یکدم کلمے دروازے سے وہ اندر داخل ہوا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور پوں لگا جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔

”علی!“ فاران کی طرح سامیہ کے لیے اس کی آمد غیر متوقع نہیں تھی یہ بات فاران ماں کے چہرے پہ نگاہ ڈال کر ہی سمجھ چکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اس کی طرح حیران یا شاک نہیں ہوئی تھی۔

فاران خاموشی سے سیر حیاں چڑھ کر اوپر چلا



گیا۔ فیصلہ آج بھی سامیہ کو ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

”ایک وقت تھا میرا وجود تمہاری محبت بھری نظروں کے حصار میں ہوا کرتا تھا۔ تمہاری محبت نے دل کو دھاگے کی طرح اپنی انگلی کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ جس طرح سج کے گرد پروانے جھومتے ہیں اس طرح بھی تم میرے آس پاس رہا کرتے تھے۔ تمہاری محبت میں میرا وجود ریت کی بھر بھری دیوار بننے لگا تھا۔ ساری دنیا کو چھوڑ کر میں تمہارے پاس چلی آئی تھی۔ خود کو کئی کرلیا میں نے تمہاری خاطر۔“

فاران اپنے کمرے میں تھا جبکہ وہ لاؤنج میں ٹیس کی طرف چلے گھاس ڈور کے پاس کھڑے تھے۔ دونوں کی نگاہیں اس وقت ڈھلتے سورج پر ہی تھیں اور پھر علی نے گردن ہٹا کر خود سے چند قدموں کے فاصلے پہ کھڑی سامیہ کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں کو محسوس کرتے سامیہ نے بھی پلٹ کر دیکھا تھا۔

”کیوں تنہا چھوڑ دیا مجھے؟“ اس کی آنکھوں میں لکھا سوال وہ بخوبی پڑھ سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا صدیوں بعد ایک دوسرے کا سامنا کر رہے ہیں۔ کتنی ہی دیر اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے نظریں چرائے وہ دونوں خاموش رہے تھے۔

”اس دنیا میں آپ کو آپ کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ کوٹ میں اگلے رومال سے لے کر پیر میں پہنے جوتے کی قیمت تک دیکھ کر آپ کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب میں رکے پیسوں سے اہمیت ملتی ہے اس کے نیچے سینے میں چمپا دل کوئی نہیں دیکھتا۔“ علی کی نگاہیں ایک بار پھر ڈھلتے سورج پہ جا رہی تھیں۔ بے چینی، اضطراب، اداسی، زوال، شام کا منظر بھلے کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو دل میں دیرانی بکھیر دیتا ہے۔

”صرف تم تھیں سامیہ جس نے مجھے اس پیمانے سے ہٹ کے سمجھا۔ مجھ سے بے لوث محبت کی۔ میرے خالی ہاتھوں سے نہیں میرے دل میں بھرے جذبات کو دیکھ کر مجھے اپنا جیون ساسی چتا۔ اس دنیا سے بھی سردکار نہیں تھا مجھے کیونکہ اس نے

احساس کمتری کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ میرا سب کچھ تم تھیں۔ تمہاری چاہت اہم تھی میرے لیے۔ آنکھ بند کر کے یقین کیا تھا تم نے مجھ پہ، کیسے توڑ دیتا اس یقین کو؟“ وہ اب براہ راست اس سے مخاطب تھا۔ اس کی طرف دیکھتے چند قدم آگے بڑھا تھا۔

”میں تمہاری محبت کے سہارے جی سکتی تھی۔ خوش رہ سکتی تھی۔ میرے لیے تمہارا ساتھ ہی کافی تھا علی۔ تمہاری بدگمانی نے مجھے جیتے جی مار ڈالا۔“ خود یہ ضبط رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ برسوں پہلے والی ہمت آج مفقود تھی یا پھر اس کی جدائی نے سامیہ کو اندر ہی اندر کمزور کر دیا تھا۔

”ایک بار خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیں۔ کیوں کرتا رہا میں خود کو بلکان۔ کس کے لیے لڑتا رہا تقدیر سے؟ لوگوں کی زندگیاں کڑ جاتی ہیں مشقت کرتے پھر بھی وہیں کھڑے رہ جاتے ہیں جہاں سے شروعات کی۔ تمہیں لگتا ہے میں یہ سب صرف پیسے کمانے کے لیے کرتا رہا۔ اپنے لیے کرتا رہا۔ میں نے یہ سب تمہارے لیے کیا سامیہ۔ صرف تمہارے لیے۔ تمہارے اس یقین کے لیے جس کے سہارے تم نے اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر میرا ہاتھ تھا۔“ دس سال پہلے اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ دس سال بعد وہ شکایت کر رہا تھا اور سوال بھی۔

”دس سال۔ دس سال حالت جنگ میں گزارے میں نے اور جب پلٹ کر دیکھا تو میں اپنی محبت ہار چکا تھا۔ میں وہ قارع تھا جس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ اتنی بری بات بھی ہوئی ہوگی بھلا کسی کو۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ مایوسی تھی۔ سامیہ نے بے اختیار غلاب کاٹا۔

”زندگی تمہارے بغیر آسان نہیں تھی۔“ اس نے بمشکل آنسو پیتے کہا تھا۔ اس کی نظروں کی تاب لانا مشکل تھا سورج ایک بار پھر گھاس ڈور کی طرف پھیر لیا تھا۔

”میری تو زندگی زندگی ہی نہیں تھی۔“ سورج کی کرنیں سرسئی بادلوں پہ پھلتی رنگوں سے پھیل رہی تھیں۔



دیکھتے ہی دیکھتے روشنی کا وہ قاتل افق کے پار اتر گیا تھا۔

”مجھے لگا تمہیں اب میری ضرورت نہیں رہی۔“ دل کے اندیشوں کی طرح شام کے سائے بھی گہرے اور طویل ہو رہے تھے۔ باہر اب مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ آج ٹیڑس کا بلب بھی نہیں جلایا گیا تھا اس وجہ سے تاریکی کچھ اور گہری لگ رہی تھی۔

”پھول کو خوشبو کی ضرورت کب نہیں ہوتی۔ دھڑکن کے بنا بھی دل ہوتا ہے کیا؟ سانسوں کے بغیر بھی کوئی زندہ رہ پاتا ہے۔“ وہ لفظوں کا جادوگر تھا، لفظوں سے اس سے بڑھ کر بھلا کون بھیل سکتا تھا۔ بے اختیار اپنی سوچ۔ وہ دل ہی دل میں ہی تھی۔

”تم سے لفظوں میں آج بھی نہیں جیت سکتی۔“ سلسلہ کو بائیس سال پرانی وہ شام یاد آئی تھی جب پہلی بار علی کے ساتھ یونیورسٹی گراؤنڈ کی پگڈنڈی پہ جیتے اس بنا جانے کی ایک رات میں وہ اس کے انہی لفظوں کے سامنے اپنا سب کچھ ہار گئی تھی۔

”پھر بھی تم سے ہار جاتا ہوں میں۔“ پہلی بار دل.....

دوسری بار اپنا آپ اور آخری بار۔ محبت۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

”محبت کبھی نہیں ہار سکتی فرہاد۔ اسے ہار کر بھی جیتنا ہوتا ہے۔“ اسے یہ مایوس لہجہ اچھا نہیں لگا تھا ایک دم اس نے آگے بڑھ کر علی کا ہاتھ تھام لیا۔

”علی!“ اس نے ٹوکا۔

”تمہیں پتا ہے مجھے تمہیں فرہاد کہنا اچھا لگتا ہے۔“ لگا ہیں جھکائے وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

”جانتا ہوں اس طرح تم خود کو ”شیریں“ سمجھتے لگتی ہو۔“ وہ اب اسے پھینک رہا تھا۔

”اتنے بڑے پروفیسر بن کر بھی تم سنجیدہ نہیں ہوئے۔“ سلسلہ نے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”میں آج بھی ہماری پہلی ملاقات کی طرح بے حد سنجیدہ ہوں۔“ مسکرا کر اس نے اس بار خود اس کا ہاتھ تھامنے کی جسارت کی تھی۔

”میں نے برسوں خاک چھانی ہے۔ دشت میں بڑھتا آبلہ پانی کی کٹھنایوں سے گزر کر تنکا تنکا جوڑ کے ایک مکان بنایا ہے۔ اس امید پر کہ اسے گھر تم بناؤ گی۔“ التجا امید کی صورت بیان کی گئی تھی۔

”میں نے بھی سالوں اس وقت کا انتظار کیا ہے۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی حسرت تھی کہ ہم کب مل کر ایک گھر بنیں۔“ ایک غلش تھی جو روح میں سحر کی طرح اتر رہی تھی۔

”تو پھر چلیں اس آشیانے میں چاہت کے رنگ بھرنے؟“ آسمان کے کسی کونے میں جاند نے رخ دکھاتے تاریکی میں شکاف ڈالا تھا۔ علی کے سوال پر سلسلہ نے بے اختیار اشارت میں سر ہلایا۔

”کہیں آپ دونوں کا ارادہ میرے بغیر جانے کا تو نہیں ہے نا؟“ ان دونوں ہی نے چونک کر قاران کی طرف دیکھا تھا۔ وہ مصنوعی نکلی چہرے پہ لائے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اپنے نظر انداز کیے جانے پر افسردہ تھا۔

”تمہارے بغیر تو ہم اچھوڑے ہیں ہمارا گھر تمہارے بنا کس طرح مکمل ہو سکا ہے میری جان۔“ علی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ ماں کی طرف دیکھتے قاران نے قدم آگے بڑھائے۔ وہ خود آنکھوں میں نمی لیے مسکرا رہی تھی۔ علی نے قاران کو سینے لگا یادہ چھوئے بچوں کی طرح اس سے لپٹ گیا تھا۔

تصور پر مکمل ہو گئی تھی۔ ذہنی شام کے ملال کے بعد جاند کی ٹھنڈک اور روشنی امید کی صورت نمودار ہوئی تھی۔ لاکھ دشت و بیابانوں کی خاک چھانیں محبت ہمارے اندر سدا قائم رہتی ہے۔ بڑھ تو سکتی ہے لیکن جدائی کی آگ اسے جلا کر بھسم نہیں کر سکتی۔ راکھ کے ہر ذرے میں وہی شدت وہی جذبہ موجود ہوتا ہے۔ جتنے بھی کیمیائی عمل ہو جائیں اس کی مالیکولر ساخت بدلنا ناممکن ہے۔ محبت کا جذبہ وہی ہے۔ وہیں رہے گا۔ ساتھ رہے گا۔ یہ پیارا ہمیشہ رہے گا۔

☆☆



غزوہ احمد

# پہلو کی

غرض شامل ہو گئی ہے کہ تمہارا کیے گئے سب کام کا بھی لوگ اسی طرح دم بھریں جیسے اس کا بھرا جا رہا ہے۔ بولو ایسا ہی ناں؟“ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہادیہ کے ہونٹوں پر رہ گئی۔

”کیوں یار! اپنی بے غرض اور بے لوث کاموں کا خراج مانگ رہی ہو اور وہ بھی خود سے کہلوا کر“ ہادیہ کی مسکراہٹ واپس بے تاثر چہرے میں کھو گئی۔

”پھر.....؟“ سوالیہ نظروں سے دیکھا گیا۔  
”بس یار! کچھ دن کی بات ہے خدا ایسے اپنے بندوں کو کیلاتا ہے جھوٹا۔ تم ابھی تھیں، اچھی ہو..... وقت ثابت کرے گا۔“ فریال نے بچ سے اٹھتے ہوئے کہا اور اس کو بھی اشارہ کیا۔

”کچھ معاملات بگڑتے بھی اسی لیے ہیں کہ ان کا انجام ہماری بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔“ پرسوج نظروں سے دیکھتی ہادیہ بھی یہ بات سن کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک نظر دوبارہ پائپ کے سوراخوں پر ڈالی جہاں چڑیاں اکٹھی ہو کر پانی پی رہی تھیں۔

”ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... چلو۔“ دونوں پارک کے خارجی دروازے کی طرف چلتے گئیں۔



کہانی بہت ہی سادہ تھی وہ جب شادی ہو کر

”سچ بتاؤ، تم اس سے جیلس تو نہیں کہ اس کی پذیرائی تم سے زیادہ ہو رہی ہے۔“ فریال نے بہت دیر سے خاموش ہادیہ سے پوچھا جو کوفت سے پائپ کے اس حصے کو دیکھ رہی تھی جس میں جا بجا سوراخ تھے اور ایک پھوار کی صورت میں پانی بہہ رہا تھا۔

”نہیں..... بالکل بھی نہیں..... سچ ہی.....“ اس نے فوراً پناہ دیان وہاں سے ہٹا کر جواب دیا۔  
”کیا تم کو ایسا لگتا ہے میں اس سے یا کسی اور سے بھی جتن محسوس کروں گی؟ مجھے لگتا ہے میں اپنی بات تم کو سمجھا ہی نہیں پا رہی۔“ اس نے مایوسی سے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ پائپ کے اس حصے کو دیکھنے لگی جہاں سے پانی بہہ بہہ کر چچی مٹی پر کچھڑا رہا تھا مالی کن گھاس میں پانی دیئے جا رہا تھا۔

”تو ایسا ہے کہ ڈیسٹر! تم کو صلی کی تمنا ہے وہ تعریفی کلمات جن سے قطع نظر تم ایسا اچھا نہیں پیش کرتی رہیں۔ آج اس چھ سات مہینے پرانی لڑکی کی واہ واہ ہوئی تو تم کو لگ رہا ہے، تمہارا کیا گیا ہر ایک اقدام شاید کسی کی نظر میں آیا ہی نہیں؟“

”ہمم..... ہم م.....“ ہادیہ نے سر کو ہلکے سے ہلایا، شاید اس کو لگنے لگا تھا کہ اس کی ذہنی کیفیت وہ سمجھ رہی ہے۔

”بس بات یہ ہے کہ تم اب تک بے غرض کام کر رہی تھیں اپنی پیچھے کے عین مطابق اور اب تمہاری



سسرال میں آئی تو دو چھوٹی ننندیں اور دو پور غیر شادی شدہ تھے جب کہ دو ننندوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اس گھرانے میں اس کا بھی استقبال روایتی انداز میں ہوا، جب تک گھر کی ذمہ داری اس کے کاندھے پر آئی تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ننندیں اپنی موڈ کی مالک ہیں، دل چاہا تو ہاتھ بٹادیا ورنہ پڑھائی، دوستیں، اپنے مشاغل..... یہ ہی حال لڑکوں کا بھی تھا۔ گھر کافی کشادہ تھا مگر اتنے لوگوں کے حساب سے وہ بھرا بھرا لگتا۔ اس کو لگتا کہ اگر کچھ چیزیں کم زیادہ کر دی جائیں تو ایک بہتر حالت نکل سکتی ہے مگر ان سب باتوں میں اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ گھر کا ہر فرد اپنے سامان سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ اب اگر کسی نے کتاب لا کر کھانے کی میز پر رکھ دی تو وہ چاہے چار دن بعد بھی یاد آئے اس کو اسی جگہ سے واپس چاہیے ورنہ پھر ایک جھگڑا تیار ہے۔

ان تمام چیزوں کو دیکھ کر ہادیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسی کوئی بھی کاپیا پلٹ کار کر دی وہ نہیں دکھا سکتی تھی۔ پھر اس نے اپنی اس پنڈ فطرت سے گھر کا نظام سنبھالا۔ آخر کو وہ اس گھر کی بڑی بیوی تھی۔ پھر یہ ہوتا کہ وہ سب کچھ ہی کرتی مگر کبھی بھی چیزوں کے ساتھ چھیڑ چھاؤ نہ کرتی۔ اس طرح زندگی کی گاڑی رواں دواں ہوئی، اس سفر میں نہ تو اس نے کسی سے بیر باندھنا نہ اگلے نے اس کو پریشان کیا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ بہت زیادہ سکون رکھ رہی تھی مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنی سسرال کی دھاک بٹھانے کے لیے روزانہ کے جھگڑے سب سے سول لیتی۔ وہ اپنے طور پر ایک مطمئن زندگی گزار رہی تھی اس خود شاشی کے ساتھ کہ اگر وہ بہت اچھی نہیں تو بہت بری بھی نہیں۔

مسک شروع ہوا تب، جب اس کی ننند اور دیور کی شادی طے پائی۔ اپنے طور پر اس نے ہر ہر کام اچھے طریقے سے انجام دیے، جہاں کو تابی ہوئی وہ

اس کو آسانی سے مان لیتی۔ نئی دلہن نے بھی جب گھونکھٹ سے منہ نکالا تو اس کو بھی قریباً قریب وہی تمام مسائل نظر آئے جو دو سال پرانی ہادیہ کو نظر آئے تھے چونکہ وہ ہادیہ نہیں تھی تو اس نے اپنی کرنے کی سوچی۔

بہنیں سے ہادیہ کی زندگی میں بھونچال آیا۔ وہ جو جو کام صرف اس وجہ سے نہیں کر رہی تھی کہ یہ لڑائی جھگڑے کا موجب بنے گا، وہ سینگ کے نام پر خوب تہدیلیاں کرنے لگی۔ تہدیلی سب کو اچھی لگتی ہے یہاں بھی یہی ہو اسب اس کو سہا رہتے تھے اس کو بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ بھی سسرال ہی تھی مگر اس کو ایک خلش سی ہونے لگی تھی کہ کیا اس نے جو کچھ بھی گھر



کا کرہ کم ٹرک زیادہ لگتا ہے سجا بنا۔“ نند نے مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

”شوق ہے اس کا.....“ امی نے بولنا چاہا مگر پھر نند نے بات کاٹ دی۔

”ارے ایسا کون سا شوق ہے سینگ کے نام پر اتنے کرشل کے پیسز بھر دیے گھر میں، نہ اس کی ڈسٹنگ پر دھیان دیتی ہیں نہ یہ دیکھتی ہیں کہ بچوں کو اس وجہ سے بھائی نے ایک طرف کر دیا ہے کہ وہ گرا کر توڑ دیں۔ جب بچے گھر میں ہیں تو اتنا تو خیال رکھنا چاہیے نا۔ آپ کو تو پتا ہے بھائی کچھ نہیں بولیں گی مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں..... اور پھر وہ بالکنی میں کھیلے لاکر بھر دیے ہیں کہ سبزہ اچھا لگتا ہے مگر جو اُن سے مٹی گرتی ہے تو آپ بار بار مجھ سے صفائی کرواتی ہیں، ان سے ہی بولیں نا..... لے کر رائٹنگ ٹیبل ہٹا دی، لیونگ روم سے جس دن احمد کا غصہ باہر نکلتا نا..... نکل جانے کا بھابھی بیگم کا سکھڑا پا۔ سکھڑ ہوں گی اپنے گھر کی، ہماری کیوں زندگی عذاب کر رہی ہیں۔“

”بات کرتی ہوں میں آج..... آج کل کی لڑکیاں بھی نا سرائی ماحول میں ڈھلنا نہیں بس خود سب کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہیں۔ آخر ہادیہ بھی تو ہے سب کو لے کر چلنے والی۔ ایسے تو اتنے لوگوں کے ساتھ بنا جھگڑے کے گزارا کر رہی تھی جب کہ تم لوگوں کا مزاج بھی شاہانہ ہے مگر وہ کتنی مزاج شناس ہے سب کی.....“

ساس کی بات جاری تھی مگر ہادیہ سے مزید کھڑا ہونا محال تھا، مارے لشکر کے اس کو رونا آ رہا تھا بس اتنی ہی بات کی وجہ سے وہ اپنے رب سے شامی تھی۔ اس کو شرمندگی ہونے لگی خود سے، وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، اس کے ذہن میں فریال کا جملہ چلنے لگا۔

”کچھ معاملات بگڑتے بھی اسی لیے ہیں کہ ان کا انجام ہماری بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔“

☆☆

کے سکون کی خاطر کیا وہ رائگاں عمل تھا اس کی خاموش قربانیاں خاموش ہی رہیں۔ اس نے نندوں سے کبھی کچھ بڑھ کر کام نہ کروایا، حکم نہ چلایا کہ ان کو لگے بھائی ہم سے تنگ ہیں یا گھر پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ اب وہ ہی لوگ اپنی پھونٹی بھادج کے کہنے پر بھی لاؤنچ کے ڈیکوریشن پیسز صاف کرتی نظر آئیں تو کبھی بالکنی میں رکھے گھلوں کی گرنے والی مٹی صاف کرتی نظر آئیں۔

واقعی آنے والی میں وہ مکن تھے جو اس میں نہ تھے۔ وہ بھی کتنے کام اس کے کہنے پر کرتی تھی، بس یہ ہی تمام باتیں اس کے لیے پریشانیوں کا باعث تھیں اور آج شام اپنی دوست نما ہمسائی سے کتھارس کر کے واپس گھر کو لوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

”امی! آپ ان کو سنبھاتی کیوں نہیں ہیں، وہ ہمارے گھر کا نظام کیوں خراب کر رہی ہیں۔ آخر پہلے بھی تو ہم لوگ رہے ہی رہے تھے نا؟“ یہ اس کی نند کی آواز تھی جو اس نے اندر آتے ہوئے سنی۔ اس کی دیورانی اپنے میکے گئی ہوئی تھی باقی گھر میں سناٹا تھا۔

”ہاں امی! آپ کو بولنا چاہیے، اب دیکھیے نا سینگ کے نام پر اتنی تبدیلیاں کر دی ہیں اور پھر آپ لوگوں کو اس کو مین ٹین کرنے کے لیے ہلکان ہونا پڑتا ہے۔“ یہ اس کی سب سے چھوٹی شادی شدہ نند کی آواز تھی جو اس کے ساتھ ڈھانی تین سال گزار چکی تھی۔

”تو کیا بولوں میں؟“ اس کی ساس کی آواز آئی۔

”ان سے بولیں نا کہ اگر اتنا سجا بنا کر رکھنے کا شوق ہے تو اپنا کمرہ سجالیں ورنہ اپنا الگ کمر لے لیں۔“

”ہم.....“ امی نے ہنکارا۔ ”کیا فضول بول رہی ہو۔“

”ہاں تو اور کیا ایسی بھی سجاوٹ کا کیا شوق، ان





☆ ”اے ایمان والو! اپنے عہد کو پورے کرو۔“  
(سورۃ المائدہ، آیت 1)

☆ تم اپنے عہد پورے کیا کرو، تم سے تمہارے  
عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ (سورۃ بنی  
اسرائیل آیت 17)

☆ ”اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو جو نہیں  
کرتے کتنی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ  
کرو (سورۃ القف آیت 3-2)

### متکبر کون ہے؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،  
فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی  
خدمت میں حاضر ہوا اور وہ ایک خوب صورت شخص  
تھا۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!  
میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ مجھے خوب صورتی پسند اور  
محبوب ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ ہی رہے ہیں  
کہ مجھے جو کچھ دیا گیا ہے (حسن و جمال) اور حد یہ  
ہے کہ میں نہیں پسند کرتا کہ کوئی جوئے کے تسمے کے  
برابر بھی مجھ سے زیادہ اچھا ہو جائے، کیا یہ بات متکبر  
کی وجہ سے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”  
نہیں بلکہ متکبر وہ ہے جو حق بات کو چھپائے اور لوگوں  
کو تہمت سمجھے۔“ (سنن ابی داؤد و ترمذی)

### قرآن کا سچا علمبردار

حضرت ابو عبد اللہ سالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
غزوات بدر و احد میں شرکت کرنے والے بہادر مجاہد  
تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں  
مرتدین کے خلاف جنگ یمامہ میں علم اٹھائے ہوئے

تھے کسی نے کہا۔

”آپ کی جان کو خطرہ ہے یہ جھنڈا کسی اور کو  
دے دیجیے۔“

فرمایا: ”پھر تو میں بہت بڑا حامل قرآن ہوں۔“  
میدان میں درآنہ چلے گئے داہنا ہاتھ کٹ گیا تو علم  
بائیں ہاتھ میں لے لیا بایاں بھی قلم ہو گیا تو علم کو گردن  
سے تمام لیا اور اسے خم نہ ہونے دیا۔

افشاں سمیع کراچی

### گوہر نایاب

☆ ہر چیز کا صدقہ ہوتا ہے اور عقل کا صدقہ یہ  
ہے کہ جاہل کی بات کو برداشت کرو (اشفاق احمد)  
☆ کسی کی پیمان علم سے نہیں ہوئی بلکہ ادب  
سے ہوتی ہے کیونکہ علم تو ایس کے پاس بھی تھا لیکن  
وہ ادب سے محروم تھا۔ (الغزالی)

☆ بے نیلے لوگوں کی سب سے بڑی نشانی یہ  
ہوتی ہے کہ تم جتنی انہیں عزت دو گے وہ اتنی ہی تمہیں  
تکلیف دیں گے۔ (بابا بابے شاہ)

☆ کسی عاشق اور کسی متعصب سے بحث نہ کرو  
کیونکہ عاشق کے پاس ایک اندھا مال اور متعصب شخص  
کے پاس بند داغ ہوتا ہے (جارج برنارڈ شاہ)

☆ میں بھی جاہل ہوں اور میرے ارد گرد رہنے  
والے بھی جاہل ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ میں اپنی  
جہالت کو جانتا ہوں اور وہ نہیں جانتے (سٹراٹ)

شمینہ اکرم..... لیاری

### مرزِ اقبال

ہائی اسکول کے طالب علموں سے نیچر نے  
دریافت کیا۔

”کیا تم میں سے کوئی لڑکا بتا سکتا ہے کہ مرز اسد  
اللہ خان غالب کی غزلیات کا کن کن غیر ملکی زبانوں  
میں ترجمہ ہوا ہے؟

ایک طالب علم نے اٹھ کر کہا۔ ”جہاں تک میری  
معلومات اور مطالعے کا تعلق ہے، میں پورے وثوق  
سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب کی غزلیات کا ابھی تک



اردو میں بھی ترجمہ نہیں کیا گیا۔“

مریم رحمانی..... خان پور

### منگائی

ہوئی جو دال گراں اور سبزیاں مہنگی  
بچن میں جا کر بھلا وہ کیا دل نواز کرے  
معاہلات عشق کا اب یہ عالم ہے  
میں پیار پیار کروں اور وہ پیاز پیاز کرے  
(فوزیہ شربت..... سمجرات)

### سرمکافات عمل

شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا:  
جوز شے تمہیں تکلیف دیں ان سے دوری اختیار  
کرلو وہ خود لوٹ آئیں گے۔ مگر اس وقت جب  
تمہارے دل سے اتر چکے ہوں گے۔ کیونکہ وہ تمہاری  
قدر سے نہیں بچھتا دے سے لوٹتے ہیں۔ جس کی دی  
ہوئی تکلیف سے تم آج رو رہے ہو، وہ کل تمہارے  
بچھتا دے میں روئے گا۔

بتول فاطمہ..... دریاخان

### مختصر مختصر

☆ بعض لوگوں کو یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ سیکڑوں  
سال پہلے ان کے آباؤ اجداد کسی علاقے میں کیا  
کارنامے انجام دے رہے تھے لیکن انہیں یہ نہیں معلوم  
ہوتا کہ گزشتہ رات ان کے بچے کہاں تھے۔  
☆ بعض ڈاکٹروں سے طبی مشورے کا مطلب  
ہوتا ہے انہیں اپنی دولت اور جائیداد میں حصے دار  
بنانا۔

☆ اپنی پرانی کار سے محبت کرنے کا بہترین  
طریقہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً کاروں کی قیمت پوچھتے  
ریں۔

☆ کوئی بھی رقم ادھار دینے سے بہتر ہوتا ہے کہ  
تحفہ دے دی جائے۔ دونوں صورتوں میں نقصان  
تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے۔

فائزہ بھٹی..... چٹوکی

### بچھتا دے

بیگم: سارا دن موبائل سے جکڑے رہتے ہو۔ کم سے کم  
چھٹی کے دن کچھ وقت میرے لیے بھی نکال لیا کرو۔“  
شوہر نے موبائل چار جنگ پر لٹکایا اور بولا: بہتر  
ہے بیگم! آج کا پورا دن تمہارے نام۔“  
پھر شوہر نے حکم کر پورے گھر کا جائزہ لیا اور  
بولا: ”آج کھانا ماسی کے ہاتھ کا نہیں تمہارے ہاتھ کا  
کھاؤں گا۔ دیکھو گھر میں ہر طرف جالے لگے ہوئے  
ہیں۔ ابھی بکھار صاف بھی کر لیا کرو۔“ چائے پینے کو  
دل کر رہا ہے۔ ایک کپ چائے بنا کر لے آؤ۔ بچن  
کے برتن نکال کر دھو کر دوبارہ سیٹ کر لو۔ میری دو تین  
شرٹ کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں۔ انہیں بھی ٹھیک کر دو۔“  
بیگم نے جھکے لیجے میں کہا: ”یہ لوجی، آپ کا  
موبائل فل چارج ہو گیا ہے۔“  
عظمیٰ چوہدری..... کو جرخان

### مسلمان کی موت

1947 میں مولانا حسرت موہانی سے کسی نے  
پوچھا کہ آپ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟ ایک  
حسرت بھرے لہجے میں ٹھنڈی سانس لے کر بولے:  
”دونوں جگہ جذباتی جنونیت کا دور دورہ ہے اور اپنی تو  
ہر دو جگہ جان خطرے میں رہے گی۔ یہاں رہے تو جانے  
کب کوئی ہندو انتہا پسند ”مسلمان“ کہہ کر مار ڈالے۔  
پاکستان میں یہی کچھ جو شیخ مسلمان کے ہاتھوں ہو سکتا ہے  
لیکن وہ مجھے ”گستاخ“ یا کافر کہہ کر مارے گا میں سمجھتا  
ہوں کہ بھارت میں رہ کر ”مسلمان“ کی موت مرنا بہتر ہے  
پاکستان میں رہ کر ”کافر“ موت مرنے سے۔“

ماہایشیر حسین..... ڈنگ

### قرآن مجید کا معجزہ

قرآن مجید میں لفظ ”البار“ یعنی زمین 13 بار  
آیا ہے اور لفظ ”البحر“ یعنی سمندر 32 بار آیا ہے۔

$$13+32=45$$

$$13/45 \times 100 = 28.29\%$$



منگی اور پانی کا بالکل یہ تناسب آج کی جدید سائنس نے دریافت کیا ہے لیکن قرآن مجید فرقان حمید نے 1400 سال پہلے بتا دیا تھا۔  
ایٹال فاطمہ..... کراچی

### دیس دیس کی کہاوتیں

☆ اندھوں کے لیڈر بھی اندھے ہوتے ہیں  
(جرمن کہاوت)

☆ جہاں صدق اور خلوص نظر آئے وہاں دوستی کے لیے ہاتھ بڑھاؤ ورنہ تجھ کی تمہاری بہترین رفیق ہے (ایرانی کہاوت)

☆ دولت جب بولتی ہے تو سچائی بعض دفعہ خاموش ہو جاتی ہے (عصری کہاوت)

☆ پیٹنر اور وکیل بہت جلد سیاہ کو سفید کر لیتے ہیں (لاٹینی کہاوت)

☆ اگر ایک کر سکتا ہے تو تم بھی کر سکتے ہو اور اگر کوئی نہیں کر سکتا تو تمہیں لازمی کرنا چاہیے (جاپانی کہاوت)

سیدہ کو باحجار..... کبودرپا

### تعمیر اخلاق

مولانا ساجد محمود جدی نے فرمایا:

- ☆ بہادر، مقابلے کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
- ☆ مستقل مزاج، مصیبت کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
- ☆ امانت دار، مفلسی کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
- ☆ عورت کی محبت کو قاتل کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
- ☆ بردبار، غصہ کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
- ☆ شریف، معاملہ ٹوٹنے کے وقت آزمایا جاتا ہے۔

سانپ تو سانپ ہی ہوتا ہے  
شاہنشاہ اور..... کراچی

دو صوفی تھے۔ ایک بڑا صوفی ٹرینڈ اور ایک چھوٹا صوفی انڈر ٹرینڈ۔ چھوٹے صوفی کو ساتھ لے کر بڑا صوفی گلیوں، بازاروں میں گھومتا رہا چلتے چلاتے اس کو لے کر ایک جنگل میں چلا گیا۔ اس بڑے صوفی

نے دیکھا کہ شاخوں اور پتوں کے ڈھیر میں ایک سانپ مرجھایا ہوا، کچھ گھسٹوایا ہوا پڑا ہے۔ صوفی کو بڑا ترس آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سانپ کو اٹھا لیا۔

چھوٹے صوفی نے کہا: ”غصہ کیا کرتے ہیں۔ سانپ ہے اس کو اٹھا نہیں کرتے۔“

انہوں نے کہا ”نہیں بے جا رہے مجبور ہے، زخمی ہے۔ زخم خوردہ ہے، اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی کچھ غور پر داخست کرنی چاہیے۔“

تو وہ سانپ کو ہاتھ میں لے کر چلے پھر دونوں ہاتھ کرتے کرتے کافی منزل میں طے کرتے گئے۔

جب شخص ہی ہوا گئی، چھوٹے ہوئے سانپ کو، تو اسے ہوش آنے لگا اور جب ہوش آیا تو طاقت ور ہو گیا تو اس نے صوفی کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ جب ڈسا تو

انہوں نے سانپ کو بڑی محبت اور پیار کے ساتھ ایک درخت کے جڑ کے پاس رکھ دیا۔

چھوٹے صوفی نے کہا: ”دیکھیں میں نے کہا تھا نہ کہ یہ موذی جانور ہے۔ آپ کو ڈس لے گا۔ پھر کیوں ساتھ اٹھا کے لے جا رہے ہیں؟“

تو انہوں نے کہا: ڈسا نہیں اس کے شکر یہ ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ سانپ اسی طرح شکر یہ ادا کرتے ہیں۔

اقراء ممتاز..... سرگودھا

سنو!

دیکھ کر ٹھہرتی ہوئی شامیں  
کہر میں لپٹی دھندلی سی مہین  
درختوں سے کرتے ہوئے

خسک زرد

وہ گاؤں کے تمام رستے

محبوبوں کے تمام رشتے

خال آباد کرتے

جہیں سب یاد کرتے ہیں

ہانیہ عمران..... سبغات



بشری محمد

## یادوں کا دریا

شمینہ اکرم، کی ڈائری میں تحریر

بھی شاہ کی منزل  
زخمِ تنہائی میں خوشبو حنا کس کی مٹی  
سایہ دیوار پر میرا تھا، مداس کی مٹی؛

اس کی رفتار سے پٹی ہیں آنکھیں بڑی  
اُس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ دُعا کس کی تھی؛

آنسوؤں سے ہی بھر گیا دامن میرا  
ہاتھ تو میں نے اٹھائے تھے، دُعا کس کی تھی؛

میری آہوں کی زبان کوئی سمجھتا کیسے  
زندگی اتنی دکھی، میرے سوا کس کی تھی؛

اگ سے دیتی اس نے کی مٹی، جلا گھر میرا مٹی  
دی گئی کس کو سزا اور خطا کس کی مٹی؛

گلشن چوہدری، کی ڈائری میں تحریر

ہر وہی شاعر کی نظم  
بس اب تو جینے کا ایک ہی سلسلہ ہے جاناں

تمہاری سوچوں میں ڈوبے رہنا  
تمہارے خوابوں میں کھوئے رہنا  
کسی طرح تم کو دیکھنے کی سبیل کرنا  
تمہارے کپڑے تک آنے کا بہانہ کرنا  
ہر گزرتے جلتے سے خیریت کی نوید لینا

ہواؤں اور چاند اور برندوں پر رشک کرنا  
مرا جوا حوالا پوچھنا ہے تو ہے جاناں!

کہ جانے کب سے  
بدلتی کے بندی خانے میں بند

برف کی سیل پہ تنہا بیٹھی  
حوارتِ زندگی سے کچھ وجہ ڈھونڈتی ہوں

بدن کو اپنے تھامے ہاتھوں سے چھو رہی ہوں

نمر و عاقب، کی ڈائری میں تحریر

دھیمی آواز کی غزل  
تم مری آنکھ کے تیور نہ بھلا پاؤ گے  
ان کہی بات کو بھول گے تو یاد آؤں گا

سرد راتوں کے ہنستے ہونے سناؤں میں  
جب کسی پھول کو ہمو گے تو یاد آؤں گا

آج تو محفلِ یاداں پہ ہو مغرور بہت  
جب کبھی ٹوٹ کے بکھر گے تو یاد آؤں گا

شال پہنائے گا اب کون دبیر میں تمہیں  
بادشوں میں کبھی بھیج دو گے تو یاد آؤں گا

بانہ عمران، کی ڈائری میں تحریر

نغمہ خان کی غزل  
اے خدا آج ایک فیصلہ کر دے  
اے میرا یا مجھے اُس کا کر دے

بہت دُکھ ہے ہیں زندگی میں  
اب اس خوشی کو میرے نام کر دے

بہت مشکل لگتا ہے اُس سے دور رہنا  
بدلتی کے اس سڑک کو متوڑا کم کر دے



نہیں لکھا اگر زندگی میں اُس کا نام  
تو ختم کر یہ زندگی ادب مجھے فنا کر دے

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے  
دوست کو نہیں کوئی، ہنسے کو زمانہ ہے

کیا حسن نے سمجھا ہے، کیا عشق نے جانا ہے  
ہم خاک نشینوں کی مٹو کر میں زمانہ ہے

یا وہ متھے خفا ہم سے یا ہم ہیں خفا ان سے  
کل اُن کا زمانہ تھا، آج اپنا زمانہ ہے

اے عشق جنوں پیشہ، ہاں عشق جنوں پیشہ  
آج ایک ستم گر کوئٹس ہنس کے دلا نا ہے

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی کچھ لیجیے  
اک آگ کا دیا ہے ادب کے بانہ ہے

اقصی ناصر کی ڈاڑھی میں تحریر  
زاہد عباس سید کی غزل

ہر اک قدم چسپاں تری رہنما کا تھا  
یہ ادب بات ہے کہ نہ یاد سفر کا تھا

بر باد ہیں کو تو نے ہر کھنے میں کر دیا  
لحہ وہ آزمائش حسن نظر کا تھا

کس کو تھا انتظار کا دعویٰ میری طرح  
کس کی نظر میں عکس ترے بام وصل کا تھا

تم جن کو یاد کر کے بھی ساحل سے دھو ہو  
دریائے بیگناہ وہ مری چٹم تر کا تھا

تیری نوازشوں میں تو کوئی کمی نہ تھی  
مگر کچھ قصور تھا تو شبِ محقر کا تھا

جلنے وہ کوئی موڑ کہاں پر بے مر گیا  
زاہد وگرنہ راستہ میرے ہی گھر کا تھا

مشاذیہ گلزار کی ڈاڑھی میں تحریر  
ادب ملک کی غزل

ہونٹوں پر اک چب سی جی رہ جاتی ہے  
دل کی اکسردل میں دہی رہ جاتی ہے

لوگ بچھڑ جاتے ہیں اور تصویر ان کی  
آنکھوں میں تا عمر بھی رہ جاتی ہے

ہر آسائش حاصل ہو جاتی ہے پر  
زیست میں بھر بھی کوئی کمی رہ جاتی ہے

چلے وقت بدل دے سب حالات گر  
دل کے کپس میں یاد پڑی رہ جاتی ہے

ہو جاتا ہے رخصت ہم سے پر اس کی  
سانسوں میں خوشنوسی لپی رہ جاتی ہے

ہر شبِ دُہر آتی ہے دل میں یاد کوئی  
ہر شب کوئی کھڑکی کھلی رہ جاتی ہے

دل کے زخم کون ارشد بھر سکتا ہے  
ایسی جوت تو دل پہ لگی رہ جاتی ہے

رفعت جبین کی ڈاڑھی میں تحریر  
بگر مراد آبادی کی غزل

ایک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے  
سنئے تو دل ماضی پہلے تو زمانہ ہے

یہ کس کا قصور ہے؛ یہ کس کا فسانہ ہے  
جو اٹک ہے آنکھوں میں تسبیح کا دانہ ہے



# کتابتِ حرام

کتاب“ سے ہی ہے اور بعض قارئین تو کرن کتاب کے مفید سلسلوں کی افادیت کی وجہ سے ہی کرن کا رسالہ خریدتے ہیں (کئی لوگوں نے مجھے بتایا ہے) مگر ”آپ کا پیغام انہوں کے نام“ یہ سلسلہ کیوں بند کر دیا گیا.....

اب کہانیوں پر تبصرے کی جانب آتے ہیں۔ اس دفعہ تو بہت ساری کہانیاں قابل ذکر ہیں۔ انٹرویوز سے دلچسپی صفر ہونے کی وجہ سے انہیں سرسری سا پڑھا، البتہ عابدہ مغل نے ”مقابل ہے آئینہ“ میں خوب رنگ جمایا۔ ان کے جوابات پڑھ کر مزا آیا۔ ”شبِ نم کی سحر“ رخ چوہدری کا سلسلہ وار ناول..... جو کہ یقیناً بہت بہتر نہیں ہوگا مگر ہائے رے قسمت..... آٹھ اقساط انکھی ہوئیں مگر میں نے ان اقساط میں سے ابھی تک ایک بھی نہیں پڑھی۔ اس قدر کرداروں کی بھرمار ہے کہ (معذرت کے ساتھ) میں ہر بار ایک دو سطر پڑھ کر چھوڑ دیتی ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ

میں نہیں آتا کہ کون کس کا کیا ہے وغیرہ وغیرہ.....؟ گنہت عبداللہ کا ”ہوا میں رخ بدل گئیں“ اب کچھ کچھ پڑھنے کے لائق ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حزرہ کیا چاہتا

ہے اور کس کو چاہتا ہے۔ دونوں کو ہی بے وقوف بنانا ہے؟

تیور نے خزینہ کے ساتھ بہت ظلم کیا۔ ایک چند گھنٹوں کا

بچہ ماں سے جدا کر کے بڑی خود غرضی دکھائی۔ اہل رضا

”شام رنگ سیاہ“ بہت خوب کہانی..... اہل رضا جب

بھی لکھتی ہیں اچھا ہی تخلیق کرتی ہیں۔ اللہ کرے کہ بسن کو

میرا مل جائے۔ افسانوں میں مصباح علی سید اور رحمانہ

آفتاب کے افسانے بہت پسند آئے۔ ”آئندہ اور

مشارب“ معاشرے کے ہر دوسرے گھر کی کہانی

..... ساس بھوکا کردار شاید ازل سے اب تک یونہی چلتا

رہے گا۔ مگر ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اچھی

لڑکیوں کو سسرال اچھا نہیں ملتا۔ اور جو لوگ شریف اور

اچھے ہوتے ہیں ان کے نصیب میں اچھی بھویں نہیں

فاطمہ حسن..... گوجرانوالہ

سب سے پہلے تو آپ بات کروں گی مصباح علی سید کی۔ ان کا نام دیکھتے ہی بندہ اسی صفحے پر جست لگاتا ہے۔ واقعی مصباح حس رنگ میں قلم ڈبو کر لکھتے نہ جنتی ہیں تو گوڑے گوڑے نہ صرف خود ڈوبتی ہیں قاری بھی ان کے

ساتھ کہانی میں کم ہو جاتا ہے۔ ”ترکہ“ پر اتنا خوب صورت

افسانہ اور انداز۔ پلیئر مصباح جلدی سے ہمارے لیے

طویل تحریر لائیں بے چینی سے انتظار۔ مکمل ناول میں شبینہ

گل کا ”جنگ“ اچھا لگا اور مجھے ایسا لگتا ہے یہ ان کا پہلا

مکمل ناول ہے۔ ایک تو کہیں ان کی طویل چیز پڑھی نہیں

دوسرے بھئی اگر یہ پہلا ہے تو بہترین کاوش۔ اللہ زور قلم

دے اور زیادہ۔ بہت معذرت اہل رضا کا ناول

ذرا خشک تھا آگے چل کر اچھا ہو جائے شاید۔ باقی

افسانے سارے مزے کے تھے۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی

طرح جان دار۔

ج: فاطمہ حسن جی! ہماری طرف سے آپ کو شادی

مبارک ہو۔ امید ہے آئندہ بھی آپ ہمیں اپنی راہ

سے ضرور آگاہ کریں گی۔

شمینہ اکرم..... لیاری

”آپ کے لیے دعاؤں کے نذرانے اور محبتوں

کے پھول لیے حاضر خدمت ہوں۔“ پتا نہیں کسی کے کہے

گئے لفظوں میں کیسی تاثیر تھی کہ اس ماہ نومبر میں تو جیسے ایک

نئی توانائی (لکھنے کے لیے) محسوس ہو رہی ہے جسم و جاں

میں.....

سب سے پہلے بات ہو جائے ”کرن کتاب“ کی

اس کو کرن میں ضم کر کے اچھا کیا اس میں کچھ سلسلے ختم کر

کے کچھ نئے سلسلے شروع کیے پر شبت جدی آگے بڑھنے کا

پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مگر پلیئر ایسا نہ ہو کہ اس کے سب سلسلے

ختم کرتے کرتے آپ بالکل ہی بند نہ کر دیں

(خدانا خواستہ) کیونکہ کرن ڈائجسٹ کی شان تو ”کرن



”کرن“ کے باقی سب سلسلے بھی پسند آئے کچھ ایسا تو ہمیں ڈھونڈنے سے نہ ملے جو پسند نہ آئے۔

بہر حال یہ میرا کرن میں دوسرا خط ہے امید ہے جگہ ملے گی میرے ہیسیڈ ان ڈائجسٹوں کو میری میڈیسن کہتے ہیں اور میں بھی کہتی ہوں جلدی سے لاویں بہت طبیعت ناساز ہے۔“

دعا ہے اللہ ہمارے پاکستان کے ساتھ ساتھ کرن کو بھی دن دینی رات چوٹی ترقی نصیب فرمائے (آمین) ”چکن اور آپ“ میں میری باری کب آئے گی آئے گی بھی کہیں بتائیے گا ضرور۔

ج: خوشی جی! بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی کرن کی اتنی پرانی قاری ہمیں خط لکھتی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی آرزو پوری کرے آمین۔

”چکن اور آپ“ میں جلد ہی آپ کو شامل کریں گے۔

فوزیہ شربت بانہی عمران آفندہ میں..... تجربات

2018ء کا نائل سینڈ لاسٹ کرن سوسورہا،

ماڈل کے ہیکے ہیکے نیناں لگے۔ کرن کے اشارت کے

سلسلے پڑھے۔ ”میری بھی سنئے“ میں سید افراز کے جواب

اجھے لگے۔ ”مقابلہ ہے آئینہ“ میں عابدہ مغزل بیٹ رپیں

دو تین سوال بہت دلچسپ تھے۔ سب سے پہلے ”ہوائیں رن“

بدل گئیں“ انوس تو بہت ہے تیور نے خزینہ کے ساتھ اچھا

نہیں کیا۔ پھر سوچا کہانی نے آگے بھی بڑھنا ہے ناں۔

دوسرا سلسلہ دار ناول ”شب نم کی سحر“ چلو جی فرجاد

نے تو اپنی بہر پسند کر لی۔ بڑی میزگی کھیر میں ہاتھ ڈالا

ہے فرجاد نے۔ یہ اسٹوری بھی دل میں جگہ بنانے میں

کامیاب ہوئی مگر ورنہ تو اتنے کرداروں کو پڑھتے ہوئے

سر جکر نہ لگتا تھا۔

ام طیفور کو میں یاد دہی کر رہی تھی۔ ”بنت سحر“ نے

کیوں چھوڑا اتنی اچھی رائٹ تھی۔ یہ تو ہمارے ساتھ اور قلم

کے ساتھ ظلم ہوا ناں..... ام طیفور کا ”ساگر کنارے“

بیٹ رہا۔ دادا پوتے کے شکوے، ہنس ہنس کر برا حال

اور اینڈ یہ آئندہ کا ایک ماہ کا اسٹاپ منہ چڑا رہا تھا۔ پلیز

اگر دو تین اقتطاع رکھی ہیں تو کہانی کے مزاج کو سی طرح

برقرار رکھیے گا تب ہی مزہ آئے گا۔

”جنگ“ اچھی تحریر تھی۔ رافع کو لگتا ہے۔ غیبی مدد ملی

ہوتیں۔ رابعہ افتخار کا ناول ”مجاور“ یہ ناول مجھے بہت اچھا لگا۔ اس میں گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کے لیے ایک بہترین پیغام ہے۔ آپ کے ساتھ تخلص وہ ہوتا ہے جسے آپ کے والدین اور بزرگ منتخب کرتے ہیں۔ جبکہ باہر کی دنیا میں صرف دھوکا ہی دھوکا ہے۔ مگر شبنم کا کردار لائق تقلید ہے۔ جنہیں ہم معاشرے کا ناکارہ عضو سمجھتے ہیں۔ اس کہانی سے یہ پیغام ملا کہ کبھی کبھی ٹھوکانا سکھ بھی آپ کے بہت کام آ سکتا۔ قدرت کے کارخانہ کی کسی چیز کو بھی بے کار نہیں سمجھنا چاہیے۔

ارباب گل کا ناول ”بیچ چھلاں رانی“ بھی بہت اچھا لگا۔ اس کی کہانی بھی دل میں گھر گئی اور ”ساگر کنارے“ ام طیفور کا مکمل ناول، میں نے ابھی پڑھنا شروع کیا ہے۔ مگر ام طیفور کی تحریر میں چٹنگی ہے اور یہ معاشرے کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔

ج: شمینہ اکرم! بہت شکریہ ”کرن“ کی کہانیوں اور سلسلوں کو پسند کرنے کا۔ کرن کتاب کا انداز بدلا تو ”آپ کا پیغام ایڈس کے نام“ سلسلہ بھی بند کرنا پڑا۔ اس بات کی بہت خوشی ہے کہ گھر میں سب کی پسند کا ”کرن“ میں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ اب آپ کو چاہیے کہ اپنے شوہر کے لیے ہر ماہ ہمیں پابندی سے خط لکھیں تاکہ انہیں بھی کرن پڑھنے کا موقع مل جائے۔ آپ کا خط ہی سکھی۔

خوشی سرائوالی..... سیالکوٹ

الحمد للہ ”کرن“ کے ساتھ ہمارا سفر تقریباً پندرہ سال سے رواں دواں ہے ”کرن“ کو ہمیشہ لا جواب پایا۔ سب سے پہلے بات ہو جائے سمجھتے صاحب کے ناول پڑھنے پڑھ کر اداسی سنیا لی نہیں جارتی ہے۔ تیور غزنی کی اپنی بیوی سے جاہت اپنی جگہ قابل رشک سی لیکن دوسری بیوی کے ساتھ یہ ظلم رلا گیا۔ میں خود سارہ کی طرح پندرہ سالوں سے بچوں کے لیے بے تاب ہوں لیکن پھر بھی کسی ماں پر بغیر اجازت سے ظلم گوارا نہ ہوا دل دکھ سے بھر گیا باقی ناول زبردست جا رہا ہے پھر ”شب نم کی سحر“ پڑھا دونوں سوکوں کا پیار واہ! کیا ہی اچھے طریقے سے عورتوں کو سبق دیا۔ گل ارباب کا ”بیچ چھلاں رانی“ جو پہلے مثالی بلکہ نایاب بھی بعد میں وہ ”انگور کھٹے ہیں“ کے مصداق ہو گئی سمجھ سے باہر ہے۔



تھی حق بابا کی صورت۔ آج کے دور کی مادہ پرست کہانی ہر دوسرے بندے کی یہی سوچ ہے ہمیں ہماری سوچ کے مطابق ملنا چاہیے مقدر پر یقین رکھنا چھوڑ دیا ہے۔

ایکسل رضا کا ناولٹ ”شام رنگ سیاہ“ لگتا ہے یہ تحریر بھی ایک یادگار تحریر ہوگی۔ ”مجاور“ راتو رات بیٹ تحریراتی بڑی کائنات کہیں نہ کہیں ایسے لوگوں بھی بستے ہوں گے۔ مجھے تو اب اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں لگتا۔ اگر مجھے کوئی کہے۔ انسان پر لگا کر آسمانوں پر سفر کر رہے ہیں تو میں یقین کر لوں گی۔

تیسرا ناولٹ ”پنچ پھلاں رانی“ حد ہوتی ہے خود پسندی کی۔ اتنی خود پسندھی پیلا، زوار نے اچھا فیصلہ کیا ورنہ تو عمر بھر کا روٹا پالے بڑ جاتا۔ ویسے بھی کہتے ہیں جہاں کی اینٹ ہو وہاں ہی اچھی لگتی ہے۔ افسانے تینوں ہی بیٹ تھے۔ اللہ کی مرضی خوشی رشتوں کی بھینک عکاسی کرتی ہوئی تحریر۔

”آئندہ اور مشارب“ لوگوں کو جب تک ٹھوکر نہ لگے جب تک عقل شریف ٹھکانے نہیں آئی۔

فریدہ فرید کے ”وہ سٹ“ کی مجھے بالکل بھی سمجھ نہیں آئی۔ وہ سٹ رشتوں کا تھاپا ایک دوسرے کی چالاکیوں کا۔

کرن کے مستقل سلسلے بھی کرن کتاب میں شامل کر لیے ہیں بہت اچھا کیا اس طرح تحریروں کو زیادہ صفحہ مل جائیں گے۔

میرے پاس پنچ موبائل نہیں۔ آپ اب کرن کتاب میں کچھ ڈیکوریشن بنانے کے بھی طریقے بتائیں بمع تصاویر۔ اس سے کرن کتاب اور زیادہ اچھی ہو جائے گی۔ ”نامے میرے نام“ خوب محفل جی رہی۔ میرا اکرم..... ٹنڈو خان۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی دل ٹوٹے ٹوٹے کرویا۔

ج: فوزیہ جی! حسب معمول بھر پور تبصرے کے ساتھ خوش آمدید آپ کے مشورے پر غور کیا جائے گا ان شاء اللہ۔ اور رہا آپ کے دل ٹوٹنے کا سوال تو وہ تو حیرا اکرم ہی جوڑیں گی۔

ثناء ذوالفقار..... نورے والی رحیم یار خان  
نوبر کا ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ محمد علی جوں کا اندر دیا اچھا

تھا۔ ان کا ڈرامہ بین خالد کی بیٹیاں میرا فیورٹ ہے۔“  
مقابل ہے آئینہ“ میں عابدہ منٹل نے اچھے جوابات دیے۔  
آخر میں انہوں نے اچھی بات کہی۔

فہرست میں ایکسل رضا کا ناولٹ ”شام رنگ سیاہ“ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ پہلی قسط ایکسل رضا بہت اچھی لکھی۔ سین کے نکاح کا بہت افسوس ہوا۔ اس قسط کے صفحات بہت کم تھے پلے زیادہ صفحات دیا کریں۔

”جنگ“ بالکل بھی اچھی نہیں لگی کہانی طویل بہت تھی اتنی مشکل سے مکمل کی۔ لیکن موضوع اچھا تھا جس میں لڑکے والوں کے جذبات دکھائے گئے تھے۔ حق بابا کا کردار اچھا تھا۔

”سارگرنارے“ پہلی قسط ام طیفور نے بہت اچھی لکھی۔ ماحور بہت بہادری سے حالات کا مقابلہ کر رہی ہے۔ سون اور دادا کے کردار بھی مزے کے ہیں۔ سون اور دادا کی ٹوک جھوک بھی اچھی لگی۔

”مجاور“ اچھی انٹرٹیننگ اسٹوری تھی۔ شبنم کا کردار بہت متاثر کن تھا۔ اینڈ بھی اچھا تھا۔ ”وہ سٹ“ شروع میں تو ٹھیک تھا لیکن اینڈ سے کچھ مجھ میں نہیں آیا۔

”آئندہ اور مشارب“ میں نادر اور فہمت نے مشارب کے گھر والوں کو اچھا سبق سکھایا۔

”ہوا میں رخ بدل گئیں“ شکرے حمزہ نے شہرینہ کو سب کچھ بتا دیا اور شہرینہ کی غلط فہمی دور ہوئی۔

”اللہ کی مرضی“ مصباح علی سید نے بہت اچھے موضوع پر لکھا ہمارے معاشرے میں بیٹی کا جائیداد میں سے حصہ مانگنے کو برا سمجھا جاتا ہے جبکہ یہ اس کا حق ہوتا ہے جو اس کو اللہ نے دیا ہے۔

”کرن کتاب“ میں بروچ کے متعلق پڑھ کر اچھا لگا مجھے بروچ بہت پسند ہیں اور میں اسے دو پناہیٹ کرنے کے لیے استعمال کرتی ہوں۔

”مسکراتی کرئیں“ اس مرتبہ بہت اچھی تھیں۔

”نامے میرے نام“ میں اپنا خط دیکھ کر خوش ہوئی۔

ج: ثناء جی! کرن کی کہانیوں پر اپنی رائے دینے کا بہت شکریہ۔ آپ قارئین کی رائے کی روشنی میں ہم ”کرن“ کو بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔



بتول فاطمہ..... دریا خان

شہین گل کا ناول ”جنگ“ میں لفظوں، جملوں کی

جنگ چھڑی رہی، میری نظر سے ان کا پہلا ناول گزرا ہے۔ جو ایک اچھی کوشش ہے۔ ناول میں شہین گل کا نام بھی نیا لگا اور کہانی کا عنوان بھی ”جنگ پھلاں رانی“ ایک زبردست کہانی تھی اپنے نام کی طرح سے چھائی۔

ایک پیغام رنج چوہدری تک پہنچا دس کہانی کا پلاٹ بہت جاندار تھا۔ اگر اسے سیریل لے کر لکھتیں تو پر لطف کے ساتھ پرائز بھی بنتا۔ اب یہ ام طیفور کا شروع ہوا ہے۔ ”ساگر کنارے“ یہ کیسا رہے گا۔ مجھے ان کا حراج پسند ہے۔ مستقل سلسلوں میں آپ کی محنت بولتی ہے جو نظر بھی آتی ہے۔ ”مقابلہ ہے آئینہ“ میں عابدہ فضل نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا اچھا۔

راج: بتول فاطمہ! ہمیں آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آپ نے کل کر اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ ”تاسے میرے نام“ کی محفل میں شرکت ضرور کریں گی۔

حمیرا اکرم..... ٹنڈو محمد خان

نومبر کا کرن حسب تاریخ ملا، یعنی پندرہ کو، تو جناب سب سے پہلے بھاگے ”تاسے میرے نام“ والے صفحے پر اپنا خط ڈھونڈنے، خطوط کے پہلے ہی صفحے پر اپنا نام نظر آیا تو خوشی سے اچھل پڑی ”ناٹل“ سادہ سی ماڈل اچھی لگ

خواتین کے اس ادارے سے میرا تعلق نیا تو نہیں برسوں پرانا ساتھ ہے، اب تو یاد بھی نہیں کس عمر میں اور کس نے یہ رسالے پڑھنے کو دیے تھے۔ لیکن بر ملا کہوں گی زندگی کی اونچ نیچ سکھانے میں ان رسالوں کا بہت ساتھ دیا ایک سے بڑھ کر ایک رائٹر نے ہمارے دلوں میں گھر کیے۔ نومبر کا رسالہ اپنے سرورق کے ساتھ بہت دل کش لگا۔ کہانیاں اپنی روئین پر پڑھیں۔ اب ایسا نہیں کہ رسالے کا انتخاب اچھا نہیں لگا سب کچھ اپنی روئین پر تھا جو دل کو بھایا لیکن یہ ایک سچی حقیقت ہے خط لکھنے اور مخاطب ہونے کا سبب صرف مصباح علی کا افسانہ بنا۔ پتا نہیں اس لڑکی کا انتخاب سب سے الگ کیوں ہوتا ہے۔ چار پانچ صفحات پر آنے اور جانے والی نسلوں کی ذہنیت گھول کر رکھ دی۔ کیا مولوی، کیا چوہدری کیا پانچ مرے کا ترکہ کیا خوب صورت جملہ لکھا۔

”صدقہ، خیرات، زکوٰۃ سب جائز سمجھ رہے تھے حق نہیں“ یہ جملہ مجھے اندر تک کاٹ گیا، خط بھی اسی لیے لکھا اس کہانی نے مجھے جیسے جکڑ لیا اور آج بھی نکل آئے۔ آج سے بیس سال پہلے یہ سب میرے اوپر بیت چکا ہے۔ میں نے بھی صرف اپنے جیسے کا قاضا کیا تھا۔ بھائیوں نے دینا تو خاک تھا آج تک کسی بھائی بھانجی کا منہ سیدھا نہیں ہوا۔ کیا جسے کے وارث صرف بیٹے ہوتے ہیں اور وہ ازل تک باپ کے چھوڑے گھر کے اکیلے مالک ہوتے ہیں۔ مصباح علی اپنی منفرد موضوع لکھنے کی وجہ سے پہلے ہی میرے دل کے قریب تھیں اب اس افسانے نے مجھ ساٹھ سالہ عورت کو اپنا کیا کھن بنا لیا۔ ابن سے فرمائش ہے جلدی سے ہمارے لیے بڑی تحریر لائیں ”اللہ کی مرضی“ لکھنے پر بہت مہربانی۔

کیونکہ خط لکھنے کی اصل وجہ یہ افسانہ تھا لیکن باقی شاعر بھی بہت اچھا تھا اور کرن کا ہم مزاج۔ فریدہ فرید کا ”ویدہ سہ“ ایک چھوٹا سا مسکراتا افسانہ، کہانی عام لیکن لکھنے کا انداز پر مزاح تھا۔ محل ناول میں راجہ افتخار کا ”مجاور“ بہت اچھا پیغام تھا ثروت جیسی لڑکیاں بھی اسی معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ اور پھر انہیں گل پر ہی ٹکراتے ہیں۔ اچھی جملی زندگی کو دوزخ کرنے کے لیے۔

بہنوں کے لیے خوش خبری

آج ہی تعریف لائیں اور

**30% فیصد ڈسکاؤنٹ**

حاصل کریں ہماری شاپ پر موجود

تمام کتب کی سیل جاری ہے

یہ رعایت صرف کراچی کی بہنوں کے لیے ہے

شاپ کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



رہی تھی۔ ”انٹرویو“ سب کے اچھے تھے۔ ”مقابلہ ہے آئینہ“ عابدہ مغل سے مل کر بہت اچھا لگا سب جوابات اچھے تھے ان کے، فائز ناول ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ تیمور نے اچھا نہیں کیا خزینہ کا بچہ چین کر، ایک کو خوش کرنے کے لیے خزینہ کا دل دکھایا بچتاؤ گے اور مزہ نے شہرینہ کو حقیقت بتا کر اچھا کیا کہ اس کی بدگمانی جو دور ہو گئی۔ رخ بھی کے ناول ”شب غم کی سحر“ شکر سے اس بار کی قسط کچھ پڑھنے جو کی تھی، ورنہ میں نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ اب یہ ناول پڑھوں گی ہی نہیں۔ ناول ”معاذ“ بہت سہرپ تھا راجہ جی نے سب تحریروں سے مختلف لکھا تیجور کی کہانی، واہ راجہ کیا کہنے آپ کے ”شام رنگ سیاہ“ بہت پیسٹ تھا پرائیڈ میں آئندہ ماہ پڑھ کر موڈ آف ہو گیا، لیکل ٹینکس، ”بچ بچلاں رانی“ زوار کو سہرا ملتی چاہیے تھی اپنے غروں کی پر نہیں جی، مزا نہیں آیا۔ مل ناؤز..... ام طیفور، ویلکم ”ساگر کنارے“ بہت سہرپ تھا، ماحور بے چاری، مومن بہت برا لگا، پر یہ کیا اس کے آخر میں بھی آئندہ ماہ پڑھ کر جو غصہ آیا نہ ہی پوچھیں، پر کیا کرتی اب اگلے ماہ کا تو انتظار کرنا ہی تھا ناں ”جنگ“ شبینہ گل نے بہت اچھا لکھا، لالچی لوگوں انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کرن کتاب شارے کے ساتھ ہی لگا دی، الگ سنبھالنا مشکل ہوتا تھا کرن کتاب بھی پوری کی پوری وڈو فیل تھی، صائمہ سحر کے جوابات بہت پسند آئے پراحدور سے تھے اور بھی دس بارہ سوالات اور ہوتے ناں، اچھا ہوتا۔

ج: حمیرا اکرم جی! کرن کی کہانیوں اور سلسلوں کو پسند کرنے کا بہت شکر ہے آپ سب قارئین بہنوں نے ”کرن کتاب“ کے نئے انداز کو سراہا ہے اور ہماری حوصلہ افزائی کی ہے ہم اپنی تمام قارئین بہنوں کے شکر گزار ہیں۔  
اقراء ممتاز..... سرگودھا

اس دفعہ کا شمارہ 16 تاریخ کو مل گیا تھا ناسٹل گرل اچھی لگ رہی لیکن میری سسز وئیرا کو اس کی بالیاں کچھ خاص پسند نہیں آئیں۔ سب سے پہلے شاہین رشید کا شکریہ جنہوں نے بغیر کہے ہی محمد علی جوش اور سید افراز رسول سے ملاقات کروادی۔ ”مقابلہ ہے آئینہ“ میں عابدہ مغل کے جوابات سوسو لگے۔

”ہوائیں رخ بدل گئیں“ اس دفعہ کی قسط سہرپ تھی شکر ہے کہ مزہ نے شہرینہ کی غلط فہمی دور کر دی۔ کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی جا رہی ہے کہانی میں حرا آ رہا ہے۔

”شب غم کی سحر“ کیا کمال کی اسٹوری ہے ساجد ایک معاملے میں تم خوش نصیب ہو جو نہیں اتنی پیار کرنے والی بیو پال ملی ہیں۔ ”ساگر کنارے“ اس ماہ کا بیسٹ ناول تھا۔ کہانی پڑھتے ہوئے ارد گرد کا ہوش ہی نہیں رہا کہانی کا ساہرا حرا جی کرکرا ہوا۔ جب لکھا تھا کہ بانی آئندہ ماہ۔ اگر کبھی باقی آئندہ ماہ والی کہانی ہو تو کہانی کے شروع میں ہی لکھ دیا کریں تاکہ ہم سب کچھ پڑھ سکیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ام طیفور کی کہانی ہو اور لوگوں پر مسکان نہ ہو۔ واد اتم تو بہت سبکوں نکلے کیا تھا ایک آدھا پھل ہمسایوں کو بھی پیچ دیتے وہ بھی خوش ہو جاتے۔

”جنگ“ بہت عمدہ ٹاپک تھا۔ ہمیشہ حق مہرا اپنی حیثیت کے مطابق لکھواتا جا رہے۔

”شام رنگ سیاہ“ لیکل رضا کا نام ہی کافی ہے۔ سین کو اس کے حالات نے اس قدر متاثر کر دیا ہے۔

”بچ بچلاں رانی“ زوار اتنی خوبیاں والی لڑکی اب اس دور میں ملنا مشکل نہیں نامکن بھی ہے۔ کریمیں لگا کر رنگ تو گورا کر لے لی لیکن زبان سے آگ ہی نکلے گی۔ زوار جنہیں بیلانے صحیح آئینہ دکھایا۔

افسانہ ”آئندہ اور مشارب“ بہترین کہانی تھی۔ عارفہ تم نے خوش نصیب تھیں جو جنہیں آئندہ جیسی سہوٹی۔ اور مشارب جیسا لائق اور سعادت مند بیٹا ملا۔ ”چکن اور آپ“ میں صائمہ سحر کے جوابات پسند آئے۔ یہ بہت اچھا کیا ہے کہ کرن کے ساتھ ہی کرن کتاب ہو گئی ہے۔ ”نئے میرے نام“ میں شاہ شہزادی آج کل کچھ زیادہ ہی غیر حاضر رہنے لگی ہیں اس آئندہ آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ اس ماہ کا کرن سارا بیٹ تھا۔ میری سسز وئیرا آپ کی آپ کو سلام کہہ رہی ہیں۔

ج: اقراء ممتاز جی! زونیرا جی..... علیکم السلام۔  
اقراء آپ کا ”کرن“ پر بھر پور تبصرہ بہت اچھا لگا۔ کرن کتاب کے نئے انداز کو پسند کرنے کا شکریہ۔

☆☆



# کرن ٹیگاز

نیا ٹرمڈ

گولڈ میک اپ

ضرب اور

فیس بک

نامیاتی کھاد

باغبانی

معاشرتی اور نفسیاتی مسائل

کرن کا دسترخوان



## نیا ٹرینڈ..... گولڈ میک اپ

طرح پلٹ کر لیں۔ اس کے بعد آئی برو کو براؤن پنسل کی مدد سے واضح کریں۔ براؤن اور بلیک شید کوکس کے آئی برو پر پیمیں اس طرح آئی برو کو بھی مخصوص ہوں گی۔ اس کے بعد آئی میک اپ شروع کریں۔

**پرائمر:** سب سے پہلے آنکھوں پر پرائمر لگائیے، یہ بہت ضروری ہے۔ اس کی مدد سے میک اپ آنکھوں پر زیادہ دیر رہ سکے گا اور اس پر کریم بھی نہیں پڑے گی۔

**بیمیں شید:** کسی مدیم رنگ کو بیس شید کے طور پر منتخب کیجیے اور ان کو بند آنکھوں کے اوپر لگائیے، اس میں شید کی مدد سے گولڈن لک آنکھوں پر اچھی طرح واضح ہو سکے گا۔



**گولڈ آئی شید:** آج کل گولڈ شیدز پر مشتمل آئی کٹ عام دستیاب ہیں۔ ان میں گولڈن رنگ کے گہرے اور مدیم چمک دار اور میٹ رنگ موجود ہوتے ہیں۔ آپ اپنی پسند کے مطابق کوئی ایک شید منتخب کیجیے اور اس کو بند آنکھوں کے درمیان لگا کر، آنکھوں کی کریم سے ملائیے۔

**براؤن آئی شید:** گولڈن میک اپ کو منفرد انداز میں مکمل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ آئی شید میں براؤن رنگ کا احراج بھی شامل کریں۔ براؤن شید کو آنکھوں کے کنارے پر لگا کر پلٹ کر کیجیے۔

آئی لائنز اور کارمل: یہ آپ کی پسند پر مشتمل ہے، لکیر پینڈ، جنیل یا پنسل آئی لائنز لگائیے اور کارمل سے گولڈن لک مکمل کر لیجیے۔

**مسکارا:** کسی بھی قسم کا آئی میک اپ، مسکارا کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے میک اپ مکمل کرنے کے بعد اسے احتیاط سے لگائیے۔ سیاہ مسکارا میک اپ لک مکمل کر دے گا۔

آئے دن میک اپ کرنے کی مشق نہ کیجئے اور پراکٹس سامنے آتی رہتی ہیں، جنہیں ہر کوئی آزمانے لگتا ہے۔ خواتین کو رات کے وقت کسی پارٹی میں جانا ہو تو وہ یقیناً نچرل میک اپ تو کریں گی نہیں، اس لیے کہ کچھ مخصوص رنگوں کا استعمال کر کے میک اپ کیا جاتا ہے۔ ان مخصوص رنگوں میں ایک رنگ گولڈن بھی ہے جو رات کے وقت ہونے والی کسی بھی قسم کی تقریبات کے لیے نہایت پوزیشن پر رکھنا جاتا ہے۔ اس لیے گولڈ میک اپ کرنے کی کچھ ٹیکنیکس بتائی جا رہی ہیں جنہیں پھر خاتون رات کے وقت کسی بھی تقریب میں جانے سے قبل آزما کر اپنا میک اپ خود کر سکتی ہیں۔

اس میک اپ کو کرنے کے لیے میک اپ بیس، کنسلر، فائوڈیشن، پش، آن، آئی شید وکٹ (جس میں بلیک، براؤن اور گولڈن شیدز لازمی موجود ہوں) بلیک آئی لائنز، بلیک مسکارا، لک، پائلس، لال، رنگ کی لپ اسٹک اور میک اپ برش کٹ کی ضرورت ہوگی۔

پارٹی میک اپ کرتے وقت بیس کی طرف بھی خاص توجہ دینی چاہیے۔

سب سے پہلے کنسلر سے داغ دھبوں اور حلقوں کو چھپائیں، پھر اس کے بعد اپنی رکھت سے ملتا جلتا بیس لگائیں اور اچھی طرح پلینڈ کریں۔ اس کے بعد فائوڈیشن لگائیں اور پھر پلینڈ کریں تاکہ بیس میں دو رنگ نظر نہ آئے بلکہ یکساں پورے چہرے پر مخصوص ہو۔ اس کے بعد رخساروں کی ہڈی سے اوپر کی جگہ پر ہائی لائنز، رخسار کی ہڈی پر اپنی پسند کے رنگ کا پش آن لگائیں۔ چاہیں تو خاک یا پھر ہلکے گلابی رنگ کا شید بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد رخسار کی ہڈی کے نیچے براؤن شید لگائیں یا پھر برڈوزر لگائیں۔ ہائی لائنز، پش آن اور برڈوزر کو اپنی جگہ پر اچھی



# بیوٹی باکس ..... سوالات جوابات

کرنے اور جلد کو سرخی مائل گھٹتے کرنے کی خاص خوبی ہے۔ اگر آپ باقاعدگی سے یہی کارجر کارس استعمال کریں تو آپ کی جلد بہت اچھی اور گھٹتے ہو جائے گی۔

ایک اٹھ توڑ کر اس کی زردی کسی پیالے میں الگ کر کے اس میں دو چائے کے چمچے روغن بادام ملائیں اور ایک چائے کا چمچ لیموں کا عرق شامل کر کے ان سب کو اچھی طرح چٹائیں کہ جھاگ بن جائے پھر اسے آہستہ آہستہ چہرے پر ملیں۔ دس سے بارہ منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر نیم گرم پانی سے چہرے کو دھو لیں۔ یہ عمل اگر آپ پابندی سے کریں گی تو آپ کی سرخ و سفید رنگ دوسروں کو حیران کر دے گی۔

س: میری کہنیوں کی جلد سیاہ اور خشک ہے۔ جو بہت بری لگتی ہے۔ اس کا کوئی علاج بتائیں؟

ج: نعمانہ اظہر..... واہ کیسٹ  
ج: کہنیوں میں سیاہ اور خشکی کے وجہ یا میل ہاتھوں اور بازوؤں کا حسن عارت کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے آپ لیموں کا عرق باقاعدگی سے استعمال کریں۔ لیموں کا عرق کہنیوں پر لگانے سے یہ سفید اور نرم ہو جاتی ہیں۔ کہنی کی سخت جلد کو ملائم کرنے کے لیے بادام کا پاؤڈر بنا کر اس میں تھوڑا لیموں کا عرق ملا دیں۔ اس کے علاوہ کہنی پر میک اپ کرنے کے لیے سب سے پہلے کوئی کولڈ کریم لگا میں پھر اس پر پاؤڈر چھڑک کر اب نشو سے اچھی طرح رگڑ دیں۔ چند دن کی توجہ سے کہنی کی رنگت کھر جائے گی۔

س: آپلی میری عمر میں سال بھار میرے سر میں بہت خشکی ہے۔

ج: آپ تیز مروج مسالوں سے پرہیز کیجیے اور سر کی خشکی کے لیے یوٹیکا استعمال کیجیے۔

اپنے سر اور ہاتھوں کو ہلکا سا میلا کیجیے اور ایک چمچ بیکنگ سوڈا لے کر اپنے سر پر آہستہ آہستہ ملیے اور ساتھ سے نوے سینکڑے کے لیے لگا رہنے دیجیے۔ اس کے بعد بال دھو لیں، یہ آپ ہفتہ میں کم از کم تین بار کیجیے۔

☆☆

س: میری عمر 37 سال ہے اور میرے ماتھے پر لکیریں بننے لگی ہیں۔ ان کو دور کرنے کا کوئی طریقہ بتادیں؟

ج: پھل اور سبزیوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔

خاص طور پر وہ سبزیاں اور پھل جن میں وٹامن اے، سی اور ای ہو۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل ٹوٹکا بھی استعمال کریں۔

شیشی پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، دہی دو کھانے کے چمچے، ہلدی ایک چمچی۔ ان سب کو ملا کر چہرے پر پندرہ سے بیس منٹ تک مساج کریں، پھر چہرے کو دھو لیں۔

س: میرے چہرے پر بال بال اور روئیں بہت زیادہ ہیں۔

میں بازاری چیزیں استعمال نہیں کرنا چاہتی کہ میری جلد بہت حساس ہے۔ کوئی دیکھی علاج بتادیں؟

ج: اقصیٰ ناز..... جویلیاں

ج: چہرے پر بال بال اور روئیں دور کرنے کے لیے ایک کھانے کا چمچ خشک شیشی کر سفوف بنالیں۔ کیلے چہرے اور ہاتھ پر جہاں روئیں ہوں، اس کو انگلیوں کی پوروں سے نہایت آہستگی کے ساتھ مساج کریں۔ روزانہ کے استعمال سے آپ کے چہرے اور ہاتھ کے پائندہ بال اتر جائیں گے۔

س: میرے چہرے پر براؤن مکر کے وجہ ہیں۔ ان کو دور کرنے کے لیے کوئی آسان سا طریقہ بتادیں؟

ج: فرح خانم..... سبجرات

ج: اکثر چہروں پر موسم یا جلد کی کسی بیماری کی وجہ سے داغ دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اس کے لیے آپ لیموں کا رس چہرے پر لگائیں، اسے خشک ہونے دیں۔ جب خشک ہو جائے تو منہ ہرگز نہ دھوئیں بلکہ اسی کو اسی طرح رہنے دیں، چند روز کے استعمال سے داغ دھبے دور ہونا شروع ہو جائیں گے۔

س: میرا مسئلہ میری رنگت کا ہے۔ میرے ہاتھ، پی اور گردن کا رنگ تو بہت صاف ہے۔ مگر چہرے کا رنگ کم ہے۔ چہرے پر پڑ روئی چھائی رہتی ہے۔ پیاروں والا چہرہ لگتا ہے۔

ج: حرا شاہین..... لاہور

ج: گاجر کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ گاجر میں خون صاف



انار میں الرجنی دور کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کا ایک جزو "پولی فینولز" کا بھی ہوتا ہے جو ان بائیو کیمیکل تبدیلیوں کو کم کر دیتا ہے جن کا تعلق مختلف الرجیز سے ہوتا ہے۔

انار کھانے سے پروٹینٹ کینسر اور بریسٹ کینسر کا خطرہ بھی گھٹ جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے کینسر کے خلیات مردہ ہو جاتے ہیں۔ انار ڈی این اے کو بھی تحفظ فراہم کرتا ہے۔

انار مینا بولک سسٹم کو باقاعدہ بناتا ہے۔ اس سے خون میں شکر کی سطح معمول کی حد میں رہتی ہے۔ انسولین سے حساسیت بہتر ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں غذا کے جزو بدن بننے میں جو رکاوٹیں ہوتی ہیں، ان کو دور کرتا ہے۔ ان رکاوٹوں کے باعث مٹاپا جڑ پکڑتا ہے اور بعد میں یہ ذیابیطس کا سبب بنتا ہے۔

انار انفیکشن سے بھی بچاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھولنے کے مرض یعنی الزائمر کے بڑھنے کی رفتار گھٹا دیتا ہے۔

جوزوں کے درد میں بھی انار کو مفید پایا گیا ہے کیونکہ اس تکلیف سے نجات کے لیے اس میں فاسٹو نیوٹریکس Ellagic Acid اور پولی فینولز موجود ہوتے ہیں نہ صرف انار بلکہ اس درخت کا ہر جزو مفید ہے۔ اس کا چمکا، پھول اور درخت کی چھال اطباء دوا کے طور پر تجویز کرتے ہیں۔

آج کل انار کا میزن ہے لہذا اس خوش ذائقہ اور خوش رنگ پھل سے نہ صرف بھرپور لطف لیں بلکہ بیان کردہ فوائد بھی حاصل کریں۔

☆☆☆

انار نہایت خوش مزہ، ریلا پھل ہے۔ مزے کے لحاظ سے کھٹا، میٹھا اور کھٹ میٹھا ہوتا ہے۔

پرانے حکیم انار کے غذائی اور دوائی فائدوں سے اچھی طرح واقف تھے اور جدید تحقیقات بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ انار میں پروٹین، شکر، کیشیم، فولاد اور فاسفورس جیسے اجزاء پائے جاتے ہیں، جو خون کی پیدائش اور بدن کی نشوونما میں کام آتے ہیں اور خون کو حالت اعتدال پر قائم رکھتے ہیں۔

انار کا رس آپ کی بڑھی ہوئی توغہ کو گھٹا سکتا ہے۔ انار کے دانوں میں نہ صرف مردوں بلکہ خواتین کے پیٹ کی اضافی چربی بھی گھٹانے کی

صلاحیت ہے۔ ایک ریسرچ کے مطابق کچھ افراد کو انار کے رس کی ایک بوتل روزانہ پلائی گئی تو نتائج میں یہ بات سامنے آئی کہ ان کے پیٹ میں چربی کے خلیات جمع نہیں ہو رہے۔ نہ صرف پیٹ میں چربی نہیں جم رہی بلکہ ان کا بلڈ پریشر بھی کم ہو گیا جس سے ان میں دل کے دورے، فالج کے حملے اور گردوں کے ناکارہ ہونے کی خطرات گھٹ گئے۔

انار میں اینٹی آکسیڈنٹ مادوں کی مقدار زیادہ ہوتی ہے جو ضرر رساں آکسیجن کے سالموں کو جنہیں "فری ریڈیکلز" بھی کہتے ہیں، ناکارہ کر دیتے ہیں۔ اگر ان سالموں پر قابو نہ پایا جائے تو وہ خلیات کو تباہ کرنا شروع کر دیتے ہیں، جس سے دل کی بیماریاں اور کینسر تک لاحق ہو سکتے ہیں اور جسم پر بڑھاپے کے اثرات وقت سے پہلے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

انار جسم کے مدافعتی نظام کو طاقتور بناتا ہے۔ انار کے دانوں اور جوس میں پیاریوں سے محفوظ رکھنے والے وٹامن سی کی قائل ذکر مقدار ہوتی ہیں جو جسمانی توانائی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔



## عام استعمال کی چیزوں کی ایکسپانری ڈیٹ

بعد بھی اسے استعمال میں لایا جائے تو اس میں جراثیم جمع ہوتا شروع ہو جاتے ہیں جو تویوں کی دھلائی کے باوجود بھی جمع رہتے ہیں اور جلدی بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔

**نکیہ:-**

نکیہ بھی لوگ سالہا سال استعمال کرتے ہیں اور اسے

بدلتا نہیں

چاہتے، بعض

لوگوں کو تو

اپنا نکیہ ہی

استعمال

کرنے کی

عادت ہوتی

ہے کہ

انہیں اس

کے بغیر زندگی نہیں آتی۔ لیکن نکیوں میں گرد و دھول جمع ہوتی ہے، وہیں ان کی ہچک بھی بدل جاتی ہے۔ گرد و دھول کی وجہ سے الرجی ہونے کا احتمال ہوتا ہے جب کہ ہچک بدلنے سے سردی اور گردن اور کمر میں درد جیسے عارضے لاحق ہو جاتے ہیں۔ لہذا اپنا نکیہ ہر دو تین سال کے بعد بدلیں۔

### رضانیاں، کمفرٹرز:-

ہماری ماؤں کے زمانے تک لحاف یا رضائی ادھیر کر اس کا کور دھلوا جاتا تھا، جبکہ روٹی دھکوائی جاتی تھی۔ اب مصروف زندگی میں تو یہ ایک طرح سے ناممکن ہو گیا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اپنے اچھے قسم کے لحافوں اور کمفرٹرز

مختلف اشیاء جو ہمارے گھروں میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہم زیادہ تر کمانے پینے کی اشیاء یا پھر میک اپ کے سامان کی ایکسپانری ڈیٹ کے بارے میں ہی زیادہ مہمان بن کر رہتے ہیں۔ مگر کیا آپ کو پتا ہے کہ ہمارے گھروں میں بعض اشیاء جو ثانی، وادی کے وقت سے ہمارے زیر استعمال ہیں، ان کی بھی استعمال کی ایک مدت ہوتی ہے۔ خواتین ان

اشیاء کو خرید کر یہ ہی سوچتی ہیں کہ یہ سالہا سال چلیں گی مگر ایسا نہیں

ہوتا ہے۔ آئیے آج آپ کو کچھ ایسی ہی اشیاء کی تفصیلات بتائیں۔

### تولیہ:-

ان اشیاء میں سرفہرست تولیہ کا نمبر ہے۔

جب تولیہ خریدتی ہیں تو بھی سوچتی ہیں کہ اب سالوں کی چھٹی ہوئی۔ مگر ایسا نہیں ہے ایک سے تین سال کے دوران تولیے کے استعمال کی مدت ختم ہو جاتی ہے اور یہ مدت استعمال بھی تولیوں کی کوالٹی پر منحصر ہے۔ ابھی کوالٹی والا تولیہ تین سال تک استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اگر کوالٹی خراب ہو تو وہ ایک سال میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھیں کہ اگر مدت گزرنے کے

کرت کتاب







## جھوٹی خبریں اور فیس بک

تصاویر پر غور کریں۔ جعلی خبریں اکثر ترمیم کردہ تصاویر اور ویڈیوز پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بسا اوقات ہوسکتا ہے تصاویر اصلی ہو لیکن سیاق و سباق کے خلاف لی گئی ہو۔ اس لیے تصاویر اور ویڈیوز کو تلاش کر لیں کہ وہ کہاں سے آئی ہیں۔

تاریخوں کا جائزہ لیں۔ جعلی خبروں والی کہانیاں غیر معقول اوقات یا تقریب کی تبدیلی کردہ تاریخوں پر مشتمل ہو سکتی ہیں۔

ثبوت کی جانچ کریں۔ خبروں میں موجود واقعات، شواہد اور ثبوت کی درستی کے ساتھ جانچ پڑتال کرنے سے بھی آپ افواہوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ خبر میں ثبوت کا فقدان یا بے نام ماہرین کے نام جعلی خبر کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

دیگر ذرائع سے بھی دیکھ لیں۔ کسی بھی خبر کو کسی دوسرے ذرائع سے بھی تصدیق کریں اگر خبر کو قابل اعتبار ایک سے زیادہ ذرائع نے شائع کیا ہے تو اس کے صحیح ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

خبر کہیں مذاق تو نہیں؟ اس بات کی بھی تصدیق کر لیں کہ جس خبر نے آپ میں سسنی پیدا کر دی ہے کہیں وہ چھپا ہوا مزاح یا طنز تو نہیں۔ اس حوالے سے خبر کا مواد بتادے گا کہ خبر طنز و مزاح پر مشتمل تنقید ہے یا واقعی کوئی خبر ہے۔

جو خبریں آپ پڑھتے ہیں ان کے متعلق تنقیدی انداز سے سوچیں اور صرف ان خبروں کا اشتراک کریں جن کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ وہ قابل اعتماد ہیں۔

☆☆

کتاب

سوشل میڈیا پر جھوٹی خبریں اور گمراہ کن تصاویر کا دن بدن بڑھتا ہوا ایک طوفان ہے اور خاص طور پر پاکستان میں تو سیاسی خبروں نے ایک ابہام سا پیدا کر دیا ہے کہ کیا جھوٹ؟ ان جھوٹی اور گمراہ کن خبروں سے بچنے کے لیے فیس بک نے اپنے صارفین کو کچھ ہدایات جاری کی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر صارفین حقائق پر مبنی خبروں اور افواہوں کے درمیان فرق کر سکیں گے۔ اسی طرح مصدقہ خبریں ہی شیئر ہو پائیں گی۔

فیس بک نے اس حوالے سے اپنی ایک پوسٹ میں صارفین کو خبروں کے چٹاؤ میں محتاط رہنے کی تجویز دیتے ہوئے کہا ہے کہ جعلی خبروں کی شہ سرخیاں اکثر بڑے حروف میں اور دلکش ہوتی ہیں تاہم مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کرتے ہوئے خبروں کی صداقت کو پرکھا جاسکتا ہے۔

یو آر ایل (یعنی ویب ایڈریس) کو غور سے دیکھیں۔ جعلی خبروں والی ہر سی ویب سائٹس کسی خبر رساں ادارے کی یو آر ایل میں معمولی تبدیلیاں کر کے مصدقہ اخباری ذرائع کی نقلی کرتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی خبر کے یو آر ایل کو درست طریقے سے جانچ لیا کریں۔

خبر کے ذرائع کی تصدیق کریں۔ اس بات کو یقینی بنائیں کہ آیا خبر کسی غیر مانوس تنظیم یا ویب سائٹس کی جانب سے تو نہیں آئی ہے۔ اس لیے ہمیشہ مصدقہ ویب سائٹس اور یو آر ایل سے متعلق جانچ پڑتال کریں۔

خلاف معمول فاریٹنگ دیکھیں۔ جعلی خبروں والی کئی سائٹس پر املاک غلطیاں اور بے نکلے آؤٹ ہوتے ہیں اگر یہ علامات نظر آئیں تو احتیاط سے پڑھیں، یہ جعلی ہو سکتی ہیں۔



## پودوں کے لیے نامیاتی کھاد خود تیار کیجیے

گزشتہ کھوکھریہ سب Organic کوڑا اس کے اندر ڈال دیں اور جب یہ گڑھا بھر جائے تو اس پر مٹی کی کم از کم چھ انچ موٹی لٹکادیں اور اوپر سے پانی کا چھڑکاؤ کر دیں تاکہ مٹی کی نمی برقرار رہے۔ زیادہ پانی نہ ڈالیں کیوں کہ اس طرح سے کھاد خراب ہو جائے گی۔

اور اگر آپ کے پاس زمین نہیں ہے تو بھی طریقہ کسی بڑے کنٹینر کے ساتھ استعمال کریں۔ ٹھوڑی سی مٹی پہلے کنٹینر میں ڈالیں پھر اس کو کوڑے سے بھریں رہیں۔

تین سے چار مہینے میں یہ کھاد تیار ہو جائے گی۔ یہ جانچنے کے لیے آیا کھاد تیار ہے کہ نہیں، درست طریقہ یہ ہے کہ آپ کھاد والے ٹوکھ کو کھود کر دیکھیں کہ ان چیزوں کی جن کے ذریعے کھاد بنائی جا رہی ہے، رنگت تبدیل ہوئی ہے کہ نہیں۔ ان کی بدبو ختم ہوئی یا ابھی باقی ہے۔ یہ بھر بھری ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر یہ تینوں علامات ان میں نظر آجائیں کہ ان کی اصل مہک ختم ہوئی، رنگت بدل گئی ہے اور وہ بھر بھری ہو جائے تو پھر سمجھیں کہ کھاد تیار ہے۔ ورنہ کچھ دن اور انتظار کریں۔ یہ کھاد پھلکاری کے لیے بہت موزوں ہے کیوں کہ اس میں اتنی تیزی نہیں ہوتی اور یہ آپ کے گھریلو پودوں کے لیے کیمیکلز کے بغیر بہترین کھاد ہے۔

☆☆

اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ جب ہم زسری سے پودے خرید کر لاتے ہیں تو پودے ہرے بھرے اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں مگر گھر آ کر چند ہی دنوں میں اپنا رنگ و روپ کھوتا شروع کر دیتے ہیں۔ زسریوں میں انہیں تروتازہ رکھنے کے لیے مختلف قسم کی کھادوں اور کیمیکلز کا استعمال کیا جاتا ہے مگر آپ گھر پر آسانی قدرتی

کھاد تیار کر کے اپنے پودوں کی بڑھوتی اور خوب صورتی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو گھریلو تیار شدہ کھاد ہم استعمال کریں گے وہ ہر قسم کے مصرحت کیمیکلز سے پاک ہوگی۔

گھر میں روزانہ انواع و اقسام کا کوڑا کرکٹ جمع ہوتا ہے جسے ضائع کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے مگر آپ اسی کے ایک بڑے حصے کو قابل استعمال

بناسکتے ہیں۔ سبزیوں اور پھلوں کے چٹکے،

اٹھوں کے خالی خول،

گلی سبزی سبزیاں

اور پھل، چائے کی کھج

استعمال شدہ پتی، بچے کھج

کھانے، درختوں کے پتے، گھاس

پھوس اور اگر گوبر دستیاب ہو تو اسے بھی

استعمال کریں۔

اگر گھر میں جگہ ہے تو لان کے ایک کونے میں



## اچھا جیون ساتھی کیسے بنیں

دوسرے کی خود بخاری کا خیال رکھیں۔ اس سے نہ صرف آپ کو اپنے حیلوں پر کھڑا ہونے کا موقع ملے گا بلکہ آپ اپنے فیصلے بھی آسانی سے کر سکیں گے۔

04۔ کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جہاں آپ دونوں سکون سے بیٹھ کر اپنی مشکلات، پریشانیوں، شکوک و شبہات، خوف اور کمزوریوں کا بغیر کسی رکاوٹ یا پریشانی کے تبادلہ کر سکیں۔

05۔ ایک دوسرے کو دل سے چاہیں اپنے دل و دماغ میں اپنے ساتھی کی مشکلات، پریشانیوں اور خوشیوں کو بھرپور جگہ دیں اس کی خواہشات اور ضروریات کا خیال رکھیں۔ اپنے ساتھی کی مشکلات اگر حل نہیں کر سکتے تو کم از کم سن تو سکتے ہیں۔

06۔ اپنے اختلافات کو خوب صورتی سے حل کرنے کی کوشش کریں ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ آپ کی ہر بات یا فیصلہ درست ہو۔

07۔ اپنے تعلقات میں ذاتی امیثوز پر ہمدردی سے غور کریں تاکہ تعلقات میں کشیدگی بڑھنے کا اندیشہ نہ ہو، اپنے ساتھی سے کوئی ایسی توقع ہرگز نہ رکھیں جو وہ پوری نہ کر سکے۔

08۔ کچھ وقت تنہائی میں سوچنے کا بھی لیں اور کوشش کریں کہ صدمہ سے کسی بھی مشکل یا پریشانی کا حل تلاش کیا جائے۔

09۔ رشتہ داریوں سے ہٹ کر اپنے دوستوں کا نیٹ ورک قائم کریں جو غلط ہوں کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ ایک تعلق آپ کی تمام ضروریات پوری کر سکے۔

10۔ مسکراتا نہ کیجیے کیونکہ ہر وقت خود کو بخیرہ رکھنا اور مسائل میں گھرے رکھنا آپ کے لیے ہرگز اچھا ثابت نہیں ہوتا۔



رشتہ داریاں انسانی زندگی میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ہم سب ہی ایک دوسرے سے کسی نہ کسی رشتہ سے جڑے ہوئے ہیں بہر حال ان تعلقات میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی، مشکلات بھی ہیں اور آسانیاں بھی۔ رابطہ بھی ہیں اور فاصلے بھی۔ بے تکلفی بھی ہے اور تنہائی بھی۔ تعلقات بہر حال بہت عجیب اور ڈانٹا کھوتے ہیں اور اکثر ان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔

یہاں ہم آپ کے لیے دس ایسے کارآمد نسخے پیش کر رہے ہیں، جن کے ذریعے آپ ایک دوسرے کی اہمیت، محبت اور غلوں کو پہچان سکیں گے اور تعلقات کو بہتر انداز سے نبھاسکیں گے۔

01۔ ایک دوسرے پر اعتماد کرنا سیکھیں بلکہ اس میں اضافہ بھی کریں جب آپ ایک دوسرے پر بھرپور اعتماد کریں گے تو ایک دوسرے کی سنیں گے، ایک دوسرے کو دیکھیں گے، سمجھیں گے اور قبول بھی کریں گے۔

02۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ انٹیمیٹی، محبت اور بے تکلفی کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔

03۔ ایک دوسرے کی ضروریات کو سمجھیں اور ایک



# کچن اور آپ

کچن سے متعلق صبا شریف کے دلچسپ جوابات



کھا لیتے ہیں کہ اب نہیں تو پھر کبھی (بھی مرے دار)۔  
 س: کون سی رائٹر کو پڑھتے ہوئے کھانا دھاواں ہوا؟  
 ج: بھئی اس طرح کے چوٹیلے دہاں ہی ہوتے ہیں جن کے ہاں گیس کی سہولت ہے۔ کھانا پک رہا ہے آرام سے اور خود مطالعہ میں مصروف۔ ہم گاؤں والوں کا ذرا سا دھیان ادھر ادھر ہوا نہیں اور آگ دغا دے گئی۔ بڑے غرے کرتی ہے آگ۔ کھانا پکاتے ہوئے پڑھنے کا شوق ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک دن سلنڈر پر ہنریاں اٹھنے کے لیے رکھی تھیں، کسی سے بحث میں ایسا ابھی کہ بھول ہی گئی کہ کوئی چیز مختار ہے۔ پتا جب چلا جب سارے میں پوچھ لگائی، بھئی وہ کون سا ہماری ”غریبی آگ“ تھی جو خود ہی بجھ جاتی۔

س: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ”ان“ کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

س: کیا آپ بھتی ہیں کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟  
 ج: میرے خیال میں تو جینے کے لیے کھایا جاتا ہے کیونکہ اور بھی غم ہیں زمانے میں کھانے کے سوا۔  
 س: گھر کے کام کاج خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے؟ یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان سے دور رکھتا ہے؟  
 ج: میری ساری دلچسپیاں گھر کے کاموں سے ہی متعلق ہیں۔ پڑھنے کا شوق ان سے دور نہیں کرتا بلکہ ان کاموں نے پڑھنے کے شوق سے دور کر دیا۔  
 س: ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مرے دار ہی ہے، کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں، تو گھر والوں کے کیا تاثرات ہوتے ہیں؟

ج: شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کھانا اچھا نہ بنے۔ ایسی صورت میں چند ایک باتیں کر کے صبر و دھکر کر کے







# کرن کا دسترخوان

## بینگن کا سالن

## ترکش پلاؤ

لگا کر آدھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔  
سوکھا دھنیا، خشخاش اور کھوپرا پیس  
لیں۔

دبئی میں سبھی کو کڑا نہیں۔ اس میں  
پیاز سرخ کریں، لہسن بھی ثابت اسی  
میں تل لیں پھر ان کو نکال کر خشخاش  
کر لیں اور ہاتھوں سے مل لیں یا پیس  
لیں۔ اس میں ادراک اور ہرن مرچ

کاٹ کر ملا لیں۔ زیرہ بھی ملا لیں۔  
اب ان کو کچی میں تل لیں۔ پھر الگ  
دبئی میں سبھی ڈال کر بینگن تل لیں۔

سرخ ہو جائیں تو دھنیا، خشخاش،  
کھوپرا، پیاز لہسن، ادراک، ہری  
مرچیں سب ڈال دیں۔ پھر ٹائمر اور

دہی ڈال کر ڈھک دیں اور ہلکی آگ پر  
پکے دیں۔ پانی خشک ہو جائے اور کچی  
چھوڑ دے گی تو بھونیں۔ پھر ہر دھنیا

ڈال کر پانچ منٹ کے لیے جلکے دم پر  
لگا دیں۔ پھر اتار کر لیوں کا رس نچوڑ  
لیں۔

آج تیز کر دیں۔ چاول کا پانی  
خشک ہونے پر اس میں  
زردے کا رنگ چھوڑے سے  
پانی میں گھول کر ڈال دیں اور  
پندرہ، بیس منٹ کے لیے

چاولوں کو دم دے دیں۔

☆☆



اجزاء:-

چاول ایک کلو

آدھا گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔

گوشت ایک کلو

پسی کالی مرچ / نمک حسب ذائقہ

دھنیا پسا ہوا ایک چائے کا چمچ

ادراک لہسن ایک چائے کا چمچ

پٹیا کھانے کا رنگ چوتھائی چائے کا چمچ

پیاز ایک کلو

تیل ایک کپ

گوشت کی بخنی ایک کلو

ترکیب:-

پیاز کاٹ لیں اور کسی بڑی دبئی میں تیل  
یا مٹی ڈال کر پیاز کو فرائی کر لیں۔ جب  
پیاز ہلکی براؤن ہو جائے تو اس میں پسا

ہوا ادراک لہسن ڈال کر بھونیں۔ ساتھ ہی

گوشت بھی ڈال دیں۔ خیال رکھیں کہ

گوشت کی بوٹیاں بالکل چھوٹی چھوٹی

ہوں۔ پسی کالی مرچ ڈال کر تھوڑی دیر

گوشت اور مسالے کو بھونیں، گوشت کی

بساہ ختم ہو جائے تو اس میں اتنی بخنی

ڈالیں کہ چاول گل سکے۔ چاول ڈال کر

اجزاء:-

لے بینگن

پسا ہوا دھنیا

خشخاش

دہی

لیموں

پسا ہوا کھوپرا

پیاز

لہسن

ادراک

نمک

ثابت سرخ مرچ

زیرہ

ترکیب:-

بینگوں میں ڈھک لگا

کر اس طرح چار

کلوے کریں کہ وہ

بھنی پر جڑے رہیں۔

ان کو نمک اور ہلدی





اجزاء:-

آلو

کھجی

دہی

میتھی دانہ

کلو کھجی

رائی

لیبوں

پیاز

نمک مرچ، ہر امالا

ترکیب:-

آلو بالائی کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

بنالیں، کھجی میں پیاز بادامی کر کے

آدھی پیالی پانی ڈالیں اور پیاز

ملا لیں۔ اسی میں اچاری مسالے اور

دہی ڈال دیں اور خوب بھوننے کے

بعد آلو ڈال دیں۔ تھوڑا سا پانی گھٹے

کے لیے ڈال دیں۔ گل جانے پر

تھوڑا بھونیں اور ایک عدد لیبوں کا

رس نچوڑ کر اتار لیں۔



☆☆



اجزاء:-

میدہ

کھن

اٹلے

ٹلک چاکلیٹ

پھلی ہوئی چاکلیٹ

آئسنگ شوگر

کوکو پاؤڈر

بیکنگ پاؤڈر

ترکیب:-

80 گرام

200 گرام

چار عدد

80 گرام

130 گرام

200 گرام

40 گرام

آدھا چائے کا چمچ

ایک پیالے میں میدہ لیں اور اس

میں کھن ڈال کر ملا لیں، اب اس

میں اٹلا ڈال کر دوبارہ ملا لیں۔

ٹلک چاکلیٹ اور پھلی ہوئی

چاکلیٹ ڈال کر اچھی طرح ملانے

کے بعد آئسنگ شوگر، کوکو پاؤڈر اور

بیکنگ پاؤڈر ڈال کر ملا لیں۔ اب

تیار کیا ہوا مرکب سانچے میں ڈال کر

تقریباً 180 ڈگری سینٹی گریڈ پر

بیک کر لیں۔ بیک ہونے کے بعد

براؤنی کو درمیان سے کاٹیں اور اس

پر چاکلیٹ کی تہ لگائیں اور اپنے

پسندیدہ پھل یا خشک میوہ جات

چمڑک دیں۔ ☆☆

اجزاء:-

گوشت

اورک بسن کا پیسٹ

نار (چھٹا سال کر لیجیے)

ہری مرچ

نمک

ٹاٹ دھنیا

ٹاٹ زیرہ

لیبوں کا رس

ٹاٹ کالی مرچ

تازہ ہر ادھیا

تیل

ترکیب:-

آدھا کلو

دو کھانے کے چمچ

ایک عدد

دو عدد

ایک چمچ باسب فرورٹ

ایک چمچ تھائی چمچ

ایک چمچ

دو کھانے کے چمچ

ایک چمچ تھائی چمچ

سجانے کے لیے

ایک پیالی

سب سے پہلے ٹاٹ دھنیا اور ٹاٹ کالی مرچ

توے پر ڈال کر دھبی آج پر بھون لیجیے۔

اب ان کو گرائنڈر میں موٹا موٹا پیس لیں،

باریک نہیں کرنا۔ کسی بڑے فرنی بین میں

گوشت، چھٹا صاف کیا ہوا نار، اورک بسن

کا مرکب، زیرہ، ہری مرچ (لبے) اور باریک

تھکے کاٹ لیں) ڈال کر بھون لیجیے۔ ساتھ ہی

نمک بھی شامل کر دیجیے۔ اب اس میں ڈیڑھ

پیالی پانی شامل کر کے اچھی طرح ملا لیں،

دھن باندھ کر دیں اور دھبی آج پر پکھن دیں۔

کچھ ہی دیر میں گوشت نرم ہو جائے گا

لیکن خیال رہے کہ یہ اتنا نرم نہ ہو کہ

بڑی سے ہی الگ ہو جائے۔ گوشت

گھٹے پر جو پانی بچ جائے اسے تیز آج پر

بھون کر خشک کر لیں۔ اب توے پر ایک

پیالی تیل ڈال کر اس میں گوشت بھون

لیں، یہاں تک کہ دونوں جانب سے اس کا

رنگ سنہری ہو جائے۔ اب اس پر بھون کر

رکے ہوئے مسالے ڈال کر ملا لیں، ساتھ ہی

لیبوں کا رس بھی نچوڑ دیں۔ بس اس کے بعد

گوشت کو چولے سے اتار لیں، لیبوں شامل

کرنے کے بعد گوشت پکانا بھوننا نہیں ہے۔

پلٹ میں ٹالنے کے بعد اس پر تازہ ہر ادھیا

اور ہری مرچ چمڑک دیں اور اسے دی پودینہ

چمکی کے ساتھ گرم گرم کریں۔ ☆



اجزاء:-	اجزاء:-	اجزاء:-
ایک کپ بکٹ کا چوڑا	ایک کپ دو عدد	ایک کلو
ایک پکٹ اسٹرابری جیلی	دو کھانے کے چمچے	(لپے پارچے کی طرح کٹی ہوئی)
ایک پکٹ کریم	پچھلے ایک کھانے کا چمچ	بریکر منس ایک کپ
چھ عدد کیلے سلاکس	(کٹے ہوئے)	آئیز کے لیے:-
ایک کپ خشک دودھ	بڑا (ایک کی ہوئی)	اٹھ
دو کپ دہی (ڈبے والا)	ایک کپ مرچ	میدہ
کنڈینسڈ ملک	دو کھانے کے چمچے	کارن فلور
جیلٹن پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ	سویا ساس
ترکیب:- پہلے ایک کپ بکٹ کے چورے کو ایک سرونگ ڈش	نمک حسب ضرورت	نمک
	ترکیب:-	پہلی کالی مرچ ایک چائیز سالٹ
	پیلے میں اٹھ دن کو پھینٹ کر نمک اور مرچ ملا لیں۔	آدھا چائیز سالٹ
	نان اسٹک فرائنگ چین میں آئل گرم کریں اور پھینٹے ہوئے اٹھ سے پین	چلی کارلک ساس دو کھانے کے چمچے



اٹھ پھینٹ کر تمام اجزاء ملا کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر مچھلی کو اس آئیز میں ڈبو کر بریکر میزنگ کر لیں۔ خیال رہے کہ آئیزہ اتنا گاڑھا ہو کہ اس میں مچھلی لپٹ جائے اور آج درمیانی ہو۔

اچھی طرح لگا کر بیس بنالیں، اب دہی میں خشک دودھ اور تھوڑے پانی میں گھلا ہوا، ایک چائے کا چمچ جیلٹن پاؤڈر ڈال کر پھینٹ لیں، باقی جیلٹن پاؤڈر کو ایک پکٹ کریم میں شامل کر دیں۔ ساتھ ہی اس میں اسٹرابری اور کنڈینسڈ ملک ڈال کر پھینٹ لیں۔ اب پہلے بکٹ کا چورہ لگا کر کریم کا کمپر ڈالیں۔ اوپر سے دہی والا آئیزہ ڈال کر کیلے کے سلاکس شامل کر دیں پھر باقی بچا ہوا آئیزہ ڈال کر کیلے کے سلاکس سے گارنش کر کے دو گھنٹے کے لیے فریڈر میں رکھ دیں۔ ☆☆

ایک میں ڈال کر پھیلا لیں۔ چوبے کی آج بکلی رخص۔ اٹھا آدھا پک جائے تو ایک طرف قہر، ہنر پیاز، سلاکس کے پتے اور چیدر چن ڈال کر احتیاط سے اٹھ کے دوسرے حصے کو ڈی کی فصل میں فولڈ کریں۔ اٹھ اٹھل پک جائے تو سرونگ پلیٹ میں نکال لیں۔ ☆☆





اقصی ناصر ————— گلستانِ بحر

مجھے زندگی کی دُعا نہ دے  
میری زندگی سے بنی نہیں  
کوئی زندگی پہ کرے یقین  
مجھے زندگی پہ یقین نہیں

عدنا، ناہدراشد ————— ملیر کراچی

میری راتوں کی راحت، دن کا اطمینان لے جانا  
تمہارے کام آجائے گا، یہ سامان لے جانا  
تمہارے بعد کیا رکھنا انا سے واسطہ کوئی  
تم اپنے ساتھ میرا عمر بھر کا سامان لے جانا

صدف عمران ————— کے ڈی اے سرائی

دلوں پہ زندہ عدا دل ہی نہیں رہے ہیں یہاں  
اب ایسے شہر میں جینا محال دردِ کھائے  
انوشِ ابعاد ————— قائد اعظم یونیورسٹی  
کو چھوڑ عیش میں اک عمر بھر کے خاک بھر  
تب کہیں جا کے ہم اس آئینہ میں تصویر دیکھتے  
مرو، افرات ————— کراچی

ہزار وقت کے پر تو نظر میں ہوتے ہیں

ہم ایک ملکہ، دشتِ اثر میں ہوتے ہیں

شازیہ گلزار ————— بھکر

نہ اب مسئلے کو جی چاہتا ہے  
نہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے  
مجھے بھول جانا تو ہے عنبرِ ممکن  
مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

لااریب، اقراء ————— کراچی

پھر تیری خواہش کے دردوں سے بنائیں گے نگر  
پھر تیری رسمِ طلب، رسمِ وفا لائیں گے لوگ  
سفرِ رنگوں کی آتش پر نہیں ہے دلکشی  
سے کپڑوں میں بھی مجھ کو دیکھنے آئیں گے لوگ

صائمہ سحر ————— فیصل آباد

کبھی شہر و تغیر کے کبھی آنسوؤں میں دھل کے  
وہ مجھے ملے تو لیکن ملے صورتیں بدل کے  
حناکرن ————— پتوکی

آپ کے ہوتے دنیا والے میرے دل پر ران کریں

آپ سے مجھ کو شکوہ ہے، خود آپ نے یہ بات کی

مسترت طاہق ————— مظفر آباد

مجھ سے میں کیا کہوں، اسے سوختہ جلوہ طور

دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ہے

نورِ فاطمہ ————— بومس والا

حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن

جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا

بیٹہ کرسایہ گل میں ناصر

ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

رضیہ رضوان ————— شورکوٹ

کنے سادہ مزان ہو تم مدام

اس گل میں بہت نہ پایا کرو

اساد کریم ————— جھنگ

یوں تو ہر چیز سلامت ہے میری دنیا میں

اک تعلق ہے جو لوٹا ہوا لگتا ہے

میں نے سوچا تھا کہ آباد ہوں اک شہر میں یاس

یاں تو ہر شخص کا اندازِ جدا لگتا ہے

اسملا ————— داؤدی

ہم ہی ہیں رات دن جو رزق کے چکر میں بہتے ہیں

توکل اور قناعت میں بند رہے ہم اسچے ہیں

یاسین ملک ————— کراچی

ابھی تو خشک ہے موسمِ بارش، ہو تو میں گے

کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

دُعا شاہد ————— کورنگی

رات باقی تھی جب وہ بھڑا تھا

عمر گزری ہے، رات باقی ہے



## مسکراتی کرنیں

میری برساتی کیوں پہنی؟“

وہ معصومیت سے بولا۔ ”کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارا سب سے خوب صورت کوٹ، جو میں نے پہن رکھا ہے بارش میں بیگ کر خراب ہو جائے۔“

فائزہ بھٹی..... چوکی

### دو مرتبہ اف

لڑکی نے پوچھا۔ ”یہ سوٹ کتنے کا ہے؟“

”تین ہزار کا۔“ دکان دار نے جواب دیا۔

”اف۔“ لڑکی نے ایک سرہ آہ بھری اور پھر

پوچھا۔ ”اور وہ دوسرا والا؟“

”دو مرتبہ اف۔“ دکان دار نے جواب دیا۔

سیدہ نعمان..... لاہور

### رشوت

جو یہ کہتے ہیں کہ رشوت کو نشے سے کیا غرض اب ”نشہ پانی“ کا مطلب بھی، انہیں سمجھائیے علیشا بھٹی..... چوکی

### بجٹ

تازہ بجٹ کے بعد سب ہی لوگ کہہ اٹھے

آرام سے ہے کون جہان خراب میں

تزیلہ عدیل..... کراچی

### ابھی مت آنا

ایک اشرافیہ عورت اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ شملہ کے پرفضا مقام پر سیر و تفریح کے لیے چلی گئی۔ وہاں سے اس نے اپنے شوہر کو ایس ایم ایس بھیجا۔ ”چار بجتے میں میرا وزن آدھا رہ گیا ہے، یہاں کی آب و ہوا بہت موافق ہے۔ میرا سارا موٹا پادور ہو گیا ہے، تم کہو تو واپس چلی آؤں۔“

شوہر نے فوراً جوابی مسج دیا۔ ”ابھی آنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ مزید چار بجتے قیام کرو باقی سب خیریت ہے۔“

فوزیہ عمر..... کجرات

### دوستی

بچے کی ماں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ آپ رضوان کے ساتھ نہیں کھیلیں گے، وہ نہ اچھے ہے۔“

بچے نے ماں سے پوچھا۔ ”امی! میں کیسا بچہ ہوں؟“

اس کی ماں نے جھٹ کہا۔ ”بیٹا! آپ تو بہت اچھے بچے ہو۔“

بچے نے فوراً کہا۔ ”پھر رضوان تو میرے ساتھ کھیل سکتا ہے نا؟“

ایشال فاطمہ..... کراچی

### وارفتگی

قوالی کی محفل میں ایک شخص کو حال آگیا اور وہ بے ساختہ جموٹے لگا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا، محفل میں موجود ایک شخص نے اس سے پوچھا۔

”یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟“

جموٹے والا شخص پرسکون ہوتا ہوا بولا۔ ”کچھ نہیں

یار! اے ہی بیٹھے بیٹھے میرے پاؤں ”سن“ ہو گئے تھے۔“

ہانیہ عمران..... کجرات

### خط و کتابت

حامد: ”میں ملک کے مشہور رسائل میں اپنے مضامین بھیجتا ہوں اور مجھے ان اخبارات کے ایڈیٹروں کی طرف سے خطوط بھی آتے ہیں۔“

نوید: ”اچھا پھر تو تم بہت مشہور ہوئے مگر یہ تو بتاؤ ایڈیٹر تمہیں خط میں کیا لکھتے ہیں؟“

حامد: ”بھئی کہ میری کہانیاں قابل اشاعت نہیں ہیں۔“

فوزیہ شمس..... کجرات

### دوستی

بارش میں بیٹھتا ہوا ایک طالب علم ہاشل میں داخلہ آیا تو اس کا دوست اس کی برساتی پہن کر باہر نکل رہا تھا۔ اس نے غصے سے کہا کہ ”تم نے میری اجازت کے بغیر



## کچھ موتی چنے ہیں

جاسکتا ہے دوسرا وہ ہے جو خاص آداب اور خاص اصولوں کے تحت خلق سے بلند کرنا پڑتا ہے۔

(سعادت حسن منٹو..... بغیر عنوان کے)

صائمہ سحر..... فیصل آباد

### آج کے گلوکار

میوزک بڑے کمال کی چیز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہمارے جدید و شدید گلوکارا نیک بکڑ کر جو کچھ کرتے ہیں، انہیں اس پر پاگل خانے کی ہوا کھانی پڑتی۔ لوگ ان کے گانے بھی پسند کرتے ہیں۔ ظاہر ہے، بندہ اچھے گانے سن کر کبھی اکتا بھی جاتا ہے۔ یہ نوجوان گلوکار گاتے گاتے کھو جاتے ہیں پھر کہیں سے ڈھونڈ کر انہیں لانا پڑتا ہے۔ نوجوان گروپ کی صورت میں مل کر اس لیے گاتے ہیں تاکہ پتا نہ چل سکے کہ سب سے بے سارا کون ہے۔ یہ بھاگتے ہوئے گاتے ہیں، واقعی ایسا گانا سننے والے کو بھاگنا ہی چاہیے۔

(ڈاکٹر یونس بٹ..... کلاہ بازیان)

فوزیہ ثریا..... گجرات

### پیما

خواہشات تو سب ہی کے دل میں ہوتی ہیں۔ سب ان کی تکمیل چاہتے ہیں لیکن دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ ان تک رسائی کے لیے کون سا راستہ جاتا ہے۔ اسی راستے کے انتخاب میں تو انسان کا پتا چلتا ہے۔ اسی انتخاب میں انسان کی بڑائی یا اس کا چھوٹا پن چمپا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ وہ سونے کا ہے یا پتیل کا۔ ہیرو بھی ہیروئن تک پہنچنا چاہتا ہے اور ولن بھی۔ صرف راستے کے انتخاب سے ایک ہیرو ظہرتا ہے اور دوسرا ولن۔

(فٹ پاتھ کی گھاس)

اقراء عزیز..... گاؤں دریا خان جالبانی

### حکیم صاحب

ان معالجوں میں ہمارے دوست حکیم دوست ہیں، وہ تشفی کے ماہر ہیں۔ بس مریض کی نبض دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

”تمہارا جگر خراب ہے۔“

ایک دفعہ ہماری موجودگی میں انہوں نے ہمیں مریضوں کو یہی بتایا کہ تمہارا جگر خراب ہے بلکہ اب تو یہ عالم ہے کہ انہیں تشفی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ مریض ان کے پاس آتے ہیں اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے خود کہتے ہیں۔

”حکیم صاحب! میرا جگر خراب ہے۔“

ایک دفعہ ہم نے حکیم صاحب سے پوچھا۔

”حکیم صاحب! آپ کو علم ہے کہ انسانی جسم میں

جگر کہاں واقع ہوتا ہے۔“

بولے۔ ”نہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”جب آپ جگر کے حدود اور بعد سے

واقف نہیں ہیں تو مرض کی تشفی کیسے کرتے ہیں۔“

یہ سن کر اپنے گردے کی طرف اشارہ کر کے کہنے

لگے۔

”میاں! یہ دماغ اللہ میاں نے آخر کس لیے دے

رکھا ہے۔“

(عطاء الحق قاسمی)

ماہر شیر حسین..... ڈنگہ

### دوزخ

ہر شخص کو ایک زندگی اپنے لیے اور ایک دوسروں کے لیے بسر کرنا ہوتی ہے۔ آنسو بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ قہقہے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ آنسو جو زیر دستی آنکھوں سے نکالنے پڑتے ہیں اور ایک وہ جو خود بخود نکلتے ہیں۔ ایک قہقہہ وہ ہے، جو تہائی ہی میں بلند کیا